Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منوّر لکھنوی : ایک مطالعہ

ڈاکٹر شباب للت

CC-0 ... by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

شباب للت صاحب نے اپنے اُستادِ محترم
کے تئیں اپنی عقیدت کا اظہار یوں کیا ہے کہ ملازمت کی
ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوتے ہی انھوں نے منوّر صاحب
کی شخصیت، فکر اور فن پر ایک مبسوط، مدلّل اور منضبط تنقیدی
اور تحقیقی مقالہ لکھا، اور وہ بھی اس انداز سے کہ انھوں نے
اپنی عقیدت کو کہیں بھی اپنے تنقیدی شعور کو دُھندلانے کی
اجازت نہیں دی۔ منوّر صاحب کی مختلف تخلیقی جہات کا
احاطہ جس خوبی اور خوبصورتی سے شباب صاحب نے کیا ہے اس
سے اُن کے اُستادِ محترم کے تخلیقی شعور کے کئی نئے گوشے پہلی بار
سامنے آئے ہیں اور اس طرح اُن کی ہفت رنگ ادبی یافت
کا مناسب اور موزوں تجزیہ اور اس کا اظہار بھی پہلی بار ہو سکا
ہے۔ بنیادی مواخذ تک رسائی حاصل کرنے اور مواد کی ترتیب و
تہذیب میں انھوں نے جس محنت اور لگن سے کام لیا ہے وہ ان
کی تنقیدی بصیرت اور تحقیقی شعور کی بالیدگی کا مظہر ہے۔ شباب
صاحب کے اس مقالہ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ سب کچھ
ایسی رواں دواں نثر میں لکھا گیا ہے جو اکثر تنقیدی اور تحقیقی
مقالوں کا مقدر نہیں ہوتی۔ تحقیق اور تجزیہ کے مختلف مراحل
سے گزرتے ہوئے بھی مقالہ کی READABILITY ذہن و
دل کو کچھ ایسے متاثر کرتی ہے کہ قاری منوّر صاحب کی اقلیمِ سخن
کی سیاحی میں شباب للت صاحب کے ساتھ کشاں کشاں چلنے
لگتا ہے — اور یہ کسی بھی مقالہ نگار کے لیے بہت بڑی بات
ہے۔

آزاد گلاٹی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منور لکھنوی: ایک مطالعہ

ڈاکٹر شباب للت

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

یہ کتاب
فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومت اتر پردیش لکھنؤ
کے
مالی تعاون سے شائع ہوئی

MUNAVVAR LUCKNOWI: EK MUTALA [CRITICAL ASSESSMENT OF MUNAVVAR LUCKNOWI] BY DR. SHABAB LALIT Rs. 350/-

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منوّر لکھنوی

ایک مطالعہ

Gandhi Memorial College
SRINAGAR
Acc. No: 3535 23 (IV)
Dated: ....

ڈاکٹر شباب للت

491.439
L15M

G.M.C.E.J
3535

Panjab University Chandigarh
Awarded Ph D to the Writer
on this Thesis in year 1993

ماڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲ ۱۱۰۰۰۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

© ڈاکٹر شباب للت
۹ ہائڈویل۔ چوڑا میدان
شملہ۔ ۱۷۱۰۰۴

اشاعت : ۱۹۹۶ء
قیمت : تین سو پچاس روپے
کتابت : راحت علی خاں رام پوری
تعداد اشاعت : چار سو
طباعت : جے۔ اے۔ آفسیٹ پریس، دہلی
سرورق : رزاق ارشد
ناشر : مصنّف

زیر اہتمام
پریم گوپال متل

تقسیم کار
موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منور لکھنوی کی رفیقۂ حیات
شریمتی چندر کلا سکسینہ

منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بھلائی نہ آئی برائی نہ آئی!　　خودی سامنے بن کے آئینہ آئی

کہاں کامیابی کہاں یہ زمانہ　　مُنوّر تمہیں خودنُمائی نہ آئی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

مشمولات

مقدّمہ ڈاکٹر گیان چند ۹

سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے مصنّف ۱۵

بابِ اوّل ۲۵

سوانح حیات

بابِ دوم ۶۳

مُنوّر لکھنوی کا زمانہ

بابِ سوم ۱۰۱

مُنوّر لکھنوی کی نظمیہ شاعری

(ا) نظمیہ شاعری

(ب) مُنوّر، بحیثیت غزل گو ۱۴۵

(ج) مُنوّر کی رباعی گوئی ۱۶۷

بابِ چہارم ۱۸۳

مُنوّر لکھنوی کی فارسی شاعری اور تراجم

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

باب پنجم

(ا) مُنوّر کے تراجم ۔ مذہبی تصانیف کے ترجمے ۲۲۴

(ب) سنسکرت تصانیف کے تراجم ۳۱۴

" (ج) بنگلہ ادب کے تراجم ۳۸۳

" (د) جرمن تصانیف کے ترجمے ۳۹۹

" (ہ) متفرق تراجم اور نثری تالیفات ۴۲۱

" (س) بچّوں کے لیے تراجم و تصانیف ۔ تراجم کا مجموعی تاثّر ۴۳۹

باب ششم
مقامِ مُنوّر ۴۶۱

کتابیات
رسائل و جرائد ۴۸۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

مقدّمہ

ڈاکٹر گیان چند جین

شباب کے کارنامے پر شیب مقدمہ لکھے، یہ ضعیفوں کا جوانوں پر جبر نہیں تو اور کیا ہے، لیکن چونکہ شبابؔ اپنے کالے بھجنگ بالوں کے باوجود اب اتنے شباب آلود نہیں جتنے کہ اس زمانے میں تھے، جب مجھ سے پہلی بار جموں میں ملے تھے۔ اس لیے میرا ان کے تحقیقی اور تنقیدی مقالے پر لکھنا بے جا نہیں کہلائے گا۔ میں ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۶ء تک جموں یونی ورسٹی میں تدریس کرتا تھا۔ اس زمانے میں شباب للت کئی بار مشاعروں میں جموں آئے اور ان سے ملاقات ہوئی۔ ۱۹۶۵ء کے چند سال بعد جشنِ جموں کے سلسلے میں ایک مشاعرہ ہوا تھا جس کی صدارت میں نے کی تھی اور نظامت شباب للت نے۔ اس رات ان کے ساتھ کئی گھنٹے دوش بدوش نشست رہی۔ چوتھائی صدی گزرنے کے بعد ان کی بازدید اس وقت آئی ہے جب انہیں ملازمت سے رِٹائر ہوئے تین سال ہو گئے ہیں۔

مجھے معلوم نہیں کہ شبابؔ صاحب نے کب ایم اے اردو کیا۔ ملازمت سے فارغ ہو کر انھوں نے پنجاب یونی ورسٹی سے اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ ان کا مقالہ "منوّر لکھنوی، ایک مطالعہ" آپ کے سامنے ہے۔ ان کے نگراں پنجاب یونی ورسٹی چنڈی گڑھ کے صدرِ شعبۂ اردو ہارون ایوب تھے۔ ہارون حمیدیہ کالج بھوپال میں میرے شاگرد تھے۔ گستاخی نہ ہو تو میں یہ دعویٰ کردوں کہ شباب میرے شاگرد کے شاگرد ہیں۔ کئی سال ہوئے میں جموں یونی ورسٹی کے ایک مقالے کا ممتحن تھا۔ عنوان تھا "بشیشور پرشاد

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منور لکھنوی"۔ مقالہ نگار کا نام راج سنگھ۔ امید ہے انہیں ڈگری مل گئی ہوگی۔اب مجھے کچھ یاد نہیں کہ انھوں نے کیا لکھا تھا لیکن شباب کے مقالے سے میری معلومات میں معتدبہ اضافہ ہوا جس کی بنا پر مجھے یقین ہے کہ انھوں نے راج سنگھ کے مقابلے میں زیادہ جامع کام کیا ہے۔

ہمارے دور میں استادی شاگردی کی رسم ختم ہوتی جارہی ہے لیکن منوّر صاحب کے کئی تلامذہ ملک گیر شہرت کے مالک ہیں۔ ان میں بمل کرشن اشک، راج نراین راز، کشمیر کے حکیم منظور، آسام کے ڈاکٹر تاراچرن رستوگی طاہر، نریش کمار شاد، امیر چند بہار اور باواکرشن گوپال مغموم، نادرات غالب والے آفاق حسین آفاق، شباب للت، دلیپ بادل، سمت پرکاش شوق اور امریکہ میں جابسے منشی کالی چرن اثر ممتاز ہیں۔ راج نراین راز نے ایک کتاب "منوّر لکھنوی، شخصیت اور شاعری" ۱۹۷۰ء میں شائع کی۔ یہ مستقل کتاب نہیں، مختلف حضرات کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں دو مضامین خود راز صاحب کے ہیں۔ چونکہ اس کے عنوان میں 'شاعری' کی تحدید ہے، اس لیے اس میں منور کے نثری کارناموں کو جگہ نہیں دی گئی۔

میں نے یہ تحریر لکھنے کے لیے شباب کے غیر مطبوعہ مقالے کا تفصیلی مطالعہ کیا، مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ میں اس کے ذریعہ منوّر کی شخصیت اور تخلیقات کو تفصیل سے جان سکا۔ ان کے آخری زمانے میں مجھ سے بھی قدرے مراسلت ہوئی۔ ان کے انتقال کے بعد جرمن سفارت خانہ دہلی سے ان کا ترجمہ شدہ "فاؤسٹ" موصول ہوا۔ ساتھ کی چھٹی میں لکھا تھا کہ یہ مصنّف کی فرمائش پر بھیجا جارہا ہے۔ میں نے مزاحًا لکھ دیا کہ مصنّف کا انتقال کئی مہینے پہلے ہوچکا ہے، آپ کو ان کی فرمائش کس طرح موصول ہوئی۔ اس پر سفارت خانے کے افسر نے لکھا کہ آپ یقین رکھیے، مصنّف نے یہ فرمائش جنّت سے نہیں بھجوائی بلکہ انتقال سے پہلے ہی لکھ گئے تھے۔

مجھ سے پہلے کی نسل میں ہونے کے باوجود منوّر صاحب تقریبًا ۴۷ سال میرے ہم عصر رہے ہیں۔ چونکہ اہل نقد نے اپنے جائزوں میں ان کا کوئی خاص ذکر

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

نہیں کیا اس لیے میں انہیں پڑھے بغیر ہی سوچتا تھا کہ وہ معمولی درجہ کے شاعر رہے ہوں گے۔ اب شباب کے مقالے میں جو منوّر کے کلام کے نمونے پڑھے تو خوشگوار حیرت ہوئی کہ ان کا کلام ہمیشہ ایسا پختہ اور برجستہ ہوتا ہے کہ نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں۔

مقالے سے مجھے شباب کو پہچاننے کا موقع ملا۔ اب تک میں انہیں محض شاعر کے طور پر جانتا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ ایک تحقیقی اور تنقیدی مقالہ بھی خوش اسلوبی سے سر کر سکتے ہیں۔ وہ منوّر صاحب کے شاگرد رہے ہیں، انہیں قریب سے دیکھا ہے، ان کے منھ بولے بیٹے سے ان کے مراسم ہیں جس کے سبب منوّر صاحب کے انتقال کے بعد ان کے جملہ غیر مطبوعہ کاموں تک رسائی ہو سکی۔ افسوس کے ساتھ حیرت ہوتی ہے کہ منوّر جیسے مشہور تخلیق کار کی تقریباً نصف کتابوں کو اشاعت کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ اب کوئی اُمید نہیں کہ وہ شائع ہو سکیں گی۔ جگن ناتھ آزاد نے اپنے والد کی یاد میں محروم اکیڈمی بنائی۔ اگر منوّر صاحب کے تلامذہ بھی کوئی منوّر اکیڈمی تشکیل دے سکیں تو ان کے غیر مطبوعہ آثار کی اشاعت کی کوئی سبیل ہو سکتی ہے۔ ورنہ فی الحال یہی مناسب ہوگا کہ کسی بخل کے بغیر ان کے تمام مخطوطات کو خدا بخش لائبریری پٹنہ یا رضا لائبریری رام پور کو دے دیا جائے جہاں ان کی مناسب نگہ داشت ہو سکے گی۔ ساتھ ہی ان کی ایک فوٹو کاپی بنوا لی جائے کہ وہ پائیدار کاغذ پر ہونے کے سبب لمبے زمانے تک پائندہ رہیں گی۔

شباب نے پہلے باب میں منوّر کی مفصّل سوانح عمری پیش کی جس میں یہ حیرت ناک انکشاف تھا کہ کائستھ ہونے کے باوجود وہ پیاز تک نہیں کھاتے تھے، گوشت کا تو ذکر ہی کیا۔ یہ بات پڑھ کر مجھ نام کے جینی کو شرم محسوس ہوئی۔ مقالے کا دوسرا باب "منوّر لکھنوی کا زمانہ" ہے۔ مجھے اس باب کا احاطہ سمجھ میں نہیں آتا۔ عنوان سے ایسا لگتا ہے جیسے اس میں سماجی اور ادبی پس منظر ہوگا لیکن اس میں بھی کم و بیش منوّر کی سوانح ہی ہے، جس میں ان کے اکابر معاصرین کا ذکرِ خیر بھی ہے۔ شاید اس باب کا عنوان کچھ اور ہونا چاہیے تھا۔ پہلے اور دوسرے باب میں گنپت سہائے سری واستو کے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ایک تذکرے گلدستۂ سخن مطبوعہ ۱۹۸۸ء کا ذکر ہے۔ میں اس سے قطعاً واقف نہیں۔ کیا خوب ہوتا کہ اس باب میں، یا اس سے پہلے باب میں منوّر کی جملہ تصانیف، مطبوعہ اور غیر مطبوعہ، کی زمرے دار فہرست دے دی جاتی۔ فی الوقت مسوّدے میں ہر باب کے شروع میں فہرست ہے۔ جسے مقالے کے آخر میں یکجا بھی کر دیا گیا ہے۔

شباب کے مطالعے کی جامعیت متاثر کن اور داد طلب ہے۔ بظاہر اس مقالے میں محض چھ ابواب ہیں۔ لیکن انھوں نے بعض ابواب کی جو ذیلی فصلیں کی ہیں وہ در اصل پورا باب کہلانے کی مستحق ہیں۔ مثلاً باب سوم منوّر کی اردو شاعری سے متعلق ہے۔ اس کے تین ذیلی اجزا میں بالترتیب منوّر کی نظم، غزل اور رباعی کا جائزہ لیا ہے۔ در اصل انہیں تیسرا چوتھا اور پانچواں باب کہنا چاہیے تھا۔ پانچویں باب میں تراجم کے چھ ذیلی حصے ہیں: ۱۔ مذہبی تصانیف کے ترجمے، ۲۔ سنسکرت تصانیف کے ترجمے، ۳۔ بنگلہ ادب کے ترجمے، ۴۔ جرمن تصانیف کے ترجمے، ۵۔ متفرق تراجم و نثری تالیفات، ۶۔ بچوں کے لیے تراجم و تصانیف۔

ان سب کو بھی آزاد باب قرار دینا چاہیے تھا۔ اس طرح مقالے میں چھ کے بجائے جملہ ۱۲ باب ہو جاتے۔

مقالہ نگار نے باب سوم الف نظم نگاری میں منوّر کے مطبوعہ مجموعے "کائناتِ دل" کے علاوہ تین غیر مطبوعہ مجموعوں "سوزِ وطن"، "شگفتہ عقیدے" اور "نقوشِ منوّر" کا بھی تعارف کرایا۔ باب سوم غزل گوئی میں دو مطبوعہ مجموعوں "نوائے کفر" اور "ادائے کفر" کے ساتھ ساتھ چار غیر مطبوعہ مجموعوں: "تابانیاں"، "تاثراتِ منوّر"، "بساطِ فکر" اور "شاخِ مرجاں" کو بھی اپنے جائزے میں شامل کیا۔ رباعی کی فصل میں مطبوعہ مجموعے "نذرِ ادب" کے ساتھ غیر مطبوعہ "زیرۂ گل" کو بھی سامنے رکھا۔

یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ پنڈت امرناتھ ساحر اپنی بزمِ سخن دہلی کے سالانہ مشاعرے تین دن کرتے تھے جن میں ایک دن اردو شاعری، دوسرے دن ہندی شاعری اور تیسرے دن فارسی شاعری ہوتی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں دہلی میں فارسی کا مشاعرہ

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ منوّر اس میں حصّہ لیتے تھے۔ فارسی میں شاعری کرنے کے علاوہ انھوں نے کئی فارسی شعرا کی تخلیقات کا اردو میں منظوم ترجمہ بھی کیا۔ مثلاً "ارمغانِ حجاز" کے بہرۂ فارسی کا منظوم ترجمہ 'سوزِ اقبال' کے نام سے۔ یہ عرض کر دوں کہ فارسی سے تراجم کا یہ جزو اس باب کے بجائے ترجموں والے باب میں آنا چاہیے تھا۔

اردو کے معروف شعرا میں کسی نے دوسری زبانوں کے ادبِ عالیہ کے اس قدر منظوم و منثور ترجمے نہیں کیے جتنے منوّر نے۔ شباب صاحب نے ان سب کی تفصیل دی ہے۔ ان میں پہلی شق مذہبی صحیفوں کی ہے جن میں اسلام، مسیحیت، ہندوئیت سبھی شامل ہیں۔ سب سے قابلِ ذکر بھگوت گیتا کا ترجمہ "نسیم عرفاں" ہے، جسے بقول مقالہ نگار منوّر نے براہِ راست سنسکرت سے کیا لیکن ساتھ ہی ساتھ گیتا کے ہندی ترجموں سے بھی مدد لی۔ منوّر کے بعد گیتا کا ایک اہم ترجمہ خواجہ دل محمد کا ہے۔ شباب نے متعدد سنسکرت اشلوک دے کر منوّر اور دل محمد کے تراجم کا تقابلی مطالعہ کیا۔ اس میں منوّر کی خوبیوں اور خامیوں کی بے لاگ نشان دہی کی۔ منوّر کا دوسرا اہم مذہبی ترجمہ بالمیکی رامائن کا ہے جس میں نثر کے ۲۷۶ صفحے ہیں۔ مقالہ نگار منوّر کا وکیل نہیں نقاد ہے، اس لیے صاف اعتراف کرتا ہے کہ ترجمے کی زبان سلیس اور آسان نہیں۔ اس میں فارسی ترکیبیں اور عربی الفاظ آئے ہیں، جو رامائن کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں۔

تراجم کی دوسری شق سنسکرت ادبیات کی ہے جس میں کالی داس کے کئی شاہکار نیز دوسرے عمائد کی کتابوں کے ترجمے آئے ہیں۔ مقالہ نگار نے اس سلسلے میں اصل کتاب کے بارے میں جو تفصیلات دی ہیں ان سے ہمیں ان شاہکاروں کا ضروری تعارف مل جاتا ہے، مثلاً کالی داس کے بارے میں یہ مشاہدہ اہلِ اردو کے لیے کتنا معلومات افروز ہے۔

"عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ کالی داس محض ڈرامہ نگار تھا۔ لیکن یہ رائے صحیح نہیں۔ کالی داس نے صرف تین ڈرامے تخلیق کیے: مالویکاگن متر، وکرم اروشی اور

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ابھگیان شاکنتلم ۔ اس کی باقی تصانیف مہاکاویہ (منظوم داستانیں) کہلاتی ہیں۔ ان میں رگھوونش اور کمارسمبھو نمایاں مہاکاویہ ہیں۔ کالی داس کی باقی تصانیف کھنڈکاویہ یعنی جزوی طور پر طویل نظمیں کہلاتی ہیں۔ ان میں میگھ دوت اور رتوشنگار مشہور کھنڈ کاویہ ہیں۔

منوّر نے سنسکرت ادب کے تراجم میں یہ خیال رکھا کہ شعری حصّہ کا ترجمہ شعر میں اور نثری حصّہ کا نثر میں کیا۔ سنسکرت تراجم کے بعد مقالہ نگار نے منوّر کے بنگلہ اور جرمن زبانوں سے ترجموں کی تفصیل دی ہے۔ ان میں ٹیگور کی گیتانجلی کا منظوم ترجمہ "نذرانۂ روح" سب سے اہم ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ دیش بندھو سی۔ آر۔ داس بھی شاعر تھے۔ منوّر نے ان کے ساگرسنگیت کا ترجمہ "بحرِ ترنّم" کے نام سے کیا۔ منتخب ذریات والے باب پنجم کی آخری فصل بچّوں کے لیے تراجم اور تصانیف کی ہے۔ چھٹا اور آخری باب "مقام منوّر" ہے جس میں مجموعی جائزہ لیا ہے۔ وہ خبر دیتے ہیں کہ منوّر نے شاہکاروں کے ۴۷ ترجمے کیے جن میں سے محض ۲۷ شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ کئی ترجمے ناپید بھی ہو گیے۔

غرض یہ ہے کہ شباب کا مقالہ پڑھنے سے منوّر لکھنوی کی شخصیت اور ان کے متنوع کاموں سے بھرپور آگاہی ہو جاتی ہے۔ منوّر کی تصانیف اور تالیفات کو پڑھے بغیر ہی قاری ان سب کے بارے میں اتنا کچھ جان جاتا ہے جیسے اس نے واقعی ان کی ورق گردانی کی ہو۔ اتنا طمانیت بخش کام کرنے پر ڈاکٹر شباب للت کو بھی احساسِ سُرخ روئی ہونا چاہیے۔ اس کتاب کا کمال یہ ہے کہ اسے پڑھ کر منوّر کی کتابوں کو پڑھنے کی تحریک آتی ہے۔ مقالہ نگار شاگرد کو اس سے زیادہ کیا چاہیے۔

گیان چند

لکھنؤ: ۲۱/ اکتوبر ۱۹۹۴ء

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

یہ تحقیقی کاوش منوّر لکھنوی کی اَدَبی خدمات کا مجموعی جائزہ ہے جو اُن کی بتّیس[۳۲] مطبوعہ اور اٹھائیس[۲۸] غیر مطبوعہ تصانیف، تالیفات اور تراجم پر محیط ہے۔ ظاہر ہے کہ موصوف کی نثر و نظم کے ہر مصرع اور سطر کے ساتھ اِس میں مکمّل انصاف کر پانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ منوّر لکھنوی مرحوم نے اہلِ اُردو کے لیے اِس قدر کثیر اور وقیع ادبی اثاثہ چھوڑا ہے کہ شائقینِ ادبِ اردو اور آنے والی نسلیں صدیوں تک اُن کی ممنون و مدّاح رہیں گی۔ راقم السطور نے بصد انکسار جنابِ منوّر کی اِس بیش بہا دین کا غیر جانبدرانہ تنقیدی جائزہ اس تصنیف میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اُردو دُنیا اس محنتی، مخلص اور باشعور عالِم اور ادیب کی فنکارانہ صلاحیتوں کے ذریعے کی گئی ملک و قوم کی بلکہ تمام انسانیت کی بے لوث خدمات سے روشناس ہو سکے، اُس کے افکارِ عالیہ سے استفادہ کر سکے۔ نیز اُس کے بصیرت افروز ادبی کارناموں کی روشنی میں اُدبِ اردو میں اُس کے مقام کا تعیّن کر سکے۔

طبع زاد تخلیق نیز ترجمہ دونوں ہی میدانوں میں منوّر لکھنوی کی دین ناقابلِ فراموش ہے اور اَدبِ اُردو کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ۔ اِن کاوشوں میں جو خونِ جگر انھوں نے جَلایا ہے وہ رائیگاں نہیں جانا چاہیے۔ انھوں نے فارسی، عربی، سنسکرت، انگریزی، بنگلہ، حتیٰ کہ جرمن زبان کے عظیم ادبی شاہکاروں کو اردو نثر و نظم میں پورے فنّی التزام کے ساتھ منتقل کر کے وہ شاندار اور قابلِ فخر خدمت سرانجام دی ہے جو تاریخِ اردو میں یادگار رہے گی۔ مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے شہرۂ آفاق تمثیلی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

شاہکار "فاؤسٹ" کے ترجمے میں ابتدائی صفحہ پر منوّر نے جو دعوےٰ کیا ہے وہ سو فیصد مبنی برحق ہے۔ فرماتے ہیں:

صدیوں رہے گا جس پہ ادب دوستوں کو ناز
ہم نے ادب دیا ہے وہ اردو زبان کو

لیکن اسے تقدیر کی ستم ظریفی سمجھیے یا اس شریف وخوددار انسان — اور عالی ظرف شاعر کی فقیرانہ بے نیازی کا خمیازہ کہ منوّر لکھنوی کے ہمعصر نقادوں اور اُدب کے پارکھیوں کی بعد کی نسل نے بھی اس محنتی، مخلص اور سچے فنکار کی بیش بہا ادبی خدمات کا سنجیدگی سے نوٹس نہیں لیا۔ کیا یہ انصاف ہے کہ جس انسان نے اردو زبان اور اُدب کو اپنا خونِ جگر دیا ہو اور اپنے ۷۳ سالہ عرصۂ حیات میں سے مسلسل ساٹھ برسوں تک اپنے فنّی شاہ پاروں اور تخلیقی کاوشوں سے اس کے فروغ وبقا کے عمل میں مثبت حصّہ ڈالا ہو اُسے لاعلمی سے یا شعوری طور پر نظر انداز کر دیا جائے؟ اِس لیے میں نے صِدقِ دِلی سے یہ محسوس کیا کہ منوّر لکھنوی کی اس انمول دین کی جانب دنیائے اُردو کی توجہ منعطف کرائی جائے۔ کیوں کہ ہمارے سماج میں عادتاً بڑے نام کی پرستش ہوتی ہے، بڑے کام کی نہیں۔ ہم لوگ بلند پایہ ادب اور فی الواقعی بلند پایہ ادیبوں کے تئیں انصاف نہیں برتتے۔ کیوں کہ ہم کچھ اقتصادی اور جماعتی مصلحتوں کا طوق گلے سے نہیں اُتار پاتے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور تاسف بھی کہ محض ہیئت کے تجربات اور لفظوں کی تزئین اور نراش خراش کو اعلیٰ شاعری سمجھنے والے بعض نقاد فنّی نزاکتوں اور شعری صداقتوں کے محافظ سچے شعرا کے بے حد مفید اور تعمیری کام کو کیوں خاطر میں نہیں لاتے جو لوگ دھڑے بندیوں اور اقتصادی مصلحتوں کے زیرِ اثر بعض معمولی ادیبوں کو "امامِ ادب"، "فدائے سخن"، "رئیس الشعرا" اور نہ جانے کیا کیا ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ ان کے حلق کا لعاب اور قلم کی سیاہی سچے اور کھرے ادیبوں کے گراں قدر تخلیقی کارناموں کی توزین کرتے وقت کیوں خشک ہو جاتے ہیں۔

کاش! ہمارے نقّادانِ اُدب تعصّبات کی عینکیں اُتار کر منوّر کے مثبت تعمیری اور اِفادی کام کی غیر جانب دارانہ پرکھ اور توقیع کرتے۔ خاکسار کی یہ معمولی سی عاجزانہ تحقیقی کاوش

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اِس مرحوم ادیب کی علمی و اُدبی خدمات پر کچھ روشنی ڈال سکے اور دنیائے اردو کی توجہ اس مؤقر لیکن بے نیاز ادبی شخصیت کی مخلصانہ خدمات کی جانب مبذول کرائے تو خاکسار خود کو مسعود و سرخرو سمجھے گا۔

میری اس حقیر تحقیقی پیش کش کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب کا عنوان ہے 'سوانح حیات'۔ اِس باب میں مُنوّر لکھنوی کی تاریخ ولادت، خاندان، ابتدائی تعلیم، ملازمت، شادی، اولاد، خانگی حالات، طرزِ بود و باش، اخلاق و عادات سے متعلق تفاصیل بیان کی گئی ہیں اور اُن دشواریوں اور مجبوریوں پر سے پردے ہٹائے گئے ہیں جن کے زیرِ اثر منوّر لکھنوی کو اپنی تعلیم کا سلسلہ قبل از وقت منقطع کر کے معمولی ملازمت قبول کرنی پڑی۔ وہ بڑے باپ کے بیٹے تھے اور اُن کے والد ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد اُفق لکھنوی بطور شاعر، ادیب و صحافی مُلک گیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اُردو اور فارسی اس خاندان کا اوڑھنا بچھونا تھیں۔ لہٰذا شعر و سخن اور ترجمے کا ذوق منوّر لکھنوی کو ورثے میں ملا تھا۔ ان کی شعر گوئی کا آغاز کب ہوا۔ میٹریکولیشن تک تعلیم حاصل کرنے کے لیے انھیں کس قدر جدّ و جہد کرنی پڑی اور بعد میں ذاتی مطالعہ، اخذ و اکتساب اور خود آموزی کے توسّط سے انھوں نے اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی، سنسکرت اور ہندی میں کیسے قابلِ رشک تبحّر حاصل کیا۔ انھوں نے اپنے والد جناب اُفق لکھنوی مرحوم اور اپنے اُستاد منشی نوبت رائے نظر لکھنوی مرحوم سے اپنے تخلیقی عمل کی پیش رفت کے سلسلے میں کس حد تک اکتساب ہنر کیا۔ اپنے گھرانے کے ادبی اور مذہبی ماحول و روایات نے منوّر کے فکری رویّوں کا کس حد تک تعیّن کیا —— منوّر مرحوم نے کن کن یادگار مشاعروں میں شرکت کی۔ ادبی اور معاشی سرگرمیوں کے سلسلے میں اندرونِ ملک کہاں کہاں کے سفر انھیں درپیش رہے۔ اپنے عہد کے کن کن مشاہیر کے ساتھ اُن کے دوستانہ مراسم رہے۔ اُن کے شاگردوں کے حلقے میں کون کون قابلِ ذکر ادیب و شاعر شامل رہے۔ ان سب حقائق کی چھان بین کر کے ان پر تبصرہ آرائی کی گئی ہے۔ منوّر لکھنوی کے انتقال پر شائع ہونے والے نوحہ جات اور تعزیت ناموں کے اقتباسات بھی اجمالاً اس باب کے آخر میں شامل کیے گئے ہیں۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

مقالے کے باب دوم میں منوّر لکھنوی کے عہدِ حیات (۱۸۹۷ء تا ۱۹۷۰ء) کی اہم ادبی، سماجی اور سیاسی تحریکات اور اُن کے ساتھ منوّر کی وابستگی پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور اُن سیاسی، ثقافتی اور سماجی عوامل کا جائزہ لیا گیا ہے جو اس متین شاعر اور ذہین نثار و مترجم کی تخلیقی کاوشوں کے مختلف ادوار و اوقات میں محرّک بنتے رہے۔ نیز اپنے ہم عصر اہم شعرا و ادبا کے ساتھ منوّر لکھنوی کے مراسم پر تفصیلی نظر ڈالی گئی ہے اور بحیثیت انسان اور شاعر منوّر کے کردار و عمل کی روشنی میں اُن کے اوصاف و محاسن کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب سوم کُلّی طور پر منوّر لکھنوی کی شاعری کی توزین کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ یہ تین حصّوں میں منقسم ہے۔ حصّہ الف میں اُن کی لگ بھگ ۱۸۵ طبعزاد نظموں کے ۱۹۳۹ء میں شائع شدہ مجموعہ "کائناتِ دل" اور ان کی نظموں ہی کے غیر مطبوعہ قلمی مسوّدوں "سوزِ وطن"، "شگفتہ عقیدے" اور "نقوشِ منوّر" کی منظومات کی روشنی میں بطور نظم نگار منوّر لکھنوی کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کی نظموں کے پسندیدہ موضوعات اور اُن کی نظمیہ شاعری کے محرّکات کا گہرا مشاہدہ کیا گیا ہے اور شاعر کی زندگی کے مختلف ادوار میں اس کی نظموں کی لفظیات اور لب و لہجہ میں رفتہ رفتہ در آنے والی تبدیلیوں کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔

اس باب کے حصّہ "ب" میں منوّر لکھنوی کی غزلیہ شاعری کے رنگ و آہنگ، اس پر کلاسیکی روایت کے اثرات، اور روایتی ہیئت و اسلوب میں نئے فلسفیانہ مضامین کی آمیزش و ترویج پر بحث کی گئی ہے۔ منوّر کی غزلیات کے دو مطبوعہ مجموعوں "نوائے فکر" اور "ادائے کفر" نیز غیر مطبوعہ قلمی مسوّدات "بساطِ فکر"، "تاثرات"، "تابانیاں" اور "شاخِ مرجاں" کی غزلوں کی روشنی میں اُردو غزل کو منوّر لکھنوی کی قابلِ قدر دین کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس باب کے حصّہ "ج" میں منوّر کی خمریاتی، اخلاقی، روحانی اور رُومانی رنگ کی رُباعیات اور قطعات پر بحث کی گئی ہے۔ ان کی رُباعیات کا ایک جیبی ایڈیشن "نذرِ ادب" کے نام سے ۱۹۲۹ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد بھی ان کی رُباعیات اکثر اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔ منوّر لکھنوی کے غیر مطبوعہ قلمی نسخوں میں بھی رُباعیات و

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

قطعات کا ایک جامع مجموعہ "زیرہ گُل" کے نام سے مِلا ہے۔ ان دونوں مجموعوں کی رباعیات اور قطعات کے محاسن و معائب اِس باب میں زیرِ تنقید لائے گئے ہیں۔

زیرِ نظر مقالہ کا باب چہارم منوّر لکھنوی کی فارسی شاعری پر نقد و نظر کا دریچہ وا کرتا ہے۔ اس میں اُن کے غیر مطبوعہ فارسی کلام کے ایک مجموعہ "طوافِ عجم" کے تفصیلی مطالعہ کی بنا پر ان کی فارسی شاعری کے امتیازی عناصر اور خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز دُنیا کے دیگر شعرا اور ادیبوں کی فارسی تصانیف کے جو ترجمے منوّر لکھنوی نے کیے ہیں ان کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کے مطبوعہ تراجم میں خواجہ حافظ شیرازی کے دیوان سے منتخب سینکڑوں اشعار کا ترجمہ "وجدانِ حافظ" کے نام سے اور علّامہ اقبالؔ کی آخری شعری تصنیف "ارمغانِ حجاز" کے فارسی اشعار و قطعات کا ترجمہ "سوزِ اقبالؔ" کے نام سے شائع ہو کر قارئین تک پہنچا اسی طرح منوّر نے افغانستان کے مارشل ولی خان کی ایک تصنیف "یادداشت ہائے من" کا ترجمہ اردو نثر میں "میری یادداشتیں" کے نام سے کیا ہے جسے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز نئی دِلّی نے شائع کیا۔ اِن سب کے علاوہ بابا طاہر ہمدانی کے قطعات و اشعار کا ترجمہ بھی منوّر لکھنوی نے بڑی محنت سے کیا تھا جو غیر مطبوعہ قلمی مسوّدہ کی صورت میں موجود ہے۔ ان سبھی منظوم اور نثری تراجم پر بابِ مذکورہ میں تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔

پانچواں باب چھ حصّوں پر مشتمل ہے۔ اس باب میں مختلف زبانوں کے ادبِ عالیہ کے ان منظوم و منثور اُردو تراجم کو پرکھا گیا ہے جو منوّر لکھنوی کی نگاہِ انتخاب میں شایانِ توجّہ ٹھہرے۔ اِن لگ بھگ تین درجن کتابوں کے ترجمے انھوں نے کمال جانفشانی اور عرق ریزی سے ایک مقصد کی تکمیل سمجھ کر کیے۔ طبعزاد تخلیقی کاوشوں کے بمقابلہ ترجمے کے کام کو ترجیح دینے کے پسِ پردہ کچھ مقاصد کارفرما تھے جن کے زیرِ اثر منوّر جیسے طبّاع خلّاق، پُر گو اور قادرالکلام شاعر نے اپنی زندگی کے بہترین سال اس مفید اور تعمیری کام میں لگا دیے۔ ہندوستان کے ثقافتی اور دینی سرمائے کو عوام سے قریب تر لا کر وہ سماج میں ایک صحت مند فکری انقلاب لانا چاہتے تھے۔ ان سب اسباب و مقاصد

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

پر بحث کر کے بطور مترجم مُنوّر کی خدمات پر سیر حاصل روشنی ڈالنے کی کاوش کی گئی ہے۔

اس باب کے پہلے حصّے میں مذہبی کتب کے تراجم کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس میں قرآنِ مجید کی سورتوں، انجیلِ مقدّس کے ابواب، مہاتما گوتم بدھ کے اُپدیشوں کے مجموعہ "دھمپد" شنکر آچاریہ کی تصنیف "پرشنوتری" اور "چرپٹ پنجریک"، بھگوان کرشن کے فلسفیانہ اُپدیش "شریمد بھگوت گیتا" جے دیو کی بھگتی رس کی شہرۂ آفاق تصنیف "گیت گووند" شکتی کی دیوی دُرگا بھوانی کی مناجات "دُرگا سپت شتی"، "رمہا شک سمواد"، "سامنک پاٹھ"، "جین گرنتھ سار"، "گورو نانک استتی" "آریہ ابھی ونے" اور "گجیند رموکش" وغیرہ کی ادبی اور افادی حیثیت کا تعین کیا گیا ہے۔ نیز کچھ دیگر مذہبی تصانیف کے نثری تراجم پر تصریحی بحث کی گئی ہے جن میں گوسوامی تلسی داس کی "ونے پتریکا" سوامی بہیتن آنند مہاراج کی "روحانی نکتے"، اور "رامائن والمیکی" کے تراجم شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر تراجم چھپ کر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

دوسرے حصّے میں سنسکرت زبان کے کلاسیکی ادب کے منظوم اور منثور ترجموں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ کالی داس کی "ابھگیان شکنتلا"، "کمار سمبھو"، "مالویکا گن متر"، "وکرم اُروشیم" اور "رگھو ونش"، بھوبھوتی کی "مالتی مادھو"، دِنگ ناگ کی "کند مالا" (سیتا بن باس)، وشاکھا دت کی "مدرا راکھشس" اور بھاس کی "چارو دت"، تاریخِ ہند کے عہدِ وسطیٰ کے کلاسیکی ادب اور تمثیلی سرمایہ کی وہ نمائندہ تصانیف ہیں جن پر سنسکرت زبان کو بجا طور پر ناز ہے۔ ان سب کے تراجم کرنے میں منوّر لکھنوی نے اپنی عمرِ عزیز کے بہترین سال لگائے ہیں۔ ان میں سے منوّر کے نصف سے زیادہ تراجم زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر ان کے عہدِ حیات ہی میں مارکیٹ میں آگئے تھے۔ باقی تراجم کے نامکمل اور مکمل قلمی مسوّدات حاصل کر کے اُن پر بحث کی گئی ہے۔

تیسرے جزو میں بنگلہ ادب کے تراجم پر نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ تراجم مہرشی رابندر ناتھ ٹیگور کی "گیتانجلی"، نیز مشہور محبِّ وطن بنگالی شاعر اور قومی لیڈر دیش بندھو چترنجن داس کی مشہور تصنیف "ساگر سنگیت" کے ہیں جنھیں منوّر نے اصل تصانیف کے انگریزی ترجموں سے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ اُن کا "گیتانجلی" کا منظوم ترجمہ غیر مطبوعہ ہے۔ "ساگر سنگیت" کا ان کا نثری ترجمہ "بحرِ ترنم" کے نام سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اِس باب کے چوتھے حصّے میں نامور جرمن شاعر اور ڈرامہ نگار گوئٹے کی شہرۂ آفاق تمثیل "فاؤسٹ" کے اُردو ترجمے پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ یہ ترجمہ جو دو جلدوں پر مشتمل ہے، میکس مولر بھون دہلی سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ جرمن زبان کے اِس نادر ادب پارے کو منوّر لکھنوی نے جرمن سفارت خانے کی فرمائش پر بڑی محنت اور جانفشانی سے اُردو کا جامہ پہنایا۔ اس کا بیشتر حصّہ منظوم ہے۔ جرمن زبان کی ایک اور کتاب جسے منوّر لکھنوی نے انگریزی ترجمے سے اردو کے قالب میں منتقل کیا "سمندری جوان اور دوسرے نادر جرمن افسانے" کے نام سے ۱۹۶۸ء میں مغربی جرمنی کے ایک ناشر اور منوّر لکھنوی کے نجی اشاعتی ادارے آدرش کتاب گھر دہلی کے اشتراک سے شائع ہوئی تھی۔ باب کا یہ حصّہ ان جرمن ادب پاروں کے تراجم کے تنقیدی مطالعے کے لیے وقف کیا گیا ہے۔

زیرِ نظر باب کا پانچواں حصّہ منوّر لکھنوی کے قلم سے نکلے ہوئے متفرق تراجم "افکارِ بلند" "درخشاں نکتے"، "درسِ عظیم" اور چند نثری تالیفات کا تنقیدی جائزہ پیش کرتا ہے۔ "صدرِ کی گیتا"، اور "لمعاتِ اُفق"، جیسی ضخیم کتابیں اور ایک کتابچہ "مُجاہدۂ حسینی اور اسلام"، منوّر لکھنوی کی قابلِ ذکر تالیفات ہیں جن کی روشنی میں منوّر کی نثر کے محاسن کی نشان دہی کی گئی ہے۔

چھٹے جزو کو بچّوں کے لیے منوّر کی تصانیف و تراجم کی تدوین و احاطہ کے لیے وقف کیا کیا گیا ہے۔ تراجم میں "ایلیز روزویلٹ"، "ذرّے سے آفتاب" اور "وویکانند بچّوں کے لیے" نیز تصانیف میں "دادا نہرو"، کے تجزیاتی مطالعہ کے حوالے سے منوّر کی ان اَدبی کاوشوں کے معیار اور حُسن و قبح پر بحث کی گئی ہے۔

زیرِ نظر کتاب کے چھٹے اور آخری باب میں بطور استادِ فن منوّر لکھنوی کے مقام اور ان کی خدمات کے تعلّق سے بحث کی گئی ہے اور اُردو اَدب پر اُن کے ناقابلِ فراموش احسانات کی نشان دہی کرتے ہوئے اَدب میں اس مخلص ادیب اور فنکار کے صحیح مقام کا تعیّن کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ نیز اُن کی شخصیت اور فنی عظمت کے بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے،

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

جو ابھی تک ناقدین اور قارئین کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔

ظاہر ہے کہ اتنے ضخیم اور وقیع سرمایۂ ادب کو جو منوّر لکھنوی جیسے ذہین اور فاضل ادیب کی ساٹھ سالہ ادبی ریاضت کی دین ہے۔ پڑھنے کی طرح پڑھنا اور اس کا تنقیدی مشاہدہ و جائزہ کارِ آساں نہیں تھا۔ ایسے میں مرزا غالبؔ کا یہ مصرع بارہا زبان پہ آیا۔ ع

سفینہ چاہیے اِس بحرِ بیکراں کے لیے

بہر کیف یہ تحقیقی کاوش بفضلِ خدا پایۂ تکمیل تک پہنچی ہے۔ اسے حتی المقدور جامع اور واضح بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ خاکسار کفرانِ نعمت کا مرتکب ہوگا۔ اگر اُن مخلص احباب اور فیّاض و فراخ دل مہربانوں کے گراں بہا تعاون اور عملی مدد و اعانت کا ذکر نہ کرے جن کی ترغیب و تعاون کا ثمرہ اِس کتاب کی صورت میں معرضِ وجود میں آیا ہے۔ ان کرم فرماؤں میں میرے رہنما ڈاکٹر ہارون ایوب صدر شعبۂ اُردو پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ اور ڈاکٹر غضنفر علی کی تحریک و تلقین اور بصیرت افروز مشورے و مذاکرات میرے لیے بالخصوص مشعلِ راہ رہے۔ منوّر لکھنوی مرحوم کی بیشتر مطبوعہ تصانیف بھی یونیورسٹی لائبریری سے ڈاکٹر ہارون صاحب نے فراہم کرائیں۔ میرے دانش ور دوست ڈاکٹر غضنفر علی صاحب لیکچرار اُردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر، گورنمنٹ آف انڈیا سولن (ہماچل) اور حبیبِ عزیز محبی آزاد گلاٹی پرنسپل گورنمنٹ کالج نابھہ (پنجاب) کی حوصلہ افزائی اور تنقیدی مشورے بھی اس تحقیق کے سلسلے میں مفید اور کار آمد رہے۔ سنسکرت ادب کے اصل شاہکاروں کے بنیادی متن کے ساتھ تراجم کی تطبیق و توثیق کے سلسلے میں میرے مہربان دوست اور ہندی کے نامور مصنف ڈاکٹر اوم پرکاش سارسوت چیئرمین شعبۂ ہندی حال ڈائرکٹر ڈائرکٹوریٹ آف کارسپانڈنس کورسز، ہماچل یونیورسٹی شملہ کا پُرخلوص تعاون بھی حسبِ ضرورت وقتاً فوقتاً مجھے ملتا رہا ہے۔

تاہم اِس تحقیقی کاوش کی تکمیل شاید ممکن ہی نہ ہوتی اگر میرے ایک خاص عزیز کلدیپ کمار سکسینہ کا عملی اور گراں قدر تعاون شاملِ حال نہ ہوتا۔ عزیزی کلدیپ سکسینہ حضرت منوّر لکھنوی کے صاحبزادے ہیں۔ لہٰذا رُوحانی رِشتے سے میرے چھوٹے بھائی ہیں۔ یہ مقالہ ہر لحاظ سے تشنہ رہتا اگر عزیزم کلدیپ سکسینہ اپنے والدِ مرحوم کے غیر مطبوعہ کلام اور تراجم کے قلمی نسخوں کے مطالعے کی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سہولت مجھے فراہم نہ کرتے۔ میں ان کا بطورِ خاص ممنون ہوں۔

میری رفیقۂ حیات محترمہ شاردا للت نے اس جامع کتاب کی تیاری کے دوران میرا ہاتھ بٹایا اور اپنے حصّے سے زیادہ خانگی ذمّہ داریوں کا بوجھ اپنے کاندھوں پر منتقل کر کے جو رضاکارانہ تعاون دیا اُس کی بدولت میں یکسوئی سے اس تحقیقی منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکا۔ ان کے چھوٹے بھائی عزیزم کلدیپ رائے چوہڑہ ایم اے ایل ایل بی کو اس کتاب کی ترتیب و تشکیل کے سلسلے میں اپنا کافی وقت صرف کر کے میرا ہاتھ بٹانا پڑا۔ میں ان دونوں کا بھی شکر گزار ہوں۔

راقم السطور بصد عجز و نیاز اُن فنکاروں، مصنّفوں اور تنقید نگاروں کا بھی سپاس گزار ہے، جن کی تصانیف یا رسائل و جرائد میں مطبوعہ مضامین و مقالات میں سے مختلف حصّے، اقتباسات اور حوالے میری اس تحقیقی کاوش کا حصّہ بنے ہیں۔

شباب للت

۹۔ ہائیڈ ویل
چوڑا میدان۔ شملہ ۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

باب اوّل

سوانح حیات

- خاندان اور ولادت
- تعلیم
- شادی
- ملازمت
- اولاد
- خانگی حالات
- اخلاق وعادات
- احباب سے مراسم
- سفر
- شعروسخن سے وابستگی
- تلمیذ
- مشاعرے
- شاگردوں کا حلقہ
- مشاہیر سے تعلّقات
- انتقال اور تعزیت نامے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سرزمینِ لکھنؤ نے دنیائے ادب کو ایسے ایسے قد آور اور بلند فکر ادیب عطا کیے ہیں جنھوں نے تاریخِ علم و ادب کے اوراق پر اپنے مستقل اور اَمٹ نقوش چھوڑے۔ اس شہر کا محلہ نوبستہ بالخصوص علم و فن کی وہ کان تھا جس نے گنجینۂ اُردو کو بیش بہا جواہرات بخش کر مالامال کیا۔ لکھنؤ کے اسی محلہ نوبستہ میں ۸ جولائی ۱۸۹۷ء کو منوّر لکھنوی نے اپنے آبائی مکان میں جنم لیا۔ منوّر لکھنوی بڑے باپ کے بیٹے تھے۔ شاعری ان کا خاندانی ورثہ تھی۔ اُن کے والد ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد اُفقؔ کی ادبی صلاحیتوں کی دھاک پورے ملک میں بیٹھ چکی تھی اور وہ بطورِ ادیب، شاعر اور صحافی اپنا لوہا منوا چکے تھے۔ منوّر لکھنوی کے دادا منشی پورن چند ذرّہؔ بھی باکمال شاعر تھے۔ منوّرؔ کا شجرۂ نسب اُن کے اس دعوے کی تصدیق و تائید کرتا ہے کہ:

شاعری سے نہ منوّرؔ کو ہو کیوں کر رغبت
پانچ پشتوں سے یہی شوق چلا آتا ہے

منوّر لکھنوی کا حسبِ ذیل شجرۂ نسب اِس حقیقت پر دال ہے کہ اُس کے اس بیان میں رتی بھر بھی مبالغہ نہیں ہے۔

منشی اودے راج مطلعؔ لکھنوی
|
منشی ایشور پرشاد شعاعیؔ
|
منشی پورن چند ذرّہؔ
|
منشی رام سہائے تمنّاؔ لکھنوی — منشی ماتا پرشاد نیساںؔ لکھنوی — منشی دوارکا پرشاد اُفقؔ لکھنوی
|
رام شنکر پرشاد ایڈیٹر "تفریح" و اسسٹنٹ ایڈیٹر "اودھ اخبار" — کرشن بھگت شاعرہ صاحبزادی دھرم دیوی — یشیشور پرشاد منوّرؔ لکھنوی — بشن پرشاد مقدّرؔ لکھنوی — جانکی پرشاد سکینہ[۱]

---

[۱] تذکرۂ معاصرین (مالک رام) مطبوعہ ۱۹۷۲ء صفحہ ۲۰۸، نیز لمعاتِ اُفقؔ (مؤلفہ منوّر لکھنوی) مطبوعہ ۱۹۶۴ء صفحہ ۳۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

مرزا جعفر حسین اپنے طویل مضمون بعنوان "دبستانِ لکھنؤ کے ہندو شعرا" میں جو ماہنامہ "تعمیر ہریانہ" میں بالاقساط شائع ہوا، رقم طراز ہیں :

"انیسویں صدی کے آخر میں جب اردو شاعری کی اصلاح کے لیے مقتدر شاعروں اور ادیبوں نے اقدام کیے تو ہمارے ہندو شعرا کی کاوشیں بھی ان کے شریکِ حال رہیں...... اس زمانے میں ہندو شعرا کی تعداد اتنی تھی جس کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا[1]

مضمون کے آخری پیراگراف میں فرماتے ہیں :-

"اس مقام پر یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ لکھنؤ کے ہندو شعرا میں سب سے بڑا حصہ سکسینہ برادری کے شاعروں کا تھا۔ ان بزرگوں نے نہ صرف اردو بلکہ فارسی زبان میں بھی بہتر سے بہتر طبع آزمائی کی تھی اور اُن کے یہاں متعدد ایسے خاندان تھے جن میں شعر و سخن کا شغف نسلاً بعد نسلاً چلا آتا تھا۔"[2]

موصوف اسی سلسلے میں اُفقؔ لکھنوی صاحب کے خاندان کا خصوصیت سے ذکر کرتے ہوئے تفصیلاً لکھتے ہیں :-

"بعض ہندو شعرا ایسے تھے جن کے یہاں شاعری کا سلسلہ پُشت در پُشت چلتا رہا تھا۔ ایسی مثالیں مسلمان شعرا کے خاندانوں میں بہت کم ملتی تھیں۔ انیسؔ و دبیرؔ کے خاندان مرثیہ گوئی کی صنف میں اس خصوصیت کے ضرور حامل تھے۔ لیکن میدانِ غزل میں ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا بہتر ہونا تو درکنار، اپنے باپ دادا کے ہم مرتبہ بھی کوئی نہیں ہو سکا۔ انھیں خاندانوں میں ملک الشعرا دوارکا پرشاد اُفقؔ کا خاندان نمایاں اور گرانقدر حیثیت کا مالک تھا۔ اُفقؔ کے والد پورن چند ذرّہؔ، دادا منشی ایشور پرشاد شعاعیؔ، اور

---

[1] مقالہ "دبستانِ لکھنؤ کے ہندو شعرا"، قسط ۱۲۔ ماہنامہ "تعمیر ہریانہ" شمارہ ستمبر اکتوبر ۱۹۷۰ء صفحہ ۳۰۔ مرزا جعفر حسین

[2] ایضاً صفحہ ۳۱۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

پردادا منشی اودے راج مطلع تھے۔ یہ سب بزرگ فارسی زبان میں مشقِ سخن کرتے تھے۔ اُفق نے زورِ کلام اردو زبان میں دکھایا اور اُن کے بعد اُن کے صاحبزادے منوّر اور مقدّر نے بھی اُردو ہی میں غزلیات وغیرہ کہہ کر شہرت حاصل کی۔"[1]

محض ددھیال کی طرف ہی سے نہیں، ننھیال کی جانب سے بھی شاعری کا ملکہ منوّر لکھنوی کے خون میں منتقل ہوا۔ منشی جگدمبا پرشاد قیصر لکھنوی اُن کے ماموں تھے۔ منوّر کے سسرال کے خاندان میں بھی یہی عالم تھا۔ منوّر لکھنوی کے خُسر منشی لچھمن پرشاد صدر لکھنوی نامور تاریخ نگار تھے اور فارسی و اردو کے باکمال شاعر۔

کائستھوں کا یہ متوسط درجہ سکسینہ گوت کا خاندان پُشتوں سے محلہ نوبستہ لکھنؤ میں آباد تھا۔ یہاں کے ادبی ماحول میں بشیشور پرشاد سکسینہ نے آنکھ کھولی۔ لڑکپن ہی میں منوّر تخلص اختیار کر کے شعر کہنا شروع کر دیا۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں منشی دیا شنکر سے حاصل کی جو انھیں ابجد کی تختی یاد کروانے کے بعد "آمدنامہ" پڑھایا کرتے تھے۔ اپنی خود نوشت سوانح عمری "داستان" میں منوّر لکھنوی لکھتے ہیں:۔

"بعد ازاں سات آٹھ سال کا ہونے پر والد صاحب (ملک الشعرا اُفق لکھنوی مرحوم) کے ساتھ لاہور جانا پڑا۔ وہیں شاہ عالمی گیٹ کے پاس کے مدرسہ میں بٹھایا گیا۔ .... غالباً ۱۹۰۶ء کے آخر میں ہم لوگ لکھنؤ واپس آئے تو پہلے نوبستہ مڈل اسکول (جو اپنے لال رنگ کے باعث لال اسکول بھی کہا جاتا تھا) میں داخل کیا گیا۔ اِس سے کچھ دِنوں پہلے منشی رمن لال کے مکتب میں بھی بیٹھا ہوں۔"[2]

---

[1] مقالہ "دبستانِ لکھنؤ کے ہندو شعرا"، قسط ۲، ماہنامہ "تعمیر ہریانہ"، شمارہ ستمبر اکتوبر ۱۹۷۷ء صفحہ ۳۰ (مرزا جعفر حسین)
[2] داستان (منوّر لکھنوی کی خود نوشت سوانح عمری کا قلمی نسخہ) اقتباس از صفحہ ۱۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

دوسرا درجہ پاس کرنے کے بعد لکھنؤ کے کاظمین اسکول میں داخلہ ہوا جو حضرت عباس کی درگاہ کے بہت قریب واقع تھا۔ منوّر لکھنوی کی انگلش شروع ہی سے اچھی تھی اور اُن کے معلّم اُن کی انگریزی کی قابلیت سے متاثر تھے۔ اردو تو کئی پشتوں سے اس خاندان کا اوڑھنا بچھونا رہی تھی۔ ہندی کیسے سیکھی اِس سے متعلق منوّر اپنی خودنوشت "داستان" میں یوں رقم طراز ہیں :-

"اگرچہ بچپن میں والدہ ماجدہ نے مجھے ہندی سے حرف آشنا کر دیا تھا' لیکن چھٹی کلاس تک اردو کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ ساتویں درجے میں آتے ہی سائنس کے ساتھ اردو کے بجائے جو ہماری خاندانی زبان ہوگئی تھی، ہندی لینے کی داستان بہت دل چسپ ہے۔ شروع ہی سے میرے خاص انیس و جلیس رامیشور پرشاد سری واستو، سندر لال سری واستو' میرے ماموں دیا شنکر برتریا اور میرے بھتیجے سُورج سہلائے رہے تھے۔ ہم سب کائستھ تھے۔ .... ایک روز سنسکرت اور ہندی کے ٹیچر پنڈت گوری شنکر نے ہم سب لڑکوں کو اپنے پاس بُلایا اور کائستھوں کو یہ کہہ کر بڑی پھٹکار بتائی کہ تم لوگوں کے سبب میری (یعنی پنڈت گوری شنکر کی) ملازمت ختم ہو رہی ہے۔ ہم سب نے وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ اسکول میں ہندی اور سنسکرت پڑھنے والا کوئی لڑکا ہی نہیں ہے۔ پنڈت جی کی اس بیکسی آمیز ڈانٹ کا ہم سب پر بہت اثر پڑا اور بیک وقت ہم سب اردو چھوڑ کر ہندی پڑھنے کے لیے راضی ہو گئے ...... اس سے ہم سب کی زندگی میں ایک نیا موڑ پیدا ہو گیا اور پنڈت جی کی ملازمت بھی محفوظ رہی۔ پنڈت جی نے ان دو درجوں میں ایسی عمدہ تعلیم ہندی میں دی کہ آج تک اُس وقت کا پڑھا ہوا کام آ رہا ہے۔"[1]

---

[1] داستان (قلمی نسخہ۔ منوّر لکھنوی کی خودنوشت سوانح عمری) ص ۱۸

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اور واقعی ہندی زبان کا یہ اکتساب آئندہ زندگی میں منوّر کے تخلیقی شعور و عمل اور بالخصوص ترجمے کے کام میں بہت کار آمد ثابت ہوا

منوّر لکھنوی نے آٹھویں درجے میں اسکالرشپ کا امتحان دیا لیکن اس میں کامیابی نہ ملی۔ اس کے ساتھ ہی ان کی اسکولی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ کیوں کہ ان کے بڑے بھائی رام شنکر پرشاد (ایڈیٹر رسالہ "تفریح"، واسسٹنٹ ایڈیٹر اودھ اخبار لکھنؤ) کے پلیگ کے وبائی عارضہ میں فوت ہو جانے کے باعث گھر کے مالی حالات دِگرگوں ہو گئے تھے۔ لہٰذا منوّر لکھنوی کو اودھ اخبار کے رپورٹر کی اسامی قبول کرنا پڑی جو رائے بہادر منشی پریاگ نرائن نے، اُن کے خاندان کے قدر دان اور مشفق ہونے کے ناطے انھیں پیش کر دی۔ وہ عدالتوں میں جا کر مختلف مقدموں کی روداد اور شہر کے اہم جلسوں کی کارروائی نوٹ کر کے اودھ اخبار کو فراہم کرنے لگے۔

خاندان کے مالی حالات اب اور بھی ابتر ہو گئے تھے۔ مجبوراً اودھ اخبار کی ملازمت چھوڑ کر منوّر لکھنوی نے او۔ آر ریلوے کے اگزامنر آف اکاؤنٹس کے لکھنؤ دفتر میں ۱۸ روپے ماہانہ تنخواہ پر بحیثیت ریزروسٹ ملازمت شروع کی اور یہ ملازمت بعد میں مستقل بھی ہو گئی۔ انھیں یہ ملازمت دلانے میں مذکورہ دفتر کے ایک سینئر افسر تپن لال ودیارتھی کا بڑا ہاتھ تھا، جو ایک سرگرم آریہ سماجی کارکن اور انگریزی، ہندی، سنسکرت اور فارسی کے عالم تھے اور منوّر لکھنوی کی شعری صلاحیتوں اور اخلاقی خوبیوں کے قدر دان بھی تھے۔ انہی دِنوں میں نول کشور بک ڈپو کے لیے انگریزی ناولوں کے ترجمے اُردو میں کر کے ماہانہ ساٹھ ستّر روپے کی فاضل آمدنی بھی منوّر کو ہو جاتی تھی اور اس طرح وہ اپنی خانگی ضروریات کے کفیل ہو سکے۔ اُس وقت کُنبے میں ان کی ایک بیوہ بہن، بیوہ ماں، ایک بھتیجی اور دو چھوٹے بھائی تھے۔

منوّر نے دورانِ ملازمت ہی انٹرنس کا امتحان پرائیویٹ طور پر ۱۹۱۹ء میں پاس کیا۔ یہ امتحان پاس کر لینے کے بعد محکمہ کے ضوابط کے تحت ان کی تنخواہ میں اضافہ ہونا چاہیے تھا لیکن اضافے میں تاخیر ہوئی تو بد دلی کے عالم میں منوّر نے ایک غزل کہی جس کے کچھ اشعار

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اِس طرح تھے :-

ذرا سی ٹھیس سے آئینہ دل ٹوٹ جاتا ہے — ہمیشہ دل بشر کا وقت مشکل ٹوٹ جاتا ہے
شکستہ خاطری بھی اے منوّر کیا عجب شے ہے — نہیں ہوتا ہے کوئی کام جب دل ٹوٹ جاتا ہے [1]

یہ اشعار اُن کے سینیئر افسر پنڈت لال ودیارتھی کی نظر سے بھی گزرے تو وہ بہت متاثر ہوئے اور اس کے بعد منوّر کی تنخواہ بڑھا دی گئی۔

منوّر لکھنوی نے اپنے ذاتی مطالعہ اور محنت سے فارسی، سنسکرت، انگلش اور ہندی زبانوں میں اس قدر استعداد اور دسترس حاصل کرلی کہ زمانہ مابعد میں انھوں نے کمال ذہانت و مہارت کے ساتھ مختلف عالمی زبانوں کے مشاہیر ادب کے شہرۂ آفاق شاہکاروں کے ترجمے کیے جن میں سے بیشتر شائع ہو کر مقبولِ عوام ہوئے۔

ملازمت کے لگ بھگ چودہ سال لکھنؤ میں گزارنے کے بعد جنوری ۱۹۲۷ء میں منوّر کا تبادلہ ریلوے کلیئرنگ اکاؤنٹس کے نئے قائم شدہ دفتر لاہور میں کر دیا گیا لیکن چند ماہ بعد اکتوبر ۱۹۲۷ء میں ان کا ٹرانسفر دلّی ہو گیا اور یہیں تیس برس مسلسل ریلوے آڈٹ کی ملازمت میں گزار کر وہ ۱۹۵۷ء میں ساٹھ سال کی عمر میں ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔ لکھنؤ، لاہور اور دلّی جیسے علمی، ادبی اور ثقافتی مراکز میں نصف صدی سے زائد کے قیام کے دوران منوّر لکھنوی کے تخلیقی سفر اور اَدبی کامیابیوں کی مرحلہ بہ مرحلہ روئداد خاصی دل چسپ اور قابلِ توجہ ہے۔

۱۹۱۸ء میں منوّر لکھنوی کی شادی فارسی اور اُردو کے جیّد عالم اور ادیب منشی لچھمن پرشاد صدر لکھنوی کی خوب صورت اور ذہین بیٹی چندر کلا سکسینہ کے ساتھ ہو گئی۔ منوّر کی عمر اس وقت ۲۱ سال تھی اور اُسی سال ہی اُس نے پرائیویٹ اُمیدوار کے طور پر انٹرنس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اُسی برس دفتر میں بھی اُن کی قابلِ اطمینان ترقی ہوئی۔ لیکن منوّر اولاد کے معاملے میں کم نصیب واقع ہوئے اور زندگی بھر اِس محرومی کا احساس اُن

---

[1] منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (مؤلفہ راج نرائن رازؔ) ص ۲۱-۲۲ ، پہلا اڈیشن: ۱۹۷۰ء

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کے دل کو کچوٹتا رہا۔ منوّر کے کلام میں کئی جگہ اس شومئی تقدیر کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً ان کا یہ شعر :-

کبھی لوگ یوں منوّر مجھے بے نشاں نہ کہتے
جو کوئی جگر کا ٹکڑا مری یادگار ہوتا[1]

اپنی "داستان" میں منوّر لکھتے ہیں :-

"پتر رن کے سلسلے میں کچھ خود میری صحت کی خرابی اور کچھ میری اہلیہ حیدر کلاجی کی صحت کی خرابی سے رکاوٹ پیدا ہو گئی اور پھر زندگی بھر وہ رکاوٹ دور نہ ہو سکی۔ پہلے ۱۹۲۲ء میں اور پھر ۱۹۲۴ء میں ایک نور چشمی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا لیکن یہ مسرت بھی ناپائیدار ثابت ہوئی۔ بالآخر مایوس ہو کر اپنی اہلیہ کا دل رکھنے کے لیے ۶ مارچ ۱۹۶۶ء کو ہولی کے دن اپنی اہلیہ کی بھتیجی یعنی اپنے بڑے سالے بابو امبکا پرشاد کی لڑکی کے صاحبزادے کلدیپ کمار کو باقاعدہ گود لے لیا۔ جس کی تقریب اُسی دن چترگپت سبھا، مندر بازار سیتارام (دہلی) میں ادا ہوئی، اور اس طرح پتروں کا یہ قرض ادا کر دیا۔"[2]

چنانچہ منوّر کی غیر مطبوعہ غزلیات کے آخری مجموعہ "شاخِ مرجاں" میں اس عزیز کے متعلق کچھ اشعار بھی ملتے ہیں۔ جن پر تاریخ تحریر ۱۳ اپریل ۱۹۶۶ء درج ہے۔ اس مسودہ میں منوّر لکھنوی کی ۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۵ء کی غزلیات شامل ہیں۔ مذکورہ غزل نما نظم کے کچھ اشعار اس طرح ہیں :-

ہے سہاروں کا سہارا مجھے کُلدیپ کُمار
ہے دل و جاں سے بھی پیارا مجھے کُلدیپ کُمار

چاند سُورج بھی کبھی جس کی بلائیں لیں گے
نظر آتا ہے وہ تارا مجھے کُلدیپ کُمار

پڑھ کے پُروان مرا نام کرے گا روشن
کر رہا ہے یہ اشارا مجھے کُلدیپ کُمار

مری کشتی کو نکالے سے لگائے گا یہی
بحرِ غم کا ہے کنارا مجھے کُلدیپ کُمار[3]

---

[1] شاخِ مرجاں (مجموعہ غزلیات منوّر لکھنوی۔ قلمی مسودہ)

[2] قلمی نسخہ "داستان" [3] قلمی مسودہ "شاخِ مرجاں" (منوّر لکھنوی)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منوّر بڑے باپ کے بیٹے تھے۔ اُن کے والد ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد اُفق لکھنوی نے صرف انچاس ۴۹ برس کی قلیل عمر میں اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ "لمعاتِ اُفق" میں منوّر اپنے والدِ محترم کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"رندانہ مزاجی نے کبھی ایک ٹھکانے سے نہ بیٹھنے دیا۔ کبھی ایک ادارے سے وابستگی نہیں کی۔ اس لیے امرا اور رؤسا کی قدر دانی کے باوجود تمام عمر تنگ دستی میں بسر کی۔ طبیعت شاہانہ تھی یا فقیرانہ۔ جب رقم ہاتھ آگئی بادشا بن گئے۔ جب جیب خالی ہوگئی پھر قرض و دام پر بسر ہونے لگی۔ خانہ داری کے جھنجھٹوں سے کبھی تعلق نہ رکھا۔ ہر معاملے میں آزاد تھے۔ تمام ذمہ داری والدہ ماجدہ کے نحیف کاندھوں پر تھی۔ ان سے کہا کرتے تھے کہ میں نے تو جہانگیر کی طرح اپنی تمام سلطنت ایک پیالہ شراب کے عوض تمہارے سپرد کر دی ہے۔ انھیں شراب کا شوق تھا۔ پانی کی طرح پیتے تھے۔ غالب کی طرح قرض و دام لے کر پیتے تھے۔ دَم دَم پر پیتے تھے، مگر پی کر ہمیشہ اپنی حدود میں رہے۔ خوراک برائے نام تھی۔ مقوّیات کی طرف سے بے نیازی تھی۔ شراب اور محض شراب کے پینے سے کلیجا چھلنی ہو گیا.....

...... اولاد کی تعلیم و تربیت میں کبھی دل چسپی نہیں لی لیکن اس کے باوجود بلا واسطہ والدہ ماجدہ کے زیرِ سایہ اس قابل بنا دیا کہ مُحتاج کے لیے کسی دوسرے کا منہ نہ دیکھ سکے۔ بڑے بھائی معمولی اسکولی تعلیم کے باوجود اس قابل ہو گئے کہ انھوں نے دو اخبارات "ہند" اور "تفریح" کی ایڈیٹری کی۔ لاہور کے "اخبارِ عام" میں کام کیا...... انھوں نے "اودھ اخبار" کے عملۂ ادارت میں بھی کافی عرصے تک شرکت کی ہے۔" [۱]

---

۱ لمعاتِ اُفق (مرتبہ منوّر لکھنوی) صفحہ ۲۸۔ سالِ اشاعت ۱۹۶۴ء

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منوّر لکھنوی کے والدِ محترم اُفقؔ صاحب کی شادی ۱۵ برس کی عمر میں ہوگئی تھی۔ منوّر کی والدہ مہتاب کنور رائے صاحب رائے سپرنٹنڈنٹ محکمہ جنگلات کوٹہ بوندی (راجستھان) کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں۔ منوّر رقمطراز ہیں کہ اُفقؔ صاحب اگرچہ

"خود بڑے ذہین، طبّاع، عالم، فاضل، باکمال شاعر اور بے مثال ناثر تھے لیکن اولاد کی طرف بالکل دھیان نہ تھا۔ اس کا بندوبست میری والدہ محترمہ ہی کیا کرتی تھیں۔ انھوں نے اولاد کے لیے خود کو ہر طرح قربان کر دیا۔ حتیٰ کہ زیور تک فروخت کر دیے۔ بچپن میں ناز و نعم میں پلی ہوئی اس دیوی نے خود کو ہر طرح سے لٹا دیا اور آخر میں اپنے سہاگ سے بھی محروم ہوگئیں۔ .... اولاد کو ذرا سی تکلیف ہوتی تو بے چین ہو جاتیں۔ دُرگا پاٹھ شروع کر دیا جاتا اور فوراً تکلیف دُور ہو جاتی۔ دُرگا پاٹھ پر بڑا اعتقاد تھا۔ رامائن اور بھگوت کا بھی پاٹھ کیا کرتیں۔"[1]

اُن کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں اُن کی بیوگی کے سائے میں پلیں اور اس طرح پلیں کہ انھیں اپنے باپ کی دائمی جدائی کا احساس بھی نہ ہو پایا۔ اُفقؔ صاحب کی وفات کے بعد وہ تیس برس تک حیات رہیں۔ اور ۱۹۴۳ء میں انتقال فرمایا۔

منوّر کے بڑے بھائی رام شنکر پرشاد نامور صحافی تھے۔ ان کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اُردو جرنلزم کی تاریخ میں ان کا ذکر ہمیشہ ناگزیر رہا ہے۔ فروری ۱۹۱۳ء میں اُن کی وفات ہوئی تو اس سانحہ کا صدمہ اُن کے والد اُفقؔ صاحب کے لیے جان لیوا ثابت ہوا اور وہ اس صدمے کی تاب نہ لاکر ستمبر ۱۹۱۳ء میں رحلت فرما گئے۔ رام شنکر پرشاد کے بعد شیو شنکر پرشاد پیدا ہوئے لیکن وہ کم سنی میں وفات پا گئے۔ ان کے بعد منوّر کی بڑی بہن دھرم دیوی نے ۱۸۸۹ء میں جنم لیا، جو ۱۹۱۵ء میں ۲۶ برس کی عمر ہی میں بھرپور جوانی میں بیوہ ہوگئیں "لمعاتِ اُفقؔ" میں مذکور ہے۔

---

[1] لمعاتِ اُفقؔ (مرتبہ منوّر لکھنوی) صفحہ ۸۱ - سالِ اشاعت ۱۹۶۴ء

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

"اُن کی بیوگی نے انھیں ایک سچّی کرشن بھگت اور سوز و گداز سے بھری ہوئی شاعری کرنے والی شاعرہ بنا دیا۔ وہ اُردو اور ہندی میں شعر کہنے لگیں۔ سینکڑوں بھجن کہہ ڈالے، بیسیوں غزلوں میں دل کے جذبات ڈھالے۔ ان کے کلام کے دو تین مجموعے شائع ہوئے۔ "دھرم پریم ترنگ" کے نام سے بھجنوں اور درد بھری غزلوں کا ایک مجموعہ اور شریمد بھاگوت کے پانچ اسکندھوں کا منظوم ترجمہ نولکشور پریس سے چھپا۔ اُن کے کلام کا ایک اور مجموعہ دہلی سے "دھرم پریم آنجلی" کے نام سے شائع ہوا....

......۱۹۶۳ء میں ۸۴ سال کی عمر پاکر بہن دھرم دیوی بھی اپنے محبوب اور معبود بھگوان کرشن کی مقدّس اور لافانی ہستی میں مل گئیں۔"[1]

منوّر کی دوسری بہن نے ۱۸۹۴ء میں اور اُس کے بعد ۸ جولائی ۱۸۹۷ء کو منوّر نے اس جہانِ فانی میں آنکھ کھولی۔ اُن کے بعد اُن کے چھوٹے بھائی بشن پرشاد مقدّر کا ۱۹۰۰ء میں جنم ہوا۔

منوّر کے خُسر منشی لچھمن پرشاد صدر، منوّر کے والد جناب اُفق لکھنوی کے دَور کے اُعزا میں سے تھے اور اُن کے ہم نوالہ و ہم پیالہ بھی۔ صدر صاحب کا تعلّق ناسخ اسکول سے تھا۔ وہ فارسی اور اُردو میں شعر گوئی اور تاریخ گوئی کرتے تھے۔ اُن کی دو مثنویاں "سلکِ گہر" اور "رشد اما" ان کی زندگی میں شائع ہوئیں۔ صدر کی منظوم بھگوت گیتا (اُردو ترجمہ) منوّر نے اُن کی وفات کے بعد "صدر کی گیتا" کے نام سے شائع کی۔

۱۹۱۱ء میں شہنشاہ جارج پنجم کے دربارِ تاج پوشی کے موقع پر صدر صاحب نے ایک قصیدہ فارسی میں اور ایک اُردو میں تصنیف کیا تھا جس کے صلے میں انھیں بھی حضرتِ اُفق کی طرح ایک نقرئی تمغہ اور ایک اعزازی سند حکومت کی طرف سے عطا ہوئی۔

گھر کا ماحول مجموعی طور پر مذہبی اور پاکیزہ تھا۔ منوّر کے والد اُفق صاحب اپنی کثرتِ

---

[1] لمعاتِ اُفق (مرتبہ منوّر لکھنوی) مطبوعہ ۱۹۶۴ء صفحہ ۸۵-۸۶

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

شراب نوشی کی لت کے باوجود کٹر سناتن دھرمی ہندو تھے۔" لمعاتِ اُفق" میں منوّر بیان کرتے ہیں کہ ان کے والد اپنے پہلو میں ایک عقیدت مند بھگت کا دل رکھتے تھے۔ اوائلِ عمر ہی سے انھوں نے دیوی دیوتاؤں کی منقبتیں اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں نظم کیں۔ صرف انیس برس کی قلیل عمر میں انھوں نے رامائن یک قافیہ تخلیق کر کے دنیائے ادب کو حیران و ششدر کر دیا تھا۔ مذہباً وہ دیوی منتر لیے ہوئے تھے۔ گھر میں چچا صاحب منشی رام سہائے تمنّا کا بنوایا ہوا رام استھان بھی موجود تھا ہی۔ پھر ان کے لیے بھگتی بھاؤ کی طرف مائل ہونا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ تمام سناتن دھرمی جگت اور مذہبی رہنما اُفق کے زورِ قلم کے قائل اور مدّاح تھے۔

ایسے ماحول میں گھر کے بچّوں کا بھی مذہبی رنگ میں رنگا جانا فطری امر تھا۔ منوّر پر والدِ ماجد کی شراب نوشی اور لاابالی پن کا رنگ تو نہ چڑھ سکا لیکن وہ کرم کانڈی قسم کے سناتن دھرمی ہندو ضرور بن گئے۔ سیّد آفاق حسین آفاقؔ جو منوّر کے دفتر کے جونیئر ساتھی تھے اور بعد میں ان سے اپنے کلام پر اصلاح بھی لینے لگے، اپنے مضمون" منوّر میرے رفیقِ کار" میں منوّر سے دفتر میں اپنی پہلی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

" اونکار دیال صاحب نے مجھ سے تفصیلی تعارف کرایا۔ منوّر صاحب میرے ساتھ نہایت بزرگانہ شفقت سے پیش آئے۔ متین و سنجیدہ چہرے پر شگفتگی اور ہلکی سی مسکراہٹ کھیلتی رہی۔ میں نے مزید اشتیاقِ ملاقات ظاہر کیا۔ مکان کا پتہ پوچھا۔ فرمایا:۔

" یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے"

یعنی بلبلی خانہ کے محلّہ میں مسجد کے سامنے اونچی چوکی والا مکان ہے۔ بلبلی خانہ میں جانتا تھا جو میرے گھر کلاں محل سے پیدل دس پندرہ منٹ سے زیادہ کا راستہ نہ تھا۔ غزل پڑھ کر میں جتنا متاثر ہوا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ اس کے خالق کی سادگی و خلوص کا مظاہرہ دیکھ کر متاثر ہوا۔ یہ تھی میری پہلی ملاقات۔"[1]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

چنانچہ آفاق ایک روز اپنی ایک مطبوعہ غزل لے کر منوّر صاحب کے گھر پر اُن سے ملنے گئے۔ دستک دی۔ دو چار منٹ بعد دیکھا کہ حضرت منوّر خود اُن کے خیر مقدم کو سیڑھیوں سے اُترتے چلے آرہے ہیں۔ بدن پر سودیشی کپڑے کا کُرتا اور دھوتی۔ یہ اُن کے گھر کا لباس تھا۔ منوّر نہایت سادہ طبع انسان تھے۔ نمود و نمائش کا قطعی شوق نہ تھا۔ آفاق مزید لکھتے ہیں کہ منوّر :-

" عام شعرا کی طرح نہ سگریٹ پیتے تھے اور نہ ہی دخترِ رز سے شغل فرماتے تھے۔ کسی اور قسم کی بے راہ رَوی سے بھی کوئی علاقہ نہ تھا۔ مذہب کے نہایت پابند۔ شعر و اَدب ان کا اوڑھنا بچھونا۔ ان کا کمرہ اِنہی سب چیزوں کی عکاسی کر رہا تھا۔ اس کمرے میں آرائش کا کوئی سامان نہ تھا۔ کوئی ایش ٹرے نہ تھی۔ جام و سبو یا صُراحی و مینا نہ تھے۔ کوئی قالین نہ تھا۔ صوفہ سیٹ یا اعلیٰ قسم کا فرنیچر بھی نہ تھا۔ اس کے برعکس اس کمرے میں ایک طرف ایک چھوٹی الماری اور تھی۔ اس میں پُوجا پاٹ کا سامان تھا۔ ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ اسی پر اُن کا لکھنا پڑھنا ہوتا اور اسی پر آرام فرماتے۔ سرہانے کی جانب ایک کھڑکی کھُلتی تھی جس میں سے سامنے مسجد نظر آتی تھی۔ بیچ میں قریباً پندرہ فٹ چوڑی ایک سڑک ہی تو تھی۔ اذان کی آواز سن کر احتراماً ہمیشہ خاموش ہو جاتے۔ "[۲]

منوّر لکھنوی کے خانگی حالات، عادات و خصائل، خورد و نوش اور طرزِ بود و باش کے متعلق آفاق اپنے اسی مضمون میں مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" منوّر صاحب بھی کٹّر مذہبی آدمی تھے۔ اُن کی پُوجا پاٹھ کے سامان کا ذکر پہلے بھی کر آیا ہوں۔ روزانہ بیگم منوّر کے ساتھ مندر جاتے تھے۔ بیگم منوّر شرم

لہ حاشیہ صفحہ گزشتہ

[۱] " منوّر لکھنوی۔ شخصیت اور شاعری " (مرتب راج نرائن رازؔ) ایڈیشن ۱۹۷۰ء۔ صفحہ ۷۳

[۲] ایضاً صفحہ ۷۵-۷۶ (مقالہ " منوّر میرے رفیقِ کار " از آفاق حسین آفاق)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تخلص فرماتی ہیں اور حد درجہ باحیا خاتون ہیں۔ اُن دنوں بھی ان کا گھونگھٹ اتنا لمبا ہوتا تھا کہ چہرہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ منوّر صاحب وفاداری بشرطِ استواری کو اصل ایمان سمجھتے تھے۔ تنگ نظری اور مذہبی تعصب سے بالکل بالا و مبرّا۔ میرے یہاں بھی تشریف لاتے تو کچھ نہ کھاتے۔ آخر مَیں نے ایک بار ایک ہندو دوست کی معرفت خورد و نوش کا سامان کیا۔ مجھے اُن کے یہاں کھانے پینے میں کبھی تکلف نہ رہا اور اُن کی لکھنوی مہمان نوازی سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا رہا۔ آج بھی اُن کے یہاں کی کھٹّی پُھلکیاں یاد آتی ہیں تو منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ منوّر صاحب کے یہاں اکثر کتھا ہوتی تھی۔ اس میں شرکت کرنے کا تو کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن پرشاد میں میرا حصّہ ضرور ہوتا۔“ [1]

خورد و نوش میں منوّر لکھنوی حد درجہ محتاط تھے۔ پیاز تک سے پرہیز تھا۔ ایک بار مرزا ہرگوپال تفتہ کے نواسے سر شانتی سروپ بھٹناگر کے بیٹے آنند سروپ بھٹناگر کی شادی کی دعوت میں منوّر مدعو تھے۔ اِس دعوت میں اعلیٰ حکام اور عمائدینِ شہر شریک تھے۔ انواع و اقسام کے کھانوں میں پیاز کا استعمال ہوا تھا۔ منوّر وہاں سے بغیر کھائے ہی لوٹ آئے۔ اِسی طرح کا ایک قابلِ ذکر واقعہ منوّر کے ہم عصر ادیبی رفیق اور نجی حبیب گوپی ناتھ امن صاحب نے اپنے مضمون میں مذکور کیا ہے لکھتے ہیں:۔

”قریب سے دیکھنے پر میں نے یہ پایا کہ منوّر صاحب کائستھ ہوتے ہوئے بھی ذاتی زندگی میں برہمن زیادہ ہیں۔ کائستھ پن ان کی سماجی زندگی میں نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک دل چسپ لطیفہ بھی ہے۔ مَیں اور وہ جے پور میں ایک مشاعرے میں شریک ہونے کے لیے ۱۹۳۵ء میں گئے اور ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرائے گئے۔ کمرے الگ الگ تھے۔ چوں کہ ہم دونوں

---

[1] ”منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (مرتب راج نرائن راز) صفحہ ۸۰۔۸۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سبزی خور یا نباتاتی غذا والے تھے اس لیے ہم نے ایک جگہ کھانا طے کیا۔ میرے کمرے میں دوپہر کا کھانا آیا اور ہم دونوں کھانے بیٹھ گئے۔ چند لقمے کھانے کے بعد منوّر صاحب کی طبیعت بگڑ گئی۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اس سبزی میں پیاز پڑا ہے۔ میں نے بے تکلفی سے کہا کہ ہاں پیاز تو ہے۔ انھوں نے گھور کر میری طرف دیکھا جیسے اُن کی آنکھیں چشمے میں سے جھانکتی ہوئی کہہ رہی ہیں۔

تجھے اتنا بھی نہیں معلوم کہ منوّر پیاز نہیں کھاتا؟

میں خاموش رہ گیا اور منوّر صاحب کو مِتلائیاں آنے لگیں۔ وہ کھانے پر سے اُٹھ گئے.......... مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک سکسینہ کائستھ پیاز بھی نہ کھاتا ہوگا۔ کائستھ ویسے بھی کھانے پینے کے لیے مشہور ہیں لیکن سکسینہ کائستھ تو اور بھی آگے ہیں۔ خود منوّر صاحب کے والدِ ماجد ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد اُفق بہت کھانے پینے والے تھے۔"[1]

منوّر صاحب کے کھان پان اور عادات کے متعلق امنؔ صاحب لکھتے ہیں کہ انھوں نے بھرے جاڑے میں منوّر کو ننگے بدن صرف ایک دھوتی آدھی پہنے آدھی اوڑھے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ دھوتی لگا کر پوجا کرتے تھے۔ یہ پوجا سناتن دھرمی کی قسم کی ہوتی تھی۔ آج کل کے دَور میں اس قدر پابند قسم کے سناتن دھرمی شاذ ہی ملتے ہیں۔ امنؔ نے منوّر صاحب کے کھان پان کی عادات سے متعلق ایک اور دل چسپ واقعہ کا ذکر اپنے مضمون میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

" ۱۹۳۶ء میں میں نے آخر منوّر صاحب کے دھرم میں رخنہ ڈال ہی دیا۔ منشی پریم چند اپنی زندگی میں آخری بار دِلّی آئے تھے۔ اس کے چند مہینے بعد

---

[1] مقالہ " منوّر ۔ جیسا میں نے انھیں دیکھا" (از گوپی ناتھ امنؔ) " منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری" (راج نرائن رازؔ) ایڈیشن ۱۹۷۰ء صفحہ ۵۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ جامعہ میں اُن کی استقبالیہ تقریب تھی۔ منوّر صاحب اس زمانے میں مسلمانوں کا چھُوا ہوا کھانا نہ کھاتے تھے۔ مَیں اور وہ جس ٹیبل پر چائے نوشی کے لیے بیٹھے وہاں مسلمان بھی تھے اور مسلمان ہی مٹھائی، نمکین اور چائے تقسیم کر رہے تھے۔ مَیں نے منوّر صاحب کی ہمت بندھائی اور اُس دن سے اُن کا یہ پرہیز ختم ہو گیا۔ کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔" ۱؎

لیکن یہی کٹّر سناتن دھرمی منوّر ہی تھے جنھوں نے قرآن شریف کی سُورتوں کے اور انجیلِ مقدّس کے تراجم کیے۔ جنھوں نے بُدھ دھرم کی تعلیمات کی متبرک ترین کتاب "دھمپد" کا منظوم ترجمہ کیا۔ سِکھ اور جین دھرم کے پیشواؤں اور ان کی تعلیمات پر طویل نظمیں کہیں جو ملک کے ممتاز رسائل و جرائد میں شائع ہوئیں۔ شہدائے کربلا کے مرثیے کہے۔ جنھوں نے اسلامیات کا گہرا مطالعہ کیا اور اسلام کے بارے میں لکھا:-

ہو بنا نفرت پہ جس کی یہ وہ مذہب ہی نہیں
دوسروں سے ترکِ اُلفت اِس کا مشرب ہی نہیں
سرزنش کافر کی اور اسلام؟ ناممکن ہے یہ
ہو دل آزاری سے اس کو کام' ناممکن ہے یہ ۲؎

اسی منوّر نے اسلامی رہنمایانِ دین، رسولِ خدا، حضرت علیؓ اور امام حسینؓ کی منقبتیں لکھیں۔ حضرت عیسیٰ مسیح کی توصیف میں نظمیں کہیں۔ دراصل اس بامذہب اور خدا پرست شاعر کا مذہب: انسانیت پرستی تھا۔ جس کے ثبوت اُس کی عملی زندگی سے فراہم ہوتے ہیں۔ آفاق حسین آفاق اپنے مقالے میں رقم طراز ہیں:-

---

۱؎ مقالہ "منوّر۔ جیسا میں نے انھیں دیکھا (از گوپی ناتھ امن)"۔ "منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری" (راج نرائن رآز) ایڈیشن ۱۹۷۰ء۔ صفحہ ۵۵-۵۶

۲؎۔ نظم "ایک نیا پیغام"۔ کائناتِ دل (منوّر لکھنوی) ایڈیشن ۱۹۳۹ء صفحہ ۱۶۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

"میری درخواست پر منوّر صاحب ایک دم پلنگ پر کھڑے ہو گئے۔ مغرب کی جانب دیوار میں پلنگ سے ملی ہوئی جو الماری تھی۔ اس میں سب سے اوپر کے خانے سے ایک ضخیم کتاب اور ایک کاپی نکالی۔ فرمایا میرے گھر میں اشیا رکھنے کے لیے اس سے زیادہ بلند مقام نہیں ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ کیا کتاب ہے۔ یہ ہے کلامِ پاک۔ مَیں ابھی عالمِ حیرت و استعجاب میں غرق ہی تھا کہ آپ نے بیٹھ کر اپنی کاپی کھولی اور ارشاد فرمایا کہ قرآن شریف پڑھنے سے میری رُوح کو بالیدگی ملتی ہے۔ کلام اللہ تمام منظوم ہے۔ مَیں نے اس کا منظوم ترجمہ کرنا شروع کر دیا ہے لیکن ڈرتا ہوں کہ علمائے اسلام و مشائخ میری اِس کوشش کو کہیں گستاخی پر محمول نہ فرمائیں۔ کام تو مَیں کیے ہی جاؤں گا لیکن کچھ علما سے اس باب میں مشورہ ضروری ہے۔"[۱]

منوّر ایک وفا شعار اور پُرانی روایات کے پاسدار شوہر تھے۔ اپنے خانگی حالات کے ضمن میں اپنی خودنوشت سوانح عمری "داستان" میں اپنی رفیقۂ حیات شریمتی چندر کلا شرما کا ذکر اِن الفاظ میں کرتے ہیں:-

"بچپن ہی سے ایشور نے انھیں حُسن و جمال کی مُورتی بنایا تھا۔ اصل یہ ہے کہ اُن کی اور میری شادی میرے حق میں بہت مبارک ثابت ہوئی۔ عقیل، ذہین، پارسا، باہمّت، علوم و فنون کی شائق، دستکار اور گرہستی کو نہایت خوش اسلوبی سے چلانے والی ایسی رفیقۂ زندگی خوش نصیب انسانوں ہی کو میسّر آتی ہے۔ اگرچہ اب ان کی عمر ۶۰ سے تجاوز کر گئی ہے لیکن وہ طبعی نزاکت، نفاست، خوش مزاجی، زندگی کے ہر محاذ پر فرض شناسی کے گوناگوں محاسن ابھی تک بدستور قائم ہیں۔ دوسروں کے کام آنا، بے سہاروں کو سہارا دینا،

---

[۱] "منوّر میرے رفیقِ کار" مقالہ از آفاق حسین آفاق: منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (مرتّب راج نرائن راز) صفحہ ۷۷، ۷۸۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

یتیم اور بیوہ عزیزوں کی پرورش کا بار قبول کرنا اور ان کی پرورش و پرداخت میں اس طرح منہمک رہنا جیسے کوئی اپنی حقیقی اولاد کے لیے جان دیتا ہے، ان کا مایہ الامتیاز ہے۔ میری بیماری، پریشان حالی اور کس مپرسی میں پرماتما کے بعد اگر کوئی دوسری ہستی شریک ہے تو وہ میری رفیقۂ حیات شریمتی چندر کلا دیوی کی ہے جو ایک طرف اپنے میکے والوں کے لیے قابلِ فخر ہے اور جن سے دوسری طرف ہمارا سر بھی ایک آدرش خاتون سے بلند ہو رہا ہے۔ [1]

شعر و سخن سے منوّر لکھنوی کی وابستگی بچپن ہی سے ہو گئی تھی۔ ان کی شاعری کی ابتدا ۱۹۱۰ء میں بعمر تیرہ سال ہوئی۔ ابتدا میں انھوں نے اپنا کچھ کلام نظرِ ثانی کے لیے اپنے والد جناب اُفق لکھنوی کو دکھایا۔ ۱۹۱۵ء میں وہ نبّاضِ سخن منشی نوبت رائے نظّر کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے اور فطری ذہانت سے بہت جلد اُستاد کی جانشینی کا فخر حاصل کر لیا۔ کچھ عرصہ انھوں نے اپنے خسر منشی بچھمن پرشاد صدر لکھنوی سے بھی مشورۂ سخن کیا۔ شاعری پانچ پشتوں سے اُن کے خاندان میں ورثہ کے طور پر چلی آرہی تھی۔ گنپت سہائے سریواستو اپنے مرتّب کردہ تذکرۂ شعرا "گلدستۂ سخن" میں رقمطراز ہیں:-

"منوّر صاحب کے والد ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد اُفق نہ صرف اپنے خاندان کے لیے بلکہ تمام قوم کے لیے ایک مایۂ ناز شاعر گزرے ہیں۔ سارے ملک نے ان کے زورِ قلم کا لوہا مانا ہے۔ اُردو میں "نظم" اخبار نکالنے کا فخر صرف ان ہی کو حاصل تھا۔ رامائن یک قافیہ گرو گوبند سنگھ کی منظوم سوانح عمری، مہابھارت، رامائن اور ٹاڈ راجستھان کے تراجم اُن کی قابلِ قدر یادگار ہیں۔ الف لیلیٰ کا بھی ترجمہ نظم و نثر میں کیا تھا۔" [2]

نظّر صاحب کے دامانِ فیض سے وابستہ ہونے کے بعد منوّر مسلسل آٹھ نو برس تک ان سے

---

[1] "داستان" (خود نوشت سوانح عمری از منوّر لکھنوی) قلمی مسودہ صفحہ ۳۹

[2] "گلدستۂ سخن" (گنپت رائے سریواستو) مطبوعہ ۱۹۸۸ء، صفحہ ۳۳۹۔ ۳۴۰

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

مشورۂ سخن کرتے رہے۔ مالک رام تذکرۂ معاصرین میں لکھتے ہیں :-

"اردو میں اگرچہ منوّر نے چندے اپنے والد اور پھر چچا رام سہائے تمنّا سے مشورہ کیا۔ لیکن صحیح معنوں میں وہ ۱۹۱۵ء سے منشی نوبت رائے نظر سے ۱۹۲۳ء تک اصلاح لیتے رہے۔ اب فارسی کا شوق ہوا تو اس میں رائے سدھ ناتھ بلی فراقی دریابادی سے مشورہ کرنے لگے۔"[ل]

یعنی ۱۹۲۳ء میں اپنے استاد نظر لکھنوی کی وفات کے بعد منوّر فارغ الاصلاح ہو گئے ان کے والد اُفق لکھنوی ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۶ء تک بہ سلسلۂ ملازمت لاہور میں مقیم تھے۔ ۱۹۰۶ء میں یہ خاندان لکھنؤ واپس آگیا۔ منوّر بھی اپنے کنبے کے ہمراہ لکھنؤ آ گئے۔ لاہور میں قیام کے دنوں میں اُفق صاحب جب کبھی اپنے کسی قدر داں رئیس کے یہاں جاتے یا اپنے پبلشرز میسرز رام دتہ مل اینڈ سنز یا سردار سنت سنگھ کی دکان پر جاتے تو بیشتر منوّر کو یا اُن کے چھوٹے بھائی بشن پرشاد کو (جنھوں نے بعد میں مقدّر تخلص اختیار کیا) اپنے ہمراہ لے کر جاتے۔ ۱۹۰۶ء میں لکھنؤ میں واپسی کے بعد بھی جب کبھی وہ نول کشور پریس میں جاتے تو ان بچّوں کو ہمراہ لے لیتے۔ اس طرح علمی و ادبی ماحول کے اثرات کم سنی ہی سے منوّر کے ذہن پر مرتب ہونے شروع ہو گئے تھے۔ منوّر کے بڑے بھائی رام شنکر پرشاد لاہور کے قیام کے دوران "اخبارِ عام" میں کام کرتے رہے۔ لکھنؤ واپسی کے بعد وہ اخبار "ہند" سے وابستہ رہے۔ پھر منشی دیا نرائن نگم کے مشہور رسالہ "زمانہ" کے مینیجر مقرر ہوئے۔ "زمانہ" سے علاحدہ ہو کر وہ مطبع نول کشور کے اخبار "تفریح" اور "اودھ اخبار" سے وابستہ ہو گئے۔ منوّر اپنی "داستان" میں رقم طراز ہیں :-

"۱۹۱۱ء میں "اودھ اخبار" کا تاج پوشی نمبر بھائی صاحب کے زیرِ اہتمام تیار ہوا۔ اس میں جہاں والدِ مرحوم کا تاریخی مسدس شائع ہوا تھا وہاں میرا بھی کلام چھپا تھا۔ والد صاحب اُس زمانے میں نول کشور پریس کے لیے الف لیلیٰ کا ترجمہ فرما رہے تھے۔ اس کے پایۂ تکمیل پر پہنچ جانے پر انھیں تقریباً

[ل] "تذکرۂ معاصرین" (مرتب : مالک رام) مطبوعہ ۱۹۷۲ء صفحہ ۲۱۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ایک درجن انگریزی ناولوں کا ترجمہ دیا گیا .... والد صاحب کے ساتھ نول کشور پریس جاتے رہنے کا مجھے عملی فائدہ ہوا۔ والد صاحب جو خدمات ترجمے کے سلسلے میں انجام دے رہے تھے وہ (اُن کی وفات کے بعد) میرے سپرد ہو گئیں۔ میں اس وقت بہت کم عمر تھا۔ میرے زمانۂ طالب علمی ہی میں والد صاحب مجھ کو اپنا شریکِ کار بنا لیتے۔ الف لیلے کے ترجمے کا جو مسوّدہ صاف ہو کر آتا تھا اُس کے مقابلے کے لیے مجھے ساتھ بٹھا لیتے۔ اس سے میری علمی اور ادبی قابلیت میں کتنا اضافہ ہوا اس کا اندازہ مجھی کو ہو سکتا ہے۔[1]

بعض مرتبہ "اودھ اخبار" کے سلسلے میں بھی منوّر کے لڑکپن کے باوجود اُن کی خدمات حاصل کر لی جاتی تھیں۔ ایک دو مرتبہ بڑے بھائی صاحب نے انگریزی اخبار کا کچھ سہل اور معمولی حصّہ ترجمے کے لیے بھی انھیں دیا۔ منوّر اس وقت ساتویں یا آٹھویں درجے میں زیرِ تعلیم تھے۔ خیال ہے کہ وہ مالویہ جی کی ایک تقریر تھی، جو منوّر کو ترجمے کے لیے دی گئی۔ ان کا ترجمہ پسند کیا گیا۔ منوّر مزید لکھتے ہیں :-

> "بڑے بھائی صاحب ریاست نابھ کے رسالہ "بہارِ سرمور" کی ترتیب و تدوین کرتے تھے۔ چوں کہ وہ نول کشور پریس کے باقاعدہ ملازم تھے۔ "بہارِ سرمور" پر بحیثیت ایڈیٹر اپنا نام نہ دے سکتے تھے۔ اس لیے اس کے سرورق پر میرا نام بحیثیت ایڈیٹر نمایاں ہوتا تھا۔ میری کچھ ابتدائی غزلیں بھی "بہارِ سرمور" میں چھپی ہیں .... ۱۹۱۱ء ہی سے میرا کلام بھائی صاحب کے اخبار "تفریح" میں چھپنا شروع ہو گیا تھا۔ پہلی نظم "برسات" کے عنوان سے چھپی تھی۔"[2]

---

[1] داستان (قلمی نسخہ۔ منوّر لکھنوی) صفحات ۲۳۔۲۴۔۲۵

[2] ایضاً ـــــ صفحہ ۳۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ظاہر ہے کہ شعری تخلیق و ترجمے کا کام لڑکپن ہی سے منوّر لکھنوی کی گھٹی میں پڑا تھا اور یہ سلسلہ اُن کے آخری دنوں تک جاری رہا۔ ملک بھر کے مقتدر رسائل و اخبارات ان کے منظومات اور نثری مضامین کو بڑے اشتیاق و احترام کے ساتھ نمایاں طور پر شائع کرتے تھے۔ اپنی خود نوشت "داستان" میں منوّر نے ان رسائل و جرائد نیز اخبارات کی فہرست بھی درج کی ہے جس کی ہو بہو نقل یہاں درج کی جا رہی ہے:-

ہفتہ وار "تفریح"، لکھنؤ	ہفتہ وار "دیش سیوک" میرٹھ
روزنامہ "اودھ اخبار" لکھنؤ	ہفتہ وار "کائستھ ہتکاری"
ماہنامہ "بہارِ سرمُور" ناہن	ہفتہ وار "پریم پرچارک" آگرہ
ہفتہ وار "کرم ویر" لاہور	ماہنامہ "شعاع" سکندر آباد
ماہنامہ "ترجمان" لاہور	ماہنامہ "کارواں" کراچی
"نظارہ" لاہور	ماہنامہ "نیا راہی" کراچی
ماہنامہ "زمانہ" کانپور	ماہنامہ "کاکل" بمبئی
روزنامہ "تیج" دہلی	ماہنامہ "آج کل" دہلی
روزنامہ "پرتاپ" دہلی (سابق لاہور)	ماہنامہ "بساطِ عالم" دہلی
روزنامہ "ملاپ" دہلی	ماہنامہ "گلدستۂ اطفال" لاہور
ماہنامہ "پیامِ یار" لاہور	ماہنامہ "تعلیم" لاہور
ماہنامہ "مستانہ جوگی" لاہور (حال دلی)	ماہنامہ "رہنمائے تعلیم" دہلی
ماہنامہ "انقلاب" لاہور	روزنامہ "وطن" دہلی
ہفتہ وار "آزاد" کانپور	ماہنامہ "آندھرا پردیش" حیدر آباد
ہفتہ وار "بھائی" گورکھپور	ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ
ماہنامہ "دستگیر" دلی	ماہنامہ "پاسبان" چنڈی گڑھ
ماہنامہ "تحریک" دلی	ماہنامہ "سحاب" لدھیانہ
ماہنامہ "زبان" کاٹھیاواڑ	ہفتہ وار "ریاست" دہلی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہفت روزہ "سوراجیہ" دہلی	ہفتہ وار "ادبِ اردو" دہلی
ماہنامہ "محور" دہلی	ہفتہ وار "ہماری زبان" علی گڑھ
ماہنامہ "تلاش" دہلی	ہفتہ وار "سناتن دھرم پتر کا" فیروز پور
ماہنامہ "شاعر" آگرہ	ہفتہ وار "دربار" امرتسر
ماہنامہ "اوشا" (ہندی)	ماہنامہ "نیم ماہ" دہلی
ہفتہ وار "بھٹناگر سماچار" دہلی	ہفت روزہ "خوش باش" دہلی [1]

لیکن میرے علم کے مطابق یہ فہرست ادھوری ہے۔ میں نے بیسیوں ایسے اہم ادبی رسائل میں علامہ منوّر کا کلام پڑھا ہے جو اس فہرست میں شامل نہیں۔ غالباً اس لیے کہ فہرست قلم برداشتہ لکھی گئی ہے اور بہت سے نام انجانے میں چھوٹ گئے۔ مثلاً طفیل ہوشیارپوری صاحب کا مؤقر ماہنامہ "محفل" لاہور، ماہنامہ "روشنی" سونی پت، (ایڈیٹر تبسم علی پوری) سہ ماہی "نگارش" امرتسر (ایڈیٹر مہندر باوا)۔ ماہنامہ "کلیم" (جوش ملیح آبادی) ماہنامہ "اوم" لاہور (حال دہلی۔ ایڈیٹر گورکھ ناتھ نندہ)، ماہنامہ "بیسویں صدی" دہلی (ایڈیٹر خوشتر گرامی) ماہنامہ "لہریں" روہتک (ایڈیٹر مراری لال پنوار اور شباب للت) ماہنامہ "شانِ ہند" دہلی۔ (ایڈیٹر سرور تونسوی) ہفت روزہ روہیل کھنڈ اخبار، روز نامہ "ایشیا"، ماہنامہ "ہوشیار" لدھیانہ، ماہنامہ "جاں نثار" امرتسر، ہفت روزہ "حقیقت بیانی" دہلی (ایڈیٹر جگدیش مہتہ درد) "اخوت" لاہور "صبح امید" پٹنہ، "شیرازہ" سری نگر "پونم" حیدر آباد۔ ہفت روزہ "سینک سماچار" دلی، ماہنامہ خاتونِ دکن حیدر آباد، رسالہ "جلوۂ اردو"، "ہما" اور دیگر رسائل۔

لکھنؤ کے قیام کے دوران منوّر مشاعروں میں بہت کم شرکت کرتے تھے۔ تاہم آئیڈیل ہاؤس لکھنؤ کے مشاعرے انہی کے زیرِ اہتمام ہوتے تھے۔ لکھنؤ کے جن یادگار مشاعروں میں انھوں نے شرکت کی ان میں سے ایک گردھاری سنگھ ہائی سکول کی بلڈنگ میں منعقدہ مشاعرہ تھا جس میں لکھنؤ کے بیشتر اساتذۂ سخن شریک تھے۔ ۱۹۲۱ء میں محلہ نوبستہ لکھنؤ میں

---

[1] داستان (قلمی مسودہ منوّر لکھنوی) صفحہ ۴۸-۴۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

رائے گردیال مرحوم کی کوٹھی میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس میں گوپی ناتھ امن بھی شریکِ محفل تھے۔ محلہ ٹھاکر گنج لکھنؤ کے دو مشاعروں میں بھی منوّر شامل ہوئے۔ ان مشاعروں میں زیادہ تر لکھنؤ ہی کے ممتاز شعرا شرکت کرتے تھے۔ غزل گوئی کے ساتھ ساتھ شراب کے دَور بھی چلتے تھے اور میزبان کی جانب سے پُر تکلّف دعوت دی جاتی تھی۔ انہی صحبتوں میں منوّر کے تعلقات حسرت لکھنوی سے استوار ہوئے اور اُن کی رفاقت میں منوّر نے متعدد مشاعروں میں شرکت کی۔ ان میں سے اکثر انجمن بہارِ ادب کے زیرِ اہتمام منعقد ہوتے تھے۔ منوّر تسلیم کرتے ہیں کہ لکھنؤ کے متغزلانہ ماحول میں اُن کی نشوونما یا تو ان کے استاد حضرت نوبت رائے نظر کے توسّل سے ہوئی یا حسرت لکھنوی کی رفاقت سے۔

لاہور کے مختصر قیام کے دوران منوّر لکھنوی نے سناتن دھرم کالج لاہور میں منعقدہ ایک مشاعرے میں شرکت کی۔ منوّر نے "داستان" میں اس مشاعرے کے بارے میں یوں ذکر کیا ہے :-

"مشاعرے کے صدر مسیحائے اُردو سر عبدالقادر تھے..... مشاعرہ کافی زوردار تھا۔ نازش لاہوری حفیظ جالندھری وغیرہ پنجاب کے نامی شعرا شریکِ مشاعرہ تھے۔ مشاعرہ کا ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ حفیظ جالندھری اور نازش لاہوری کا کلام بار بار پڑھوایا جا رہا تھا۔ جس وقت میں پڑھنے کے لیے ڈائس پر گیا اور مَیں نے پڑھنا شروع کیا تو ایک طرف سے کچھ لوگوں نے ہوٹنگ شروع کر دی۔ مَیں نے پڑھنا فوراً بند کر دیا۔ اس پر سر عبدالقادر نے حاضرین کو پھٹکارا اور فرمایا کہ آپ لوگ تو صرف اُس کلام کی داد دے سکتے ہیں جو ترنّم سے پڑھا جاتا ہے اور جس میں طبلے اور سارنگی کی کسر رہ جاتی ہے۔ اس پر مجمع خاموش ہوا۔ میں نے سر عبدالقادر کے اصرار پر دوبارہ شعر خوانی کی تو مجمع پر قبرستان کی سی خاموشی طاری ہو گئی۔

شور و غل سے بھرے ہوئے اس مشاعرے میں میری شرکت میری زندگی کا پہلا تجربہ تھی۔ مَیں نے مرزا یگانہ سے کہا "بھائی ایسی فضا میں آپ کہاں؟" فرمایا "میاں، زندگی تو ہے"۔ مَیں مرزا کے جواب سے خاموش ہو گیا۔ مجھے اس وقت لکھنؤ کے مشاعروں کی تہذیب یاد آ گئی اور مَیں پنجاب کی شورش بیز زمین میں مشاعروں کی اس انقلابی صورت سے بہت متحیّر ہوا۔"[1]

منوّر لاہور سے تبادلے کے بعد دِلّی میں وارد ہوئے تو منشی مہاراج بہادر برق نے دِلّی کے ادبی حلقوں

---

[1] منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (راج نرائن راز) صفحہ ۱۰

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

میں اُن کا تعارف کرایا اور وہ پنڈت امرناتھ ساحرؔ کے ماہانہ مشاعروں شرکت کرنے لگے۔ کبھی کبھی سیتارام بازار میں حکیم مدن لال مدنؔ کی دوکان پر بھی شعرا کی محفل جمتی تھی۔ امرناتھ ساحرؔ صاحب کے مشاعروں ہی میں منورؔ کے تعلقات گمنام سکندر آبادی، حضرت جگرؔ مرادآبادی، قمرؔ بدایونی، اطہر ہاپوڑی وغیرہ سے قائم ہوئے۔

ساحرؔ صاحب کے اردو مشاعروں کے علاوہ اُن کے ہندی اور فارسی مشاعروں میں بھی منورؔ شامل ہوتے رہے۔ ایک زمانے میں تو یہ عالم تھا کہ منورؔ فارسی میں شعر کہنے پر ہی اکتفا کرنے لگے۔ لیکن یہ دور عارضی ثابت ہوا، تاہم منورؔ لکھنوی کا فارسی شاعری کا ایک دیوان "طوافِ عجم" کے نام سے قلمی مسوّدہ کی صورت میں محفوظ ہے۔

رائے بشن دیال شادؔ کے مشاعروں میں بھی گاہے بگاہے منورؔ شریک ہوتے تھے۔ سبزی منڈی دلی کے قیام کے دوران منورؔ نے خود ایک مشاعرہ منعقد کیا جس میں دلی کے تمام سربرآوردہ شاعر شامل ہوئے۔ یہ مشاعرہ نو بجے شب شروع ہوا اور صبح تک جاری رہا۔ نواب سراج الدین خاں سائلؔ دہلوی خود تو تشریف نہیں لائے لیکن انھوں نے اپنی غزل بھجوادی تھی۔ امرناتھ ساحرؔ، دینا ناتھ معجزؔ، علامہ برج موہن دتاتریہ کیفیؔ، مہاراج بہادر برقؔ دہلوی، سحرؔ اور نہ جانے کتنے ہی مسلّم الثبوت اساتذہ اس مشاعرہ میں شریک تھے۔

میرٹھ، بلند شہر اور مظفر نگر کے مشاعروں میں بھی شرکت کا منورؔ نے "داستان" میں ذکر کیا ہے۔ منورؔ نے اپنی بلبلی خانہ (بازار سیتارام) والی رہائش گاہ پر بھی منتخب شعرا کی کئی محفلیں منعقد کیں، جن میں نہال سیوہاروی، ابن الحسن، جوشؔ ملیح آبادی، عرشؔ ملسیانی، پروفیسر تلوک چند محرومؔ، جگن ناتھ آزادؔ، ساغرؔ نظامی جیسے مشاہیر بھی شرکت کرتے رہے۔ "تیج" ویکلی کے ایڈیٹر فکرؔ صاحب بھی ان صحبتوں میں شریک ہوتے رہے۔

منورؔ کے سیتارام بازار کے قیام کے دنوں میں ایک یوپی ایسوسی ایشن قائم ہوئی۔ منورؔ اس کے صدر اور نائب صدر بھی رہے۔ اس ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام ہر سال ایک مشاعرہ، ایک کوی سمیلن، اور ایک سنگیت سمیلن منعقد کیا جاتا تھا، لیکن بعض تنگ نظر اور خود غرض ارکان کے طرزِ عمل کے باعث اس ایسوسی ایشن کا خاتمہ ہوگیا۔

"داستان" میں یوں تو منورؔ نے لکھنؤ، دہلی اور لاہور ہی کی ادبی صحبتوں کا اور چند گنے چُنے مشاعروں کا تذکرہ کیا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ ان مشاعروں کے علاوہ اس نے ہندوستان بھر کے اہم شہروں میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں شرکت کی جن میں حیدرآباد، جے پور، انبالہ، پانی پت اور دلی کے کئی یادگار مشاعرے اور یومِ جمہوریت کی تقریب پر منعقد ہونے والے دلی کے لال قلعے کے مشاعرے بھی شامل ہیں۔ حیدرآباد میں ۱۹۶۴ء میں یومِ اُفقؔ کی تقریب کا مشاعرہ بھی منورؔ کی زندگی کا ایک اہم مشاعرہ تھا جو منورؔ کے والدِ محترم اُفقؔ لکھنوی مرحوم کی یادگار میں منعقد کیا گیا تھا۔

"داستان" میں منورؔ اپنے بچپن اور جوانی کے احباب کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

"کم آمیزی میری فطرت میں داخل ہے۔ بچپن میں بھی یہی حال تھا۔ بچپن کے ساتھیوں کا مجھے زیادہ خیال نہیں ہے۔ ہاں لڑکپن کے کئی ساتھی رہے۔"[1]

اِس فہرست میں زیادہ تر انھوں نے ایسے ساتھیوں کے نام دیے ہیں جو اُن کے قریبی رشتے دار خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے، یا کائستھ انسٹی ٹیوٹ سے علاقہ رکھتے تھے۔ لکھنؤ میں قیام کے دِنوں میں البتہ جب منوّر لکھنوی کے والد اُفق صاحب کا انتقال ہوا اور پورے کُنبے کی پرورش کا بوجھ محض سولہ سال کی عمر میں منوّر کے کندھوں پر آن پڑا تو اُس کے والد کے کچھ دوستوں نے اس کی دستگیری کی۔ ان محسنوں کا ذکر خاص طور پر "داستان" میں کیا گیا ہے۔ ان میں جناب پریاگ نرائن بھارگو مالک نوَل کشور پریس بھی ایک تھے جنھوں نے منوّر کو دس روپے ماہانہ کے مشاہرہ پر (جسے موصوف وظیفہ کہتے تھے) اپنے "اودھ اخبار" کا لوکل رپورٹر مقرر کر دیا۔ جب منوّر نے مشاہرے کے قلیل ہونے کے باعث بعد ازاں اس خدمت سے معذوری ظاہر کی تو انھوں نے منوّر کو محکمہ ریلوے آڈٹ کی ملازمت قبول کرنے کی منظوری دے دی اور ساتھ ہی ساتھ منوّر کو ناولوں کے ترجمے کا کام دینا بھی جاری رکھا۔ سرکاری تنخواہ اور ترجمہ کی اُجرت ملا کر اس طرح کنبے کی پرورش و پرداخت کا کام بخوبی چل جاتا تھا۔

ریلوے میں ملازمت دلانے کے سلسلے میں بابو تپن لال ودیارتھی نے منوّر کی بہت مدد کی۔ ودیارتھی جی ریلوے آڈٹ میں سینئر آفیسر تھے اور بعد میں ترقی پا کر اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل کے عہدے تک جا پہنچے۔ منوّر کے قدردانِ خاص بابو بنکٹ بہاری لال جب "اودھ اخبار" کے منیجر مقرر ہوئے تو منوّر کو گاہے بگاہے "اودھ اخبار" میں کام کرنے اور مضامین وغیرہ لکھنے کے مواقع بھی ملے۔ منشی نوبت رائے نظرؔ جب "اودھ اخبار" کے ایڈیٹر بنے تو منوّر لکھنوی کو اِن دونوں قدردانوں کی شفقت کے طفیل ترقی کا موقع ملا۔ منشی نوبت رائے نظرؔ کے شاگرد تو تھے ہی اِن شفیق بزرگوں کے علاوہ اور بھی کئی نام اُس طویل فہرست میں درج ہیں جو منوّر نے اپنی خود نوشت سوانح عمری "داستان" میں منسلک کی ہے۔ ان ہم عصر ادیبوں اور دیگر اہم شخصیات کے مراسم کا تفصیلی جائزہ اگلے باب میں پیش کیا جائے گا۔

منوّر کے بچپن اور لڑکپن کے ہمجولیوں میں زیادہ تر اُن کے رشتے داروں کی اولادیں تھیں یا کائستھ برادری کے کچھ لڑکے تھے۔ دیاشنکر، رگھوناتھ پرشاد المعروف بشمبھر جی، سورج سہائے، رامیشور پرشاد سری واستو، جگن ناتھ پرشاد، کرپا شنکر، بھیروں پرشاد، شام منوہر تواری وغیرہ بھی اُن کے ہمجولی رہے لیکن چوں کہ ان میں سے کوئی بھی میدانِ ادب کا شہسوار نہیں تھا، اس لیے ان لوگوں کا تذکرہ یہاں بے معنی ہوگا۔

منوّر کے دفتر کے ساتھیوں میں آفاق حسین آفاق، بابو جانکی پرشاد، جگت نرائن نگم، جناب غلام محمد، جناب حفیظ احمد اور بابو ایشور دیال ماتھر سے منوّر کا خاص اختلاط تھا۔

---

[1] "داستان" (منوّر لکھنوی۔ خود نوشت سوانح عمری کا قلمی مسودہ)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منوّر کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ اُن کی "داستان" میں ان سے فیض حاصل کرنے والے جن شعرا کی فہرست درج ہے وہ لگ بھگ بینسٹھ ناموں پر مشتمل ہے۔ داستان کے کچھ دیگر صفحات میں مزید چند شاگردوں کا ذکر ہے۔ حکیم منظور صاحب نے "منوّر کے تلامذہ" کے زیرِ عنوان تحریر کردہ اپنے مفصّل مقالے میں آستانِ منوّر سے فیض یاب ہونے والے شعرا کے جو اسماء مذکور کیے ہیں ان کی تعداد بھی کچھ اتنی ہی بنتی ہے۔

"داستان" میں منوّر لکھنوی نے اپنے ذاتی عقائد نیز خانگی اور سماجی فرائض کے بارے میں ۱۹۶۶ء میں جو اظہارِ خیال کیا ہے اُس کا ذکر یہاں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے تلامذہ کی رہنمائی اور اصلاحِ سخن کے تعلق سے منوّر کا یہ بیان خود میں حد درجہ تقدّس اور روحانی اقرار و ارتکاب کی نشان دہی کرتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"جس کو لینا ہے روشنی لے لے
ورنہ میرا چراغ بجھتا ہے

"ہمارے سناتنی ہندو عقیدے کے مطابق انسان پر تین قسم کے "رِن" یا قرض عائد ہوتے ہیں:-

(۱) "دیو رِن" (قرضِ ربّانی) "پِتر رِن" (قرضِ بزرگاں) اور "رِشی رِن" یا "گرو رِن" (قرضِ مرشد)

"دیو رِن" (قرضِ ربّانی) کی اَدائیگی کا طریقہ ہے مالکِ کُل کی یاد آوری، عبادت کے ذریعے اُس کا تقرّب حاصل کرنا۔ "پِتر رِن" (قرضِ بزرگاں) افزائشِ خاندان کی شکل میں ادا ہوتا ہے۔ یعنی اچھی، صحت مند، ذکی، توانا اور فرض شناس اولاد کا پیدا کرنا۔ "رِشی رِن" (قرضِ مرشد) سے مراد یہ ہے کہ جو تعلیم مرشد کے یا کسی اور کے ذریعے سے حاصل کی جائے اُس سے دوسروں کو مستفید کرنا۔

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ میں اِن تینوں قرضوں کی ادائیگی سے بڑی حد تک قاصر رہا ہوں پھر بھی کچھ نہ کچھ کوشش ان قرضوں سے سبکدوش ہونے کے لیے کی گئی ہے۔" [۱]

"دیو رِن" اور "رِشی رِن" کے تعلق سے منوّر لکھنوی نے اگلی سطور میں اُن مذہبی اور رُوحانی گرنتھوں کی فہرست دی ہے جن کے منظوم و منثور ترجمے شائع کر کے انھوں نے اسلام کی تہذیب و تعلیم اور رُوحانی پیشواؤں کے پیغام کے ابلاغ و اشاعت کا فرض ادا کیا۔ پِتری رِن کے سلسلے میں انھوں نے اپنی دو بیٹیوں کی ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۴ء میں ولادت کا ذکر کیا ہے جنھیں پروردگار نے دیا اور چند مہینوں ہی میں چھین لیا اور بعد میں اولاد سے محرومی اور اپنے سسرال کے خاندان میں سے ایک کم سن بچّے کلدیپ کمار کو گود لینے کا ذکر کیا ہے۔

اور درحقیقت یہ قرضِ مُرشد سے سُبک دوش ہونے کا مقدّس فریضہ تھا جس کی ادائیگی کے لیے منوّر نے ربع صدی سے زائد تک شاعروں کی کم از کم دو نسلوں کی تہذیب و تربیت کے لیے اپنا قیمتی وقت اور ذہنی کاوشیں صرف

---

[۱] داستان (منوّر لکھنوی)، قلمی نسخہ۔ صفحہ درج نہیں۔ تاریخ تحریر ۱۵ر جولائی ۱۹۶۵ء۔ (بعد میں کچھ اضافے ۱۹۶۶ء میں کیے گئے)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کیں۔ پھر بھی اُن کی منکسر مزاجی، حلیمی اور کسرِ نفسی ملاحظہ ہو کہ وہ خود سے مشورۂ سخن کرنے والے اہلِ قلم کے بارے میں بطورِ عنوان جو الفاظ لکھتے ہیں اُن میں ان حضرات و خواتین کے استاد ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے بلکہ اس فہرست کی پیشانی پر یہ تحریر کرتے ہیں:-

جن شعراء نے مشورۂ سخن لینے کی ضرورت سمجھی
یا جن حضرات کے کلام میں دست اندازی کا مجھے حق دیا گیا۔[1]

اس فہرست کی عکسی تصویر زیرِ نظر مضمون میں شامل ہے۔ "داستان" کے اگلے صفحات میں منوّر لکھنوی نے کچھ ایسے اہلِ قلم کی طرف بھی اشارے کیے ہیں جنھوں نے کچھ عرصہ مشورۂ سخن لے کر یہ سلسلہ بعد میں ملتوی یا منقطع کر دیا۔ کچھ فارغ الاصلاح قرار دے دیے گئے۔ بقول منوّر :-

"دو ایک افراد ایسے ہیں جو واقعات سے گُریز کر کے یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ انھوں نے بیس پچیس سال تک میرے دماغ سے فائدہ اُٹھایا ہے۔"[2]

پنجاب کے دو غیر ہندو شعرا کے بارے میں منوّر لکھتے ہیں :-

"اپنے رہنماؤں کی صف میں انھوں نے مجھے نظر انداز کر دیا۔ اگر چہ اُن کی تحریریں میرے بیان کی تصدیق میں موجود ہیں۔"[3]

اس فہرست میں کچھ ایسے شعرا کے نام بھی ہیں جو کثیر الاستاد رہے ہیں۔ وہ باقاعدہ طور پر منوّر کے دامانِ تلمذ سے وابستہ نہیں ہوئے۔ لیکن ضرورت پڑنے پر کبھی حضرت منوّر لکھنوی سے اور کبھی اُن کے دیگر ہمعصر اساتذہ سے اصلاح لیتے رہے۔ بعض لوگ یوں بھی اُستاد کی رہنمائی کا اعتراف کرنا کسرِ شان اور باعثِ ندامت سمجھتے ہیں۔

اردو شاعری میں استاد کا ادارہ نُو واردانِ بساطِ سخن کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ رہا ہے۔ بالخصوص اس لیے بھی کہ اُردو میں شعر گوئی کے لیے چند مستحکم اصولوں کی پابندی، گرامر، عروض، تلفّظ اور محاورہ کی صحت، بندش کا سلیقہ، استعارات و علائم کا صحیح اور پختہ کارانہ استعمال، صنائع و بدائع سے آگاہی، معائب و متروکات سے احتراز اس فن کے لوازمات سمجھے جاتے ہیں، اور نو آموز و نو مشق ذہنوں کو کچھ مدّت تک کسی رہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ خود منوّر نے اُستاد کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے منظوم ترجمے "کمار سمبھو" کا انتساب

---

[1] داستان (منوّر لکھنوی) قلمی مسوّدہ صفحہ ۱۵

[2] ایضاً " " صفحہ نمبر درج نہیں

[3] ایضاً " " " " " "

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اپنے شفیق محترم استاد منشی نوبت رائے نظرؔ لکھنوی کے نام کر کے فارسی کے اس شعر کے ذریعے استاد کی عظمت اور اس کے تئیں اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے :-

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم   شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

منورؔ کے شاگردوں کے حلقے میں ہر مکتبِ خیال اور ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے شعرا شامل ہیں۔ ان میں ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی، جینی سبھی فرقوں کے ادیب ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو ادب میں کلاسیکیت اور روایت کے پرستار ہیں اور ایسے بھی ہیں جو ترقی پسند تحریک کے ساتھ نمایاں طور پر وابستہ رہے ہیں اور اُن سے قطعاً مختلف نظریۂ شاعری رکھنے والے جدت پرست بھی، جو روایتی طرزِ سخن اور اشتراکی نظریات سے دامن بچاتے ہوئے جدید علائم و استعارات اور نئے تخلیقی رویّوں سے ناطہ جوڑ چکے ہیں۔ گویا منورؔ نے ہر عقیدے اور ہر نہج کے عزیزوں کی یکساں لگن اور فراخدلی سے رہنمائی کی ہے۔ علم و ادب کی ایسی مخلصانہ خدمت اور کون کرے گا۔؟ اور یہی منورؔ لکھنوی کی کشادہ ظرفی، شرافتِ نفس اور وسیع النظری کا ثبوت ہے۔

منورؔ لکھنوی کے شاگرد بھارت میں بھی ہیں اور پاکستان میں بھی۔ ان کے مسلم تلامذہ میں آفاق حسین آفاقؔ (دمال کراچی) محمد یعقوب (پاکستان) عزیز مخدومی بلند شہری، محمد رضوانؔ بریلوی، ماجد ادیب (مرحوم حکیم گلچیں کرنالی (پاکستان) حاذقؔ سہارنپوری اکبر حیدری (کشمیر) اور کامل نظامی شامل ہیں۔ جدید مکتبۂ فکر کے شاعر حکیم منظور بھی منورؔ کے دامانِ فیض سے وابستہ رہے ہیں [1]

اُن کے سکھ تلامذہ میں پورن سنگھ ہنرؔ اور مہندر سنگھ کوثرؔ (برادرِ پورن سنگھ ہنرؔ) سوڈھی ایشور سنگھ ناتواںؔ اور عیسائی فرقے سے تعلق رکھنے والے شاگردوں میں ہینس قربانؔ، ڈاکٹر طالب شاہ آبادی، فرہاد پردیسی، انجم لدھیانوی کے اسماء قابلِ ذکر ہیں۔

منورؔ لکھنوی کے شاگردوں میں سے ایک خاصی تعداد صاحبِ دیوان اور پختہ مشق شعرا کی ہے۔ ان میں کلاسیکی مزاج اور شعری روایات کے پاسداروں کی صف میں باوا کرشن گوپال مغمومؔ، کالی چرن اثرؔ، نرائن داس بھٹناگر طالبؔ پانی پتی مرحوم، شیش چندر سکسینہ طالبؔ دہلوی مرحوم، منشی چندر بھان کیفیؔ، طالبؔ چکوالی مرحوم، کنول انبالوی، دھیرج پرکاش گشتہؔ، پرنسپل امیر چند بہارؔ، کرشن متل مزاجؔ، رام کرشن تمناؔ، کیلاش ورما شائقؔ ہنگامی، خموشؔ سرحدی، بخشی اخترؔ امرتسری، گنگا شرن قاصدؔ بلند شہری، رام چندر غافلؔ، گیان پرکاش اخترؔ، بابو رام گلشنؔ کیتھلوی، مدہوشؔ کیتھلوی سید رضوانؔ عثمانؔ بریلوی، ماجد ادیبؔ، بدری ناتھ کاملؔ، نسیمؔ دہلوی برج لال جگی رعناؔ، معصوم انبالوی، حکیم ترلوک ناتھ اعظمؔ ایشور سنگھ ناتواںؔ، راحتؔ ایمن آبادی، موہن لال نیّرؔ، ہیرا لال فلکؔ کورو کھشیتر کے بالکرشن مضطرؔ، کملا پت ماہرؔ لکھنوی

---

[1] فہرست تلامذہ مندرجہ "داستان" (منورؔ لکھنوی کی خود نوشت سوانح حیات۔ قلمی مسوّدہ) صفحہ نمبر ۵۱-۵۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

جگیشور پرشاد بیتاب بریلوی، کنورلال کنول، امرچند قیس جالندھری، افسر آذری، شیوراج بہار، کل بھوشن پرواز انبالوی، فرہاد پردیسی، نوہر یارام جوہر سرحدی، جگدیش مہتہ درد، جگدیش بھٹناگر حیات، ڈاکٹر جگدیش سرن شرما سابق لائبریرین پنجاب یونیورسٹی، مراری لال متین، ن۔ ب نجمی ہوشیارپوری (مرحوم) کلدیپ نرائن ٹکو گوہر، ڈاکٹر مدن لال ازل، زخمی حصاری، روشن پانی پتی، شیر سنگھ ناز دہلوی، پروفیسر پریم چند، امرتسر کے پورن سنگھ ہنر اور اُن کے بھائی مہندر سنگھ کوثر امرتسری دکھائی دیتے ہیں (ہرچند کہ ہنر اور کوثر دونوں بھائیوں نے منور سے کبھی کبھار مشورۂ سخن کیا لیکن بنیادی طور پر ان کا شمار ابوالفصاحت جوش ملسیانی کے تلامذہ میں ہوتا ہے)۔

منور کے جو شاگرد ترقی پسند تحریک کے ساتھ وابستہ رہے۔ ان میں شرر فتح پوری، رام ناتھ اسیر (اسیر منی مزرعوی) دلیپ بادل، جگدیش متل معصوم اور نریش کمار شاد وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

شاعری میں جدیدیت کی تحریک سے وابستہ پروفیسر بمل کرشن اشک اور راج نرائن راز، نیز حکیم منظور منور کے ممتاز اور عقیدت مند تلامذہ ہیں جنھوں نے اردو ادب کی تاریخ میں اپنے مستقل نقوش چھوڑے ہیں۔ منور کے کچھ برگزیدہ تلامذہ ایسے بھی ہیں جو کلاسیکی روایت اور جدید اسلوب کے متوازن امتزاج کے شعر اچھے جاتے ہیں، ان میں اہم نام بلراج حیرت، ڈاکٹر تاراچرن رستوگی، ستیہ پرکاش شوق، کنور سین حسرت، رانا گنوری، دھرم پال عاقل اور انجم لدھیانوی کے ہیں۔ اِس صف میں راقم السطور (شباب للت) بھی گرد کارواں کے طور پر اپنا نام شامل کرنے کی بجا طور پر جسارت کر سکتا ہے۔

منور کے اقارب میں سے اُن کی ہمشیرہ دھرم دیوی صاحبہ، اُن کے برادرِ خورد بشن پرشاد مقدر لکھنوی اور ماموں جگدمبا پرشاد قیصر لکھنوی جیسے مزاح نگار شاعر بھی منور کے حلقۂ تلامذہ میں رہے ہیں۔

حکیم منظور اپنے مقالہ "منور کے تلامذہ" میں رقمطراز ہیں کہ ایک مختصر سا حلقہ ان شعرا کا ہے جو حضرتِ منور لکھنوی کے شاگرد تو نہیں لیکن بہ وقتِ ضرورت ان سے مشورۂ سخن کرتے رہے ہیں۔ اس ذیل کے اہم شعرا میں جناب برج لال جگی رعنا، افسر آذری، طالب چکوالی، امرچند قیس جالندھری کے نام دیے گئے ہیں۔ حکیم منظور کے مطابق اس زمرہ میں ابوالفصاحت جوش ملسیانی کے ہونہار شاگرد نریش کمار شاد کا نام سرِ فہرست آتا ہے جو تمام اصنافِ سخن پر حاوی تھے اور باکمال شاعر و ادیب تھے۔ لیکن دلّی میں اپنے قیام کے دوران اکثر منور لکھنوی سے ملنے جایا کرتے تھے اور ضرورتاً مشورۂ سخن بھی کرتے تھے، خود منور نے شاد کو اپنا خاص سعادت مند عزیز تسلیم کیا ہے اور اپنی ایک دو نظموں میں اُس کا ذکر اپنے گھر کے لاڈلے بچّے کے طور پر کیا ہے۔ مندرجہ ذیل رباعیات بھی انھوں نے شاد کے لیے کہیں۔ ان پر تاریخ تحریر ۲۵ دسمبر ۶۶ء درج ہے۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تحسین ملتی ہے بے محابا سب سے　　ہے طرزِ فن تیرا نرالا سب سے
لیتا ہے بڑے بڑوں سے ٹکر تو شادؔ　　اِس دورکے شاعروں میں چھوٹا سب سے

مَیں نے تجھے دلبند ہمیشہ سمجھا　　ہم صورتِ فرزند ہمیشہ سمجھا
اخلاق و ادب نے جو مقرر کی ہے　　اُس رسم کا پابند ہمیشہ سمجھا

تو بزمِ سخن میں ہے ہُنرورکا عزیز　　سارے اربابِ مہر گستر کا عزیز
رشتے یہ سب ہیں تری عظمت کی دلیل　　تو دردؔ کا فرزند منوّرؔ کا عزیز

نریش کمار شادؔ کی ناگہانی موت پر کہے گئے طویل نوحے میں بھی منوّرؔ نے اسی طرح کے پُرخلوص جذبات کا اظہار کیا ہے۔ منوّرؔ لکھنوی سے استفادہ کرنے والوں میں کچھ ایسے حضرات بھی تھے جو اپنے استاد کے انتقال کے بعد منوّرؔ کے آستانِ فیض سے وابستہ ہو گئے جیسے منشی مہاراج بہادر برقؔ دہلوی کے تلامذہ طالبؔ پانی پتی، شگن چند روشنؔ پانی پتی، بیتابؔ بریلوی، نیش چند سکسینہ طالبؔ دہلوی، بدری ناتھ کاملؔ وغیرہ۔ حضرت نوحؔ ناروی کے شاگرد رائے پرانند اثرؔ، حضرت آثرؔ لکھنوی کے شاگرد ڈاکٹر تاراچرن رستوگی، علامہ سیمابؔ اکبرآبادی کے شاگرد مرحوم کرتارناتھ شفقؔ، اور خموشؔ سرحدی، پیارے لال رونقؔ کے شاگرد بخشی شوری لالی احترامؔ تسری، نہال سیوہاروی کے شاگرد اکملؔ جالندھری، پروفیسر تلوک چند محرومؔ کے شاگرد کشن چند اُمیدؔ اور اسی طرح افقرؔ موہانی کے شاگرد دھرم پال عاقلؔ لاہوری وغیرہ۔

منوّرؔ کے برگزیدہ تلامذہ میں سے کچھ ملک گیر شہرت سے ہم کنار ہو چکے ہیں۔ ان میں پروفیسر بمل کرشن اشکؔ مرحوم جدید شاعری کے پیشواؤں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کا مجموعۂ کلام "آئینہ اور پرچھائیں" ۱۹۷۳ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس سے قبل دیوناگری رسم الخط میں اُن کا ایک اردو مجموعۂ کلام "آنسو آنسو" کے نام سے ۱۹۶۳ء میں چھپ چکا تھا۔ اُن کے دیگر شعری مجموعے ہیں "روشنی پھر روشنی" (مطبوعہ ۱۹۸۰ء)، "وہ فقیر اور" (۱۹۷۹ء)، "نام بدن اور میں" (۱۹۸۱ء)، "ماضیانہ" (مطبوعہ ۱۹۸۲ء)۔ ان کی انگریزی شاعری کے مجموعے ON DIRTY LINEN AND OTHER POEMS ۱۹۷۶ء میں، AND ON AND THERE WAS LIGHT ۱۹۷۷ء میں اور ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئے تھے۔ "ماضیانہ" اردو شاعری کا اُن کا آخری مطبوعہ مجموعہ تھا۔ ہریانہ سرکار نے اشکؔ کو حالی ایوارڈ عطا کیا اور اتر پردیش اُردو اکاڈمی نے بھی اُن کی پہلی شعری تصنیف کو انعام سے نوازا۔ اشکؔ کی ایک اور تصنیف "گیت وطن کے" بھی شائع ہوئی تھی۔

جدیدیت کی تحریک سے وابستہ جناب راج نرائن رازؔ بھی منوّرؔ لکھنوی کے عزیز ترین شاگردوں میں شامل تھے آپ بہت برسوں تک حکومتِ ہند کی وزارتِ اطلاعات و نشریات میں پبلی کیشنز ڈویژن کے اردو ماہنامہ "آجکل" کے ایڈیٹر رہے۔ آپ کے شعری مجموعے "چاندنی اساڑھ کی" "لذتِ لفظوں کی" اور "دھنک احساس کی" جدید لب و لہجے کی شاعری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اپنے استادِ محترم علامہ منوّرؔ لکھنوی کی حیات اور فن پر انھوں نے ایک وقیع اور معلوماتی کتاب "منوّرؔ لکھنوی۔ شخصیت اور شاعری" کے نام سے ترتیب دی

۱؎ شاخِ مرجاں (منوّرؔ لکھنوی کی غزلوں کا مجموعہ)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تھی جو منوّر کی حیات ہی ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب اُردو کے تحقیقی اور تنقیدی ادب میں ایک جامع اور یادگار اضافہ ہے۔ اس میں منوّر کی حیات اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر انیس[19] اردو ادیبوں کے مقالے یکجا کر کے شائع کیے گئے۔

منوّر لکھنوی کے جن تلامذہ کے یہاں کلاسیکی قدروں اور جدید علائم و استعارات نیز نئے لب و لہجہ کا امتزاج ملتا ہے، ان میں راقم السطور کا نام بھی ادبی حلقوں میں خاصا جانا پہچانا ہے۔ اس ہیچمدان کی اردو شاعری کے دس مجموعے "مضراب"، "پتوار"، "پُروائی"، "منزل منزل"، "صحرا کی پیاس"، "اُڑان"، "دائروں کا سفر"، "زرد موسموں کے درد"، "سمندر پیاسا ہے" اور "آنچ برف زاروں کی" بالترتیب ۱۹۶۱ء، ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۷ء، ۱۹۷۰ء، ۱۹۷۳ء، ۱۹۷۶ء، ۱۹۸۰ء، ۱۹۸۳ء، ۱۹۸۶ء اور ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئے ہیں جو غزلوں، نظموں، گیتوں، قطعات، رُباعیات اور دوہوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے سات کو ملک کی مختلف ادبی اکاڈمیوں، مرکزی اور صوبائی سرکاری اداروں سے انعام و اعزاز عطا ہوئے۔ ان کے علاوہ اس خاکسار کے چار شعری مجموعے ہندی میں اور دو ہماچل کی پہاڑی بھاشا میں (بحروف دیوناگری) شائع ہو چکے ہیں۔ احقر گزشتہ برس ۳۱ مارچ ۱۹۹۱ء کو مرکزی حکومت کی وزارتِ اطلاعات و نشریات سے بطور فیلڈ پبلسٹی آفیسر شملہ ریٹائر ہوا۔ احقر کی ہندی کی شعری تصانیف "پتوار"، "دھنک"، "میری چیتنا کی"، "اپنی تلاش ہیں" اور "تیرتے پاشان" کے ناموں سے شائع ہوئیں۔

باوا کرشن گوپال مغموم کا شمار منوّر لکھنوی کے ان ممتاز شاگردوں میں ہوتا ہے جو کلاسیکی مزاج اور شعری روایات کے پاسدار و جاں نثار ہیں۔ باوا مغموم کے شعری مجموعے "نقوشِ حُسن"، "آرزوؤں کے خواب" اور "آرزوؤں کے جزیرے" منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ان کی رُباعیات کا ایک مجموعہ "جہاں نما" کے نام سے اور قومی نظموں کا ایک مجموعہ "بیداریٔ وطن" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ان شعری تصانیف پر مغموم مختلف سرکاری اداروں سے انعامات پا چکے ہیں۔ آپ نے ملک کی ۳۸ نامور ادبی شخصیات کے نوحے بھی "بزمِ ماتم" کے نام سے کتابی صورت میں ۱۹۸۰ء میں شائع کیے تھے۔ "جھانسی کی رانی" مغموم کی ایک اور قابلِ ذکر تصنیف ہے۔ اُردو کے تحقیقی ادب کو مغموم کی بیش بہا دین ہے "درگا سہائے سرور جہان آبادی: حیات اور شاعری" جو ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ مغموم نے یہ کتاب بڑی کاوش، تحقیق اور عرق ریزی سے ترتیب دی ہے۔

مغموم کے برادرِ خورد جناب دھرم پال عاقل بھی اپنے اُستاد افقر موہانی صاحب کی وفات کے بعد حضرت منوّر کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے تھے۔ ان کے دو شعری مجموعے "خونِ جگر" اور "اک چراغ اور" شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کچھ برسوں تک ہماچل کے سرکاری اردو جریدہ سہ ماہی "جدید فکر و فن" کے ایڈیٹر بھی رہے۔ اس سے قبل وہ ہماچل کے سکول کیڈر میں معلّم تھے۔ محکمہ السنہ و ثقافت ہماچل پردیش کے مشاعروں میں شرکت کرنے والے شعرا کے کلام کے دو مجموعے "آبشار" اور "دھوپ چھاؤں" بھی انھوں نے ترتیب دیے تھے جنھیں محکمے کی طرف سے شائع کیا گیا۔

پرنسپل (ریٹائرڈ) امیر چند بہار پنجاب اور ہریانہ کے مختلف کالجوں میں انگریزی پڑھاتے رہے اور کچھ برس پہلے ہریانہ کے ایک گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ انگریزی کی چھبیس[26] مشہور اور منتخب نظموں کے آپ نے منظوم ترجمے کیے اور انھیں کتابی شکل میں "نسیمِ مغرب" کے نام سے شائع کیا۔ آپ کی رُباعیات کا مجموعہ "نسیم بہار" اور مجموعۂ غزلیات "ارمغانِ بہار"

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بالترتیب اتر پردیش اُردو اکاڈمی اور ہریانہ سرکار سے انعامات حاصل کر چکے ہیں۔ حال ہی میں بہار صاحب کے تین سو پچاس قطعات کا ایک حسین مجموعہ "زخم و مرہم" منظرِ عام پر آیا ہے۔

منوّر کے ایک اور نامور شاگرد جو ترقی پسند تحریک کے علمبرداروں میں شمار کیے جاتے ہیں جناب رام سنگھ شرر فتحپوری مرحوم ہیں۔ آپ نے یونیورسٹی کی تعلیم جامعہ ملیہ اور علی گڑھ سے حاصل کر کے درس و تدریس کے پیشے کو اپنایا۔

"جنگ نہ ہونے دیں گے" طویل نظم، سازِ جمہور" (مثنوی) "ہمالیہ جاگ اٹھا" (نظمیں) "کاروانِ سحر" مسدس ان کی چار چھوٹی کتابوں کی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔ آپ کی معرکۃ الآرا رزمیہ تصنیف 'پدمنی' پر مختلف اکاڈمیوں کی جانب سے انعامات عطا ہوئے۔ "حرف حرف" "فردا" "کہاں کی رباعی کہاں کی غزل" اور "نئی دنیا نیا آدم" آپ کی دوسری تصانیف بھی اردو حلقوں میں مقبول ہو چکی ہیں۔

حضرت منوّر کے برگزیدہ تلامذہ میں ایک اور اہم نام حکیم منظور کا ہے جو جدیدیت کی تحریک سے وابستہ ہیں اور جن کی چار شعری تصانیف "ناتمام" (مطبوعہ ۱۹۷۷ء) "لہولمس چنار" (۱۹۸۲ء) "برف رُتوں کی آگ" (۱۹۹۰ء) اور "خوشبو کا نیا نام" (۱۹۹۱ء) شائع ہو کر ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکی ہیں۔ آپ سری نگر (کشمیر) سے تعلق رکھتے ہیں اور حکومتِ کشمیر کی انتظامیہ سروس میں بہت سینئر عہدوں پر کام کر چکے ہیں۔ کشمیر کی دھرتی کی سوندھی مہک ان کی شاعری میں رچی بسی ہوئی ہے۔

ملک کے کچھ نامور صحافی بھی منوّر کے شاگردوں میں ہیں۔ جناب سمت پرکاش شوق، روزنامہ "تیج" دہلی سے وابستہ رہے ہیں۔ غزل، نظم اور نثر پر انھیں مکمل ملکہ حاصل ہے۔ نثری مضامین اردو کے علاوہ ہندی میں بھی لکھتے ہیں۔ ان کا کلام ملک کے ممتاز رسائل میں شائع ہوتا ہے۔

لکھنؤ "ہما" کے ایڈیٹر اور اسلامیات کے ماہر ڈاکٹر طالب شاہ آبادی نظم و نثر پر یکساں طور پر حاوی ہیں۔ بریلی کے دو شاعروں ماجد ادیب مرحوم اور رضوان بریلوی کے نام بھی اسی خصوص میں لیے جا سکتے ہیں۔

منوّر لکھنوی کی خودنوشت "داستان" میں اُن سے مشورۂ سخن کرنے والوں میں ایک اہم نام ڈاکٹر رانا پرتاب سنگھ رانا گنوری کا ہے جو آر کے ایس ڈی کالج کیتھل (ہریانہ) میں ہندی کے لیکچرار ہیں۔ شعر اردو میں کہتے ہیں اور ہندی اور اُردو میں اپنے تخلیقی کارناموں پر ہریانہ کے محکمۂ السنہ اور ملک کی مختلف ادبی اکاڈمیوں سے انعامات پا چکے ہیں۔ آپ بنیادی طور پر پروفیسر تلوک چند محروم کے ممتاز شاگرد مہتہ جیمنی سرشار سے وابستہ تھے لیکن گاہے گاہے منوّر لکھنوی سے بھی مشورۂ سخن کرتے رہے۔ اردو میں "فانوسِ خیال"، "میگھ دوت" (کالی داس کی سنسکرت تصنیف کا ترجمہ)، "رعنائیِ خیال"، "ترنگیں"، "سناٹے کی آواز"، آپ کے انعام یافتہ شعری مجموعے ہیں۔

مرحوم پریم شنکر فرحت نے منوّر سے ذوقِ ترجمہ پایا۔ ان کا مجموعۂ کلام "سازِ حیات" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اپنی وفات سے قبل انھوں نے اپنی طویل نظم "ساقی نامہ" مکمل کی تھی اور ٹیگور کی "گیتانجلی" کے ترجمے میں مصروف تھے۔

بزرگ شاعر اور نقادِ ادب ڈاکٹر تاراچرن رستوگی پہلے حضرتِ اثر لکھنوی سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ اثر

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کی وفات کے بعد انھوں نے رہنمائی کے لیے منوّر کی جانب رجوع کیا۔ آپ گوہاٹی یونیورسٹی میں انگریزی اور تقابلی ادبیات پڑھاتے رہے ہیں۔ اردو ادب کے جیّد عالم اور محقق کی حیثیت سے ملک بھر کے ادبی حلقوں میں محترم ہیں۔

بخشی اختر امرتسری کا مجموعۂ کلام "تجلّیات" شائع ہو چکا ہے۔ اکمل جالندھری کا ایک شعری مجموعہ "بوئے گل" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ عزیز مخدومی کی دو شعری تصانیف "حدیثِ وفا" اور "حدیثِ محبت" منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ نریش کمار شاد مرحوم صاحبِ طرز ادیب اور مقبول شاعر تھے۔ ان کے متعدد شعری اور نثری مجموعے نیز تراجم شائع ہوئے اور پنجاب سرکار کی جانب سے انعامات سے نوازے گئے۔ شاد کے قطعات کا مجموعہ "قاشیں" اردو دنیا میں بہت مقبول ہوا تھا۔ ان کے تنقیدی مضامین "مطالعے" کے نام سے شائع ہوئے۔ جگیشور پرشاد بیتاب بریلوی نظم و غزل کے اچھے شاعر ہیں۔ صاحبِ کمال ہندو شعرا کے تعلق سے بیتاب نے بڑا مفید کام کیا ہے۔ کم نام اور گمنام ہندو شعرا اور اُن کی تصنیفات و تالیفات سے متعلق بیتاب صاحب کے مضامین اردو کے معتبر رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔[1]

جگدیش مہتہ درد برسوں تک دلّی سے ماہنامہ "حقیقت بیانی" شائع کرتے رہے۔ آپ بھی آستانِ منوّر سے فیض یاب ہوتے رہے۔ درد کے شعری مجموعے "یاقوت رواں" اور "کلیاتِ درد شائع ہو چکے ہیں"۔ اردو کے ہندو شعرا کے نام سے ایک ضخیم تذکرہ بھی آپ نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔

حکیم منظور نے اپنے مقالہ "منوّر کے تلامذہ" میں ایک اور کشمیری شاعر کلدیپ نرائن ٹکو گوہر کا ذکر کرتے ہوئے کچھ اپنے متعلق بھی بطور تعارف لکھا ہے جو درج ذیل ہے:-

"گوہر صاحب راقم السطور کی طرح ہی منوّر صاحب کے حلقۂ تلامذہ میں نسبتاً نو وارد ہیں۔ گوہر صاحب غزل و نظم دونوں اصناف میں مشقِ سخن فرماتے ہیں۔ راقم السطور صرف غزل کہتا ہے۔"[2]

" منوّر کے ایک کہنہ مشق شاگرد نرائن داس بھٹناگر طالب پانی پتی مرحوم غزل، نظم، قطعہ، مثنوی سبھی اصناف پر قادر تھے۔ ۱۹۳۶ء میں ان کی ایک مختصر تصنیف "کورو کھشیتر یاترا" شائع ہوئی تھی۔ جس میں شامل ان کی نظم "گیتا کا اپدیش" بہت مقبول ہوئی تھی۔ ازاں بعد ان کا کوئی شعری مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آسکا۔ ڈاکٹر ہینسن قربان کی بھی کئی تصانیف منظرِ عام پر آچکی ہیں ان میں شیکسپیئر کی کہانیاں، مثنوی داستانِ عجب، فکر حسین، اردو کے مسیحی شعرا اور شعری مجموعہ "صلیب کا درد" (مطبوعہ ۱۹۸۷ء) قابلِ ذکر ہیں۔ منوّر لکھنوی کے ایک اور شاگرد عزیز بلراج حیرت صاحب کے گیتوں کا ایک مجموعہ دیوناگری رسم الخط میں شائع ہو چکا ہے۔ ان کی غزلیات اور نظموں کا مجموعہ "از بر" ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔

اپنے دور کی جن مشہور ہستیوں کے ساتھ منوّر لکھنوی کے دوستانہ اور خصوصی مراسم رہے ہیں۔ ان کی ایک فہرست منوّر نے اپنی خودنوشت "داستان" میں درج کی ہے۔ جس کی نقل ذیل میں دی جارہی ہے۔ لیکن ان شخصیات کے ساتھ منوّر

---

[1] "منوّر کے تلامذہ" مقالہ از حکیم منظور (منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری مرتب راج نرائن راز ص ۲۶۹)

[2] ایضاً ص ۲۷۰

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

لکھنوی کے تعلقات کا تفصیلی جائزہ اگلے باب میں "ہم عصر ادیبوں کے ساتھ منوّر کے مراسم" کے زیرِ عنوان پیش کیا جائے گا۔
ذیل کی فہرست میں کچھ ادیبوں کے نام ہیں تو کچھ ادب نواز شخصیتوں کے بھی۔ اس فہرست کی پیشانی پر بطورِ عنوان لکھا ہے "میرے محسنانِ اعظم"

۱۔ میرے والد کے قدردانِ خاص لاہور کے رائے رام سرن داس
۲۔ " " " مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر مرحوم
۳۔ " " " رائے بہادر جسٹس کنور سین ماتھر
۴۔ " " " مسٹر بشن چند ماتھر لاہور
۵۔ " " " راجہ نرسنگھ راج حیدر آباد دکن
۶۔ جناب ممتاز حسن گورنر نیشنل بنک آف پاکستان کراچی
۷۔ نواب مہدی نواز جنگ بہادر گورنر صوبہ گجرات
۸۔ مرحوم مسٹر چمن لال ودیارتھی ریٹائرڈ اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل ریلوے
۹۔ مرحوم جناب زاہد حسین، سابق چیف آڈیٹر ریلوے کلیرنگ اکاؤنٹس (بعدازاں گورنر نیشنل بنک آف پاکستان)
۱۰۔ مرحوم ہزایکسیلنسی غلام محمدؐ (سابق کارکن ریلوے آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس/ بعد میں پاکستان کے گورنر جنرل ہو گئے)
۱۱۔ ڈاکٹر گوکل چند نارنگ بار ایٹ لا، سابق وزیرِ پنجاب
۱۲۔ شری کیلاش چند پارلیمنٹری سیکریٹری، حکومتِ ہند دہلی
۱۳۔ جناب آل احمد سرور سیکریٹری انجمن ترقیِ اردو ہند، علی گڑھ
۱۴۔ برادرِ معظم جناب ڈاکٹر لکشمی سہائے سکسینہ
۱۵۔ مرحوم پروفیسر کے سی رائے سکسینہ پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن
۱۶۔ مرحوم پروفیسر اقبال بہادر
۱۷۔ برادرِ معظم مرحوم جناب کامتا پرشاد ریٹائرڈ انسپکٹر ریلوے اکاؤنٹس
۱۸۔ مرحوم منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر "زمانہ" کانپور
۱۹۔ مرحوم ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ایم اے پی ایچ ڈی، ڈی لٹ
۲۰۔ مرحوم رائے بہادر پراگ نرائن بھارگو مالک نول کشور پریس لکھنؤ
۲۱۔ مرحوم مسٹر مکٹ بہاری لال بھارگو، سابق مینیجر اودھ اخبار لکھنؤ
۲۲۔ مرحوم علامہ برجموہن دتاتریہ کیفی
۲۳۔ بہن بیگم حمیدہ سلطان سیکرٹری انجمن ترقیِ اردو۔ دہلی
۲۴۔ فدائے اردو پنڈت سندر لال صدر انجمن ترقیِ اردو، شاخ دہلی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

۲۵۔ مرحوم ڈاکٹر سچدانند سنہا۔ بار ایٹ لا، صدر آئین ساز اسمبلی

۲۶۔ مرحوم مسز سروجنی نائیڈو

۲۷۔ مرحوم ڈاکٹر بھگوانداس آف بنارس

۲۸۔ مرحوم جناب رفیع احمد قدوائی، وزیر مرکزی حکومت دہلی

۲۹۔ مرحوم سر کیلاش ناتھ ہکسر، وزیر مالیات گوالیار

۳۰۔ جناب شبیر حسین خاں جوش ملیح آبادی (حال وارد پاکستان)

۳۱۔ جناب ابوالفصاحت پنڈت لبھورام جوش ملسیانی

۳۲۔ حضرت عرش ملسیانی ایڈیٹر "آجکل" دہلی

۳۳۔ ڈاکٹر امیر حسن عابدی، صدر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی

۳۴۔ پروفیسر یوگ دھیان آہوجہ، دہلی یونیورسٹی

۳۵۔ پروفیسر بھگوت سروپ ماتھر "

۳۶۔ ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی۔ سابق صدر شعبۂ فارسی و اردو لکھنؤ یورسٹی۔

۳۷۔ مسٹر کالی چرن ماتھر۔ انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس، دہلی

۳۸۔ جناب حفیظ احمد (حکومت پاکستان)

۳۹۔ مرحوم جانکی پرشاد صاحب او۔ آر ریلوے لکھنؤ

۴۰۔ ڈاکٹر گنگارام مرحوم (لکھنؤ)

۴۱۔ حکیم عبدالرشید مرحوم (لکھنؤ)

۴۲۔ حکیم عبدالحمید مرحوم (لکھنؤ)

۴۳۔ ڈاکٹر روپ کشور ٹنڈن مرحوم (لکھنؤ)[۱]

مالک رام اپنی تالیف "تذکرۂ معاصرین" میں منور لکھنوی کے آخری ایام کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"ان کی صحت بہت دنوں سے خراب رہنے لگی تھی۔ ہچکیوں (فواق) کا عارضہ تھا۔ ذیابیطس کی شکایت بھی ایک زمانے سے تھی جس نے جسم کو گھلا دیا تھا۔ آخری ایام میں بینائی بھی بہت کمزور ہو گئی تھی۔ ان سب عوارض کے باوجود یہ گمان تک نہ تھا کہ انجام اتنا قریب آگیا ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں کسی مجلس میں نظر آجاتے تھے۔ درحقیقت انھیں کوئی خاص شکایت بھی نہیں تھی۔ بس ۲۴ مئی صبح پونے سات بجے اسی خاموشی سے جو ان کے مزاج کی افتاد تھی، ابدی سفر پر روانہ ہو گئے۔"[۲]

"انگریزی روزنامہ ہندوستان ٹائمز نے اپنے ۲۵ مئی ۱۹۷۰ء کے ایڈیشن میں منور کی وفات حسرت آیات کی خبر دی جس

---

[۱] داستان (منور لکھنوی) قلمی مسودہ) [۲] تذکرہ معاصرین (مالک رام) ایڈیشن ۱۹۷۲ء صفحہ ۲۱۱۔۲۱۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

Urdu poet dead

Hindustan Times Correspondent

New Delhi, May 2[illegible] — Mr Bisheswar Prasad Munnawar Lucknavi, well-known Urdu poet, died this afternoon after a prolonged illness. He was 73.

Munnawar belonged to a family of Urdu poets in Lucknow and used the force of Urdu poetry as an instrument for national integration. His father, Dwarka Prasad 'Ufq', started the tradition of rendering Hindu scriptures in enchanting Urdu. Munnawar, who settled in Delhi 30 years ago,

carried this tradition with fervour much in the manner of the great Sufi poet Malik Mohammed Jayasi in the 16th century.

کی عکسی تصویر ذیل میں دی گئی ہے۔

مختلف ادبی جرائد نے منوّر لکھنوی کی وفات پر ادارتی نوٹ لکھے اور نوحے شائع کیے۔ ماہنامہ "جاں نثار" امرتسر نے "آہ منوّر لکھنوی" کے زیرِ عنوان اپنے اداریہ میں لکھا :۔

"آسمانِ ادب کا ایک اور درخشندہ ستارہ ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔ حضرت علامہ منشی بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی طویل علالت کے بعد رحلت فرما گئے۔ ع خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

...... بعض حضرات اردو پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس کے ادب میں ہندو کلچر نہیں ہے اُن کو منوّر صاحب کی منظومات کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ منوّر صاحب نے ہندو کلچر کے سلسلے میں اتنا منظوم لٹریچر ہماری زبان کو دیا ہے کہ اُن کی ادبی خدمات کو ہم فراموش نہیں کر سکتے...... منوّر صاحب نے ہمارے قدیم فکر و فن کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اردو فن پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ آپ کے شاگردوں کا حلقہ بیخود دہلوی مرحوم کی طرح کافی وسیع تھا..... منوّر صاحب کی وفات سے اردو ادب کا ایک اور ستون گر گیا۔ اب منوّر صاحب جیسے انسان صدیوں کے اُلٹ پھیر کے بعد بھارت میں پیدا ہوں گے۔[۱]

جناب چرخ چینوٹی نے قطعہ تعزیت میں کہا

جس کے انوار سے درخشاں تھی — محفل علم و کائناتِ ادب

ہائے داغِ مفارقت دے کر — وہ منوّر کہاں گیا یارب[۱]

اکمل جالندھری نے رباعی میں یوں اظہارِ ماتم کیا :۔

دُنیائے ادب کا وہ مدبّر نہ رہا — یعنی صدفِ علم کا گوہر نہ رہا!

دنیائے سخن میں تھا اُجالا جس سے — افسوس وہ خورشیدِ منوّر نہ رہا[۲]

راقم السطور کا اُستادِ مکرّم کے سوگ میں کہا ہوا یہ نوحہ متعدد رسائل و جرائد میں شائع ہوا۔

دلدادگانِ شعرِ منوّر اُداس ہیں — بزمِ سخن میں آج منوّر نہیں رہا

اقلیمِ فکر و فن کی یتامت پہ رویئے — اقلیمِ فکر و فن کا سکندر نہیں رہا

---

[۱] ماہنامہ جاں نثار امرتسر، شمارہ جولائی ۱۹۷۶ء، صفحہ ۸-۹ (اداریہ)

[۲] ایضاً صفحہ ۱۸

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE 2025-Grant

Gandhi Memorial College
SRINAGAR
Acc. No: 35355
Dated:
Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تخلیق و ترجمہ کی نفاست میں بے گماں — فیضیؔ کا تھا جو ہند میں ہمسر نہیں رہا
گہرائیوں سے دل کی اگلتا تھا جو رتن — وہ فکر و فلسفہ کا سمندر نہیں رہا
خونِ جگر ٹپکتا تھا، جس کے کلام سے[1] — وہ زندگی شناس سخنور نہیں رہا
جس کا ہر اک خیال تھا الہام سربسر — دنیائے شعر کا وہ پیمبر نہیں رہا
جو "خود نمائیوں" سے گریزاں رہا مدام[2] — وہ عجز و انکسار کا پیکر نہیں رہا
ارباب دل کو دے کے گیا "کائناتِ دل"[3] — گو خود شریکِ بزم وہ دلبر نہیں رہا
وہ کشورِ اُفق کا ولی عہدِ ذی وقار — باغِ نظر کا آج نظر ور نہیں رہا
رشتہ تھا جس سے روح کا اکیس سال سے[4] — وہ مردِ باکمال وہ رہبر نہیں رہا

گرتا رہوں گا پھر بھی شبابِ اکتسابِ نور
ہر چند اب جہاں میں منوّر نہیں رہا[5]

بخشی اختر امرتسری نے منوّر کی رحلت کی تاریخ گوئی ان الفاظ میں کی:-

آج غمگین کیوں ہے بزمِ سخن — غم کا اُمڈا ہوا سمندر ہے
ہاتفِ غیب نے کہا اختر — "ہائے ہائے غمِ منوّر ہے"[6]
(تاریخ۔ ۱۳۸۹ھ ہجری)

منوّر لکھنوی کے ایک اور نیاز مند شاگرد باوا کرشن گوپال مغمومؔ نے منوّر کا طویل نوحہ کہا جو اُن کی کتاب "بزمِ ماتم" میں شامل ہے۔[7] اس نوحہ کے کچھ بند درج ذیل ہیں:-

---

[1] مرے کلام سے خونِ جگر ٹپکتا ہے — قبولِ عام کی پھر بھی سند نہیں ملتی (مجموعہ نظمیات "کائناتِ دل" منوّر لکھنوی) صفحہ ۵۴

[2] بھلائی نہ آئی بُرائی نہ آئی — خودی سامنے بن کے آئینہ آئی
کہاں کامیابی کہاں یہ زمانہ — منوّر تجھے خود نمائی نہ آئی
} منوّر لکھنوی کی تصویر کے نیچے درج اشعار

[3] منوّر لکھنوی کا پہلا مجموعۂ نظمیات "کائناتِ دل" مطبوعہ ۱۹۳۹ء

[4] راقم السطور آستانۂ منوّر سے ۱۹۴۹ء سے وابستہ تھا۔ منوّر کی وفات (۱۹۷۰ء) تک یہ روحانی رشتہ اکیس ۲۱ برس تک قائم رہا۔ بلکہ ان کی وفات کے بعد بھی قائم ہے۔

[5] منزل منزل (شعری مجموعہ: شباب للت) صفحہ ۱۴۳-۱۴۴ نظم بعنوان نذرِ منوّر / ماہنامہ حقیقت بیانی دلی۔ شمارہ اکتوبر ۱۹۷۰ء

[6] [illegible]

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

غمِ رحلت ہے آج اُس شاعرِ دلولش سیرت کا — نمونہ تھا جو تسلیم و رضا، صبر و قناعت کا
علمبردار تھا دلّی میں بھی جو لکھنویت کا — جو تھا بے مثل پیکر اُنس و تہذیب و شرافت کا

کہاں پائیں گے اب انساں منوّرؔ لکھنوی جیسا
کہاں ہے بندۂ ایماں منوّرؔ لکھنوی جیسا

اب وجد جس کے علم و فضل میں ممتاز تھے کیا کیا — عروسِ شاعری کے عاشقِ جانباز تھے کیا کیا
سبھی دلدادگانِ بادۂ شیراز تھے کیا کیا — ہر اک صنفِ سخن کے آشنائے راز تھے کیا کیا

منوّرؔ نے روایت تازہ کی اپنے گھرانے کی
بڑھائی قدر و قیمت اور اردو کے خزانے کی

زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دلّی آشکارا ہے — تخیّل کارفرما، فکرِ دلکش جلوہ آرا ہے
نظر افروز ہے نقشِ ادب جو بھی اُبھارا ہے — بہت دلچسپ ہے رنگین ہے جو بھی نظارا ہے

چھلکتی ہے یہاں ہر شعر سے پاکیزگی دل کی
یہی سرمایۂ شعر و سخن ہے جانِ محفل کی

ادب کے شاہکاروں کے تراجم کی وہ کثرت ہے — ہر اک معروف ادیب و اہلِ فن تصویرِ حیرت ہے
کہیں ٹیگور کے نغمات کا سازِ لطافت ہے — کہیں افکارِ کالی داس کا عکسِ بلاغت ہے

کہیں دانشورانِ یورپ کی ترجمانی ہے
کہیں مشہورِ عالم شاعروں کی ترزبانی ہے [1]

یہاں محض چند نوحوں کے اقتباس ہی دیئے گئے ہیں، چہ جائیکہ ملک بھر کے ادبی رسائل اور ممتاز ادیبوں نے اس عظیم فنکار کے انتقال پر اظہارِ تعزیت و تاسّف کیا۔ لیکن منوّرؔ لکھنوی اپنی تصانیف، تالیفات اور تراجم میں زندہ رہیں گے۔ خود منوّرؔ کا عقیدۂ حیاتِ اَبدی اُس کی غزل کے اس شعر میں منعکس ہے:

مری ہستی نہیں محدود ہرگز چند لمحوں تک — ازل سے تا اَبد جاری رہے گا سلسلا میرا

---

[1] بزمِ ماتم (نوحوں کا مجموعہ) از بادا کرشن گوپال مغموم، مطبوعہ دسمبر ۱۹۸۱ء صفحہ ۹۹ تا ۱۰۱۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE,2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

باب دوم

منوّر لکھنوی کا زمانہ

- منوّر لکھنوی کا زمانہ (۱۸۹۷ء تا ۱۹۷۰ء)
- اُس دور کی اہم ادبی سماجی اور سیاسی تحریکات اور منوّر کی اُن سے وابستگی
- اُس دور کے اہم شعراو ادبا سے اُن کے مراسم
- منوّر لکھنوی بحیثیت انسان اور شاعر

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منوّر لکھنوی کا زمانہ

منوّر نے جس ماحول میں آنکھ کھولی، وہ انیسویں صدی کے اختتام کا جاگیردارانہ ماحول تھا، جس میں ایک طرف انتہائی عسرت و افلاس کی ماری اکثریت اور دوسری جانب مغلیہ دور کی انحطاط پذیر سماجی قدروں کو سنبھالے ہوئے رئیسانہ شان و شوکت سے عمر گزارنے والی اقلیت ایک ساتھ سانس لے رہی تھی۔ ہر چند کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کو چالیس سال بیت چکے تھے اور صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ (موجودہ اتر پردیش) کی حکومت براہ راست انگریزوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو چکی تھی۔ لیکن اودھ میں گزرے ہوئے نوابی عہد کے تہذیبی نقوش اور بچی کھچی قدریں ابھی نظر سے اوجھل نہیں ہوئی تھیں۔

ادھر ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے بعد ہندوستان کی سیاست میں بھی اہم تبدیلیاں رونما ہو چکی تھی۔ منوّر کے سن بلوغت تک پہنچتے پہنچتے آزادی وطن کا جذبہ اور فرنگی راج کا طوق گلے سے اتار پھینکنے کی امنگ ہندوستانی عوام کے دلوں میں کروٹ لے رہے تھے۔ کانگریس کے مطالبات اگرچہ ابھی ہوم رول تک محدود تھے، تاہم لوکمانیہ تلک اور لالہ لاجپت رائے جیسے روشن ستارے ہندوستان کے سیاسی اُفق پر طلوع ہو چکے تھے ان کی جوشیلی قیادت کا سحر عوام کے دلوں کو اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔ لیکن جمہوریت کے حصول کا تصوّر ابھی دیوانے کا خواب تھا۔ اُدھر منوّر لکھنوی کی شعر گوئی سن بلوغت تک پہونچی اور اِدھر خطۂ ارضی کو روس کے انقلاب اور اشتراکیت کے پیغام نے آلیا۔

اِدھر ہندوستانی سماج پر آربندو، راجہ رام موہن رائے، سوامی وویکانند، سوامی دیانند اور سر سیّد احمد خاں کی اصلاحی تحریکوں کے اثرات واضح طور پر دکھائی دینے لگے تھے۔ ہندوستانی سیاست کے ساتھ ساتھ معاشرے کے نظام میں بھی آنے والے انقلاب کی چاپ سنائی دینے لگی تھی۔ بیواؤں کی شادی، چھوت چھات کے خاتمہ، زمینداروں کے مظالم کے خلاف کسانوں کی بیداری اور احتجاج کی داغ بیل دلوں میں پڑنی شروع ہو گئی تھی، اونچی ذاتوں کی برتری اور سماجی غلبے کے خلاف بغاوت کی ایک زیریں لہر سماج کے اندر ہلچل پیدا کر رہی تھی۔ بنگالی ادب میں بنکم چندر چٹرجی اور رابندر ناتھ ٹیگور اس ذہنی انقلاب اور اصلاحی تحریک کی قیادت کر رہے تھے تو اردو میں پریم چند اور سدرشن اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh. Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

آنے والی سماجی تبدیلیوں کو قبول کرنے کے لیے رائے عامہ کو بیدار و استوار کر رہے تھے۔ تعلیم نسواں اور انگریزی تعلیم کی مقبولیت کی طرف عوام کا رجحان تقویت پا رہا تھا۔

اردو کے ادبی ماحول میں بھی اہم تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ الطاف حسین حالیؔ، محمد حسین آزادؔ سر سید احمد خاں، اور اکبر الہ آبادی کاروانِ اردو کو روایتی موضوعات کے خارزاروں، اور گل و بلبل کے راز و نیاز کے بیاباں سے نکال کر کشاں کشاں حقیقتوں کے خیابانوں کی طرف موڑ رہے تھے۔ درگا سہائے سرور جہان آبادی ملک الشعرا ردوار کا پرشاد افقؔ لکھنوی برج نرائن چکبست، نوبت رائے نظرؔ، محمد اسمعیل میرٹھی جیسے نظم گو شعرا کی دھاک اُن دنوں اردو دنیا میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر اقبال کی آواز دنیائے اردو میں سب سے زیادہ نمایاں ہو کر اُبھر رہی تھی۔ سبھی اصنافِ ادب میں موضوعات تیزی سے بدل رہے تھے۔ حالیؔ کے زیرِ اثر نیچرل شاعری مناظرِ فطرت کی عکاسی، حالاتِ حاضرہ کا جائزہ، وطن پرستی اور قومی آزادی کے تصورات نظم و نثر میں نمایاں تر ہو چکے تھے۔ سوشل نظمیں، تاریخی اور مذہبی نظمیں، اخلاقی اور فلسفیانہ نظمیں بکثرت لکھی جانے لگی تھیں۔ اس سلسلے میں اقبال کے فلسفۂ خودی اور مردِ مومن کے تصور کا اُن کی شاعری کے کلیدی عنصر کے روپ میں اُبھرنا، چکبست کی رامائن سے متعلق نظمیں، سرور جہاں آبادی کی نظم "پدمنی"، افقؔ لکھنوی کی رامائن یک قافیہ، استری دھرم، محرم، تاریخِ امام باڑہ، گورو گوبند سنگھ اور بھیشم پتامہ کے منظوم سوانح حیات، حالی کی مثنوی "برکھا رُت" "مناظرۂ رحم و انصاف" اور حبِ وطن نیز مسدس حالی، اکبر الہ آبادی کی اصلاحی نظمیں اور طنزیات مقصدی شاعری کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ میں یہ عہد علی گڑھ تحریک کا زمانہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

انگریزی ادب سے ترجموں کا رواج بھی ان دنوں فروغ پا رہا تھا۔ سرور جہاں آبادی کی اگرچہ انگریزی بہت محدود تھی پھر بھی انہوں نے جس قدر ترجمے انگریزی نظموں سے کیے وہ بالکل اصل معلوم ہوتے ہیں بعض نظموں میں انہوں نے محض انگریزی عنوان لے لیے اور اُن پر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ مثلاً مرغابی، کوئل، موسمِ سرما کا آخری گلاب۔ بچہ اور ہلال وغیرہ اس قسم کی نہایت دلکش اور دلچسپ نظمیں ہیں[1]۔ اسی طرح ہندی فارسی اور سنسکرت کی تصانیف کے ترجمے بھی بکثرت شائع ہونے لگے تھے۔ منشی نول کشور کے مطبعِ نولکشور لکھنؤ نے اردو میں تراجم کو خوب فروغ دیا تھا۔

منورؔ لکھنوی کے والد جناب افقؔ لکھنوی نے بھی رامائن، مہابھارت، مہادیو چالیسا، جانکی چرتر اور الف لیلیٰ

---

[1] تاریخ نظم و نثر اردو (آغا محمد باقر) ایڈیشن نامعلوم ص ۲۴۴ (آزاد بھارت میں طبع اوّل) ناشر آزاد بک ڈپو امرتسر (اصل کتاب شیخ مبارک علی اینڈ سنز لاہور کی ۱۹۳۳ء میں طبع)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

وغیرہ کے کامیاب ترجمے کیے تھے۔ شریمد بھگوت گیتا کے بھی اردو تراجم خاصی تعداد میں شائع ہو چکے تھے۔ غالب نے فرمایا تھا کہ ؎ "سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے"

منوّر کو اس کے برعکس اس بات پر ناز و اطمینان تھا کہ ؎

شاعری سے نہ منوّر کو ہو کیونکر رغبت — پانچ پشتوں سے یہی شوق چلا آتا ہے

گھر کے ادبی ماحول کا اور اپنے عہد کی اہم سماجی اور سیاسی تحریکات کا منوّر کے ذہن پر اثر انداز ہونا ناگزیر تھا۔ پشتینی اور موروثی افکار و عقائد اور حالاتِ گرد و پیش دونوں ہی انسان کے ذہنی رویّوں کو مرتب کرتے ہیں۔ نتیجتاً منوّر نے بھی مذہبی، قومی، اخلاقی، معاشرتی جمالیاتی اور روحانی موضوعات کو اپنا تخلیقی آدرش بنایا اور سب سے زیادہ ترجمے کے میدان میں اپنے جوہرِ طبع دکھائے۔ نیز غزل کی صنف میں بھی روایتی مضامین، قدیم اصطلاحات و علائم کو بالائے طاق رکھ کر مقابلتاً جدید اور جداگانہ مضامین اور علائم کو اپنایا۔ اس کی منتخب مثالیں اگلے ابواب میں زیرِ بحث آئیں گی جہاں ہم منوّر کی نظمیہ شاعری اور غزل گوئی وغیرہ کا مفصل تنقیدی جائزہ لینگے۔

کسی بھی ملک میں کوئی تحریک تب تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک وہاں کے اہلِ قلم اس کا ساتھ نہ دیں۔ تحریکِ آزادی کا زمانہ برِّصغیر ہند کے باشندوں کی زندگی کا اہم ترین باب تھا جو زندگی کی تمام حرکات و سکنات پر اثر انداز ہوا۔ اس تحریک کا اظہار ہمارے فنکاروں کے شہ پاروں میں اور ہمارے یہاں کی شاعری میں ہونا ایک فطری امر تھا۔ شاہ حاتم سے لے کر میر تقی میر تک ابتدائی دور کے شعراء نے شہر آشوب لکھ کر ظلم کے خلاف احتجاج کرنے اور رائے عامہ کو بیدار کرنے کی سعی کی۔ ۱۸۵۷ء کی اوّلین جنگِ آزادی جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا، ہمارے اردو شاعروں کا موضوع بنی رہی۔ بہادر شاہ ظفر کا "نوحۂ غم" غالب کی نظم "داغِ ہجراں"، ظہیر دہلوی کی "مرثیۂ دہلی" آزردہ کی فغانِ دلّی، داغ کی مرثیۂ دہلی، فلک میرٹھی کا مرثیۂ سوز، اور الطاف حسین حالی کی نظم "دلی مرحوم" اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ حالی اپنی نظم "حُبِ وطن" میں فرماتے ہیں

اے وطن! اے مرے بہشتِ بریں! — کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں
تیری اک مشتِ خاک کے بدلے — لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے!
جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا — کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا
مُلک روندے گئے ہیں پیروں سے — چین کس کو ملا ہے غیروں سے
چھوڑو افسردگی کو جوش میں آؤ — بس بہت سوئے، اٹھو ہوش میں آؤ

۱۹۱۴ء کی پہلی جنگِ عظیم کے اثرات سے ثابت ہوا کہ ہماری تحریکِ آزادی کو اس سے نئی راہیں

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ملیں۔ مولانا شبلی، اقبالؔ، احسان دانش، جوشؔ ملیح آبادی، رام پرشاد بسملؔ، شورش کاشمیری، آنند نرائن مُلّا، محرومؔ، چکبستؔ، میلا رام وفاؔ، مولانا محمد علی جوہرؔ، حسرتؔ موہانی وغیرہ اُس زمانے کے اہم شعرا تھے جنھوں نے تحریکِ آزادی کے مختلف واقعات وسانحات پر نظمیں تخلیق کیں۔ سرزمین لکھنؤ کے دو عظیم سپوتوں گوپی ناتھ امنؔ اور بشیشور پرشاد منورؔ نے بھی تحریکِ آزادی کے ساتھ وابستہ رہ کر اپنے ہم وطنوں کے دیش بھگتی اور قومی یک جہتی کے جذبے کو مہمیز لگانے والی بے شمار نظمیں سپردِ قلم کیں۔

لیکن یہ حیرت کی بات ہے کہ قومی آزادی کی تحریک اور سیکولرازم کے فروغ کے سلسلے میں جتنے مقالے اور مضامین لکھے اور شائع کرائے جاتے ہیں، ان میں ہمارے ناقد اور مقالہ نگار منورؔ لکھنوی جیسے اہم شاعر کے نام، کام اور مقام کو ہمیشہ نظر انداز کرتے ہیں۔ یا تو یہ لوگ تحقیق کی زحمت گوارا نہیں کرتے یا اس رویے کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آج منورؔ لکھنوی کی وفات کے چوبیس برس بعد اُن کی کتابیں مارکیٹ میں آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں اور لائبریریوں سے استفادہ کرنے سے عموماً جی چرایا جاتا ہے۔ منورؔ کے عہد کے اخبارات ورسائل کو کھنگالا جائے تو ایسی بیسیوں نظمیں زیرِ مطالعہ آئیں گی جو منورؔ لکھنوی نے قومی اتحاد اور تحریکِ آزادی کے سلسلے میں سپردِ قلم کیں اور معاصر رسائل میں گاہے بگاہے شائع ہوتی رہیں۔

درحقیقت وہ پہلی جنگِ عظیم ہی کا زمانہ تھا جب منورؔ عنفوانِ شباب میں تھے اور اُن کا خون بھی فرنگی حکمرانوں کے مظالم کے خلاف کھولتا تھا۔ اس جنگ کی ابتدا ہوئی تو منورؔ کی شاعری کی عمر ابھی چار سال کی تھی کیوں کہ منورؔ نے سنہ ۱۹۰۹ء کے زمانے میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔ اپنی "داستان" میں منورؔ رقم طراز ہیں:-

"سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ میں برابر قومی تحریکوں میں بھی حصّہ لیتا رہا۔ لکھنؤ کے تمام قومی جلسوں میں میرے تصنیف کردہ قومی گیت گائے جایا کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں ریلوے ملازمین کی ایک بہت بڑی ہڑتال او۔ آر۔ ریلوے میں ہوئی۔ میں بھی اسٹرائک کے لیڈروں میں تھا..... لیکن میں اسٹرائک میں حصّہ لینے کے باوجود اپنے ایک مہربان اکاؤنٹنٹ جگت نرائن نگم کی بدولت بچ گیا۔ ورنہ میرے دوسرے ساتھی یا تو برخاست کر دیئے گئے یا ان کو کچھ نہ کچھ سزا ضرور دی گئی۔"[1]

سنہ ۱۹۱۶ء میں انڈین کانگریس کا ایک اہم اجلاس لکھنؤ میں ہوا۔ گاندھی جی پیدل چرچ مشن اسکول کی طرف جا رہے تھے جہاں انھیں ہیومینی ٹرین لیگ HUMANITARIAN LEAGUE کے جلسے میں شمولیت کرنی تھی۔ لاٹوش روڈ پر اتفاق سے انھوں نے منورؔ سے راستہ دریافت کیا۔ منورؔ لکھتے ہیں۔

۱؎ منورؔ لکھنوی شخصیت اور شاعری (مرتب راج نرائن رازؔ) صفحہ ۲۲۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

"اُس وقت مجھے ہندوستان کے اس عظیم ترین رہنما کے درشنوں سے کس قدر مسرّت ہوئی ہوگی اس کا احساس میں ہی کر سکتا ہوں۔ اور پھر جب مجھے وہ فخر وانبساط کے لمحے یاد آتے ہیں جب میں گاندھی جی کو ہیومینی ٹیرین لیگ کا رستہ بتا رہا تھا تو میری عجیب کیفیت ہو جاتی ہے۔ گاندھی جی بالک کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے کہ اتنے میں سامنے سے ایک بگھی پر سوار مالوی جی آرہے تھے۔ انہوں نے گاندھی جی کو دیکھ لیا اور اُن سے کہا کہ وہ کانفرنس میں پیدل نہ جائیں۔ ان کی بگھی پر چلے جائیں۔ مگر گاندھی جی نے انکار کر دیا اور کہا کہ نہیں میں پیدل ہی جانا چاہتا ہوں"۔[1]

یکم اگست ۱۹۲۰ء کو مہاتما تلک کی وفات سے سارے بھارت میں تہلکہ سا مچ گیا۔ لکھنؤ میں پنڈت آنند نرائن ملّا کے والد ماجد پنڈت جگت نرائن ملّا کی قیادت میں ایک ماتمی جلوس نکلا۔ منوّر کے دفتر کے ساتھی بالمکند باجپئی قومی کارکن تھے۔ اُن کے اصرار پر منوّر نے آٹھ دس ہزار کے مجمع میں لوکمانیہ تلک کا نوحہ پڑھا۔ مرزا یاس یگانہ چنگیزی نے جو اُن دنوں نوبت رائے نظر کے ماتحت اودھ اخبار میں کام کرتے تھے۔ اس نوحے کو اودھ اخبار میں شائع کیا۔ دوسرے روز نوحے کی بڑی مانگ ہوئی۔ شہر میں اس کا بڑا چرچا رہا۔ منوّر لکھتے ہیں:۔

"لیکن نظر صاحب کو میرا نوحہ پڑھنا اور پھر اُس کا اودھ اخبار میں شائع ہونا ناگوار گزرا۔ وہ اُس زمانے میں بیمار تھے۔ مجھ سے کہا کہ کیا تم میری ملازمت کے پیچھے پڑے ہو؟ بہرحال نوحے کے سلسلے میں نہ کوئی کارروائی دفتر میں میرے خلاف نہ ہوئی۔ نہ حکومت کی طرف سے کوئی باز پُرس ضروری سمجھی گئی"۔[2]

۱۹۲۱ء میں گاندھی جی کی عدم تعاون کی تحریک کے سلسلے میں بدیشی کپڑے کی ہولی جلائی گئی تو منوّر نے بھی اپنے بدیشی کپڑے نذر آتش کر دیئے۔ اور اُس کے بعد سے کھدّر پہننا شروع کر دیا۔

۱۹۲۱ء کی اسی تحریک کے سلسلے میں منوّر کا چچازاد بھائی ڈاکٹر لکشمی سہائے جو رام سہائے تمنّا کا صاحبزادہ تھا گرفتار کر لیا تو منوّر لکھنوی اور اُن کے چھوٹے بھائی کشن پرشاد مقدّر دونوں ملازمت ترک کر کے جیل جانے کو آمادہ ہو گئے۔ نظر صاحب بھی اِس بات پر راضی ہو گئے تھے کہ اگر منوّر سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو گئے تو وہ انہیں اودھ اخبار کے اسٹاف میں لے لیں گے۔ پھر بھی نظر صاحب نے اپنے شاگرد کو ایسا قدم اٹھانے سے منع کیا۔ اور گرفتار شدہ بھائی لکشمی سہائے نے بھی اس اقدام کی حمایت نہیں کی۔ لہٰذا یہ خیال ترک کرنا پڑا۔

"داستان" کے قلمی مسوّدے میں ایک جگہ منوّر لکھتے ہیں

"میرے بنگالی ماسٹروں کو مجھ سے اس وجہ سے محبّت تھی کہ وہ تینوں خود وطن پرست اور سودیشی کے

---

[1] منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (راج نرائن راز) صفحہ ۲۵-۲۶ [2] منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (مرتب راج نرائن راز)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

حامی تھے۔اور یہی بھی کالستھ انسٹی چیوٹ لکھنؤ کے زیر اثر وطن پرستی کے جذبات سے مملو تھا۔مسٹر لوس مجھ سے اس وقت بے حد خوش ہوئے جب انہوں نے اُس زمانے کے گورنر جنرل اور وائسرائے ہند لارڈ منٹو کے جلوس کے موقع پر مجھے ولائتی شکر کے بسکٹ کھانے کو دیئے اور میں نے انہیں کھانے سے انکار کر دیا۔اس وقت سے ان ماسٹروں کی نگاہ میں اور بھی میں چڑھ گیا۔اور یہ سب ہر طرح سے میری حوصلہ افزائی کرنے لگے۔"[1]

منوّر کی نظموں کا پہلا ضخیم مجموعہ "کائناتِ دل" ہندوستان کی آزادی سے آٹھ برس پہلے شائع ہوا۔یہ دوسری جنگِ عظیم کے آغاز کا زمانہ تھا۔اس مجموعہ میں "تمام عمر خدایا وطن پرست رہوں" "وطن فروش سے خطاب" "مادرِ وطن کے قدموں پر" "ہندو مسلمانوں سے" "افراط و تفریط" "اچھوت اُدھار" "مہاتما گاندھی سے" "مہارانی لکشمی بائی کی چھتری" "حضرت اقبال مرحوم سے خطاب" "مولانا محمد علی کا ماتم" "آہ موتی لال نہرو" نظمیں قومی اور سماجی شاعری کی زرّیں مثالیں ہیں۔یہ سب تخلیقات حصولِ آزادی سے قبل کی ہیں۔ان میں سے بیشتر اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکی تھیں۔

مابعد کے منوّر کے مجموعہ نظمیات "سوزِ وطن" (غیر مطبوعہ) اور "شگفتہ عقیدے" میں بھی حب الوطنی سے لبریز بیسیوں تخلیقات موجود ہیں۔ان میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔اس ضمن میں "کون ہم" "پنڈت نہرو کے نام" "سردار پٹیل" "بریگیڈیر عثمان کی شہادت" "ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی" وغیرہ عنوانات کے تحت منوّر لکھنوی کی معرکتہ الآرا قومی نظمیں اس بات کا بیّن ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ منوّر اوّل تا آخر ایک محبِ وطن قومی شاعر تھے جنہوں نے ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں اپنے رشحاتِ قلم کے ذریعہ بڑھ چڑھ کر حصہ ڈالا۔منوّر کی قومی نظمیں ملک کے ممتاز ترین اخبارات و رسائل کی زینت بنتی رہیں اور وہ ۱۹۷۰ء یعنی اپنی رحلت کے سال تک برابر ان قومی نظموں کے ذریعہ قارئین اردو کے ذہن و دل تک رسائی حاصل کرتے رہے۔

آریہ سماج کی تحریک اُس کے بانی مہرشی دیانند سرسوتی کے سانحہ ارتحال کے بعد برصغیر ہند میں دن بدن مقبول ہو رہی تھی۔پریم چند، سدرشن اور دیگر ادیب اس اصلاحی تحریک سے متاثر ہو چکے تھے، اور ان کی تخلیقات پر اس کے واضح اثرات دکھائی دینے لگے تھے۔منوّر اگرچہ کٹّر سناتنی عقیدے کے مذہبی انسان تھے، پھر بھی آریہ سماج کے کچھ تبلیغی پروگراموں اور سدھانتوں سے وہ متفق بھی دکھائی دیتے تھے۔"کائناتِ دل" اور "سوزِ وطن" میں، "اچھوت اُدھار" "وصال نصیب رشی دیانند" "دنیوی فقیر" اور اسی قبیل کی دوسری نظمیں اس حقیقت کی غمازی کرتی ہیں۔آریہ سماج کرنال کے کچھ سربراہوں کی فرمائش پر انہوں نے مہرشی دیانند کی تعلیمات پر مشتمل "آریہ ابھی وِنے" کا منظوم ترجمہ بھی کیا تھا جو شائع

---

[1] داستان (منوّر لکھنوی۔ قلمی نسخہ) صفحہ ۱۷۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہو کر آریہ سماجی حلقوں میں مقبول ہوا۔

لیکن اپنے گہرے اور کٹر مذہبی اعتقادات کے باوجود منوّر لکھنوی کو سیکولرازم اور مذہبی وسیع القلبی کی جو قدریں اپنے شہر مالوف لکھنؤ کے رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی سے لبریز ماحول سے، نیز اپنے اسلاف سے ورثہ میں عطا ہوئی تھیں اُن قدروں کو انھوں نے زندگی بھر عزیز رکھا۔ قرآنِ پاک اور انجیلِ مقدس کی توقیر و تکریم اور پھر اُن کی تعلیمات کو اُردو کا جامہ پہنانا، بانیٔ اسلام اور اُن کی آل اولاد کی توصیف میں منوّر کی لکھی ہوئی منقبتیں اس امر کی تائید و توثیق کرتی ہیں کہ وہ ایک آدرش انسان اور صدقِ دل سے سیکولر اندازِ فکر رکھنے والے وسیع النظر اور عالی ظرف شاعر تھے جو اپنی تخلیقی کاوشوں کے ذریعے تازندگی سیکولر قدروں کو تقویت دینے اور سیکولرازم تحریک کی عملی طور پر اعانت و استقامت کے لیے کوشاں رہے۔

اسی دوران معرّیٰ اور آزاد نظم نگاری کا دور شروع ہوا۔ بعض دانشوروں نے محسوس کیا کہ وزن اور قافیہ کی قید اُدائے مطلب میں خلل انداز ہوتی ہے۔ اگرچہ مقفّٰے شاعری کو پڑھنے میں زبان رُوانی کی لذّت پاتی ہے لیکن شعرائے عجم نے قافیہ اور ردیف کی جکڑ بند میں شاعر کو اس قدر کس کر رکھ دیا ہے کہ یہ پابندیاں شاعر کو اُس کے فرائض کی اَدائیگی سے باز رکھتی ہیں اور اصل خیال کا علو و حُسن ان پابندیوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں غیر مقفّٰے اور معرّیٰ نظمیں لکھی جانے لگیں۔ ن۔م راشد اور میراجی نے اس صنف کو پروان چڑھانے میں بڑا کام کیا اور شعرا کی نئی نسل کو اس تحریک اور صنفِ ادب نے کافی متاثر کیا۔ مختار صدیقی، قیوم نظر، مخمور جالندھری، کمال احمد صدیقی، سلام مچھلی شہری، فیض، ساحر لدھیانوی، سردار جعفری وغیرہ نے اس صنف میں کئی تجربے کیے۔ لیکن منوّر کے سارے کلام میں (ماسوائے چند منظوم ترجموں کے) معرّیٰ اور غیر مقفّٰی نظم کہیں نظر نہیں آتی۔ ایک دو سنسکرت ڈراموں کے منظوم ترجموں میں منوّر نے بہت محدود تناسب میں نظم معرّیٰ کو برتا ہے۔ تاہم ان مثالوں میں بھی رُوانی، موسیقیت، وزن اور بحر کا دامن کہیں بھی ان کے ہاتھوں سے نہیں چھوٹا۔

" ادب میں ترقی پسندی کے عناصر" اگرچہ بقول پروفیسر آل احمد سرور " غدر کے بعد ہی سے نمایاں ہو گئے تھے لیکن حالی کے زمانے سے ساری فضائے ادب ان رجحانات سے متاثر

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہوئی۔ پریم چند اور جوش ملیح آبادی نے اس روایت کو آگے بڑھایا اور یہ تحریک باقاعدہ طور پر ۱۹۳۵ء میں معرضِ وجود میں آئی۔[1]

لیکن یہ تحریک رفتہ رفتہ ایک تبلیغی تحریک بن کر رہ گئی۔ اس میں اُدب پر کم اور ترقی پسندی پر زیادہ زور رہا۔ اگرچہ اس نے معاشرتی اور سیاسی نظام میں تبدیلیاں لانے کی اُمنگ پیدا کر کے ذہنوں پر کچھ مثبت اثرات بھی مرتب کیے۔ تاہم بقول آل احمد سرور:۔

"شروع میں اس نے بڑی رعونت سے کام لیا۔ اس نے ماضی کی بعض مفید قدروں سے انکار کر کے اپنی تحریک کو نقصان پہنچایا ...... اس نے مارکس کو ادیب بھی ثابت کرنا چاہا۔ اس نے اقبال کی مذہبیت سے چڑ کر اور مسولینی وغیرہ کی شخصیتوں کی تعریف سے دھوکا کھاکر (حالانکہ برنارڈ شاہ نے بھی کئی دفعہ ہٹلر کی تعریف کی) اقبال کی شاعری میں ترقی پسند بلکہ انقلابی خیالات کو نظر انداز کر دیا۔ ذوقِ یقین کی اصطلاح میں اسے عقیدے کا پرتو نظر آیا۔"[2]

سرور مزید فرماتے ہیں:۔

"ادب کو خالص ادب اور جمالیاتی اور ماورائی چکّر سے نکالنا ضروری تھا، مگر اس میں مشرق سے زیادہ مغرب، ہندوستان سے زیادہ رُوس اور اُردو سے زیادہ انگریزی جلوہ گر تھی۔"[3]

یہ حقیقت ہے کہ اس تحریک نے ہر مزدور کو ہیرو اور ہر کسان کو فرشتہ ثابت کرنا چاہا۔ اقبال کو فاشسٹ قرار دیا اور اس بات پر زور دیا کہ ٹیگور اور اقبال کی شاعری بیماروں کی طرح زندگی سے گُریز کرتی ہے۔"

حصولِ آزادی کے بعد ہمارے ملک کے اُدب میں ترقی پسند تحریک کے رول کی اہمیت بتدریج کم ہوتی گئی اور ہند کے دانش وروں کے مزاج کے ساتھ اس کی مطابقت، مناسبت، معقولیت اور ہم آہنگی کا کوئی جواز نہ رہا۔ ردِ عمل کے طور پر اس تحریک کی مخالفت میں آوازیں اُٹھنی شروع ہوئیں۔ کیونکہ لوگوں کو اب ترقی پسند تحریک اور اشتراکیت (کمیونزم) کے پرچار میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔

---

[1] تنقید کیا ہے (پروفیسر آل احمد سرور) مطبوعہ ۱۹۴۷ء۔ صفحہ ۱۴۱
[2] 〃 〃 〃 〃 ۱۴۷
[3] 〃 〃 〃 〃 ۱۴۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

گوپال متّل صاحب کی ایک تالیف "آزادی کا ادب" میں ترقی پسند تحریک اور اس کے پیروکاروں سے متعلق اُردو کے مقتدر اور کبیر اُدبا کی آرا یک جا کی گئی ہیں جعفر علی خاں اثر اس کتاب میں شامل اپنے مقالے میں فرماتے ہیں :-

" ایسی شاعری جو سیاسی پروپگنڈہ اور نفرت پھیلانے کا آلہ ہے اور جو کچھ ہو ادب کی قلمرو سے خارج ہے۔ انسانیت کے تقاضوں اور اپنے ملک کے حالات سے خالی الذہن ہو کر اشتراکیت کے نعرے لگانا فسطائیت کو لباسِ نَو میں جلوہ دینا ہی نہیں بلکہ فسطائیت کی طرف خطرناک بازگشت ہے۔ بقول ملٹن :

LICENCE THEY MEAN WHEN THEY CRY FOR LIBERTY.

(چلّاتے ہیں آزادی کے لیے اور مقصود ہے کھُل کھیلنا) ۱؎

حضرتِ اثر اس مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں :-

" جو ادیب یا شاعر اپنے ملک کی سیاسی و تمدنی ضروریات و مشکلات کو سمجھنے اور ان سے پیدا شدہ مسائل کا حل یہاں کے حالات کو پیشِ نظر رکھنے کے عوض دوسرے ملکوں سے دریوزہ کیے ہوئے پس خوردہ خیالات کی روشنی میں سوچتے ہیں، جن کے ذہن میں تخریب کے سوا تعمیر کا تصور ہی نہیں ..... عجب نہیں جو ایک دن یہ شعر پڑھیں :-

تلوار اُبی ہوئی ہے چمن کی ہوا نہیں
گلگشت ہو چکی سر و گردن بچائیے ۲؎

لیکن مُنوّر لکھنوی انسانیت دوست ادب کے خالق تھے۔ خالص لذّت جوئی (استلذاذیت) کی لَے ان کے کانوں کو نہ بھاتی تھی جس کا چسکا قارئین کے کام و دہن کو لگا ہوا تھا۔ اس سے مُنوّر نے اپنی شاعری کو محفوظ رکھا۔ انھوں نے اپنے نغموں کو مقصد پسندی کی آڑ لے کر ایسی تحریکوں کا خاص الخاص مبلّغ نہیں بنایا جو کلیت پسندانہ فسطائیت کا دَم بھرتی ہیں۔ مُنوّر کا اعتقاد تھا کہ "گاندھیائی مذاق کا انقلاب خواہ آہستہ خرام سہی، غیر ہنگامہ خیز سہی، مگر ہے یہی وہ انقلاب جو ہمارے سماج کے دُکھ درد دُور کرے گا اور ہمارے لیے مستقبل کی آسائشوں کے دروازے کھولے گا۔" ۳؎

۱؎ آزادی کا ادب (مؤلف گوپال متّل)۔ جلد اوّل مطبوعہ ۱۹۵۴ء۔ صفحہ ۱۲
۲؎ " " " " ۱۴
۳؎ " " " " ۸۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منوّر لکھنوی اِس ادبی تحریک سے دُور رہے جس میں صاف ستھرے مذہبی تصوّرات اور اخلاقی اقدار سے بیگانگی "متاعِ ہر دُکاں" بن چکی تھی اور بقول اختر علی تلہری "جو فکری حرّیت کا گلا گھونٹ کر دنیا کو ایک سیاسی مکتبہ کے آستانے پر سجدہ ریز دیکھنا چاہتی تھی — نفرت، ہنگامہ پسندی اور عریانیت پھیلانا چاہتی تھی۔" لے

گوپال متّل کی زیرِ حوالہ تالیف "آزادی کا ادب" حصّہ اوّل میں منوّر لکھنوی کی ایک نظم "اے داعیانِ انقلاب" کے زیرِ عنوان شامل ہے۔ اس کے اشعار جو درجِ ذیل ہیں، ترقی پسندوں کے تعلق سے اُن کے اندازِ فکر کا پتہ دیتے ہیں :-

کہیں وجود کی بنیاد ہی نہ ہل جائے — ذرا سنبھل کے نظامِ کہن کو ٹھکرانا
جس انجمن نے سفر کے لیے کیا تیّار — قدم قدم پہ اُسی انجمن کو ٹھکرانا؛
اگر نہیں ہے یہ دیوانگی تو پھر کیا ہے — قفس سے پا کے رہائی چمن کو ٹھکرانا
یہ کیا مذاق ہے نقد و نگاہ کا آخر — گُہر کی قدر نہ کرنا، عدن کو ٹھکرانا
وقارِ کوثر و تسنیم ہو کبھی مضروب — کبھی تقدّسِ گنگ و جمن کو ٹھکرانا

کرے گا تجھ کو منوّر سپردِ رُسوائی
وطن میں پل کے یہ تیرا وطن کو ٹھکرانا

منوّر کے ذہن کا تخلیقی موسم اُن دنوں جوبن پر تھا، جو ترقی پسند ادیبوں کے غلبے کا دُور تھا۔ منوّر کو عمداً نظر انداز کیا گیا۔ کیونکہ اُس نے عُریاں ادب، حسن و صداقت سے خالی ادب، اخلاق و اطوار، شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر کھل کھیلنے والا ادب، بہیمت اور بربریت کی طرف دھکیلنے والا ادب تخلیق نہیں کیا۔ لیکن یہ بھی نہیں کہا سکتا کہ منوّر کا اُدب گوشۂ فراغت یا IVORY TOWER میں بیٹھ کر تخلیق کیا گیا ادب ہے، جس میں معاشرے کے مسائل یا اپنے عہد کی سیاسی تحریکات اور نظامِ وقت میں اصلاح و تغیّر کی ضروریات سے آنکھیں موند لی گئی ہوں۔ منوّر کی نظموں، غزلوں اور رباعیات میں اپنے عہد کے مسائل پر بڑی، بے باکی اور دیانت داری سے تبصرے کیے ہیں لیکن اُن کا لب و لہجہ تعمیری رہا۔ تخریبی نہیں۔

منوّر کی شاعری انسان کے دیدہ و دل کی انفرادی اور مجموعی دونوں حیثیت سے

لہ آزادی کا ادب (مؤلف گوپال متّل) جلد اوّل۔ ایڈیشن ۱۹۵۸ء صفحہ ۲۴۰-۲۴۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ترجمان رہی ہے۔ نام نہاد جدید شاعری کی طرح یہ کوری داخلیت کی شکار نہیں۔ جدیدیت کی تحریک منوّر لکھنوی کے دورِ حیات ہی میں آغاز پذیر ہو چکی تھی۔ موجودہ صدی کے چھٹے دہاکے کی ابتدا کے آس پاس اس نے پر پرُزے نکالنے شروع کر دیے تھے۔ اِس تحریک کا تعلق فرد کی ذات کے نہاں خانوں سے تھا اور اس کی ذہنی و نفسیاتی کیفیات سے۔

خود منوّر لکھنوی کے ایک ہونہار، اعلیٰ تعلیمی معیار رکھنے والے ذہین اور حسّاس شاگرد پروفیسر بمل کرشن اشکؔ جدیدیت کے اُن علم برداروں میں شامل تھے جو اس تحریک کے پیشوا اور امام قرار دیے جاتے تھے۔ لیکن منوّر کی لکھنویت، احساس و اظہار کی صالح اور صحت مند روایت کی پاسداری، اور ذمّہ داری کا جذبہ اُنھیں جدید شاعری کے سَوقیانہ لہجے، مشاہدے کے کچے پن، لہجے کے الھڑ پن، زبان کے کھردرے پن اور صَوتی کرختگی کو اپنانے پر آمادہ نہ کر سکی۔ نہ انھیں جدید ادیب و شاعر کی طرح اپنی ذات میں گم ہو کر سماج کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا گوارا تھا۔ ادیب و شاعر چونکہ سماج کا سب سے زیادہ حسّاس فرد ہے۔ اِس لیے منوّر سماج کی صورتِ حال سے شاعر کے بے خبر ہو کر بیٹھنے کا کوئی جواز نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اپنی متوازن ڈگر پر چلتے رہے اور روایتی اور جدید دونوں خیموں کے اہلِ قلم کا مرکزِ احترام بنے رہے۔ روایتی طرز کے پاسدار شعرا کے علاوہ راج نرائن رازؔ، بمل کرشن اشکؔ، حکیم منظور اور بلراج حیرتؔ جیسے جدید شعرا منوّر لکھنوی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے۔ منوّر نے اپنے عزیزوں کے نئے نظریات قبول کرنے پر صاد کیا۔ روایت پرست اور پیشہ ور اساتذۂ سخن کی طرح کسی تنگ نظری یا کٹّر رُوّیے کا مظاہرہ کرنے کی بجائے انھوں نے ان جدیدیت پسند شاگردوں کے نئے تجربات اور جدید استعارات و علائم کے استعمال پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ کیوں کہ منوّر کے عقیدے شاعری کے تعلق سے جامد نہیں تھے۔

وہ جدیدیت کے صحت مند تصوّر کے مخالف نہیں تھے اور دیکھا جائے تو خود منوّر کی غزلوں میں کہیں کہیں خیابانِ فکر کی تازہ ہَوا کے جھونکے محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ پھر بھی انھوں نے خود پر کسی تحریک کی مہر لگوانا گوارا نہیں کیا۔ وہ نہ تو مارکسزم کے تبلیغی دھارے میں بہہ کر ترقی پسند کہلائے اور نہ ہی ابہام گوئی اور تجربوں کی انارکی (ANARCHY) میں شامل ہو کر جسمانی تلذّذ اور نام نہاد "تحفظِ ذات" کی جدید علامتی شاعری کے داعی۔ وہ اپنے متوازن فکری اور فنّی رویّوں اور اسلوب اظہار سے دامن کش نہیں ہوئے۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اپنے عہد کے اہم شعرا اور ادیبوں کے ساتھ منوّر کے مراسم کی بہت سی تفاصیل ان کی خودنوشت "داستان" میں درج ہیں۔ بعنوانِ شباب ہی میں اُن کی ملاقات اُس دَور کے بہت اہم اور نامور شاعر منشی مہاراج بہادر برقؔ سے ہوئی۔ اس سلسلے میں وہ "داستان" میں رقم طراز ہیں :۔

"۱۹۱۱ء میں جب اودھ اخبار کا تاجپوشی نمبر نکلا تو اس میں بھی میرے کلام کو جگہ دی گئی۔ یہ خاص نمبر بڑی آب وتاب سے سرخ روشنائی میں نہایت اعلیٰ اور چکنے کاغذ پر شائع ہوا تھا اور اس میں والدِ مرحوم کا وہ زبردست اور طولانی مسدّس بھی شائع ہوا تھا جس پر انھیں دہلی دربار سے ایک نقرئی تمغہ اور ایک سندِ اعزازی عطا ہوئی تھی ۔۔۔۔ علامہ منشی لچھمن پرشاد صدؔر لکھنوی کو بھی جو ایک رشتے سے والد صاحب کے ماموں ہوتے تھے۔ اس موقع پر یہ اعزازات حاصل ہوئے تھے۔ دونوں بزرگوں کو دہلی دربار میں بلایا گیا تھا۔ مجھے بھی ان کی ہمراہی کا شرف حاصل تھا۔ پہلی بار اُس وقت دہلی کے اُبھرتے ہوئے شاعر برداری کے نوجوان منشی مہاراج بہادر برقؔ سے ملاقات ہوئی۔" [1]

برقؔ سے پھر اُن کی ملاقات ۱۹۱۵ء میں لاہور میں کائستھ کانفرنس میں ہوئی۔ دہلی میں تبادلہ کے بعد برقؔ صاحب سے قریبی تعلقات کا قائم ہونا لازمی تھا۔

لکھنؤ کے عرصہ ملازمت میں منوّر کے دوستانہ تعلقات حسرتؔ لکھنوی، سراجؔ لکھنوی قدیرؔ لکھنوی، منظرؔ لکھنوی اور محویؔ لکھنوی کے ساتھ قائم ہوئے۔ منوّر ان شعرا کی رفاقت میں آئیڈیل ہاؤس اور ٹھاکر گنج کے مشاعروں اور ادبی نشستوں میں اکثر شامل ہوتے رہے۔ اسی دوران خواجہ عشرتؔ لکھنوی اور وصل بلگرامی سے بھی راہ ورسم ہوئی۔

۱۹۲۳ء میں سیّد جالبؔ کے ساتھ منوّر کے تعلقات قائم ہوئے۔ جالبؔ روزنامہ "ہمدم" کے ایڈیٹر تھے۔ امین آباد لکھنؤ میں رہتے تھے۔ منوّر لکھتے ہیں :۔

"شام کے وقت ان کے دولت کدے پر لکھنؤ کے صحافیوں، ادیبوں اور شاعروں کا اچھا خاصا جمگھٹا لگتا تھا اور ہر وقت کے موضوع پر گفتگو ہوتی تھی۔ جالبؔ صاحب کی شخصیت ایک انسائیکلوپیڈیا سے کسی طرح کم نہ تھی۔ چارپائی پر لیٹے ہوتے۔ اُن کی چہیتی چنیا بیگم ان

---

[1] "داستان" منوّر لکھنوی قلمی مسودہ صفحہ ۳۷۔۳۸

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کے پاس ہوتی۔ اکثر پنک میں ہوتے...... اگرچہ بڑے کٹّر قسم کے مسلمان تھے لیکن میرے بڑے قدردان تھے۔ جالبؔ مرحوم نے مجھ سے ہندو مشاہیرِ ادب کا ایک تذکرہ لکھنے کی فرمائش کی۔"[۱]

اُنہی دنوں منشی پیارے لال، منشی خیراتی لال شگفتہؔ، منشی گوبند پرشاد فضاؔ، چاند بلی تکلمؔ، سورج بلی تبسمؔ، مشہور ناولسٹ موہن لال فہیمؔ، گرجا دیال واثقؔ، مہاویر پرشاد انجمؔ اور ننھو صاحب شفیقؔ سے بھی لکھنؤ میں ملاقاتیں رہیں۔ شفیقؔ صاحب منوّرؔ کے استاد منشی نوبت رائے نظرؔ کے خاص جلیس ہم نوالہ اور ہم پیالہ تھے۔

لاہور کے رائے رام سرن داس سے تو منوّر کم سنی میں ہی شناسا ہو چکے تھے۔ اپنے والد اُفقؔ صاحب کے لاہور کے عرصۂ ملازمت میں وہ اُن کے ہمراہ رائے صاحب کے ہاں اکثر جایا کرتے تھے۔ لیکن ۱۹۲۷ء میں لاہور کے ریلوے آڈٹ دفتر میں منوّرؔ کا تبادلہ ہوا تو وہاں کے ادبی حلقوں سے بھی متعارف ہوئے۔ یہاں اصغرؔ گونڈوی مرحوم سے اُن کی پہلی اور آخری ملاقات ہوئی۔ عبدالمجید سالکؔ، غلام رسول مہرؔ، اور راجیشور ناتھ زیباؔ سے دوستی ہوئی۔ علامہ برجموہن دتاتریہ کیفیؔ سے بھی پہلی مرتبہ لاہور ہی میں شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ کیفیؔ صاحب کے بڑے صاحبزادے پیارے موہن دتاتریہ اُن دنوں روزنامہ "ٹریبون" کے ادارتی اسٹاف میں تھے۔ لاہور میں "ہندو ہیرالڈ" کے مسٹر رائے سے ملاقات ہوئی۔ مشہور سائنس داں سر شانتی سروپ بھٹناگر کے خسر رائے صاحب رگھوناتھ سہائے بھٹناگر سے تعلقات ہوئے اور اُن کے رسائل "گلدستہ" اور "پیامِ تعلیم" میں منوّر لکھنوی کا کلام بھی اکثر شائع ہوتا تھا۔ مشہور صحافی ٹھاکر رام چھپالی شیداؔ، افسانہ نگار سدرشن، مہاشہ فتح چند تسیمؔ ایڈیٹر "انقلاب" لاہور اور مہاشہ ارجن دیو (ایڈیٹر کرم ویر) سے دوستی ہوئی۔ لاہور میں لکھنوی رفیقوں شنکر سروپ مفتونؔ شکوہ آبادی اور بیلی رام سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔

لاہور سے ٹرانسفر ہو کر منوّر دلّی پہنچے تو دلّی ہی کے ہو کر رہ گئے۔ یہیں تیس برس مسلسل ان کی تقرری رہی۔ یہیں وہ ۱۹۵۷ء میں ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد پٹودی ہاؤس دریا گنج میں مکان خرید کر مستقل طور پر اس میں قیام پذیر ہو گئے اور اسی مکان میں ۱۹۷۰ء میں انھوں نے آخری سانس لی۔

---

[۱] منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری از تقی بدست خزانہ آفس ایڈیشن ۱۹۸۰ء صفحہ ۱۳

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

دلّی میں ۱۹۲۷ء میں وارد ہونے کے بعد جن ہمعصر ادیبوں اور صحافیوں سے منوّر لکھنوی کے گھرے دوستانہ مراسم رہے۔ ان میں شیونرائن بھٹناگر ایڈیٹر روزنامہ "وطن" دہلی کا خصوصی مقام تھا۔ موصوف کے بارے میں منوّر داستان میں لکھتے ہیں :-

"اتنا قدر شناس، اتنا ہنر پرست، اتنا ہمدرد، اتنا مخلص اور اتنا وسیع قلب اور کشادہ نظر انسان مَیں نے بہت کم دیکھا ہے۔ میرے لیے تو وہ جان چھڑکتے ہیں۔ وہ شاید عمر میں کچھ چھوٹے ہوں لیکن عقل اور تجربے میں مجھ سے بہت بڑے ہیں۔ مجھ پر ان کی خاص نظرِ عنایت رہتی ہے......... شیونرائن پہلے "تیج" کے ایڈیٹر تھے۔ ۱۹۳۰ء میں "تیج" سے علاحدہ ہو کر انھوں نے اپنا روزنامہ "وطن" نکالا۔ ان کی خوبیوں اور سرگرمیوں کے بیان کرنے کے لیے ایک علاحدہ باب کی ضرورت ہے......"[1]

لکھنؤ میں گوپی ناتھ امن صاحب سے منوّر کی واجبی ملاقات تھی۔ دہلی آکر وہ ان سے زیادہ قریب ہو گئے۔ ان کے چھوٹے بھائی گورسرن لال ادیب بھی منوّر لکھنوی سے مانوس ہو گئے۔ ایک زمانے میں لوگ امن اور منوّر کو یک جان دو قالب سمجھتے تھے۔ منوّر لکھتے ہیں :-

"ایک زمانے میں مجھے امن و ادیب کی رفاقت پر بڑا ناز تھا۔ لیکن امن صاحب کی سیاسیات سے وابستگی اور حکمران طبقے میں اُن کی ترقی و منزلت بہت حد تک میرے اور ان کے درمیان حائل ہو گئی۔ امن صاحب یوں تو اب بھی مجھے ادب و احترام سے دیکھتے ہیں۔ میری شعر گوئی کے مدتوں قائل رہے ہیں لیکن اب کچھ دنوں سے شاید مصلحتاً میرے ساتھ وہ سلوک نہیں برتتے جو بیشتر ان کا مایۂ امتیاز تھا..... خدا کرے ان کو اپنی عوامی زندگی اور حاکمانہ زندگی میں زیادہ سے زیادہ ترقی ملے۔"[2]

خود گوپی ناتھ امن اپنے مقالہ "منوّر جیسا مَیں نے انھیں دیکھا ہے" میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے ۱۹۳۳ء میں دلّی آجانے کے بعد منوّر کو قریب سے دیکھا.... لکھتے ہیں :-

"اکثر مجھ میں اور منوّر صاحب میں تقسیمِ وطن کے بعد اُردو کے متعلق تبادلۂ خیالات ہوتا رہتا تھا۔ ہم دونوں اس بات پر متفق تھے کہ ہر چند اس دَور میں اردو کی قیمت گھٹی ہے لیکن ہماری قیمت بڑھ گئی۔ لکھنؤ میں مسلمان اردو اساتذہ نے ہم لوگوں کو کبھی دل کھول کر داد نہیں دی۔ بلکہ

---

[1] داستانِ منوّر لکھنوی (قلمی نسخہ) صفحہ نمبر درج نہیں۔

[2] " " " "

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہندوؤں کی شاعری پر

بوئے کچوری می آید

کہا کرتے تھے لیکن جب اردو زوال پذیر ہوئی تو انھیں یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کہیں یہ رہے سہے ہندو بھی ہاتھ سے نہ جاتے رہیں۔ لہٰذا دلی میں خاص طور پر تقسیم وطن کے بعد ہمیں تسلیم کیا جانے لگا۔"[۱]

امن صاحب کانگریس کے برگزیدہ لیڈر ہونے کے باعث دلی کی وزارت کے اہم رکن تھے۔ اگست ۱۹۵۰ء میں یوم آزادی کے مشاعرے کے کنوینر وہی تھے۔ انھوں نے مشاعرہ میں شراب کی ممانعت کر دی۔ اس سے چند ماہ قبل یوم جمہوریہ کے لال قلعے کے مشاعرے میں شراب خوب چلی تھی۔ شراب کی ممانعت کے بارے میں امن لکھتے ہیں کہ حضرت جوش ملیح آبادی کا ردِ عمل کیا تھا۔ فرماتے ہیں:-

"جوش صاحب کو یہ بات بہت بری لگی۔ انھوں نے صرف ایک نظم پڑھی بلکہ سرِ محفل شراب پی۔ اس نظم کا ایک شعر تھا:

دیارِ کعبہ و کاشی کے پوجنے والے یہ کوئی پوچھے نہیں کیوں مشاعروں کے امام

اور آخری مصرع یہ تھا۔ ع یہی روش ہے تو ایسے مشاعروں کو سلام

کچھ شعرا نے سرِ محفل اس کا جواب دیا۔ اس پر جوش صاحب ناراض ہو کر چلے گئے اور میرے خلاف ایک سخت نظم لکھی۔ میں نے بھی جواب لکھا۔ اب یہ کیفیت ہو گئی کہ نہ صرف دلی میں بلکہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں کچھ شعرا میری حمایت میں نظمیں لکھ رہے تھے اور کچھ جوش صاحب کی حمایت میں۔ یوں سمجھیے کہ خاصی تلخی پیدا ہو گئی تھی۔ اس فضا میں منور صاحب نے اپنا توازن قائم رکھا۔ انھوں نے نہ صرف ذاتی طور پر اس ان بن کو دور کرنے کی کوشش کی بلکہ مصالحانہ انداز میں ایک نظم بھی لکھی جس میں اس تنازعہ پر اظہارِ افسوس بھی تھا اور ہم دونوں سے، خاص طور پر جوش صاحب سے یہ کہا گیا تھا کہ ایسے نازک دور میں جب اردو کی جان کو خطرہ ہے، یہ تنازعے مناسب نہیں۔ اس ان بن کو ختم کرانے میں منور صاحب کا نمایاں حصہ تھا۔"[۲]

---

[۱] منور لکھنوی شخصیت اور شاعری (راج نرائن راز) ایڈیشن ۱۹۷۰ء۔ صفحہ ۶۰

[۲] 〃 〃 〃 〃 〃 ۶۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منوّر خود اَمن صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"نواب سراج الدین خاں سائلؔ دہلوی تو کہا کرتے تھے کہ مجھے یہ دو لڑکے بہت عزیز معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی اَمن اور منوّر انھیں ہم دونوں کا رنگِ کلام بہت پسند تھا۔ مشاعروں میں سائلؔ، برقؔ اور آغا شاعرؔ کے بعد جن کا کلام خاص توجہ سے سُنا جاتا تھا، ان میں اَمن صاحب اور ئیں دونوں شامل تھے۔" ؎۱

اپنے دیگر دہلوی ہم عصروں سے بھی منوّر لکھنوی کے بہت خوشگوار تعلقات تھے۔ جن میں منشی سُورج نرائن مہرؔ، پنڈت تربھُون ناتھ زارؔ، برج کشور زتشی، شام لال سحرؔ، ساغر نظامی، تبسّم نظامی اور دیگر بیسیوں اہلِ قلم شامل ہیں۔ دلّی سے باہر بھی ملک بھر کے اُردو حلقوں میں منوّر کی پذیرائی تھی اور اُن کے ہم عصر اساتذۂ سخن ان کا احترام و تکریم دِلی طور پر ملحوظِ خاطر رکھتے تھے۔ مولانا نیاز فتح پوری، پروفیسر تلوک چند محروم، جناب جگر بریلوی، ابوالفصاحت جناب جوشؔ ملسیانی، جناب مالک رام، لسان الاعجاز پنڈت میلا رام وفاؔ، کنور مہندر سنگھ بیدی جناب ضیاؔ فتح آبادی، جناب گوپال متّل، سیّد مسعود حسن رضوی، جناب جوشؔ ملیح آبادی، جناب بسمل سعیدی، پنڈت ہری چند اخترؔ، علامہ منوہر سہائے انورؔ، ناطق گلاوٹھی، نواب جعفر علی خاں اثرؔ، منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر "زمانہ" کانپور، جناب عرشؔ ملسیانی، جناب جگن ناتھ آزادؔ منشی پریم چند، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر بھگوان داس، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ مصنّف تاریخِ ادبِ اُردو، پنڈت سندر لال، منشی مہاراج بہادر برقؔ دہلوی اور ایسی دیگر معروف ادبی شخصیات سے منوّر لکھنوی کے دوستانہ تعلقات رہے۔ اور ان میں سے بیشتر نے منوّر کے بارے میں خلوص و احترام کا اظہار کیا۔ ان کے مدّاحوں میں ڈاکٹر آصف علی، مسز سروجنی نائیڈو ڈاکٹر گوکل چند نارنگ، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم صدر جمہوریۂ ہند، ڈاکٹر سچدانند سنہا ڈاکٹر رفیع احمد قدوائی وزیرِ مرکزی حکومت، سر تیج بہادر سپرو جیسی عظیم سیاسی شخصیات بھی شامل تھیں۔

جن ہمعصروں کے بارے میں منوّر لکھنوی نے خود اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے۔ ان میں سے چند کے متعلق کچھ منظومات بھی منوّر کے قلمی مسوّدوں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ مثلاً گوپی ناتھ اَمن اور جوشؔ ملیح آبادی کے مابین غلط فہمیوں کا ازالہ کرانے کے لیے مصنف

؎۱ منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (مرتبہ) راج نرائن رازؔ صفحہ ۴۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

رباعی میں منوّؔر یوں گویا ہیں (اس واقعہ کا ذکر اوپر کی سطور میں آچکا ہے) :-

اِس وحی، اِس الہام کا کیا ہی کہنا — اِس درسِ خوش انجام کا کیا ہی کہنا
ہو امن کے انداز میں اے جوشؔ اگر — مشفق ترے پیغام کا کیا ہی کہنا

انسان کی اصلاح وہیں ہوتی ہے — بوئے نفرت جہاں نہیں ہوتی ہے
دشنام طرازی سے تخاطب ہے فضول — اِس طرح سے اصلاح کہیں ہوتی ہے؟

مشمولِ سخن زبوں کلامی کیوں ہو — پختہ شاعر میں ایسی خامی کیوں ہو
نشتر تو رگِ جاں میں لگے جا کے مگر — جرّاحی کے ساتھ تلخ کامی کیوں ہو

اصلاحِ وطن کا یہ طریقہ نہیں خوب — تہذیب سے ہاتھ دھو کے لکھنا نہیں خوب
دعوئے حقیقت میں باندازِ کلیم — ہے جوشؔ تو خوب جوشِ بے جا نہیں خوب

(منشی گوپی ناتھ امن سے بھی تخاطب ہے جو لکھنؤ کے ایک دردمند قومی شاعر ہیں اور جن کی قربانیوں نے انہیں عظمت و منزلت کی کرسی پر لا بٹھایا ہے)[۱]

قائل ہوں تیری بلند آہنگی کا — تحریر کا اخلاق اگر پست نہ ہو
اے میکدۂ وطن کے رندِ آزاد — ہو مست شراب پی کے بدمست نہ ہو

رسالہ "کلیم" میں حضرت جوشؔ ملیح آبادی کا ایک مضمون پڑھ کر منوّؔر نے لکھا :-

ہے قابلِ فخر و ناز ہستی تیری — دریا طبعی، فراغ دستی تیری
توڑی ہیں قیودِ تنگ تو نے اے جوشؔ! — ہے مجھ کو پسند دل سے مستی تیری

اے شاعرِ کامیاب عہدِ حاضر! — اے شاعرِ انقلاب عہدِ حاضر!
تسلیم کہ آیا ہے سمٹ کر تجھ میں — یہ عالمِ اضطرابِ عہدِ حاضر!

---

۱ زیرہ گُل (مجموعۂ رباعیات۔ منوّؔر لکھنوی) قلمی مسودہ۔ صفحات کے نمبر درج نہیں۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

دل سے وطنیت کا پرستار بھی ہے　　ذہنیت عامّہ سے بیزار بھی ہے
مَیں تیرے عقائد کو سمجھتا ہوں خوب　　قربانیِ جسم و جاں کو تیّار بھی ہے

میرا بھی وہی ہے جو ہے ایماں تیرا　　معبود ہے میرا جو ہے "انساں" تیرا
اے جوشؔ! تجھے دل کا مَیں دریا سمجھوں　　اپنی حد میں رہے جو طوفاں تیرا [1]

منوّرؔ لکھنوی کی منظومات سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ جوشؔ ملیح آبادی سے دوستانہ تعلقات کے باوجود اُن سے منوّرؔ کے کچھ اصولی اختلاف بھی رہے۔ منوّرؔ جیسے مخلص، سادہ دل اور خدا پرست انسان، محبِ وطن اور دیانت دار شاعر کے لیے نام نہاد ترقی پسندی (جو در اصل اشتراکیت کا ہی دوسرا نام تھا) سے احتراز ایک فطری امر تھا۔ کچھ قطعات جو منوّرؔ لکھنوی نے "جوشؔ ملیح آبادی سے" کے زیرِ عنوان قلم بند کیے، درج ذیل ہیں:

بزمِ اُردو کے آسکر وائلڈ!　　مانتا ہوں کمال مَیں تیرا
نہیں ممکن کہ تجھ کو داد نہ دوں　　گو نہیں ہم خیال مَیں تیرا

جانتا بھی ہوں مانتا بھی ہوں　　قابلِ قدر تیری ہستی ہے
تیرا معیار ہے بلند ہزار　　پھر بھی تھوڑی سی اس میں پستی ہے

تو بھی حُبِّ وطن کا قائل ہے　　مَیں بھی حُبِّ وطن کا قائل ہوں
تو مگر اور سمت مائل ہے　　اور مَیں اور سمت مائل ہوں

تیری حُبِّ وطن ہیں روس شریک　　میری حبِّ وطن ہے ہند نژاد
لکھنؤ خاص ہے وطن میرا　　ماسکو ہے ترا ملیح آباد [2]

زیادہ تر کم فہم قسم کے ترقی پسند اور اشتراکی دوستوں کا خدا کی ہستی سے انکار اور ان کی مذہب بیزاری بھی منوّرؔ جیسے فنکاروں سے اس طرح کے ردّ عمل کا سبب بنی۔ دیکھا جائے تو حضرت جوشؔ

---

[1] کائناتِ دل (منوّرؔ لکھنوی)، ایڈیشن ۱۹۳۹ء، صفحہ ۶۷
[2] زیرہ گُل (منوّر لکھنوی کا غیر مطبوعہ مجموعہ رباعیات و قطعات) قلمی مسوّدہ

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ملیح آبادی کی لامذہبیت ہی آخری عمر میں ان کے جملہ مصائب کا پیش خیمہ بنی۔ اس سلسلے میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ مرحوم کی ان سطور کا حوالہ بھی یہاں بے محل نہ ہوگا۔ کنور صاحب جناب جوشؔ کے بہت ہی قریبی اور ہم راز دوست تھے:۔

"کچھ دنوں بعد جب جوشؔ صاحب پاکستان جانے لگے تو شام کو میرے پاس آئے اور دیر تک بیٹھے رہے۔ میں نے معلوم کیا آپ ان تمام مراعات اور احترام کو نظر انداز کر کے آخر پاکستان کیوں چلے گئے۔ کہنے لگے میرا تو جس طرح بھی ہوتا یہاں گزر ہو جاتا۔ مگر میرے بچوں کا یہاں کوئی مستقبل نہیں۔ ادھر پاکستان والوں نے مجھے جو کچھ دینے کا وعدہ کیا ہے اُس سے کم از کم اٹھارہ ہزار روپے ماہوار کی آمدنی تو فوراً شروع ہو جائے گی اب پاکستان والوں نے کہاں تک اپنا وعدہ پورا کیا۔ مجھے اس کا علم نہیں۔ لیکن میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جوشؔ ملیح آبادی نے تمام عمر سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کی مذمت کی۔ وہ خود سرمایہ کی ہوس میں پاکستان منتقل ہو گئے۔ میں نے خود جوشؔ صاحب سے کئی بار کہا کہ اگر آپ منکرِ خدا نہ ہوتے تو پاکستان جانے سے میں آپ کو روکنے کی کوشش بھی نہ کرتا، مگر آپ خدا کی ذات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کسی خالص اسلامی ملک میں ایک ملحد و کافر کیسے پنپ سکے گا۔ اس بات کا جوشؔ صاحب کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔" [1]

پاکستان میں جوشؔ ملیح آبادی جیسے عظیم شاعر کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا اور اُن کی زندگی کے آخری ایام "مملکتِ خداداد پاکستان" کے ایک شہری کی حیثیت سے کن مشکلات میں گزرے یہ اہلِ اردو سے پوشیدہ نہیں۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ مزید لکھتے ہیں:۔

"جہاں تک جوشؔ صاحب کا ایک عظیم شاعر ہونے کا سوال ہے اس میں کسی دوسری رائے کی گنجائش نہیں لیکن اُن کا عقیدہ اُن کی شاعری اور شہرت پر اثر انداز ہوا۔ اگر جوشؔ صاحب خدا پرست ہوتے تو وہ بھی علامہ اقبالؔ کی طرح قابلِ پرستش تصور کیے جاتے۔ میں سمجھتا ہوں ان کا منکرِ خدا ہونا اُن کی بڑی بدقسمتی ہے۔ میری دلی تمنا تھی کہ آغوشِ اجل میں سونے سے پہلے ایک بار جوشؔ صاحب کے مُنھ سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی میٹھی آواز

---

[1] یادوں کا جشن (کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ) ایڈیشن ۱۹۸۶ء، صفحہ ۲۵۴۔ ۲۵۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سن لوں۔۔۔ لہ

شراب بندی کے خلاف جوشؔ ملیح آبادی کے جذبات بہت شدید تھے۔ انھوں نے اس پالیسی کے خلاف اور بالخصوص سرکاری مشاعروں میں شراب پی کر آنے کی ممانعت پر جل بھن کر کچھ رباعیات کہیں جن میں سے چند یہ ہیں :-

توڑیں گے صراحی کو کھلونے دیکھو　　صورت تو ہے جوں پھٹے بچھونے دیکھو
جس کوہ سے گر چکے ہیں لنکا والے　　اُس کوہ پہ چڑھنے لگے بونے دیکھو

کیا شیخ کی خشک زندگانی گزری　　بے چارے کی اِک شب نہ سہانی گزری
دوزخ کے تخیل میں بڑھاپا گزرا　　جنّت کی دعاؤں میں جوانی گزری

یہ حکم نہ بن جائیں فسانے تو سہی　　افسانوں سے اُبھریں نہ ترانے تو سہی
مے خانے کو اے جیل بنانے والو　　جیلیں نہ بن جائیں شراب خانے تو سہی (علیٰ ہذا القیاس)

ان رُباعیات پر گو منوّر کو اعتراض نہ ہو سکتا تھا لیکن حضرت جوشؔ کی بعض غیر ذمہ دارانہ حرکات اور بالخصوص لال قلعے کے مشاعرے میں اُن کے طرزِ عمل کو دیکھ کر منوّر لکھنوی نے شدّت سے یہ محسوس کیا کہ اچھا شاعر ہونا معاشرہ کے صالح اصولوں اور انسانی اخلاق کی اعلیٰ اقدار کو سرِعام پامال کرنے کا لائسنس ہرگز نہیں۔ لہٰذا منوّر نے اپنے ردِّ عمل کا اظہار بھی رباعیات میں کیا۔ نمونے کے طور پر یہاں ایک رُباعی کا حوالہ ہی کافی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ رُوئے سخن حضرت جوشؔ کی جانب تھا :

کیا خاک وہ شغلِ مے کرتا ہے　　کیا جادۂ مستی کو وہ طے کرتا ہے
جشنِ جمہوریت میں پاگل ہو کر　　نہرو کے جو مُنہ پہ قے کرتا ہے

مالک رام موصوف علامہ منوّر لکھنوی سے اپنے نجی تعلقات کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"میں انھیں ۱۹۳۷ء سے جانتا تھا۔ چونکہ اُس کے بعد میرا کوئی رُبع صدی کا زمانہ ملک سے باہر گزرا۔ یہاں کہیں برسوں کے بعد آنے کا موقع ملتا تھا۔ اس لیے ہمارے تعلقات میں بے تکلفی

لہ یادوں کا جشن (کنور مہندر سنگھ بیدی سحر) ایڈیشن ۱۹۸۹ء۔ صفحہ ۲۵۵ - ۲۵۶

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کا رنگ تو کبھی نہ پیدا ہو سکا لیکن دوستانہ مراسم تھے اور ہم ایک دوسرے سے ملاقات میں مسرّت محسوس کرتے تھے۔ اُن سے جب کبھی ملنا ہوا، مجھے اُن کی شرافتِ نفس، انسان دوستی اور وضعداری نے متاثر کیا۔[1]

یوں تو اپنے مربیّ سیاست دانوں اور ہمعصر شعراو اُدبا کے انتقال پر منوّر نے نوحے لکھے۔ جن میں ڈاکٹر اقبال، ڈاکٹر رفیع احمد قدوائی، برج نرائن چکبست، علاّمہ کیفیؔ، مہاراج بہادر برقؔ اور دیگر کئی شخصیات شامل ہیں لیکن کئی ایسے عزیزوں کے ارتحال کا صدمہ اُس نے حد درجہ شدّت سے محسوس کیا جو اس کی رُوح کے بہت قریب تھے۔ ان میں سب سے شدید صدمہ نریش کمار شاد کی موت کا تھا۔ تاثرات کے قلمی مسوّدے میں منوّر کے کہے ہوئے متعدد ایسے نوحے ملتے ہیں۔ دہلی کے ایک ذہین اور خوش گلو شاعر مخمورؔ دہلوی کی وفات پر منوّر کے جو اشعار اخبارات میں شائع ہوئے اُن سے مخمورؔ دہلوی کے ساتھ ان کے ذاتی لگاؤ کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

داستانِ غمِ جانانہ سُنائے اب کون — حسرت و یاس کا افسانہ سنائے اب کون
ماجرائے دلِ دیوانہ سنائے اب کون — ذکرِ بیدردیِ فرزانہ سنائے اب کون

شدّتِ جذبۂ معصوم ملے گی کس میں؟
عظمتِ فانیؔ مرحوم ملے گی کس میں؟

آئے دن کس لیے لُٹتی ہے بہارِ دہلی — آئے دن کیوں یہ اُجڑتا ہے کنارِ دہلی
آج بدلے ہیں یہ کیا لیل و نہارِ دہلی — مائلِ رخصتِ پیہم ہے قرارِ دہلی

داخلِ حلقۂ اسلاف ہوئی جاتی ہیں
باکمالوں کی صفیں صاف ہوئی جاتی ہیں

ہوش بیکار ہے عالم ہے وہ حیرانی کا — مرتبہ کس کو دیا جائے سخن دانی کا
اب چمن میں نہیں کچھ لطف گُل افشانی کا — قبر میں دفن ہے اعجاز غزل خوانی کا

سو رہا ہے اَبدی نیند وہ کروٹ لے کر
ہم پلٹ آئے تھے اُس دن جسے کاندھا دے کر[2]

---

[1] تذکرہ معاصرین (مالک رام) ایڈیشن ۱۹۷۳ء، صفحہ ۱۱۷

[2] روزنامہ "تیج" دہلی میں مطبوعہ اس ماتمی نظم کا تراشہ منوّر لکھنوی کے شعری مجموعہ "تاثرات" میں ملا ہے۔ یہ نظم "تاثرات" کے قلمی نسخہ میں بھی درج ہے۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

نریش کمار شاد کی بے وقت اور ناگہانی موت منور کے لیے ذاتی صدمہ تھی۔ اس کی خودکشی کی خبر سُن کر انھوں نے ایک طویل نظم کہی جس کے کچھ منتخب اشعار نیچے درج ہیں جو شاد کے ساتھ منور کے تعلقِ خاطر کے شاہد ہیں۔

شاد اے شاد اے نریش کمار — ہمہ فریاد اے نریش کمار
آن سی اپنی آن دے بیٹھا — کیا سمائی کہ جان دے بیٹھا
شاعری میں ترا جواب نہ تھا — اس قدر کوئی کامیاب نہ تھا
کون ہم سن ترا مقابل تھا — کون فنکار ایسا کامل تھا
آگہہ رمز تھی نظر تیری — زندگی گو تھی مختصر تیری [1]

ساٹھ سے زائد اشعار پر مشتمل اس ماتمی نظم میں منور لکھنوی نے شاد کی موت سے ایک روز قبل اُس کے منور صاحب کے گھر پر وارد ہونے اور آخری ملاقات کا ذکر بڑے حسرت بھرے اور دل گداز لہجے میں کیا ہے۔

ایک اور عزیز برج لال جگی رعنا کی رُباعیات کی ستائش میں منور فرماتے ہیں:۔

رعنا کی رُباعیوں میں ندرت بھی ہے — ان کی رباعیوں میں جدت بھی ہے
پردے میں حقیقت کے ہے افسانہ بھی — افسانے کے پردے میں حقیقت بھی ہے

ہر شعر میں آہوئے دواں کا عالم — ہر شعر میں شمشادِ رواں کا عالم
بوُ غنچۂ رعنا کی ہمیں دیتا ہے — ہر شعر میں افکارِ جواں کا عالم [2]

انوپ چند آفتاب پانی پتی ہریانہ کے مشہور محبِ وطن شاعر تھے اور منور کے نیازمند۔ ان کے کلام کی توصیف میں منور لکھنوی کے یہ اشعار دیکھیے:۔

لفظوں کا اہتمام کلام آفتاب کا — معنی کا اژدہام کلام آفتاب کا
حُبِ وطن کی مے سے لبالب بھرا ہوا — ہے اِک حسین جام کلام آفتاب کا

یوں تو ہیں اپنے ملک میں لاکھوں انوپ چند
روشن کرے گا نام کلام آفتاب کا [3]

---

[1] شاخ مرجاں (منور لکھنوی کا آخری شعری مجموعہ۔ قلمی مسودہ) صفحہ نمبر درج نہیں۔
[2] زیرۂ گل (منور کی رباعیات کا دوسرا مجموعہ) (غیر مطبوعہ) قلمی نسخہ۔ صفحہ نمبر درج نہیں۔
[3] شاخ مرجاں (منور کی غزلوں کا آخری مجموعہ) قلمی مسودہ۔ " " "

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

افسانہ نگار اور منجم نیائے شرما اور نریش کمار شاد میں بہت گہری دوستی تھی اور یہ دونوں منوّر لکھنوی کے نیازمند تھے۔ ان کے بارے میں جو اظہارِ انس منوّر نے ایک نظم میں کیا ہے۔ اس نظم کے منتخب اشعار دیکھیے :-

نیائے شرما کے ایک سو گیارہ
کیوں منوّر کے ہوں نہ پو بارہ

اس سے کچھ ربط پچھلے جنم کا ہے
شاد لڑکا ہے کس قدر پیارا

دل سے دونوں کے واسطے میرے
اک محبت کا ہے رواں دھارا

جب منوّر کے ساتھ نیائے ہوا
قابلِ دید تھا وہ نظارا

ساتھ دینے لگے ثوابت سب
ہے موافق ہر ایک سیّارا

چال میری مخالفت بس چلے
اک ستارے کو اب نہیں یارا

دیکھی جائے گی صورت انجام
لاد کر جب چلے گا بنجارہ [1]

دہلی میں دنیائے ادب کے کبیر اور سینئر اہلِ قلم کے دستِ شفقت کا سایہ بھی منوّر لکھنوی کو حاصل تھا۔ علامہ برجموہن دتاتریہ کیفی سے اگرچہ ان کی ملاقات لاہور میں بھی ہوئی تھی لیکن لاہور سے دہلی کو تبادلہ ہونے کے بعد منوّر کو کیفی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کے مواقع اکثر حاصل ہوتے رہے۔ منوّر لکھنوی کی نظموں کا پہلا مجموعہ "کائناتِ دل" ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تو علامہ کیفی نے "حرفِ محکم" کے عنوان سے اس کا دیباچہ رقم کیا۔ اس میں انھوں نے منوّر کو "بڑے باپ کا بیٹا" تسلیم کیا۔ اُس دَور کے محترم و معظم شاعر نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی نے نو اشعار پر مشتمل ایک قطعہ تاریخ اس کتاب کے لیے تحریر کیا۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ایم۔ اے پی ایچ ڈی نے اپنے طویل مقدمے میں منوّر کو "ہندوؤں کا بہترین قومی شاعر" قرار دیا۔ مشہور کانگرسی رہنما مسٹر آصف علی بار ایٹ لا، منشی گوپی ناتھ امن لکھنوی، اختر بریلوی، کالی چرن آشر، رائے سدھ ناتھ بلی فراقؔ، ابو الفصاحت جوشؔ ملسیانی، اقبال ورما سحرؔ ہنگامی، پنڈت امرناتھ ساحرؔ دہلوی، پنڈت تربھون ناتھ زار دہلوی، علامہ ندرتؔ میرٹھی، منشی چندر بھان کیفی دہلوی اور حضرتِ جذبؔ عالم پوری، جناب شیام موہن لال جگر بریلوی اور منشی چندی پرشاد شیدا دہلوی کی آرا اور منظوم ارشادات بھی کائناتِ دل

---

[1] شاخِ مرجان (منوّر لکھنوی) قلمی مسودہ۔ صفحہ نمبر درج نہیں۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کے ابتدائی صفحات کی زینت بنے ہیں۔ اسی طرح "دھمپد" کے منوّر لکھنوی کے ترجمے میں علامہ کیفی نے حافظ شیرازی کے کلام کے ترجمے "وجدانِ حافظ" میں پروفیسر تلوک چند محروم اور جنابِ باقی مالک و مدیر روزنامہ "پیامِ وطن" دہلی نے اپنے فاضلانہ دیباچے لکھے ہیں۔

منوّر لکھنوی کی دیگر تصانیف میں بھی ملک کے مشاہیر نے منوّر کی شخصیت اور تخلیقی محاسن کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ نسیم عرفاں (ترجمہ بھگوت گیتا) میں مسز سروجنی نائیڈو، سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر سچدا نند سنہا، ڈاکٹر بھگوان داس، منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر "زمانہ" کانپور، کیلاش ناتھ ہکسر، ڈاکٹر گوکل چند نارنگ، جسٹس سر سلیمان، ڈاکٹر امرناتھ جھا، علامہ تاجور نجیب آبادی اور منشی مہاراج بہادر برق دہلوی نے ابتدائی صفحات میں اپنی گرانقدر آرا اس ترجمے کے متعلق تحریر کی ہیں۔ کالی داس کے مہا کاویہ "کمار سمبھو" کا جو ترجمہ منوّر لکھنوی نے کیا، اس پر جناب فراق گورکھپوری، جناب عرش ملسیانی اور جناب جگن ناتھ آزاد نے تقریظیں لکھی ہیں۔ اسی طرح منوّر کی دیگر مطبوعہ تصانیف میں کرنل بشیر حسین زیدی پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر ذاکر حسین، سابق صدر جمہوریہ ہند، مولانا نیاز فتح پوری۔ جناب موہن لال سکسینہ، سابق وزیر کابینہ، حکومتِ ہند، شری چیتنا نند جی مہاراج چدا کاشی، سید علی جواد زیدی اور ڈاکٹر ہزاری پرشاد دویدی جیسی عظیم ادبی، سیاسی اور روحانی ہستیوں کے تنقیدی دیباچے شائع ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان بزرگوں سے منوّر صاحب کے تعلقات رہے ہوں گے یہ سب لوگ منوّر کے فن کی عظمت سے آشنا تھے۔

"منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری" ۱۹۷۰ء میں منوّر کے سانحۂ ارتحال سے کچھ عرصہ پہلے شائع ہوئی۔ ۲۷۲ صفحات پر محیط یہ گرانقدر کتاب منوّر کے شاگرد رشید راج نرائن رازؔ نے ترتیب دی۔ اس میں شامل اُنیس[۱۹] مقالے جو حضرت منوّر کی نجی اور ادبی زندگی اور اُن کی عظمتِ فن پر سپردِ قلم کیے گئے۔ جانے پہچانے ادیبوں اور ناقدینِ فن کا نتیجۂ فکر ہیں۔ ان مقالہ نگاروں میں سے چند کے نام اوپر مذکور ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ شمیم حنفی، شہاب جعفری، ستیہ نند جاوا، عطاءاللہ پالوی، ڈاکٹر شارب ردولوی، سید محمود نقوی، سلیم اختر، کالی چرن اثر اور محمود ہاشمی نے بھی اس کتاب میں اپنے مقالے دیے ہیں۔ یہ سب لوگ منوّر لکھنوی کے نیازمندوں میں سے تھے اور اُن کے کلام کے مدّاح بھی۔

ماہنامہ "تحریک" کے مالک اور ایڈیٹر مایۂ ناز ادیب و شاعر جناب گوپال متل کے تعلقات بھی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منوّر لکھنوی کی دوستانہ رسم و راہ تھی۔ نیز ملک بھر کے بے شمار ہم عصروں سے، جن میں ان کے ہم عمر بھی تھے اور کم عمر بھی، منوّر صاحب کے مربیانہ تعلقات تھے۔ ان کے دوستوں اور خیر خواہوں میں سے ایک ایک کا نام گنوانا ممکن نہیں۔ تاہم جو کوئی بھی اُن کے ربط میں آتا تھا' اُن کی شرافت' حسنِ سلوک اور اوصافِ حمیدہ کا گرویدہ بن جاتا تھا۔

منوّر لکھنوی بطورِ انسان ایک درویش صفت، سادہ وضع اور سادہ دل آدمی تھے۔ اُن کا سلسلہ ان شاعروں اور ادیبوں سے ملتا ہے جو شاعری کو عام آدمی کی روح و دل کی تہذیب کا آلہ کار سمجھتے تھے۔ انسانی اور رُوحانی قدروں کی تبلیغ کو ایک مقصد بنا کر ہی انھوں نے زندگی کو جیا اور اپنے فن کو برتا۔ اس شریف اور عالی ظرف، خوش اطوار اور منکسر مزاج انسان سے بہتر ایک آدرش ہندوستانی کا تصوّر نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے شاعری ایک پیشہ نہیں عبادت تھی۔ جس سے اُس کی زندگی کے نصب العین کی تکمیل ہو سکتی تھی۔

نجی زندگی میں یہ فرشتہ صفت انسان گہرے مذہبی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اس کی پرہیزگاری اور خوراک و لباس کی سادگی کا مفصّل چرچا پہلے باب میں کیا چکا ہے لیکن گہری مذہبیت کے ساتھ اس کی وسیع القلبی اور سیکولر نقطۂ نظر، رواداری اور تعصب سے معرّیٰ و مبرّا طرزِ عمل کے مدّاح و معترف وہ سبھی لوگ تھے جنھیں کبھی بھی اس سے ملنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ مذہبی رواداری' قومی یک جہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے تعلق سے منوّر بہت جذباتی تھے جب مذہبی جنون سے مشتعل ایک قاتل نے بھارت کے سب سے بڑے سیاسی سربراہ اور سیکولرازم کے پیمبر مہاتما گاندھی کی جان لے لی۔ تو اس سانحہ سے منوّر کو گہرا صدمہ پہنچا۔

گوپی ناتھ امن اپنے مقالہ "منوّر جیسا میں نے انھیں دیکھا ہے" میں لکھتے ہیں:۔

۱۹۴۸ء میں میں نے منوّر صاحب کو بہت بُری حالت میں دیکھا۔ انھیں دورہ پڑا تھا۔ اور اتنا شدید کہ جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ میں کئی بار انھیں دیکھنے گیا۔ انھیں دِنوں مہاتما گاندھی کی شہادت ہوئی تھی۔ منوّر صاحب جذباتی ہیں: ان کے دل پر اس کا اثر پڑا..... بہت دنوں صاحبِ فراش رہ کر وہ صحت یاب ہوئے۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے انھوں نے مجھ سے کہا کہ مجھے زمین آسمان میں گاندھی ہی گاندھی نظر آتے ہیں۔ غالباً اُسی سال حضرتِ جوش ملیح آبادی رسالہ "آجکل" کے ایڈیٹر ہو کر دلّی آئے تھے۔[1]

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh Funding by IKS-MoE-2025-Grant

[1] منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (از راج نرائن راز) صفحہ ۱

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

گاندھی جی کے قتل کا شدید ردِ عمل منوّر لکھنوی کی متعدد نظموں میں دِکھائی دیتا ہے جو گاہے بگاہے مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتی رہیں۔ مثلاً نظم "کون ہم" کے ابتدائی اشعار دیکھیے:

باپو کے قتل کا ہے گنہ گار کون ؟ — ہم
پاداشِ جرم کا ہے سزاوار کون ؟ — ہم
اپنے ہی محسنوں پہ چلانے کے واسطے
رکھتے ہیں اپنے ہاتھ میں تلوار کون ؟ ہم

راقم السطور نے خود انھیں سبک سبک کر روتے دیکھا ہے۔ جب مذکورہ واقعہ کے تین برس بعد پاکستان میں ایک عام جلسے میں اس پڑوسی ملک کے وزیرِ اعظم مسٹر لیاقت علی خاں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تو دِلّی کے رام لیلا گراؤنڈ میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جسے وزیرِ اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو نے مخاطب کیا۔ مَیں اُس شام منوّر صاحب کے نیاز حاصل کرنے کے لیے ان کی رہائش گاہ پر گیا ہوا تھا۔ وہ مذکورہ تعزیتی جلسے میں مجھے ہمراہ لے گئے۔ اِدھر جواہر لال نہرو کی تعزیتی تقریر میں لیاقت علی خاں کا ذکر آیا اور اُدھر منوّر صاحب کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور اُن کی سسکیوں سے اردگرد بیٹھے لوگوں پر بھی رقّت کا عالم طاری ہو گیا۔

محض یہی نہیں۔ گوپی ناتھ امن نے جو بعد میں دِلّی میں کانگریسی وزیر بھی رہے، تقسیم وطن کے دِنوں کا ایک دلچسپ واقعہ بھی منوّر صاحب کے تعلق سے رقم کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"۱۹۴۷ء کا زمانہ بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ اگست کے مہینے میں تو دِلّی میں خوشیاں منائی جاتی رہیں کہ ملک آزاد ہو گیا ہے اور ۱۵؍ اگست کو لال قلعے کے نیچے کوئی دس لاکھ آدمی پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریر سننے کے لیے جمع ہو گئے تھے، لیکن ستمبر کے پہلے ہی ہفتے میں دِلّی میں وہ فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے جو کم وبیش گاندھی جی کی شہادت کے زمانے تک جاری رہے۔ مَیں بھی ایسے محلّے میں رہتا تھا جہاں ایک طرف ہندوؤں کی بستی تھی اور دوسری طرف مسلمانوں کی۔ — اور منوّر صاحب بھی مُلیٹی خانہ میں ایسی جگہ تھے کہ جہاں ایک طرف بازار سیتا رام میں ہندوؤں کی بستی تھی اور دوسری طرف ترکمان دروازہ پر مسلمانوں کی — مَیں نے بھی اپنے علاقے میں کوشش کی اور منوّر صاحب نے بھی۔ مجھ سے تو علاقے کے ہندو اور سکھ ناراض ہو گئے تھے اور مُسلم پرست کہنے لگے تھے۔ لیکن منوّر صاحب کے ساتھ اور بھی بُری ہوئی۔ یعنی وہ ایک جگہ پولیس کے ہتھے چڑھ گئے۔ ہوا یہ کہ وہ بلوہ فرو کرانے گئے تھے لیکن پولیس نے انھیں پکڑ لیا کہ تم بھی بلوائی ہو۔ اب انھیں ع۔ یاد تھیں جتنی دعائیں صَرفِ درباں ہو گئیں۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

انھوں نے ہر چند کئی ایسی ہستیوں کا ذکر کیا جن سے ان کا تعلق تھا لیکن پولیس نہ مانی۔ یہ بہت پریشان ہوئے۔ آخر اُسی صورت میں پولیس سے جان بچی جیسے عام طور پر بچتی ہے۔ "[1]

بمل کرشن اشک کو منوّر صاحب سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے ہوئے ایک برس بیت چکا تھا۔ جب انھیں دِلّی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں وقت پاکر وہ اپنے استادِ مکرم منوّر لکھنوی سے ملنے اُن کے مکان پر گئے۔ اِس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنے مقالہ "منوّر میرے اُستاد" میں لکھتے ہیں:۔

"گھر میں منوّر صاحب چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مَیں نے عرض کی میں بمل کرشن اشک ہوں اور اتنا کہہ کر پائنتی بیٹھنے لگا تو منوّر صاحب نے ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا اور سرہانے کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگے "یہاں بیٹھو بھئی" مَیں نے سوچا شاید مذاق کر رہے ہیں لیکن انھوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا "تم برہمن ہو نا؟" میں اُٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔"[2]

بمل کرشن اشک جو پھلوں کا لفافہ لے گئے تھے۔ اس کے معاملے بھی منوّر صاحب کافی ناراض تھے۔ بصد مشکل اشک اُن پھلوں کو وہاں چھوڑ آنے میں کامیاب ہوئے۔ لکھتے ہیں کہ جب مَیں ایک گھنٹے کے بعد باہر آیا ہوں تو میرے دماغ میں کھلبلی مچی ہوئی تھی، اور مَیں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ منوّر صاحب شاگردی اور اُستادی کی رسوم سے واقف نہیں ہیں یا میرے والد صاحب جو ریاضی کے ٹیچر تھے، اور منوّر صاحب کے اصولوں میں کوئی فرق نہیں۔ اشک نے دراصل کچھ دیگر مشہور اساتذۂ سخن کی عجیب و غریب حرکات اور اپنے شاگردوں سے اشارتاً کنایتاً ان اساتذہ کی جانب سے کی جاتے والی انوکھی فرمائشوں کے بارے میں سُن رکھا تھا۔ منوّر لکھنوی کی انسانیت اور عظمتِ کردار کو دیکھ کر اشک کا متعجب اور ممنون ہونا قدرتی بات تھی۔ بمل کرشن اشک مقالے کے آخر میں لکھتے ہیں:۔

"منوّر صاحب ایک ایسا آئینہ ہیں جس میں اپنی شکل دیکھتے وقت آدمی کو اپنے سر کے گردِ ایک ہالہ کا احساس ہوتا ہے۔ روشنی اور صداقت کے ہالہ کا..... ایسے ہی

---

[1] منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (مرتب راج نرائن رآز) صفحہ ۵۹-۶۰

[2] ایضاً " " " " ۶۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

لوگوں سے ہندوستانی تہذیب عبارت ہے۔ ان کا یہ شعر تعلّی نہیں حقیقت ہے۔

بخدا ایسی صفائی ہے مرے سینے میں
نہ ہے گوہر میں، نہ شبنم میں، نہ آئینے میں،،[۱]

منوّر صاحب نے اپنے کٹّر سناتن دھرمی عقیدوں کے باوجود اپنے عزیز دوست گوپی ناتھ امن کی ترغیب و تلقین پر رفتہ رفتہ مسلمانوں کے ہاتھ کا چھُوا کھانے سے اپنا احتراز چھوڑ دیا تھا، لیکن ماضی میں اس قدر دقیانوسی خیالات رکھنے والے اُنھی حضرت منوّر نے مسلمانوں کی مقدّس کتاب قرآن مجید کی سورتوں کے تراجم کیے۔ وہ اس مقدّس صحیفے کو حد درجہ احترام کے ساتھ اپنے گھر میں سب سے اونچی جگہ پر رکھتے، کمال خشوع و خضوع کے ساتھ اس کا مطالعہ کرتے۔ نبی اور آلِ نبی کی منقبتیں اور مرثیے کہتے اور فرماتے تھے کہ قرآن شریف کے مطالعے سے میری رُوح کو بالیدگی ملتی ہے۔ وہ مجلسِ عزا میں شریک ہوتے تھے۔ انجیلِ مقدس کے ابواب کو اردو نظم کے پیکر میں ڈھالنے والے ایسے بلند فکر اور عالی ظرف انسان کو ہم اپنے حقیقی معنوں میں انسان، بلکہ خصائل کے اعتبار سے فرشتہ قرار دیں گے۔

منوّر کی تعلیم اگرچہ میٹریکولیشن تک تھی لیکن مسلسل ذاتی مطالعے کی وساطت سے ہندی، فارسی، سنسکرت اور انگلش میں بھی انھوں نے حیرت انگیز استعداد حاصل کر لی تھی۔ شریمد بھگوت گیتا، گوسوامی تلسی داس کی "وِنے پتریکا"، دُرگا سپت شتی، گیت گووند اور کالیداس کے سنسکرت ادب پاروں کے ساتھ ساتھ انھوں نے فارسی تصانیف، بنگلہ اور جرمن زبان کے شاہکاروں کے بھی بہترین ترجمے اُردو زبان میں کیے۔ انھوں نے اسلامیات کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ اور یہ فرمایا کہ:-

گو مسلماں میں نہیں پر قائلِ اسلام ہوں
کیوں کہ مُردانِ خدا کا بندۂ بے دام ہوں

ہے مری شرع میں ہر دین کی تعظیم رُوا
ہر عقیدے کی ہر ایمان کی تکریم رُوا
منحرف جادۂ انکار سے رہتا ہوں میں
کس لیے پھر نہو اسلام کی تعلیم رُوا

---

[۱] منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (مرتب راج نرائن راز) صفحہ ۷۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سید محمود نقوی اپنے مقالہ "اسلام منوّر کی نظر میں" کے ایک پیراگراف میں یوں اظہارِ رائے کرتے ہیں :-

"اُس کے یہاں جو دل میں ہے وہی زبان پر ہے۔ بشیشور پرشاد کسی لمحہ بھی منوّر لکھنوی سے جدا نہیں ہوتا۔ زندگی کے یہ دونوں پہلو اس قدر زیادہ باہم شیر و شکر ہیں کہ دونوں میں کوئی حدِ فاصل کھینچی نہیں جا سکتی۔ بشیشور کی طرح سے منوّر لکھنوی کو بھی تصنع یا ظاہرداری سے دور کا بھی علاقہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن سے ملاقات کے بعد کبھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ ایسے شخص سے ملاقات ہوتی ہے جو بیسیوں کتابوں کا مصنف اور مؤلف ہے۔ کیونکہ وہ کبھی اپنی علمیت یا قد آور شخصیت سے مرعوب یا متاثر کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ سادگی اور خلوص اُن کے وصفِ خاص ہیں جو انہیں انتھک اور ٹھوس ادبی خدمات میں مصروف رکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت کے سماجی اور شاعرانہ پہلوؤں میں اس قدر زیادہ مفاہمت ہے کہ بشیشور پرشاد جو بات جس طرح محسوس کرتے ہیں، منوّر لکھنوی بے کم و کاست اُسے پیش کر دیتا ہے۔ ان کے یہاں مصلحتیں یا معروضات، دل اور زبان میں تفاوت کا سبب نہیں بن پاتے۔"[1]

افسانہ نگار اور ناقد حضرت کوثر چاندپوری مرحوم نے اپنے نثری مضامین کے مجموعہ "دانش و بینش" میں منوّر لکھنوی کا ذکرِ خیر یوں کیا ہے :-

منشی بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی انسانیت اور شرافت کا نہایت حسین پیکر تھے۔ ان کی شخصیت میں کوئی فنکارانہ کشش نہ تھی لیکن ایسا انسان ضرور جھانکتا محسوس ہوتا تھا جو قدیم اقدار کا حامل تھا اور جس میں ایک طرح کی معصومیت کا عکس تھا۔"[2]

بیشتر اساتذۂ سخن اپنے نوآموز شاگردوں، یہاں تک کہ پختہ مشق تلامذہ سے بھی کئی طرح کی خدمات کی توقع رکھتے ہیں۔ کئی بار شاگرد ہی تحفے تحائف عقیدتاً پیش

۱؎ منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (مرتب راج نرائن) صفحہ ۱۸۹

۲؎ دانش و بینش (کوثر چاندپوری) طبع اول جنوری ۱۹۷۵ء۔ صفحہ ۳۷ (ماہنامہ "شاعر" بمبئی۔ شمارہ جنوری ۱۹۷۸ء صفحہ ۲۰۔ ڈاکٹر مجاہد حسین کے مقالہ سے اقتباس)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh. Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کرتے ہیں۔ بعض اساتذہ اُجرت پر اصلاحِ سخن سے فیضیاب کرتے ہیں۔ بعض اپنے شاگردوں سے فرمائش کرکے مختلف اشیا منگاتے رہتے ہیں اور بعض شراب و کباب کی خدمت کے عوض خود نظمیں اور غزلیں کہہ کر شاگردوں کو "عنایت" کرتے ہیں۔ بعض استادوں کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ اُن کے شاگرد گاہے بگاہے استاد کا جشن منعقد کرکے انھیں تھیلی بھینٹ کروائیں یا کم از کم اپنے اثر و رسوخ سے استاد کو مشاعروں میں مدعو کروائیں لیکن منوّر صاحب کے یہاں عالم ہی دوسرا تھا۔ یہاں تو استاد گرو رن (یعنی قرضِ مرشد یا قرضِ استاد) سے سبکدوش ہونے کے مقصد سے روشنی بانٹتا تھا۔ انسانی ہمدردی کے جذبات سے لبریز منوّر کا دل یہ گوارا نہیں کرتا تھا کہ کوئی شاگرد ان کے لیے مٹھائی کا پیکٹ یا پھلوں کا لفافہ ہی لائے اور اس طرح بلا وجہ زیر بار ہو۔ میں نے انھیں اس طرح کے معمولی تحائف قبول کرنے سے بھی انکار کرتے ہوئے بلکہ ناراض ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اس کے برعکس اپنے محدود مالی وسائل کے باوجود اپنے شاگردوں کے مالی بحران کے دِنوں میں اُن کی دامے، درمے، سخنے امداد کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ منشی نرائن داس طالبؔ پانی پتی جب کوروکھشیتر کی تحصیل کورٹ میں ریڈر تھے اور کچھ مالی پریشانیوں کے شکار تھے۔ انھیں کئی بار منوّر صاحب کی جانب سے منی آرڈر موصول ہوئے۔ اب یہ عطیہ تھا یا عارضی طور پر دیا گیا قرض، اور یہ قرض تھا تو اس کی واپس ادائیگی بھی ہوئی یا نہیں، اسے خدا بہتر جانتا ہے لیکن طالبؔ مرحوم نے خود اس امر کا ذکر مجھ سے کئی بار کیا۔ ۱۹۴۸ء سے لے کر ۱۹۵۲ء تک کوروکھشیتر میں اکثر طالب پانی پتی صاحب سے میری ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ انہی کی وساطت سے آستانۂ منوّر تک اِس خاکسار کی رسائی ہوئی تھی اور حضرتِ منوّر سے رُوحانی رشتہ قائم ہوا۔

منوّر ریلوے آڈٹ کے محکمہ میں آڈیٹر تھے اور تنخواہ کے علاوہ ان کا کوئی مزید ذریعۂ آمدنی بھی نہیں تھا، لیکن مذکورہ ڈھنگ سے اپنے کئی اقارب، عزیزوں اور شاگردوں کی مدد انھوں نے کی۔ نریش کمار شادؔ مرحوم اکثر منوّر صاحب کے مقروض رہتے تھے۔ انھوں نے بہت مرتبہ شادؔ کی حاجت رُوائی کی۔ کثرتِ مے نوشی کے باعث شادؔ عموماً تنگ دستی کا شکار رہتے تھے۔ لیکن ہر ایک کے سامنے دامانِ طلب بھی نہ پھیلا سکتے تھے۔ منوّر صاحب سے اکثر اس طرح کے تقاضے کرتے تھے جیسے لاڈلا بیٹا اپنے باپ سے کرتا ہے۔

صرف یہی نہیں زندگی کی جدّ و جہد اور تلاشِ روزگار کی تگ و دَو کے دَوران منوّر صاحب

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

نے اپنے کئی شاگردوں کا حوصلہ بڑھایا۔ ان کی دامے، درمے، سخنے حوصلہ افزائی کی اور خود کفیل ہونے میں استطاعت کی۔ خود راقم السطور کا خاندان پاکستان سے ہجرت کر کے ہریانہ کے ایک چھوٹے سے شہر کوروکھشیتر میں آن بسا، تو والدین کی مالی مشکلات کے باعث راقم السطور کو بی اے کے آخری سال میں کالج کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر تلاشِ روزگار کے سلسلے میں شہر دلی کا رُخ کرنا پڑا۔ ان دنوں میں متعدد بار ایسا ہوا کہ منوّر صاحب نے صاحبِ اقتدار شخصیات کے نام اس خاکسار کو سفارشی خطوط عطا کیے۔ مقصد میں کامیابی ملی یا نہیں، اس سے قطع نظر حضرت منوّر کی اُس شفقت، ہمدردی اور عظمتِ کردار کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ انہی کے ایک سفارشی خط کی بدولت راقم السطور کو روزنامہ "ویر بھارت" میں بطور سب ایڈیٹر ملازمت ملی۔ لاہور سے دلی منتقل ہونے کے بعد یہ روزنامہ —— خود ہی مالی بحران کا شکار تھا۔ مجھے اردو جرنلزم میں اپنا مستقبل تاریک نظر آیا اور چند ماہ بعد مجھے اپنی بی اے کی تعلیم مکمل کرنے کے لیے اس ملازمت کو خیر باد کہنا پڑا۔

منوّر لکھنوی کے بارے میں جناب عرشؔ ملسیانی مرحوم کا درجِ ذیل اظہارِ رائے یہاں خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ عرشؔ ان کی سیرت نگاری ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

"منوّر وضع کے پابند، روایات کے دلدادہ، پوجا پاٹھ کے گرویدہ، سادہ دل سادہ لوح، زاہدِ خشک اور بھلے انسان ہیں۔ کسی سے جھگڑا مول لینے کا حوصلہ ہی نہیں رکھتے، اسی لیے کسی کا دل تو کیا دُکھائیں گے لیکن اس کے باوجود بڑے خود دار، مخلص اور بڑے دیانت دار ہیں۔ صاف گوئی میں جواب نہیں رکھتے۔ زیادہ تر تنہائی پسند ہیں۔ محفلوں میں جاتے ہیں تو تلخ تجربے لے کے آتے ہیں۔ یہ زمانہ صاف گو اور سادہ دل مخلصوں کو راس نہیں۔ یہاں تو وہ لوگ کامیاب ہیں جن کا اندر باہر یکساں نہ ہو۔ اہلِ جوہر سے صحیح داد پاتے ہیں۔ سخن شناسوں کے نزدیک ان کا مرتبہ بہت اونچا ہے۔ عموماً مرضِ اختلاج میں مبتلا رہتے ہیں۔ کئی بار مشاعروں میں طبیعت خراب ہوگئی۔ مَیں دس سال سے دلی میں ہوں۔ اس مدت میں منوّر صاحب کو ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ شروع شروع میں دعوتیں بھی کھلاتے تھے۔ منشی دیا نرائن نگم مدیر "زمانہ" ایک بار دلی تشریف لائے۔ ان کی دعوت آپ نے کی تو مجھے بھی بلایا۔ اس دعوت یا صحبت میں ہم تینوں ہی تھے۔ بڑا لطف آیا۔ مَیں نے دیا نرائن نگم مرحوم کو پہلی اور آخری بار انھیں

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کے وہاں دیکھا۔ نگم صاحب منوّرؔ صاحب کے بڑے قدر دان اور عقیدت مند تھے۔ بات بات میں کہتے تھے کہ دیکھو فلاں کام کرڈالو۔ فلاں کتاب کا ترجمہ ضرور ہو جائے۔ یہ چھپ جائے وہ چھپ جائے۔ وہ تو اردو کے بہت مخلص خادم تھے۔ ایک زمانہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ میں خود منوّرؔ صاحب کو محترم سمجھتا تھا۔ لیکن نگم صاحب کی عقیدت دیکھی تو منوّرؔ صاحب کے لیے اور عزّت میرے دل میں پیدا ہوئی۔"[1]

ایسے مخلص اور خالص سونے جیسا دل رکھنے والے، فرشتہ خصلت انسان کو آج کل کی عیّار اور شاطر دنیا بطور عظیم شاعر اپنا مقام کیسے دیتی۔ نہ انھوں نے اپنے شاگردوں اور بستہ برداروں کی کوئی صف بندی یا گروہ بندی کی۔ نہ وہ خود کسی گروہ بندی سے منسلک ہوئے۔ نہ خود ستائی اور خود نمائی کے ذریعے اربابِ اقتدار کو مرعوب و متاثر کرنے کی کوشش کی۔ انھیں اپنی محرومی اور ناقدریِ فن کا اظہار اس قطعے میں کرنا پڑا۔

بھلائی نہ آئی بُرائی نہ آئی — خودی سامنے بن کے آئینہ آئی
کہاں کامیابی کہاں یہ زمانہ — منوّرؔ تجھے خود نمائی نہ آئی

منوّرؔ بطورِ انسان تو خلوص کا پیکر تھے ہی، وہی خلوص انھوں نے اپنے فن کے ساتھ بھی برتا۔ علیم اللہ حالیؔ کی رائے ہیں :-

دانش وری وقتی اقتداری آویزش سے بلند ہوتی ہے۔ جب کبھی مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں کارنامے انجام دینے والوں کے قدروں کی پیمائش ہوتی ہے تو یہ فنکار سب سے بلند و بالا نظر آتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سچا فنکار، مذہب، سیاست، معاشرت اور معیشت سے بلند ہو کر ایک ایسا نظام حیات ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جو انسان کو لطیف ترین جذبوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ انسانی معاشرے کی نجات ان دانش وروں کے ذریعے ہو سکتی ہے جو ملانے کا کام کرتے ہیں تقسیم کرنے کا نہیں۔"[2]

علیم اللہ حالیؔ کی یہ رائے منوّرؔ لکھنوی کی شخصیت اور فن پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے

۱؎ بامِ عرش سے (دیباچہ کمار سنبھو) دیباچہ نگار عرش ملسیانی۔ ترجمہ کمار سمبھو (منوّرؔ لکھنوی)۔ ایڈیشن ۱۹۵۲ء صفحہ ۲

۲؎ ماہنامہ سہیل "گیا"، شمارہ فروری ۱۹۹۲ء۔ صفحہ ۸

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بلاشبہ منوّر نے ہمیشہ ملانے کا کام کیا۔ واقعتاً منوّر قومی یک جہتی کے شاعر تھے۔ انھوں نے ہندوستان میں رہنے بسنے والے مختلف فرقوں کو باہم دگر قریب لانے کے لیے اپنی شاعری سے کام لیا۔ قومی رہنماؤں، عظیم شعرا اور مفکروں کو بلا امتیازِ مذہب و ملّت خراجِ تحسین اور گلہائے عقیدت پیش کیے۔ ان میں ڈاکٹر اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، حافظ شیرازی، خیام، مرزا غالب، بابا طاہر ہمدانی، ڈاکٹر رفیع احمد قدوائی۔ بریگیڈیر عثمان، موتی لال نہرو، مہاتما گاندھی، لوک مانیہ تلک، سردار پٹیل، حضرت یسوع مسیح، حضرت علیؓ، حضرت امام حسینؑ، پیغمبرِ اسلام حضرت محمدؐ، ماں درگا، جینندر مہاویر، گوتم بدھ، گورونانک، رام چندر جی، کرشن جی مہاراج، سوامی دیانند، سوامی رام تیرتھ، شیواجی، دشمیش پتا گورو گوبند سنگھ، رانی لکشمی بائی۔ برج نرائن چکبست، علامہ کیفیؔ، مہاراج بہادر برقؔ، مخمور دہلوی، جوشؔ ملیح آبادی، نریش کمار شادؔ وغیرہ شامل ہیں۔ غرض یہ کہ ہر مذہب و ملّت کے دانش وروں، سیاسی رہنماؤں، مذہبی پیشواؤں اور قومی ہیروز کے تئیں انھوں نے اپنے توصیفی جذبات کا اظہار اپنی شاعری میں کیا۔

منوّر نے لکھنؤ کے روایتی شعرا اور ادیبوں کی نقالی میں ادب کو محض ذہنی عیاشی یا زندگی کی تلخیوں سے فرار کا ذریعہ نہیں بنایا۔ اس نے ادب کا ناطہ عوام کی زندگی سے جوڑنا اپنا مقدس فریضہ سمجھا اور زندگی بھر اس کے لیے عملی طور پر سعی کی۔

ماہنامہ "زمانہ" کانپور کے نومبر ۱۹۲۹ء کے خصوصی شمارہ (آتش نمبر) کے مطالعے کے بعد منشی پریم چند نے "زمانہ" کے ایڈیٹر منشی دیا نرائن نگم کو ایک احتجاجی خط میں لکھا تھا:۔

"......... لکھنؤ کی شاعری کا مذموم پہلو آتش کی شاعری میں مقابلتاً کم ہے۔ مگر پھر بھی اتنا زیادہ ہے کہ بہ استثنا اُن حضرات کے جو لکھنوی شاعری کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں اور سبھی طبقوں کو موجودہ معیار اور ذوقِ صحیح سے گرا ہوا نظر آتا ہے۔ ....

لٹریچر کا موضوع ہے۔ تہذیب، اخلاق، مشاہدہ، جذبات، انکشافِ حقائق، واردات کیفیتِ قلب کا اظہار۔ جو شاعری حسن و عشق کو آئینہ و شانہ، خنجر و محشر، بشریٰ و خط، دہن و کمر کے تخیل سے ملوث کرتی ہو، وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ آج ہم اس کا وِرد کریں۔ جن کی افتادِ طبیعت اس رنگ کی ہے۔ انھیں اختیار ہے کہ آتش یا ناسخ، رند یا امانت کا وظیفہ

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

پڑھیں لیکن "زمانہ" کے مختلف الطبع ناظرین کو اس وِرد اور وظیفے میں شریک ہونے کے لیے مجبور کرنا کہاں کا انصاف ہے۔"[1]

"زمانہ" کے آتش نمبر سے متعلق پریم چند کا یہ احتجاجی خط کافی طویل ہے۔ مذکورہ بالا مختصر سا اقتباس یہ واضح کرتا ہے کہ ایسا ادب دورِ انحطاط کا ادب ہے اور قوموں کو سلانے والا عیش و عشرت کی طرف جوڑنے والا ادب ہے۔ یہ ادب انسان کو میدانِ عمل سے مُنہ موڑ کر کاخ و کو میں پناہ لینے اور حسن و عشق کے چٹخارے لینے کی دعوت دے کر اُس کی جدّ و جہد کی قوت کو مفلوج کرتا ہے۔

منوّر کا عہد قوم کے ذہن و رُوح کو متحرک اور بیدار کرنے کا عہد تھا۔ عاشقانہ غزلوں اور عیش و عشرت کے معصیت آلود قصوں کا نُوا پی دَور آخری ہچکی لے چکا تھا۔ صحیح سوچ اور ذوقِ سلیم رکھنے والے قلم کاروں کے لیے یہ دَور اصلاحِ تمدّن اور قومیت کے جذبے کی بلوغیت کا دَور تھا۔ ملک حصولِ آزادی کی جدو جہد میں بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ یہ قومی غیرت اور وقار کے احیا کا زمانہ تھا۔ منوّر کا ادب اس عہد کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اس کی نظموں اور غزلوں میں رنگِ قدیم سے واضح موڑ اور انحراف نمایاں ہے۔ منوّر کے تراجم کے کام کی طرف زیادہ وقت اور توجّہ دینے کی بھی کلیدی وجہ یہی ہے کہ وہ قومی وقار کے احیا اور وطنی غیرت کی بازیافت کو ایک مقصد بنا کر اپنے فن سے کام لینا چاہتے تھے۔

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوآنہ نے منوّر کی نظموں کے مجموعہ "کائناتِ دل" کے مقدّمے میں "ہمارا بہترین قومی شاعر" کے زیرِ عنوان بالکل بجا فرمایا ہے کہ:۔

"اقبال مسلمانوں کے بہترین قومی شاعر تھے۔ منوّر ہندوؤں کے بہترین قومی شاعر ہیں دونوں بلاغت پر لٹّو، فارسیت سے مغلوب، دونوں دل کی گہرائیاں ناپنے والے، دونوں ترجمانِ حقیقت۔"[2]

اپنے مقالہ "منوّر کی قومی نظمیں" کی ابتدائی سطور ہی میں شہاب جعفری فرماتے ہیں:۔

"مسلمانوں میں مولانا حالی اور ہندوؤں میں تشیشور پرشاد منوّر دو ایسے معصوم شاعر ہیں جن کی پارسائی، شرافتِ نفس اور نیک نیتی کی قسم کھائی جاسکتی ہے لیکن یہ پارسائی

---

[1] ماہنامہ "سہیل" گیا۔ جلد ۵۲۔ شمارہ ۴۔ صفحہ ۷

[2] کائناتِ دل (منوّر لکھنوی) ایڈیشن ۱۹۳۹ء۔ صفحہ ۱۶

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ایسی نہیں ہے جو مصلحت کوش ہو۔ اس کے آئین میں معصومیت کے ساتھ حق گوئی و بیباکی کا مسلک اوّلیت کا درجہ رکھتا ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو حالیؔ اور منوّرؔ کے یہاں علاوہ اور باتوں کے قدرِ مشترک ہے۔،،[۱]

منوّرؔ کی شاعری میں قومی جذبہ بھی ہے اور آزادی کی اُمنگ بھی۔ مناظرِ فطرت کی بھرپور عکاسی بھی ہے اور انسانی جذبات و نفسیات کی آئینہ داری بھی۔ سماجی اور اقتصادی استحصال سے ہراساں طبقوں کی ہمدردی و حمایت بھی ہے، حالاتِ گرد و پیش پر بے باکانہ تبصرہ آرائی بھی اور مابعدِ آزادی کے سیاسی نظام کی بدعنوں پر ضربِ کاری بھی۔ اور ان سب باتوں سے بڑھ کر منوّرؔ نے عالمی اُدب کے شہرۂ آفاق ادبی شاہکاروں کے منظوم اور منثور ترجمے بڑی مُشّاقی، پختہ کاری اور ذہانت سے کر کے اردو کے ادبی خزانے کو مالا مال کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں بھی سوفیانہ پن سے گریز اور ذہنی عیّاشی کے تقاضوں سے حذر نمایاں ہے۔ غزل کو انھوں نے نئے فلسفیانہ اور حقیقت پسندانہ موضوعات سے سنوارا ہے گنپت سہائے سریواستو کے مرتّب کردہ تذکرے "گلدستۂ سخن" میں منوّرؔ کی شاعری کے بارے میں یوں اظہارِ رائے کیا گیا ہے:-

"منوّرؔ کی غزلوں میں قدیم و جدید رنگوں کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کے زیادہ تر اشعار تجرباتِ زندگی، حقائق و معارف اور اخلاقیات سے متعلق ہوتے ہیں۔ طبیعت کا رجحان فلسفیانہ ہے۔ کلام متبذل مضامین اور ادنیٰ تخیلات و جذبات سے پاک ہوتا ہے۔ زبان نہایت فصیح اور بامحاورہ پائی جاتی ہے۔ وہ حسنِ بیاں کے ساتھ ساتھ لطافتِ زبان کو بھی ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں۔ بندش اور تراکیب کی غرابت جدید شعرا کا شیوہ بن گئی ہے۔ ان کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔،،[۲]

منوّرؔ کا اُدب لافانی ہے۔ مقصدیت اور ابدیت سے بھرپور اس مثبت اور تعمیری اُدب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہی وہ جوہرِ خاص ہے جو منوّرؔ کو اُن کے عہد کے بہت سے شعرا و اُدبا سے ممتاز کرتا ہے۔ چاہے اپنی زندگی میں اس درویش

---

[۱] منوّرؔ لکھنوی شخصیت اور شاعری (مرتّب راج نرائن رازؔ) صفحہ ۱۶۳

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

[۲] گلدستۂ سخن (گنپت سہائے سریواستو) ایڈیشن ۱۹۸۸ء صفحہ ۲۲۱

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

خصلت شاعر کو وہ مقام نہیں مل پایا، جس کا وہ مستحق تھا، لیکن "شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم" کا حقیقی احساس بھی کم مایہ دولت نہیں۔ بطورِ ایک عظیم شاعر منوّر کو بجا طور پر اس سچائی کا احساس و اطمینان تھا کہ :-

میرے طلوع کو نہیں کھٹکا غروب کا
میری سحر سے شام بہت دور ہے بہت
میرا مذاقِ خاص منوّر ہے دیدنی
مجھ سے مذاقِ عام بہت دور ہے بہت

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

باب سوم (الف)

منوّر لکھنوی کی شاعری

(نظمیں)

- منوّر لکھنوی بحیثیت نظم نگار
- مطبوعہ مجموعۂ نظمیات "کائناتِ دل" کا تنقیدی جائزہ
- تین غیر مطبوعہ شعری تصانیف :
  "سوزِ وطن"، "نقوشِ منوّر" اور "شگفتہ عقیدے" کا مطالعہ
- قومی نظمیں۔ اخلاقیات اور قومی یک جہتی سے متعلق نظمیں
- نعتیہ کلام
- منوّر کا پیغامِ رواداری و انسان دوستی
- مجموعی تاثر

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منوّر بحیثیت نظم نگار

منوّر ایک پُرگو شاعر تھے اور خدائے بخشندہ نے ان کو جملہ اصنافِ شاعری پر یکساں دسترس بخشی تھی۔ نظم، غزل، قطعہ، رباعی، مثنوی غرض یہ کہ ہر صنفِ شاعری کو انھوں نے اپنا خونِ جگر پلایا اور کشتِ شعر میں وہ رنگارنگ گل بُوٹے کھلائے جو اپنی دائمی دل کشی اور خوشبو سے اہلِ ذوق کے مشامِ جاں کو معطّر کرتے رہیں گے۔ اُن کے حسّاس دل اور بیدار ذہن نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابتدا میں نظم گوئی کی جانب متوجہ کیا۔ کیوں کہ انسانیت اور شرافت کی اعلیٰ اقدار کے نشر و ابلاغ کے لیے نظم ایک بہتر اور مؤثر وسیلہ ہے۔ نیز اس صنف میں اپنے موضوع کو تفصیل و وضاحت کے ساتھ بیان کرنے اور اس کے ساتھ مکمل انصاف کرنے کی بے پایاں گنجائش ہوتی ہے۔ چوں کہ منوّر لکھنوی شاعری کو ایک افادی عمل مانتے تھے جسے انسانی سماج کے ذہنی اور روحانی ارتقا، تربیتِ نفس اور اخلاقی ترقّی کے مقصد کی تکمیل کے لیے بہترین اور قوی ترین آلۂ کار بنایا جا سکتا تھا۔ اس لیے منوّر کا جو پہلا ضخیم مجموعۂ کلام چھپ کر منظرِ عام پر آیا وہ نظمیہ شاعری پر مشتمل تھا۔ یوں ان کی رباعیات کا ایک جیبی ایڈیشن "نذرِ ادب"، اور دو تراجم رامائن بالمیکی اور نسیمِ عرفاں (شریمد بھگوت گیتا) اس سے پہلے منظرِ عام پر آ چکے تھے۔

منوّر لکھنوی کا اوّلین نمائندہ مجموعۂ کلام "کائناتِ دل"، جو ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا، اُن کی نظمیہ شاعری اور کچھ رباعیات پر مشتمل ہے۔ ان کی نظمیہ شاعری کا منظرنامہ بے حد وسیع متنوع اور رنگارنگ ہے۔ اس میں جمالیاتی، منظری، اخلاقی، مذہبی، سیاسی، سماجی اور قومی ہر طرح کی نظمیں شامل ہیں اور رُباعیات بھی۔ ان کے موضوعات میں روزمرہ زندگی کے مسائل

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کے علاوہ منوّر کے عہد کے اہم عصری، سیاسی اور سماجی واقعات و واردات بھی شامل ہیں جو شاعر کے خلوصِ جذبہ، سوچ کی پاکیزگی، حساسیت اور گہرے مشاہدے کا پتہ دیتے ہیں۔

منوّر لکھنوی کا ایک ادبی مقالہ ہفت روزہ "دورِ جدید" دہلی کے ۱۵ راگست ۱۹۵۴ء کے خصوصی شمارہ میں "اُردو زبان اور کائستھ" کے عنوان کے تحت شائع ہوا تھا۔ اس میں مرحوم درگا سہائے سرور جہان آبادی کے بارے میں منوّر نے ان الفاظ میں اظہارِ خیال کیا تھا۔

"میں ان کو اردو کا ورڈز ورتھ کہا کرتا ہوں۔ میں نے ان کا تتبع کیا ہے۔"[1]

منوّر ہی نہیں فراق گورکھپوری بھی سرور جہان آبادی کو بھارت کا سب سے بڑا قومی شاعر مانتے تھے اور ڈاکٹر اقبال مرحوم بھی سرور جہان آبادی کے علاوہ کسی کو نظم گو شاعر ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔

منوّر لکھنوی کی بیشتر نظمیں اُن کے مذکورہ اعتراف کی تائید کرتی ہیں کہ انھوں نے نظم گوئی کے میدان میں سرور مرحوم کے نقشِ قدم پر چلنا مستحسن مانا۔ اُن کی نظمیہ شاعری اخلاقی اقدار کی استواری، گلستانِ حبِ وطن کی آبیاری اور فرقہ وارانہ تعصبات پر ضرب کاری کے مقدس عمل کی شعوری اور کامیاب سعی معلوم ہوتی ہے۔ ان کی نظموں کا مطبوعہ مجموعہ "کائناتِ دل" اور غیر مطبوعہ شعری تصانیفِ نظم "سوزِ وطن"، "شگفتہ عقیدے" اور "نقوشِ منوّر" اس صداقت پر دال ہیں۔

خود منوّر نے چنڈی گڑھ کے ایک ادبی جریدہ "پاسبان" کو برائے اشاعت عطا کردہ خودنوشت سوانح عمری میں یہ اعتراف کیا تھا:

"جب تک لکھنؤ میں رہا غزلیں کم کہیں، نظمیں زیادہ۔ کیوں کہ ان دنوں طبیعت فطرت پرستی کی طرف مائل رہا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ ورڈز ورتھ، کیٹس، شیلی، فلیش لاہیز اور مسز سروجنی نائیڈو سے بہت زیادہ اثر لیا تھا۔ شروع میں درگا سہائے سرور جہان آبادی کی تقلید پسند تھی..... مگر بعد ازاں منتشی توبت رائے نظر نے اپنے سانچے میں ڈھال لیا۔"[2]

منوّر کی نظمیات میں بیانیہ شاعری کے اعلیٰ ترین نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ نیچرل شاعری، قومی شاعری، اخلاقی اور روحانی شاعری، مذہبی اور تہذیبی شاعری کی نادر ترین مثالیں

---

[1] ہماری زبان۔ شمارہ ۲۲ ر دسمبر ۱۹۸۷ء صفحہ ۲ (مقالہ شبلی اور حالی کے تنقیدی تصورات۔ ایک تقابلی مطالعہ) ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی

[2] ماہنامہ 'پاسبان' چنڈی گڑھ شمارہ مئی ۱۹۵۹ء صفحہ ۲۹ (مقالہ: اکابر اردو ادب)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بھی "کائناتِ دل" میں ملتی ہیں، جو اُس عہد کے بھرپور، توانا اور عہد ساز رجحانات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جن کی پُرزور وکالت، حالی اور آزاد جیسے اصلاح کاروں نے کی تھی۔

"کائناتِ دل" ۳۵۵ صفحات پر مشتمل منوّر کی نظموں کا ضخیم مجموعہ ہے جو رادھیکا پرشاد سکسینہ، بلبلی خانہ دہلی ۶ نے ناشر کی حیثیت سے ۱۹۳۹ء میں شائع کیا۔ یہ نظمیں ۳۲۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ پہلے ۳۵ (اضافی) صفحات اُس عہد کے رواج کے مطابق قطعاتِ تاریخ، مقدّموں، دیباچوں، پیغامات و آرا، فہرست مضامین اور صحت نامہ کے حامل ہیں۔ کتاب کا انتساب منوّر لکھنوی نے اپنی والدہ محترمہ کے نام کیا ہے۔

نظموں کے اس ضخیم مجموعے میں ۱۸۵ نظمیں اور متعدد قطعات و رُباعیات شامل ہیں۔

یہ نظمیں چھ زُمروں میں منقسم ہیں:

۱۔ عام موضوعات پر نظمیں
۲۔ عالم گیر شخصیتیں
۳۔ ذاتی اعتقادات
۴۔ قومی جذبات
۵۔ تراجم
۶۔ ماتمی نظمیں یا نوحے

ابتدائی صفحات میں ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل کا عطا کردہ قطعۂ تاریخ شامل کیا گیا ہے جو نو اشعار پر مشتمل ہے۔ اسی طرح جناب بدھ ناتھ بلی فراقی دریابادی، ابوالفصاحت جوش ملسیانی، سحر ہنگامی، امرناتھ ساحر دہلوی، تربھون ناتھ زار دہلوی، وتستہ پرشاد فدا، منشی چندر بھان کیفی دہلوی، جذب عالم پوری اور ندرت میرٹھی کے دعائیہ اشعار کے بعد جناب شیام موہن لال جگر بریلوی اور منشی چندی پرشاد شیدا دہلوی کی توصیفی نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ اس زمانے میں شاعری کے دواوین کی اشاعت کے سلسلے میں یہ بھی ایک رسم مروجہ تھی۔

علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی، جناب آصف علی بیرسٹر ایٹ لا، منشی گوپی ناتھ امن لکھنوی، کالی چرن آشر اور اختر بریلوی کے مقدّمے اور دیباچے بھی "کائناتِ دل" کی نظموں کی خصوصیات و محاسن کی نشان دہی کرتے ہیں۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

"کائناتِ دل"[1] کی بیانیہ نظموں میں سے "نزولِ حیا"، "لوازمِ انسانی"، "انسانی قالب"، "عرضِ صادق"، "حنا"، "میں کیا کہوں"، "سیتا ہرن" وغیرہ کتنی ہی ایسی نظمیں ہیں جو قاری کے دل و ذہن پر گہرے نقوش چھوڑتی ہیں۔ "نزولِ حیا" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ اس نظم میں مؤثر بیانیہ کے ہم دوش شاعر کی جمالیاتی حس کا اظہار بھی ہے لیکن اس کی جمال پرستی میں پاکیزگی بھی شامل ہے۔

آب و گِل سے جب نمایاں ہو گئے آثارِ حسن — دستِ قدرت نے دیا ترتیب جب گلزارِ حسن

رہ گیا کچھ نامکمّل سازو سامانِ کشش — دل رُبا رنگینیوں سے تھا نہ دامانِ کشش

عشوۂ دمساز بھی تھا غمزۂ غمّاز بھی — ناز بھی پیدا ہوا تھا اس میں جلوہ گرانداز بھی

تاہم ان پھولوں میں شانِ دلرُبائی ہی نہ تھی — کافرانداز میں شامل پارسائی ہی نہ تھی

پھول یہ اک جوہرِ نایاب سے محروم تھے — جوہرِ غلطاں تھے لیکن آب سے محروم تھے

ان گُلوں سے قطرہ زن عطرِ جوانی ہی نہ تھا — تیر تھیں یہ کشتیاں جس میں وہ پانی ہی نہ تھا

چونک اُٹھی قدرت یکایک یہ نظارہ دیکھ کر — اک نظر ڈالی پھر اُس نے حُسن کی تصویر پر

جامۂ نسوانیت سے دے کے اس قالب کو زیب — ایک جوہر اس میں ڈالا آبدار و دلفریب

جنبشیں پلکوں کی تہذیبِ حیا سے رُک گئیں — حسن جاذب بن گیا جس وقت آنکھیں جھک گئیں[1]

اس بیانیہ میں بیان کی شگفتگی اور کلام کی فصاحت ملاحظہ ہو۔ علامہ برج موہن دتاتریہ کیفیؔ حضرت منوّرؔ کی اسی طرح کی نظموں کے حوالے سے فرماتے ہیں:

"ان کا ذوقِ سلیم ندرت آفرینی کے لیے اخلاق کے سنگستان میں ٹھوکریں نہیں کھاتا۔ مذاق کی سلامتی اسی کا نام ہے...... ان کے کلام میں اثر ہے کیوں کہ وہ

---

[1] کائناتِ دل (منوّرؔ لکھنوی) طبع اوّل ۱۹۳۹۔ صفحہ ۵۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

دل کی بات مُنہ سے نکلتے ہیں۔"[1]

نظم "انسانی قالب" میں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

آشکارا ہی نہیں تجھ پہ حقیقت اپنی — دیکھ آئینۂ شفاف میں صورت اپنی
آج تک تو نے جو سمجھا ہے غلط سمجھا ہے — خود کو اک خاک کا پتلا ہی فقط سمجھا ہے
منزلت اس کی ہمیشہ تجھے لازم ہے عزیز — ڈیڑھ دو گز کا یہ ڈھانچہ ہے بڑے کام کی چیز
یہی کعبہ یہی گرجا ہے یہی ہے مندر — کسی معبد سے بھی رتبہ نہیں اس کا کمتر
غور سے دیکھ اگر وا ہے تری چشم یقیں — مزرعۂ تخم عمل اس کے سوا اور نہیں
جس سے بڑھتے ہیں سرِ بام وہ زینہ ہے یہی — پار اُتر سکتے ہیں جس سے وہ سفینہ ہے یہی[2]

مہاکوی تلسی داس نے جسمِ انسانی کو "سوَرگ، نرک، اپ برگ نسینی" کہا ہے۔ یعنی جنت یا جہنم یا نجاتِ ابدی کے بام تک پہنچانے والی سیڑھی۔ منورؔ لکھنوی نے اسی قول کی تائید بھی کی ہے اور مؤثر الفاظ میں اس کی وضاحت بھی۔

ایک اور نظم "سیتا ہرن" میں حُسنِ بیان، نفسیاتی کیفیات کی تفصیل اور تجزیۂ جذبات ملاحظہ ہو:-

اک روز سیرِ دشتِ بہاریں سے شاد کام — سیتا کے ساتھ جلوہ فگن تھے جناب رام
اتنے ہی میں کہیں سے اک آہوئے تیز گام — خوش رنگ، مشک ریز، سیہ چشم، زرد فام

آکر رواں دواں کہیں سن سے نکل گیا
جادو بلا کا جس میں تھا وہ چال چل گیا

سیتا رمِ غزال سے مسرور ہو گئیں — سرمایۂ جمال سے مسرور ہو گئیں
اُس سحر خیز چال سے مسرور ہو گئیں — صہبائے کیفِ حال سے مسرور ہو گئیں

دل میں جگہ تھی بچۂ آہو کے واسطے
مضطر تھیں ایک فتنۂ دلجو کے واسطے[3]

---

[1] کائناتِ دل (منورؔ لکھنوی) صفحہ ۱۰
[2] ایضاً صفحہ ۱۹
[3] ؍؍ ؍؍ ۱۹۳۹۔ صفحہ ۲۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کیا ہندو، کیا مسلم اور کیا دوسرے فرقوں کے مقلد۔ لگ بھگ بھی رامائن کی رزمیہ داستان اور اس کے کرداروں سے تھوڑے بہت واقف ضرور ہیں۔ تعلیم یافتہ قاری نے بیسیوں بار یہ کتھا پڑھی، سُنی ہوگی۔ لیکن منوّر کا بیانیہ، اس کی روانی اور بے ساختگی اس کتھا کے لطف کو دوبالا کر رہے ہیں۔ مایاوی (طلسمی) ہرن کے دل کش بدن اور اعضا کی تفاصیل بیان کرنے کے لیے کتنی پُر لطف تراکیب استعمال میں لائی گئی ہیں۔ خوش رنگ، مشک ریز، سیہ چشم، زرد فام وغیرہ۔ ان اشعار میں بندش کی رواں دواں بحر کی موسیقیت، الفاظ و تراکیب کا صوتی آہنگ، پڑھنے والے کو انوکھے کیف و سرور میں شرابور کر دیتے ہیں۔ "فتنۂ دلجو" اور "سَن سے نکل گیا" کے ٹکڑے کیا نگینے سے خاتم نظم میں جُڑے ہوئے ہیں۔ ہرن چوں کہ سنہری رنگ کا تھا، اِس لیے زرد فام کی ترکیب لائی گئی ہے۔

"کائناتِ دل" میں اس طرح کی بیسیوں بیانیہ نظمیں ہیں جو قاری کو متاثر کرتی ہیں۔ "مَیں کیا ہوں" کے زیرِ عنوان نظم کے ہی کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

وہ مومن ہوں جو مرتا ہے نگاہِ کفر ساماں پر
وہ منکر ہوں جو عاشق ہے جمالِ رُوحِ قرآں پر

وہ ساغر ہوں جو اپنی گردشوں میں محو رہتا ہے
وہ صہبا ہوں برستی ہے جو بیمِ بزمِ رنداں پر

وہ قاتل ہوں خود اپنے قتل کا الزام جس پر ہے
وہ بسمل ہوں تڑپ پیدا ہے جس کی خونِ ارماں پر[1]

اوپر کے اشعار میں منوّر لکھنوی کے صلح کُل عقیدے اور مشربِ انسانیت کی عکّاسی ہے۔ درج ذیل جمالیاتی نظم "حنا" میں شاعر کی نازک خیالی اور رنگینیِ فکر کا ایک انداز دیکھیے۔ منوّر کی حسن پرستی میں بھی طہارت و پاکیزہ خیالی کی لہر نمایاں ہے۔

وفا شناس نہ ہو قدرِ دوستی نہ کرے
ثنائے برگِ حنا خواہ آدمی نہ کرے
بنا کے چور اسے بے وقار بھی نہ کرے
یہ بے خطا ہے اِسے متّہم کبھی نہ کرے
وفا کا رنگ نقوشِ حنا میں بھرتی ہے
یہ رُوح اپنی حسینوں کو نذر کرتی ہے

---

[1] کائناتِ دل، منوّر لکھنوی، صفحہ ۸۸

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

یہ چراغ بن کے یہ روشن ہے دستِ رعنا میں
تجلّیِ مہ نو اس سے ہے کفِ پا میں
عجیب چیز حنا بھی ہے باغِ دنیا میں
طراوت اس سے ہے پیدا دلِ مسیحا میں

اسی کا رنگ نمایاں جمال میں دیکھا
کسی حسین کو جہاں برشگال میں دیکھا[۱]

نیچرل شاعری یا حسنِ فطرت کی منظر نگاری کے بھی بہترین نمونے "کائناتِ دل" میں ہماری دلچسپی کا محور بنتے ہیں۔ ایسی کچھ منتخب نظمیں پنجاب یونیورسٹی کے ادیب عالم کے نصاب میں برسوں تک شامل رہیں۔ ادیبِ عالم کے طلبا کے لیے "کائناتِ دل" کا ایک چھوٹے سائز کا نصابی ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں آدرش کتاب گھر بلبلی خانہ دہلی کے زیرِ اہتمام شائع کیا گیا تھا۔ منظر یا حسنِ فطرت کی عکاسی سے بھرپور نظموں میں منوّر کی نظم "طاؤس" بہت پسندیدہ نظم ہے۔ آزادیِ وطن کے بعد بھارت کے طیوّر میں سے حسین ترین پرندے مور کو سرکاری طور پر قومی پرندہ (راشٹریہ پکھشی) کا درجہ عطا کیا گیا۔ پرندوں کے اس سرتاج نے منوّر کے دل کو بہت پہلے موہ لیا تھا۔ اس کے اوصافِ باطن اور حسنِ ظاہر دونوں نے شاعر کو حد درجہ متاثر کیا۔ نگارِ فطرت کی آرائش و زیبائش اور مناظرِ قدرت کے حسن و جمال میں اضافہ کرنے کے عمل میں نباتات، اشجار، پھول، کلیاں اور وحوش و طیور ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ منوّر مور کو مخاطب کرکے اپنی نظم میں کیا کیا موشگافیاں کرتے ہیں، ملاحظہ ہو۔

ہے شہنشاہِ طیورِ عالمِ اسباب تو
اک پرندہ ہے ریاضِ دہر میں نایاب تو
تیرا ہمتا کوئی تیری شان و شوکت میں نہیں
یہ لباسِ فاخرہ شاہوں کی قسمت میں نہیں
ہمسرِ بابر، ہمایوں فال، اکبر مرتبہ
ہے جہانگیری میں تیرا سب سے بڑھ کر مرتبہ
تو ہے اک شاہ جہانِ حسن و عالمگیر ناز
تجھ کو قدرت نے پرندوں میں کیا ہے سرفراز
پنکھیاں تیرے پروں کی نازنینوں کو پسند
کلغیاں تیری ہیں چنچل مہ جبینوں کو پسند
ہے ترا مسعود منظر، اک شگون اچھا ہے تو
دیدۂ ہندو میں باہمن سرسوتی کا ہے تو[۲]

---

[۱] کائناتِ دل (منوّر لکھنوی) صفحہ ۱۰

[۲] کائناتِ دل (منوّر لکھنوی)۔ صفحہ ۵۲-۵۳

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہندو دیومالائی کرداروں میں طاؤس (مور) کو دیوی سرسوتی (علم و ادب کی دیوی) کا باہن (سواری) تسلیم کیا گیا ہے۔ اس نیک فال پرندے کے اوصاف گنواتے ہوئے منوّر نے ایک طرف خاندانِ مغلیہ کے حکمرانوں بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور عالمگیر وغیرہ کے ناموں سے کام لیا ہے تو دوسری جانب ہندوؤں کے اساطیری ادب میں سے حوالے دے کر اسے سعادت و عظمت کی علامت ٹھہرایا ہے۔

"کائناتِ دل" میں منظر نگاری کی دوسری حسین مثالوں میں "طلوعِ سحر"، "سورج مکھی کا پھول"، "بادل"، "کوئل"، "گنگاجی" وغیرہ نظمیں ہیں۔ دیکھا جائے تو قدرت انسان کی زندگی میں صرف شریکِ غم ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کی چارہ سازی، دل جوئی اور رہنمائی بھی کرتی ہے۔ اس لیے اسلام کی مقدس کتاب میں قدرت کے مطالعے اور مشاہدے کے لیے بار بار تلقین کی گئی ہے۔ اردو کے نامور شاعر جوش ملیح آبادی نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ:-

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے
اگر رسولؐ نہ ہوتے تو صبح کافی تھی[1]

منوّر نے بھی صبحِ صادق کے منظر کی پاکیزگی اور عظمت کو نظم کیا ہے۔ "طلوعِ سحر" کے کچھ اشعار دیکھیے:-

نورِ حق کا جلوہ گسترِ گلشن و صحرا میں ہے
نغمہ پردازی کا جس کی غلغلہ دنیا میں ہے

آگ سی جس نے لگا دی چادرِ دریا میں ہے
بھیروی ترشول دستِ نازکِ اوشا میں ہے

وسعتِ ارض و سما میں شان سے استادہ ہے
اس کی نورانی ادا کا اک جہاں دلدادہ ہے

کھل گئی ہے ڈوریوں پر رسم و راہِ التفات
خلق نے اندیشۂ رہزن سے پائی ہے نجات

سُرمہ آلودہ تھی رنگِ شب سے چشمِ کائنات
لائی ہے شبنم طہارت کے لیے آبِ حیات

باغِ جنت کی ہوائیں سحر دم کرنے لگیں
اہلِ عالم کی رگوں میں بجلیاں بھرنے لگیں

مرد و زن اذنِ نسیمِ روح پرور سے اُٹھے
کھول دیں آنکھیں، ہوئے بیدار، بستر سے اُٹھے

پاؤں سیرِ صبح گاہی کے لیے گھر سے اُٹھے
وَلوَلے دل میں طلوعِ مہرِ انور سے اُٹھے

---

[1] ماہنامہ "شاعر" بمبئی۔ شمارہ مارچ ۱۹۷۹ء (جلد ۵۰ - شمارہ ۳) صفحہ ۲۳

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

روح کو تسکیں ہوئی حاصل مسرت چھا گئی
کاروبارِ زندگی میں جانِ تازہ آگئی [1]

اس نظم کے مطالعے سے خوشی محمد ناظر کی اس مشہورِ زمانہ نظم کے رواں دواں اشعار بے اختیار یاد آجاتے ہیں جو لڑکپن میں راقم الحروف نے آٹھویں درجے کی نصابی کتاب "مرقعِ ادب" میں پڑھی تھی۔ میری پیڑھی کے ہزاروں اردو پڑھے لکھے لوگوں کو یہ نظم اپنی موسیقیت، قافیوں کے صوتی آہنگ، شیریں اور مترنم بحر کے کارن ازبر تھی۔ ملاحظہ ہو ناظر کی مذکورہ نظم کے مصرعوں میں کیا روانی ہے:

کل صبح مطلعِ تاباں سے جب عالم بقعہ نور ہوا
سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
مستانہ ہوائے گلشن تھی، جانانہ ادائے گلبن تھی
ہر وادی وادیٔ ایمن تھی، ہر کوہ پہ جلوہ طور ہوا
جب بادِ صبا مضراب بنی، ہر شاخِ نہال رباب بنی
شمشاد و چنار ستار بنے، ہر سرو و سمن طنبور ہوا

اگرچہ منوؔر کی نظم "طلوعِ سحر" میں وہ روانی، بے ساختگی، موسیقیت اور صوتی توازن نہیں جو ناظر کی مذکورہ بالا نظم "جوگی" کا طرۂ امتیاز ہے۔ لیکن منظر کشی کے لحاظ سے "طلوعِ سحر" ایک عمدہ نظم ہے۔

منوؔر لکھنوی کی نظم "بادل" کا پہلا بند ملاحظہ ہو:۔

اے دلِ دیوانہ زیرِ دامنِ کہسار دیکھ
دُر فشانی کر رہا ہے ابرِ دریا بار دیکھ
کون تسخیرِ دو عالم کو ہوا تیار دیکھ
اِک نگارِ نازکی یہ شوخیِ رفتار دیکھ
یوں سمندر سے فلک پر جھوم کر بادل چلے
کامنی جس طرح کوئی بھر کے گنگا جل چلے [2]

---

[1] کائناتِ دل (منوؔر لکھنوی) صفحہ ۱۵-۱۶

[2] ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۲۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

حسنِ فطرت کی پرستش انسان کی رُوح کی غذا ہے۔ یہ سرشت ہی سے حسنِ قدرت کا والا و شیدا رہا ہے۔ ڈاکٹر فضل امام رضوی کے الفاظ ہیں:

"فطرت ہی اس کے مجروح دل کے لیے مرہم کا کام کرتی ہے۔ چناں چہ مداوائے غم و رنج آغوشِ فطرت ہی بنتی ہے۔ قرانہ قدرت کی بیش بہا نعمتوں سے کون منہ موڑ سکتا ہے۔ دن رات، پیشِ نظر ہواؤں کا چلنا، سبزے کی شادابی اور لہک، فلک پر شفق کی سرخیاں، جھرنوں کے نغماتِ طرب افزا، کہساروں کے فرحت بیز راستے، پہاڑوں کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں، کرنوں کا تاجِ زریں، کھلائے رنگ رنگ کی دلکشی اور دلفریبی سے کون کفرانِ نعمت کرنے والا ہے۔" [1]

چناں چہ ہندوستانی شاعری میں زمانۂ قدیم سے منظر نگاری ہندی اور سنسکرت کے شعرا کا محبوبِ عمل رہا ہے۔ سنسکرت میں بالمیکی رامائن، مہابھارت، کالی داس کے کھنڈ کاویہ" میگھ دُوت" اور تمثیل "وکرم اُروشی"، بھوبھوتی کے ناٹک "مالتی مادھو" اور ہندی میں اپ بھرنش کال کے کویوں میں سویم بھو کی نظم "منڈپ چاریو"، پشپ ونت کی نظم مہاپُران، بھگتی کال اور ریتی کال کے متعدد کویوں کی نظمیں اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ سنسکرت اور ہندی شاعری میں حُسنِ فطرت کی منظر نگاری حقیقی ہے، اور تصنّع اور تکلّف سے مُبرّا۔ اس کے برعکس اُردو کی قلیل المقدار منظریہ شاعری میں حقیقت کے بہ مقابلہ تصنّع زیادہ ہے اور اس ضمن میں اردو شعرا نے عربی اور فارسی کی شاعری کی منظر نگاری کا تتبع کیا ہے۔ کیوں کہ اردو شعرا فارسی شاعری سے بہت زیادہ مرعوب رہے۔ لہٰذا وہ تصنّع اور مبالغہ آرائی سے دامن نہیں بچا سکے۔

حسنِ اتفاق سے منوّر کی گہری نظر سنسکرت شاعری پر رہی ہے اور اس کا مطالعہ اس سلسلے میں کافی وسیع رہا۔ انھوں نے سنسکرت کے متعدد شہرۂ آفاق ناٹکوں کے ترجمے بھی کیے۔ لہٰذا منوّر لکھنوی کی منظریہ شاعری حقیقت کے بہت قریب ہے۔ مثلاً مذکورہ بالا نظم "بادل" کا یہ شعر دیکھیے:

یوں سمندر سے فلک پر جھوم کر بادل چلے　　　کامنی جس طرح کوئی بھر کے گنگا جل چلے

---

[1] ماہنامہ "شاعر" بمبئی۔ جلد ۵۰۔ شمارہ ۳۰۵۔ ۱۹۷۹ء۔ صفحہ ۱۸

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

مصرعہ ثانی کی تشبیہ کس قدر حقیقی ہے اور خالص ہندوستانی مزاج اور سنسکرت شاعری کا لب و لہجہ رکھتی ہے۔

نظم "سورج مکھی کا پھول" میں منوّر کا تخیّل کیا جولانیاں دکھاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

سورج مکھی کا پھول شگفتہ چمن میں ہے — یا شمع جلوہ پاش کسی انجمن میں ہے
پیدا جو اس میں بات ہے سورج کہاں سے لائے — یہ آن بان اور یہ سج دھج کہاں سے لائے
قدرت نے اپنی شان دکھائی اسی میں ہے — برقِ تپاں سمٹ کے سمائی اسی میں ہے
بیٹھا ہے اک رئیس جواں تختِ شان سے — خورشید تک رہا ہے اسے آسمان سے[۱]

ڈاکٹر سلام سندیلوی اپنے تحقیقی مقالہ "اردو شاعری میں منظر نگاری" میں ہڈسن، رسکن اور مجنوں گورکھپوری کے حوالوں سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:-

"فطرت نہ تو کبھی مسرور ہوتی ہے اور نہ غمگین۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شاعر جس عالم میں ہوتا ہے وہی عالم اس کو فطرت میں نظر آتا ہے۔ اصل میں فطرت کا چہرہ تو ایک سادہ ورق ہے۔ شاعر اپنے جذبات کی روشنی میں اُس پر مختلف خط و خال کھینچ دیتا ہے۔ وہ اس کی رنگین نگاہوں کے اثر سے کبھی رنگین ہو جاتی ہے اور غمگین نگاہوں کے اثر سے کبھی غمگین نظر آتی ہے۔ ایسے موقع پر شاعر کسی سائنسی صداقت کا اظہار نہیں کرتا بلکہ شاعرانہ صداقت کی توضیح کرتا ہے۔"[۲]

واقعی شاعر قدرت کو اپنے جذبات کی نگاہ سے دیکھنے کے لیے دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے کیوں کہ اس کی قوتِ متخیلہ عام انسانوں سے زیادہ رسا ہوتی ہے اور حساس دلی مسلّم۔ ڈاکٹر سلام کے مذکورہ بالا حوالے کی صداقت کو منوّر کی نظم "ٹیسو کا پھول" میں عکس ریز دیکھا جا سکتا ہے۔ جہاں منوّر لکھنوی ٹیسو کے سرخ رنگ کی کیا کیا تاویلیں اپنے تخیّل سے تراشتے ہیں۔ یہاں شاعر کی اپنی قلبی واردات اور ذاتی غم و ملال ٹیسو کی سرخ رنگت میں پرتو فگن نظر آتے ہیں۔ پہلے بند میں شاعر کہتا ہے:-

اللہ اللہ رے حسنِ زیبائی — اللہ اللہ رے شانِ رعنائی

۱؎ کائناتِ دل (منوّر لکھنوی) طبع اوّل ۱۹۳۹ء صفحہ ۳۴

۲؎ اردو شاعری میں منظر نگاری (ڈاکٹر سلام سندیلوی) ایڈیشن ۱۹۷۸ء صفحہ ۴۹۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

آگ گویا لگی ہے جنگل میں
ایک ہلچل مچی ہے جنگل میں
آتش افروزِ رشک تیری بہار
جل مرے حسن دیکھ کر یہ چنار [1]

لیکن دوسرے بند میں شاعر کا لہجہ اور اندازِ فکر اپنی وارداتِ قلبی سے اثر پذیر ہو کر یکسر بدل جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے :-

کیوں ہے رونا لہو گل رنگیں
کس سے پھوٹا ہے تو گلِ رنگیں
کون دشمن ہوا ترے دل کا؟
خون کس نے کیا ترے دل کا؟
رحم نازل کرے خدا تجھ پر
میں بھی تیری طرح ہوں نفتہ جگر
پھول ٹیسو کے، ماجرا ہے کیا؟
کسی سے کس بات پر ہے اتنا خفا؟
اس قدر تیرا چہرہ لال ہے کیوں؟
اس قدر تجھ کو اشتعال ہے کیوں؟
کون ہے تجھ کو چھیڑنے والا؟
بخیۂ ہوش اُدھیڑنے والا؟
آگ ہے شعلہ ہے بھبھوکا ہے؟
کیوں نزول آنکھ میں لہو کا ہے؟ [2]

منوّر لکھنوی اخلاق اور رُوحانی معراج کے اور رفعتِ کردار کے مبلّغ بھی تھے اور خود اس کے ایک مثالی پیکر بھی۔ ان کی رباعیات، غزلیات اور بالخصوص نظمیہ شاعری اخلاقی اسباق اور روحانی اسرار سے مالامال ہے۔ "کائناتِ دل" کے علاوہ ان کے غیر مطبوعہ نظمیاتی مجموعوں "سوزِ وطن"، "تاثرات" اور "شگفتہ عقیدے" میں ایسی شاعری کی اعلیٰ ترین مثالیں دستیاب ہوتی ہیں۔ ان کی نظموں میں فلسفیانہ مسائل، معرفت کے رموز، دنیا کی بے ثباتی، گردشِ روزگار، تغیّرِ زمانہ، روحِ انساں کی توقیر و عظمت اور انسانی پیکر میں جنم لینے (یعنی رحمتِ حق سے انسانی چولا عطا کیے جانے) کی سعادت کے موضوعات پر بہترین تخلیقات ملتی ہیں۔ اُن کے لیے شاعری بذاتِ خود ایک پرستش اور مقدّس فریضہ ہے اور علوِ کردار کی تبلیغ اس کا مقصد ہے جیسا کہ "کائناتِ دل" کی اوّلین دعائیہ نظم "عرضِ صادق" سے روشن ہے۔ فرماتے ہیں :

اگر ہو ننگِ خلائق جہاں میں ذات مری
نہ کام آئے کسی کے اگر حیات مری

---

[1] کائناتِ دل (منوّر لکھنوی)، طبع اوّل۔ صفحہ ۱۱۶

[2] " " " " ۱۱۶ – ۱۱۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اگر مجھے روشِ ارتقا پسند نہ ہو — مرے وجود کا معیار اگر بلند نہ ہو
مرا اصول جو دنیا میں شاندار نہ ہو — مرا سلوک جو دنیا کو سازگار نہ ہو
زبان و دل میں نہ یا رب مطابقت ہو اگر — نہ قول و فعل میں باہم موافقت ہو اگر
کبھی جو کام میں جذبِ وفا سے لے نہ سکوں — جو اپنی جان مفادِ دگر پہ دے نہ سکوں
جو مری عمر گزرتی ہو خود پرستی میں — گرا رہا ہوں اگر روح کو بھی پستی میں

متاعِ جلد ہو برباد میری ہستی کی
گھٹا دے شوق سے میعاد میری ہستی کی ؎۱

منور اُن اہلِ قلم میں سے تھے جن کے قدم مذہب کی زمین پر مضبوطی سے جمے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اِس لحاظ سے منفرد کردار کے شاعر تھے کہ ان کے ادراک و شعور کا رشتہ ایک طرف کٹر سناتنی دھرم عقائد سے تھا تو دوسری جانب اسلامی نظریہ حیات کے بھی وہ معترف و مداح تھے۔ اِسی لیے انھوں نے ان اخلاقی و رُوحانی اقدار و عقائد کی تبلیغ کو اپنا نصب العین بنایا جو آفاقیت پر اساس پذیر ہیں اور جو تمام بنی نوعِ انسان کی فلاح و عافیت کی ضمانت دیتے ہیں۔ مذہبی عقائد سے روگردانی کر کے کوئی بھی صنفِ ادب انسانیت کی مثبت خدمت نہیں کر سکتی۔

"کائناتِ دل" میں متعدد نظمیں ان رُوحانی اور اخلاقی عقائد کی وضاحت و تلقین کرتی ہیں، مثلاً "ضمیر کی آواز"، "نعرۂ وحدت"، "دیکھ"، "نکاتِ ارفع"، "لوازمِ انسانی"، "جوہرِ ایثار"، "ترغیبِ ارتقا"، "انسانی قالب"، "برہمچرج"، "انسان کی خونخواری"، "بے ثباتیِ دنیا"، اور اسی قبیل کی بعض دیگر نظمیں۔ نظم "ضمیر کی آواز" کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

صدا ضمیر کی رکھتی ہے شانِ حکمِ خدا — ضرر کبھی کوئی اس سے پہنچ نہیں سکتا
بلا سے آئے مٹانے تمھیں بلا کوئی — ہلاکِ تیغ کرے کاٹ لے گلا کوئی
پہاڑ ٹوٹ پڑیں خواہ آندھیاں آئیں — فلک سے خواہ مہ و مہر آگ برسائیں
مگر نہ حرفِ شکایت زبان پر لانا — جو کچھ ضمیر بتائے وہی کیے جانا
جہاں ضمیر پرستی میں آزما لے گا — خدائے پاک تمھیں آ کے خود بچا لے گا ؎۲

؎۱ کائناتِ دل (منور لکھنوی) طبع اوّل، صفحہ ۱
؎۲ ایضاً " " " ۹۳-۹۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منوّر لکھنوی کا اندازِ فکر کتنا پاکیزہ ہے اور اظہار کا اسلوب کتنا واضح اور روشن، مذکورہ بالا نظم کے علاوہ ذیل میں دیے گئے کچھ اخلاقی اور رُوحانی نظموں کے منتخب اشعار میں ملاحظہ فرمائیے، کیا کوثر و تسنیم سے دھلی اور شستہ زبان ہے ان اشعار کی :-

مہِ پُر نور ہوں مَیں مہرِ درخشاں ہوں مَیں
ذرّہ ذرّہ میں ضیا بن کے نمایاں ہوں مَیں

حُسن بن کر مَیں نمایاں رُخِ محبوب میں ہوں
شرم بن کر مَیں ہویدا دلِ محبوب میں ہوں

شُورِ ما جنگ میں ہوں مائلِ پیکار ہوں مَیں
بُرّشِ فرقِ عدو کے لیے تلوار ہوں مَیں

شمعِ سوزاں بھی ہوں، پروانۂ محفل بھی ہوں
مَیں مسافر ہوں مسافر کی منازل بھی ہوں

میزباں ہوں مَیں کہیں اور کہیں مہماں ہوں مَیں
یوں ہی ہر چیز میں ہر سمت نمایاں ہوں مَیں [۱]

(نعرۂ وحدت)

اَے جُرعہ کشِ ایاغِ ہستی
اے عاشقِ سبز باغِ ہستی

چاروں طرف اپنے اِک نظر ڈال
دنیا کا بغور دیکھ سب حال

ہر سمت بچھا ہے وہم کا دام
ہر شے کا فنا ہے انجام

یہ ماہ و شما کی رشتہ مندی
اقبال کی پستی و بلندی

یہ قصر حویلیاں عمارات
یہ مرتبہ، اوج یہ خطابات

یہ شان و شکوہ یہ مراتب
یہ حسن وصفات یہ مناقب

یہ فہم و خرد، یہ عقل و ادراک
یہ خلعتِ فاخرہ یہ پوشاک

جن پر تجھے ناز اِس قدر ہے
کچھ ان کے مآل کی خبر ہے؟

سامان جتنے بھی دل نشیں ہیں
نیشِ عقرب سے کم نہیں ہیں [۲]

(بے ثباتیِ دنیا)

مذکورہ نظم "بے ثباتیِ دنیا" میں نفسِ مضمون کی صحت و صداقت تو مسلّم ہے ہی لیکن اس میں بیان کیے گئے حقائق کی وضاحت کے لیے جو دلائل زبان و بیان کی جملہ لطافت و بلاغت کے ساتھ بروئے کار لائے گئے ہیں، مثنوی کی بحر میں قاری کو مزا بھی دیتے ہیں اور اُس کے دیدۂ دل کو

۱؎ کائناتِ دل (منوّر لکھنوی) صفحہ ۱۳۷

۲؎ ایضاً " " ۱۳۵-۱۳۶

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

واضح کرتے ہیں۔ حسنِ تشبیہ، بندش کی چستی اور پختہ کلامی دیدنی ہے۔
اسی ضمن میں نظم "لوازم انسانی"، کے چند اشعار دیکھیے:۔

مردِ میداں بھی اگر ہو تو اُسے ہیز سمجھ — دلِ سرکش کو جو مجبورِ اطاعت نہ کرے
وہی مومن ہے بجالائے جو ارشادِ ضمیر — کچھ غم اس کا نہیں پروائے شریعت نہ کرے
وہ بہادر نہیں جرّار نہیں، مرد نہیں — بے پناہوں کی جو ظالم سے حفاظت نہ کرے
ستم و جور کو بنیادِ حکومت نہ بنائے — کون کہتا ہے کہ انسان حکومت نہ کرے[1]

یہ نظمیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ منوّر لکھنوی کو اخلاقی قدروں اور رُوحانی ادب کی اہمیت وعظمت کا مکمل احساس تھا۔ ایسا ادب انسان کو راہِ مستقیم پر لانے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اسے گمراہی سے دُور رکھ کر صالح اور پاکیزہ اقدارِ عمل کی ترویج کے لیے ترغیب و تحریک دیتا ہے۔ جس اُدب سے انسان کے کردار میں جوشِ عمل، غور و فکر کی قدرت، پاکیزہ نفسی، حوصلہ مندی، پامردی، شجاعت، اولوالعزمی اور صالح ضابطہ حیات کو اپنانے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ وہ ادب درحقیقت انسان کے لیے فتح و نصرت کا پیش خیمہ، شہرت، ناموری، استدلال و استقلال، مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا ضامن ہوتا ہے۔ ایسا ادب کُل عالمِ انسانیت کے لیے ایک پیغام و بشارت کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسے ادب کی ہر دَور میں ضرورت اور اہمیت رہتی ہے۔ لیکن صد حیف کہ آج انسانیت کُشی کے دَور میں اِس جنس کے خریدار بہت کم ہیں۔ ایسا ادب جنس نایاب ہوتا جارہا ہے۔ جبکہ ادب کے نام پر مختلف زبانوں میں خرافات وفضولیات کا طومار نظر آتا ہے جو ہماری خارجی اور داخلی زندگی کو توازن اور اعتدال کی بجائے مزید انتشار اور بحران میں مبتلا کر رہا ہے۔

"کائناتِ دل" کا شاعر محض زاہدِ خشک ہی نہیں تھا۔ نہ وہ جمالیاتی ذوق سے عاری تھا۔ اخلاقی اور رُوحانی موضوعات کے ساتھ ساتھ منوّر لکھنوی کے کلام میں جمالیاتی اور رُوحانی عناصر بھی قاری کے لیے دامن کشِ دل بنتے ہیں۔ وہ حُسنِ حقیقت اور حُسنِ مجاز دونوں سے متاثر ہوتے تھے۔ وہ محض اُپدیشک یا واعظِ تنگ نظر نہیں تھے۔ "کائناتِ دل"، ہی میں منوّر کی متعدد بلند پایہ رومانٹک نظمیں بھی شامل ہیں لیکن ان میں بھی ایک احتیاط اور تہذیبِ عشق کا

---

[1] کائناتِ دل (منوّر لکھنوی) صفحہ ۵۰

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

پہلو نمایاں ہے۔ ان کی ایک نظم "اشاراتِ شوق" میں سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

غیر سے آنکھ ملانا بھی گوارا کیوں ہو جو ہمارا نہ ہو آخر وہ ہمارا کیوں ہو
جسے منظور نہ منظورِ نظر ہونا تھا دیدۂ شوق کو پھر اُس کا نظارا کیوں ہو

ہائے اُس جانِ تمنّا کا منوّرؔ دیدار
جس سے آبادیِ آغوشِ تمنا نہ ہوئی
ہو گئے خاک بھی ہم سوزِ محبت سے مگر
آگ یہ دل میں اُدھر نام کو پیدا نہ ہوئی
پردہ پردہ میں رہا شغلِ پرستاریِ حسن
نہ ہوئی ہم سے منوّرؔ کبھی توبہ نہ ہوئی [۱]

"کائناتِ دل" ہی کی ایک اور جمالیاتی نظم میں منوّرؔ نے کسی نگارِ نازنین کے جسمانی حسن و جمال کی جزئیات کی تصویرکشی کس نفاست اور چابک دستی سے کی ہے اور کس طرح گوشے گوشے اور زاویے زاویے کو اُبھارا ہے، ان اشعار میں ملاحظہ ہو۔ شاعر کا مشاہدہ کتنا گہرا ہے اور جزئیات نگاری کتنی مشاقی سے کی گئی ہے۔ اگرچہ ان اشعار میں محض ایک تصویر گر کو ہدیۂ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ نظم کا عنوان ہے "پریم ناؤ"

چوم لوں آ اِدھر اے خامۂ نقّاش تجھے کہہ رہا ہوں تری ندرت پہ میں شاباش تجھے
داد تو نے فنِ تصویر کی کیا کیا دی ہے نقش ہر اک ترے اعجاز کا فریادی ہے
تو نے تصویر یہ کھینچی کہ ستم ڈھایا ہے خامۂ مانی و بہزاد کو شرمایا ہے
سبزہ زاروں کی فضا خوب ہویدا کی ہے بات دریا کی روانی میں بھی پیدا کی ہے
جو ادھر مائلِ پرواز طیور آتے ہیں پیاس دریا میں بجھانے کو ضرور آتے ہیں
چھیڑ دیتا ہے انھیں دستِ حنائی کوئی اپنے دیدوں کی دکھاتا ہے صفائی کوئی
جس کی آرائشِ گیسو میں ہیں اندازِ ستم خمِ محراب کا ابرو میں ہے جس کے عالم
جس کی ہر آنکھ میں پنہاں کوئی قتالہ ہے حسنِ رُخ جس کا کوئی شعلۂ جوالہ ہے
کان میں جس کے ہیں پھولوں کے جڑاؤ کنڈل ناک جس کی ہے کوئی سنگِ بلوریں کا محل

---

[۱] "کائناتِ دل" (منوّر لکھنوی) صفحہ ۱۳۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

جسم کا سینہ ہے نہاں پردۂ زنگاری سے — ہے تکلّف جیسے محرم کی گرانباری سے
زیب دیتی ہے شکم سے کفِ پا تک ساری — دستِ صنّاع کی ہے جس سے عیاں گلکاری
مسندِ گُل پہ جو لیٹی ہوئی راحت سے ہے — سیرِ دریا میں جو مشغول مسرت سے ہے
دیکھتی چشمِ عقیدت سے ہے جس کا انداز — شوق سے جانبِ پائیں کوئی مصروفِ نیاز
ناؤ میں اپنی محبت سے بٹھایا ہے اُسے — زینتِ کشتیِ آغوش بنایا ہے اُسے
اے مصوّر تری صنعت کا میں راز اَب سمجھا — جو ترے دل میں ہے مستور وہ مطلب سمجھا
جو ندی اِس میں بہائی ہے ندی پریم کی ہے — جو ندی تو نے بنائی ہے ندی پریم کی ہے
روغن و رنگ سے ہے پریم کا اس میں اظہار — پریم ہی ناؤ ہے اور پریم ہی اس میں ہے سوار [1]

یوں تو منوّر لکھنوی کی مزید کئی جمالیاتی نظمیں "کائناتِ دل" اور اُن کے دیگر شعری مجموعوں کی زینت بنی ہیں۔ لیکن ایک نظم "اُپلے والی" کا ذکر بطورِ خاص منشی گوپی ناتھ امن نے "کائناتِ دل" کے مقدمے میں کیا ہے۔ امن فرماتے ہیں :-

"مثال کے طور پر ایک نظم "اُپلے والی" دیکھیے۔ ۱۹۳۵ء میں جے پور میں ایک عالی شان مشاعرہ ہوا تھا۔ میں بھی اُس میں گیا تھا۔ منوّر صاحب بھی تشریف لے گئے تھے۔ راستے میں انھوں نے ایک حسینہ کو دیکھا۔ یہ نظم اُسی کے متعلق ہے۔ حُسن اور اُس کی اداؤں کا دلفریب منظر کھینچا ہے مگر عام شاعروں کی طرح بوالہوسی نہیں پائی جاتی۔" [2]

اس نظم کا عنوان ہے "راجپوتی حُسن یا اُپلے والی" وہ ایک اہیرن یا گوالن تھی اور اُپلے سر پر اُٹھائے تھی لیکن اُس کا حُسن وشباب نگاہوں کو خیرہ کرتا تھا۔ اس نظم کے کچھ منتخب اشعار دیکھیے :

اِک چاند بھی مگر اس جھرمٹ میں جلوہ گر تھا — تھی تاج کی عمارت یا قالبِ بشر تھا
پتھر کی مورتی میں پڑتی تھی جان جس سے — چکّر میں آ رہے تھے ہفت آسمان جس سے
شیریں بیانیاں تھیں رنگیں نوائیاں تھیں — ملبوسِ پارسا میں کافر ادائیاں تھیں
محشر خرامیاں تھیں رعنائیوں میں اس کی — تھا ماہِ نَو کا پَرتو انگڑائیوں میں اس کی
انداز تھا انوکھا، تھی ہر اَدا اَچھوتی — پلکیں چلا رہی تھیں تلوار راجپوتی

---

[1] "کائناتِ دل"، (منوّر لکھنوی)۔ طبع اوّل۔ صفحہ ۱۲۹۔۱۳۱
[2] ایضاً " " ۲۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اُپلوں کا ٹوکرا اِک رکھا ہوا تھا سَر پر
سینے پہ بوجھ تھا کچھ، کچھ بوجھ تھا کمر پر

زیور نہ زیبِ تن تھے پھر بھی سجی ہوئی تھی
نازک بدن بھی ایسی گویا چھوئی موئی تھی

اِس نازکی میں لیکن شامل تھا بانکپن بھی
پھولوں کی شاخ میں تھے تلوار کے چلن بھی

تھی آن کی پُجارن یہ بات کی دُھنی تھی
عفّت میں لکشمی تھی، عصمت میں پدمنی تھی

دامانِ بوالہوس کو پیروں سے روندتی تھی
خرمن پہ معصیت کے بجلی سی کوندتی تھی

بھُولے سے بھی جو آکر اس کو وہ چھیڑ دیتی
پیراہنِ صبا کے بخیے اُدھیڑ دیتی

عصمت کے بوستاں کی ایک منہ بندھی کلی تھی
صرف اپنے کرشن ہی کی رادھا وہ لاڈلی تھی [1]

یہ پوری کی پوری نظم سہلِ ممتنع کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ جمالیاتی ذوق، پاکیزگی اور معصوم نگاہی، نسوانی وقار کا ارفع احساس سب کچھ اس نظم میں پَرتو فگن ہے۔ کئی مصرعے تو شاعرانہ تعلّی کی پُرلطف لیکن حقیقت آمیز مثالیں ہیں جیسے :-

ع پلکیں چلا رہی تھیں تلوار راجپوتی

ع پھولوں کی شاخ میں تھے تلوار کے چلن بھی

ع پیراہنِ صبا کے بخیے اُدھیڑ دیتی

اکثر مصرعے یوں لگتے ہیں جیسے ٹکسال میں گھڑے ہوئے جگمگاتے ہوئے سکّے۔ موزوں الفاظ کی نشست ہر مصرعے کے لطف کو دوبالا کر رہی ہے۔

"کائناتِ دل" میں ایک خاصی تعداد قومی نظموں کی ہے۔ ان میں سے کچھ تو ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تاریخ کے مختلف مراحل اور اہم واقعات سے متعلق ہیں اور کچھ تحریکِ آزادی کے محرک وَلوَلہ انگیز نعروں اور شخصیات سے۔ کھدّر پہننے کی جو تحریک مہاتما گاندھی نے شروع کی تھی، کسی حد تک بدیشی موضوعات کے بائیکاٹ کے نعرے سے منسلک تھی۔ لاکھوں ہندوستانیوں نے گاندھی جی کے اس نعرے کو لبیک کہا۔ منوّر لکھنوی نے نہ صرف کھدّر کی شان میں نظم کہی، جو کائناتِ دل" میں شامل ہے بلکہ عملی طور پر خود بھی زندگی بھر کے لیے کھدّر کو اپنا لیا۔ اس نظم کا ذکر علّامہ کیفی مرحوم نے کائناتِ دل" کے دیباچے میں بطورِ خاص کیا ہے۔ اس نظم کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں :-

کھدّر کے برابر کوئی کپڑا ہی نہیں ہے
اس کا تو مقابل کہیں پیدا ہی نہیں ہے

ہوں خوبیِ تقدیر سے پھر اس کے پھرے ہیں
کمخواب و زربفت نگاہوں سے گرے ہیں

---

[1] کائناتِ دل (منوّر لکھنوی)۔ صفحہ ۶۲-۶۳

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

یہ پان سے ہلکا ہے، سبک ہے گُل تر سے — اِس وصف میں گر جائے گا ریشم بھی نظر سے
حاصل ہوا رتبہ اِسے ملبوسِ وطن کا — پردہ ہے نگاہوں میں یہ ناموسِ وطن کا
ہوگا نہ جُدا زیست میں کھدّر کبھی تن سے
مرتے پہ بھی لپیٹیں گے تو کھدّر کے کفن سے [1]

دیگر قومی نظموں میں "تمام عمر خدایا وطن پرست رہوں"، "افراط و تفریط"، "وطن پرستی"، "ملک کی موجودہ حالت"، "وطن فروش سے خطاب"، "صدقہ"، "مبارک آرزو"، "مہاتما گاندھی سے"، "مہارانی لکشمی بائی"، وغیرہ نظمیں قابلِ ذکر ہیں۔ "کائناتِ دل" میں کچھ منظوم ترجمے بھی شامل ہیں۔ ان تراجم کے لیے بھی منوّر لکھنوی نے کچھ قومی نظموں کا انتخاب کیا۔ مثلاً "مادرِ وطن کے قدموں پر"، "پیارا وطن"، وغیرہ۔ کتاب کے آخری حصّے میں "اشکِ خوں"، میں کچھ عظیم اَدبی شخصیات نیز مولانا محمد علی اور موتی لال نہرو جیسے اہم سیاسی لیڈروں کے نوحے بھی شامل ہیں۔ ان سب منظومات میں منوّر کی مذہبی عقیدت وخلوص اور قوم پرستی باہم شیر وشکر نظر آتی ہیں۔ کیونکہ حصولِ آزادی کی جدّوجہد کا زمانہ مذہبی عقائد کی بازیافت، سیکولر عقائد کے فروغ، رجعت پسندانہ طرزِ عمل کی اصلاح اور سیاسی بیداری کے زور پکڑتے ہوئے طوفان کا زمانہ تھا۔ مذہبی اصلاح و احیا نیز سیاسی انقلاب کے اس اتصال سے جو اثرات نمایاں ہوئے انھیں سب سے پہلے ادب وثقافت نے قبول کیا۔ منوّر کی قومی شاعری کو اس پس منظر کی روشنی میں پرکھنا ہوگا۔ پہلے ہم "کائناتِ دل" کی قومی نظموں پر نظر ڈالیں گے۔ یہ نظمیں دوسری جنگِ عظیم کے آغاز سے قبل کے زمانے کی ہیں اور ان کا مزاج مابعد کی نظموں سے واضح طور پر مختلف اور جداگانہ ہے۔ چند قومی نظموں سے اقتباسات دیکھیے:۔

باغباں باغ کے، بلبل ہے چمن کے صدقے — مَیں فدا قوم پہ اور اپنے وطن کے صدقے
آریہ ورت بنا گلشنِ شاداب ان سے — پاک سرجُو پہ فدا، گنگ و جمن کے صدقے
رُوح ہوتی ہی نہیں وقفِ تناسخ اُن کی — جو اُتر جاتے ہیں قوم اور وطن کے صدقے [2]

(نظم صدقہ)

حبِّ وطن کے راگ الاپے جو ہر نفس — یارب زباں ملے وہ دہن وہ ملے مجھے
جس میں نہ غیر ملک کی مٹی کا جزو ہو — جس میں ہو خاک ہند کی تن وہ ملے مجھے [3]

(نظم: مبارک آرزو)

---

[1] [2] [3] کائناتِ دل (منوّر لکھنوی) صفحات بالترتیب: ۹۴۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

نظم "تمام عمر خدایا وطن پرست رہوں" کے چند شعر دیکھیے :

ہر اک نفس ہے مجھے مادرِ وطن کا خیال — حقوق اس کے نہ میرے سبب سے ہوں پامال
وطن کا عشقِ مقدس مجھے نصیب ہوا — نہ مجھ سا دہر میں پیدا ہوا خجستہ خصال
جنونِ عشقِ وطن ہو اسی میں مست رہوں — تمام عمر خدایا وطن پرست رہوں [۱]

لیکن منورؔ حصولِ آزادی اور ہندوستانیت کے تصور کو فروغ دینے کے لیے فرقہ وارانہ یکانگت واتحاد کو شرطِ اوّل مانتے تھے۔ ان کی مختلف نظموں کے درج ذیل اقتباسات ان کے اسی مستحکم نظریے اور عقیدے کی تصدیق کرتے ہیں :۔

کیوں عقل کے دشمن بنتے ہو جس سے ہو بھلا وہ کام کرو
مذہب کے لیے ناحق لڑ کر مذہب کو نہ تم بدنام کرو

یہ لڑنا بھڑنا بند کرو، ہو لہر رواں آزادی کی
یہ دولت ہاتھ جب آجائے پھر چین کرو آرام کرو [۲]

(نظم : ہندو مسلمانوں سے)

نہ ہندوؤں کو رہا اپنے دھرم کرم سے کام — نہ حق پرست رہے آج پیروِ اسلام
یہ اپنے دھرم کا کچھ سوچتے نہیں انجام — وہ اپنے دین کو کرتے ہیں مفت میں بدنام
نہیں خیال کسی کو بھی نیک نامی کا
گلے سے طوق اُترتا نہیں غلامی کا

نظر کرم کی ہو ان پر اب اے خدائے کریم — یہ آئیں ہوش میں دے ان کو ایسی عقلِ سلیم
وطن سے دُور ہو یہ حالت ہراس و بیم — دل و جگر ہیں فدایانِ حرّیت کے دونیم
یہ مل کے سعی کریں پھر پئے نجاتِ وطن
کہ اتفاق ہی ان کا ہے کائناتِ وطن [۳]

(نظم : ملک کی موجودہ حالت)

---

[۱] کائناتِ دل (منورؔ لکھنوی) صفحہ ۲۳۲

[۲] ایضاً " " ۲۳۰۔

[۳] ایضاً " " ۲۳۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

روش یہ کیا ہے تری اے وطن فروش بتا — مرے سوال پہ ہے کس لیے خموش بتا
یہ اور بات ہے تو کامیاب مقصد ہے — ترے کفیل کا احسان تجھ پہ بے حد ہے
یہ اور بات ہے اقبال ہے غلام ترا — خدا کے فضل سے جاری ہے آج کام ترا
مگر شکایتِ اہلِ وفا، یہ کیا معنی؟ — مگر حمایتِ جور و جفا یہ کیا معنی؟
خدا کے سامنے تجھ کو جواب دینا ہے — تمام فردِ عمل کا حساب دینا ہے
طریقِ زشت سے آباز سفلہ کوش نہ بن — عزیز ابہرِ خدا اب وطن فروش نہ بن [1]

(نظم: وطن فروش سے خطاب)

منوّر لکھنوی کی قومی نظموں کے حوالے سے شہاب جعفری اپنے مقالے میں رقم طراز ہیں:-

"قومیت تک منوّر کا سفر مذہب اور مذہبی سچائی کے راستے سے ہوا ہے.......
ان کی شاعری کے قومی مزاج میں مذہب کے صالح اقدار کا ہاتھ ہے"۔ [2]

"کائناتِ دل" میں بھی منوّر لکھنوی کی چالیس سے زائد مذہبی رنگ کی نظمیں شامل ہیں۔ لیکن اپنی گھریلو زندگی میں اُس کے کٹّر سناتن دھرمی چلن کے باوجود منوّر کی شاعری پر مذہبی تعصب اور ہٹ دھرمی کا ذرّہ بھر عکس دکھائی نہیں دیتا، بلکہ اُس کے یہاں ناقوس کے عقیدت خیز آہنگ کے ساتھ اذان کی بلند بانگ اور طہارت بخش صدا بھی سنائی دیتی ہے۔ وسعتِ نظر اور آفاقی خدا پرستی اس کی مذہبی شاعری کا سنگِ بنیاد بن گئی ہے۔ اگر ایک طرف وہ مہرشی وید ویاس، والمیک، دیانند، گورو نانک، گوتم بدھ، عیسےٰ مسیح اور جینندر مہاویر جیسے مذہبی پیشواؤں اور رشیوں نیز رام اور کرشن جیسے اوتاروں کی توصیف و عقیدت کے نغمے اُلاپتے ہیں تو اس کے دوش بدوش شیرِ خدا حضرت علیؑ کی توصیف و منقبت میں سجدہ ریز نظر آتے ہیں۔ ان کی نظموں "شیرِ خدا" اور "ایک نیا پیغام" میں حضرت علیؓ اور حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے تئیں ان کی عقیدت کوشی ملاحظہ ہو:-

یارب مرے کلام میں لطفِ زباں کہاں — جو تجھ کو ہو قبول وہ طرزِ بیاں کہاں
دریا کی طرح اپنی طبیعت رواں کہاں — اتنا بلند میں صفتِ آسماں کہاں

---

[1] کائناتِ دل (منوّر لکھنوی) صفحہ ۲۳۶-۲۳۷

[2] منوّر لکھنوی، شخصیت اور شاعری (مرتب راج نرائن رازؔ) صفحہ ۱۶۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

توصیفِ راز دانِ خفی و جلی کروں
یعنی بیانِ شانِ جنابِ علیؑ کروں

مَیں گم رہِ مجاز، حقیقت شناس آپ — مَیں معصیت نہاد تقدس اساس آپ
عریاں مری نگاہ، صداقت لباس آپ — مَیں دُور۔ اور خالقِ دوراں کے پاس آپ
پستی اِدھر خصیص کی ناچیز خاک میں
قلبِ فلک کا اوج اُدھر ذاتِ پاک میں

ایسا مطیعِ اہلِ کلام اور کون تھا — ایسا شہِ عرب کا غلام اور کون تھا
فرشِ زمیں پہ عرش مقام اور کون تھا — تسبیحِ مصطفیٰؐ کا امام اور کون تھا
پیدا دلاوری سے تھی صدق و صفا کی شان
شیرِ خدا کی شان تھی شیرِ خدا کی شان [1]

اب پیغمبر اسلام سے مخاطب ہوکر اپنی نظم "ایک نیا پیغام" میں منوّر لکھنوی کیا گزارشات کرتے ہیں، ملاحظہ ہو :-

آپ پر نازل خدائے پاک نے قرآں کیا — سرمۂ توحید سے وا دیدۂ عرفاں کیا
آشکارا زندگی کا جوہرِ پنہاں کیا — پیکرِ اقدس کو رشکِ کعبۂ ایماں کیا
جو نہ سمجھیں آپ کا رُتبہ وہ اہلِ دل نہیں
اور کوئی جادۂ تسلیم کی منزل نہیں

جانتے ہیں رازِ مردانِ خدا اسلام کا — ہیں سمجھتے مرتبہ اہلِ صفا اسلام کا
ہے فقط عشقِ الٰہی مدعا اسلام کا — اور کچھ مقصد نہیں اس کے سوا اسلام کا
ہو بِنا نفرت پہ جس کی یہ وہ مذہب ہی نہیں
دوسروں سے ترکِ اُلفت اس کا مطلب ہی نہیں [2]

گورو نانک دیو کے تئیں اظہارِ احترام کرتے ہوئے منوّر کیا کہتے ہیں، ذیل کے اشعار میں دیکھیے :-

---

[1] منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (راز) صفحہ ۱۸۲-۱۸۳

[2] کائناتِ دل منوّر لکھنوی صفحہ ۱۶۳-۱۶۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کیوں ہو نہ آج اپنا دماغ آسمان پر — ہے پاک منتر واہگورو کا زبان پر
مرشد یہ وہ تھا مرشد اعظم کہیں جسے — اہل جہاں کا ہادی اکرم کہیں جسے
خود کو مٹا چکا تھا یہ راہ نیاز میں — توحید کی صدا تھی نہاں اس کے ساز میں
عرفاں کا نور سینۂ صافی میں بھر دیا — دیر و حرم کے فرق کو نابود کر دیا
قرآن اور وید کو باہم ملا دیا — دونوں میں تھا جو فرق نمایاں مٹا دیا [1]

منورؔ لکھنوی کی چند مزید مذہبی نظموں میں سے مختصر اقتباسات ملاحظہ ہوں :-

سنبھل کے دست تعدی کوئی دراز کرے — مآل جور و ستم ہولناک ہوتا ہے
سبق ملا ہے یہ ہم کو جناب رواں سے — خود اپنے ظلم سے ظالم ہلاک ہوتا ہے [2]

(نظم : دسہرہ)

نہ کر پایا کسے کاشی کا علم و فضل آسودہ — کسے الجھن ہوئی ویدوں کی تفسیروں کے چکر میں
جنازہ دیکھا کس کے لیے اک درس عبرت تھا — مآل زندگی سے درد پیدا ہو گیا سر میں

فرشتے دست بستہ کس کے گرد و پیش رہتے ہیں
یہ ہستی کیا ہے وہ سب جس کو گوتم بدھ کہتے ہیں [3]

(نظم : گوتم بدھ)

روح پر جب حملہ آور عقل حیوانی ہوئی — تیرگی میں کالعدم تہذیب انسانی ہوئی
بے کسوں کی جان لینا دھرم میں داخل ہوا — خون کے پیاسوں کی دشواری میں آسانی ہوئی
دیوتاؤں کو بھی ناحق کر لیا اس میں شریک — آئے دن کا شغل ذی روحوں کی قربانی ہوئی
معجزہ فرما ہوئی اس کی نگاہ التفات — ظلم کی جو آگ تھی اک آن میں پانی ہوئی

کیا کوئی سمجھے گا اہمیت اہنسا دھرم کی
خاک اس کوچے کی ہے جن راج کی چھانی ہوئی [4]

(نظم : مہاویر جنم)

---

[1] کائنات دل (منورؔ لکھنوی) - صفحہ ۱۹۴-۱۹۵
[2] " " " ۱۶۸
[3] " " " ۱۹۶
[4] " " " ۲۱۳-۲۱۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

نظر آئے ہمیں تو کرشن کیوں کر میسر دیدۂ عرفاں نہیں ہے
بظاہر تو نظر آتا ہے پنہاں نظر والوں سے تو پنہاں نہیں ہے
ترے ملنے کی شکلیں ہیں ہزاروں مگر ملنا ترا آساں نہیں ہے
تری گیتا کے اُپدیشوں کا پابند گرفتارِ غمِ دوراں نہیں ہے

(کرشن جی سے)

اسی قبیل کی پاکیزہ اور نیاز آہنگ نظمیں خاصی تعداد میں "کائناتِ دل" کی زینت بنی ہیں، جو قاری کے قلب و روح کو نورِ ایماں اور عقیدتِ یزداں سے منور کرتی ہیں اور اسے وسعتِ قلب و نظر کی دولت سے مالامال کرتی ہیں۔

حالاتِ حاضرہ کے تقاضوں سے بھی منوّر لکھنوی غافل نہیں رہے۔ اصلاحِ مذہب کے ساتھ ساتھ اصلاحِ معاشرہ اور سماج کے رجعت پسندانہ قوانین کی تنسیخ بھی بیسویں صدی کے ابتدائی دور کی ایک بہت بڑی ضرورت تھی۔ ان اصلاحی اقدامات کے لیے متعدد تحریکیں ان دنوں جاری ہو چکی تھیں۔ رشی دیانند، رام موہن رائے، وویکانند، مہاتما گاندھی اور سرسید جیسے اصلاح پسندوں کی بلند آواز سوئے ہوئے سماج کو بدلتے وقت کے تقاضوں سے آگاہ کر چکی تھی۔ منوّر نے بھی ان موضوعات پر قلم اُٹھایا۔ "کائناتِ دل" میں "شکوۂ مزدور" "اچھوت اُدھار" "ہولی" اور "بیوہ کے جذبات" جیسی نظمیں انہی ہنگامی تقاضوں کی دین ہیں۔ کچھ اقتباسات دیکھیے:۔

خوں فشاں ہوں، سوزِ زاری ہوں ازل سے ہائے ہائے
مبتلائے رنج و خواری ہوں ازل سے ہائے ہائے
میں رہینِ بے قراری ہوں ازل سے ہائے ہائے
کشتۂ سرمایہ داری ہوں ازل سے ہائے ہائے
میں بناتا ہوں جنھیں مجھ کو مٹاتے ہیں وہی
میں اُٹھاتا ہوں جنھیں مجھ کو گراتے ہیں وہی

خاک ہیں الماس و گوہر میری محنت کے بغیر
ہاتھ آسکتے ہیں کیوں کر میری محنت کے بغیر

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بن نہیں سکتا کوئی گھر میری محنت کے بغیر
ہیچ ہیں گو دولت و زر میری محنت کے بغیر
پھر بھی مجھ پر اہلِ سرمایہ کی بدعت ہے رَوا
دُور ہو گا کب الٰہی نقص یہ تہذیب کا [۱]

(نظم : شکوۂ مزدور)

جو قومیت کے مکاں میں ہیں سنگِ بنیادی — انھیں کی مدِ نظر ہے مدام بربادی
نہ رسم و راہ نہ ہے شرکتِ غم و شادی — خدا کے سامنے ہیں اب اچھوت فریادی
سنو سنو کہ زبانوں پہ کیا دعائیں ہیں
ڈرو ڈرو کہ غریبوں کی یہ صدائیں ہیں
ہیں بھائی بند ہمارے اچھوت جتنے ہیں — ہیں رام کرشن کے پیارے اچھوت جتنے ہیں
ہیں بھگوتی کے دُلارے اچھوت جتنے ہیں — ہیں شِو کی آنکھوں کے تارے اچھوت جتنے ہیں
ہماری طرح پسر مادرِ وطن کے ہیں
اُسی کے یہ بھی ہیں، ہم پھول جس چمن کے ہیں [۲]

(نظم : اچھوت اُدھار)

زیرِ نظر کتاب کے پانچویں حصّے میں منوّر نے کچھ پسندیدہ نظموں کے تراجم شامل کیے ہیں جن میں کچھ ترجمے سنسکرت شلوکوں کے ہیں، کچھ انگریزی اور جرمن نظموں کے ــ اور بیشتر ٹیگور کی نظموں کے جو رابندر ناتھ ٹیگور کی تصنیف "باغبان" THE GARDENER میں سے لی گئی ہیں۔ چونکہ ترجمے کے میدان میں منوّر لکھنوی کا کام بہت وسیع ہے۔ اس کے ترجموں کا مفصّل جائزہ اگلے ابواب میں لیا جائے گا۔ تاہم کچھ چیدہ چیدہ اشعار اس شعری تصنیف میں مشمولہ تراجم میں سے بھی درجِ ذیل کیے جا رہے ہیں :-

سروجنی نائیڈو کی ایک نظم کا ترجمہ جو منوّر نے بڑے سلیقے اور چابک دستی سے کیا ـ "فریبِ خیال" کے زیرِ عنوان ماہنامہ "زمانہ" کانپور میں شائع ہوا۔ اس کا پہلا بند ملاحظہ ہو :-

---

[۱] کائناتِ دل (منوّر لکھنوی) طبع اوّل۔ صفحہ ۱۴۲، ۱۴۳

[۲] " " " " ۲۴۶، ۲۴۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تری چٹکی میں تھا وحشت زدہ اِک پھول صحرائی
لبوں میں تُو نے جس کو بے نیازی سے دبا ڈالا
اُدا سے نوچ ڈالیں پتیاں سب قرمزی جس کی
وہ میرا قلبِ مضطر تھا، وہ میرا قلبِ مضطر تھا[1]

(نظم : فریبِ خیال)

رابندرناتھ ٹیگور کی تصنیف "باغبان" (THE GARDENER) کی کلیدی نظم "ملکۂ حُسن کی باغبانی" میں سے کچھ بند ملاحظہ کیجیے۔ ملکۂ حُسن یوں گویا ہے :۔

اے مرے دلدادۂ خدمت! مرے خواہانِ لطف
اے مرے شیدا! مرے لذّت کشِ ارمانِ لطف
یہ تو کچھ منہ سے کہو کیا لوگے خدمت کا صلہ
اِس محبّت اور اِس حُسنِ عقیدت کا صلہ؟

سائل جواباً لب کشا ہوتا ہے :۔

میری خدمت کا ہے یہ انعام اے جانِ جہاں!
میرے ہاتھوں میں ہوں تیری پیاری پیاری مٹھیاں
مٹھیاں کیسی کنول کے جیسے غنچے خوشگوار
ساعدِ سیمیں میں پہناتا رہوں پھولوں کے ہار
پھر ہو جب تیّار روحِ نازِ گلہائے اشوک
تر کروں اُس سے کفِ پا میں تری بے روک ٹوک
اور رہ جائے کفِ پا میں کوئی دھبّا اگر
دُور کر دوں میں اُسے اپنے لبوں سے چوم کر[2]

منوّر لکھنوی کے منظوم تراجم سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ترجمہ بجائے خود ایک تخلیقی کام ہے اور مترجم کا درجہ اصل مصنّف سے کسی طور بھی کم تر نہیں ہوتا۔ قومی ثقافت

---

[1] کائناتِ دل (منوّر لکھنوی) ۔ صفحہ ۲۵۸

[2] 〃 〃 ۲۶۴-۲۶۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کی تعمیر میں مترجم ایک اہم کردار ادا کرتا ہے اور اس حیثیت سے منوّر نے اپنے رول سے پورا پورا انصاف کیا ہے۔

"کائناتِ دل" کا آخری حصہ "اشکِ خوں" بارہ ماتمی نظموں پر مشتمل ہے۔ ان میں منوّر کے اپنے والدِ ماجد حضرتِ اُفق لکھنوی، اُن کے استادِ گرامی منشی نوبت رائے نظر، چچا رام سہائے تمنّا، ان کے خسر منشی لچھمن پرشاد صدر لکھنوی، ماموں جگ موہن پرشاد قیصر لکھنوی، بھتیجی درگیش نندنی، پنڈت برج نرائن چکبست، منشی مہاراج بہادر برق دہلوی، منشی پیارے لال رونق دہلوی کے علاوہ گنیش شنکر ودیارتھی، پنڈت موتی لال نہرو اور مولینا محمد علی کے نوحے شامل ہیں۔ ان ماتمی نظموں میں بھی حضرتِ منوّر نے زبان و بیان کی خوبیوں کو قائم رکھتے ہوئے کاغذ پر اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔ ان تخلیقات میں شاعر کا دلی قلق اور صدمے کا احساس بالکل حقیقی معلوم ہوتے ہیں اور مبالغہ سے عاری۔ مولینا محمد علی کے نوحے کے دو ابتدائی بند دیکھیے :-

شاہ و گدا کسی کی بھی اس سے چلی نہیں — جب آگئی یہ سر پہ بلا پھر ٹلی نہیں
آگے اجل کے دال کسی کی گلی نہیں — دارِ فنا میں آج محمد علی نہیں
دھوکا حیات وادیِ غربت میں دے گئی
خاکِ وطن سے دُور قضا کھینچ لے گئی

تھی کس کو آگہی یہ بھلا تھی کسے خبر — تھا آخری مسافرِ ہستی کا یہ سفر
مرحوم کے فراق میں عالم ہے نوحہ گر — گویا پہاڑ ٹوٹ پڑا اہلِ ہند پر
غفلت سے قوم جاگ اُٹھی جب وہ سو گیا
خاموش آہ ضیغمِ اسلام ہو گیا [۱]

منشی مہاراج بہادر برق دہلوی کی موت اپنے شاگرد روشن پانی پتی ایڈوکیٹ کے گھر پر پانی پت میں واقع ہوئی۔ حالی کا وطنِ مالوف بھی پانی پت تھا۔ برق کے نوحہ میں منوّر اس حوالے سے فرماتے ہیں :-

اے سرزمینِ حالیِ مرحوم آہ، آہ — تو نے سپردِ خاک کیا کیوں نظامِ برق
اب گلشنِ ادب میں یہ کس کو دماغ ہے — تھا نکہتِ سخن سے معطر مشامِ برق

---

[۱] کائناتِ دل (منوّر لکھنوی) صفحہ ۳۱۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

حسنِ کلام ہے جو منوّر دلوں پہ نقش　　　صدیوں رہے گا عالمِ امکاں میں نامِ برق ؎۱

بہت بڑی تعداد میں قطعات و رباعیات بھی "کائناتِ دل" میں شامل ہیں۔ منوّر کی رباعی سے منسوب الگ باب میں ان رباعیات و قطعات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ لیکن "کائناتِ دل" کے متعلق مشاہیرِ ادب کی جانب سے مجموعی طور پر جن تاثرات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان کا ذکر یہاں بے محل نہ ہو گا۔

بھگوان داس شعلہ اپنی غیر مطبوعہ شعری تصنیف "شہ نامۂ ہند" کے قلمی نسخے میں شامل نظم "اردو کی فریاد" میں منوّر کا حوالہ اس طرح دیتے ہیں :۔

اُفق نے جس کو وسعت، جذبۂ ذوقِ عمل بخشا　　　منوّر نے تصوّف، فلسفہ، حسنِ غزل بخشا
منوّر لکھنوی پروردگارِ "کائناتِ دل"　　　دیا اردو کو اس نے شاہکارِ "کائناتِ دل" ؎۲

"منوّر لکھنوی کائناتِ دل کی روشنی میں" کے زیرِ عنوان اپنے مقالے میں عطا اللہ پالوی فرماتے ہیں :۔

"خود سوچیے کہ جہاں حنا کی حجاب آگینی، مطربہ کی نوا سنجی، بسنت کی محشر بدامانی، نزولِ حیا کی جلوہ آرائی، طاؤسِ رقصاں کی گوناگوں رنگینی اور ابرِ باراں کی گہرباری اپنی پوری ساحرانہ طاقت کے ساتھ ناز و ادا دکھا دکھا کے مجھے اپنی اپنی رنگینی میں کھو جانے کی دعوت دے رہی ہو، میں یہ کیسے گوارا کروں کہ خود تو اس میں کھو جاؤں اور لوگوں کو اس میں نہ لے ڈوبوں۔" ؎۳

علامہ برجموہن دتاتریہ کیفی فرماتے ہیں :۔

"کائناتِ دل" اسم بامسمّیٰ ہے۔ جس طرح ان کا کلام اور زبان تنگ دلی اور صوبیت کے نظر سوز رنگ سے پاک ہے۔ اسی طرح ان کا تخیّل اور پروازِ سخن تصنّع اور تکلّف سے بے لوث ہے۔ بے ساختگی ان کے کلام کا جوہر ہے۔ مشقِ سخن پختہ ہے اور انھوں نے زمانے کو آنکھیں کھول کر دیکھا ہے۔" ؎۴

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ رقم طراز ہیں :۔

"الفاظ کے انتخاب اور بندش میں منوّر اپنی آپ نظیر ہیں ـــــ مذہب کی نمائندگی، تہذیب

؎۱ کائناتِ دل (منوّر لکھنوی)، صفحہ ۳۰۷

؎۲ شہ نامۂ ہند (بھگوان داس شعلہ مرحوم۔ قلمی مسودہ

؎۳ منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (راج نرائن راز)۔ صفحہ ۱۵۸

؎۴ کائناتِ دل (منوّر لکھنوی صفحہ ۱۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کی آئینہ داری، قومیت کی ترجمانی، فطرت کی عکاسی اور حسن کی نقاشی کس انفرادی پیرایہ میں کی ہے اور فنِ شعر کے کس قدر نئے اختراعات دکھائے ہیں۔"[۱]

کائناتِ دل کے مشمولات کے بارے میں نامور عالم اور سیاسی لیڈر ڈاکٹر آصف علی مرحوم کا کہنا ہے :۔

"مضامین کا میدان بڑا کھلا ہے جس میں ارتقائے کائنات بھی ہے۔ کاسنی کا پھول بھی ہے اور گلہری بھی۔ حبِ وطن بھی ہے، دھرم اور عبادت بھی ہے اور موت اور زیست کا نوحہ بھی۔ قدیم روش بھی ہے اور جدید رفتار بھی۔"[۲]

گوپی ناتھ امن فرماتے ہیں :۔

"منوّر صاحب کے کلام میں صوری و معنوی دونوں قسم کی خوبیاں موجود ہیں۔ پرانے رنگ کے کہنے والے ان کے الفاظ کی بندش اور ترکیبوں کی چستی پر داد دیتے ہیں۔ نئے رنگ کے شیدائی ان کی جذبات نگاری پر وجد کرتے ہیں۔"[۳]

پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی کی رائے میں منوّر کی کائناتِ دل میں :۔

گلہائے مضامیں کی فراوانی ہے　　گلدستہ کی جو نظم ہے لاثانی ہے
ساحر اعجاز ہے منوّر کا کلام　　یہ حسن کی کائنات لافانی ہے"[۴]

"کائناتِ دل" اور نظمیات کے حامل منوّر کے دیگر شعری مجموعوں میں جو بات منفرد نظر آتی ہے وہ ہے تغزّل کی چاشنی۔ منوّر ماہنامہ "پاسبان" (چنڈی گڑھ) میں مطبوعہ اپنے ایک سوانحی خاکے میں تسلیم کرتے ہیں کہ بعض نکتہ دانوں کے خیال کے مطابق اُن کی نظموں میں تغزّل کی جھلک بہت پائی جاتی ہے۔

بہر حال "کائناتِ دل" کی شاعری تخلیقی اور تقلیدی رویّوں کا ایک متوازن امتزاج پیش کرتی ہے۔ چوں کہ ہر دَور میں اُدب کا ایک جداگانہ مزاج اور معیار رہا ہے۔ منوّر نے بھی اسلاف اور ہم عصروں کے اسلوبِ نگارش اور بدلتی اقدار سے متاثر ہو کر اپنی نظموں کے مواد اور پیرایۂ اظہار کا انتخاب کیا اور "کائناتِ دل" بلاشبہ ان کا لاثانی کارنامہ ہے۔

---

۱ تا ۴ کائناتِ دل (منوّر لکھنوی)۔ ایڈیشن ۱۹۳۹ء، صفحات بالترتیب: ۱۲-۱۷-۲۰-۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منوّر کی نظموں پر مشتمل غیر مطبوعہ تصانیف پر نگاہ ڈالی جائے تو نظموں کے مزاج و آہنگ میں رفتہ رفتہ در آنے والی ایک خاموش تبدیلی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ یہی منوّر جو تحریکِ آزادی کے دنوں میں اپنے قومی رہنماؤں کی مدحت اور بتدریج اظہارِ عقیدت میں رطب اللسان رہے۔ حصولِ آزادی کے ایک دہائی بعد اربابِ سیاست کی ریشہ دوانیوں، اعلیٰ سیاسی اور سماجی اقدار کی پامالی، بدیانتی کے زور پکڑتے ہوئے طوفان اور ملک کی ابتری سے سرگشتہ و حیران نظر آتے ہیں۔ وطن کے بگڑتے ہوئے حالات سے شاکی و بیزار ہو کر وہ بڑی صاف گوئی اور بے باکی سے اربابِ اقتدار کے عقلی دیوالیہ پن پر احتجاج کرتے ہیں۔ اُن کی تصانیف "سوزِ وطن"، "شگفتہ عقیدے" اور "نقوشِ منوّر" کی نظمیں اس طرح کی بہت سی مثالیں فراہم کرتی ہیں۔ ان غیر مطبوعہ بیاضوں میں عظیم سیاسی رہنماؤں کے تئیں اظہارِ عقیدت بھی ہے اور بعض عظیم ہستیوں کے نوحے اور ماتمی نظمیں بھی ہیں۔ ان کے ساتھ ہی کہیں کہیں سیاسی رہنماؤں کی غلط روی اور عوامی مسائل سے عدم توجہی پر مایوسی کا اظہار بھی "سوزِ وطن"، "شگفتہ عقیدے" اور "نقوشِ منوّر" کی نظموں پر فارسیت کا اتنا غلبہ دکھائی نہیں دیتا جتنا "کائناتِ دل" کی نظموں میں موجود ہے۔ "تاثرات" میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی، جو فارسیت کے سائے سے کافی حد تک محفوظ ہیں۔ ان نظموں کی زبان مقابلتاً سہل اور سلیس ہے۔ نیز عام قاری کی تفہیم کے قریب تر ہے۔

مذکورہ نظموں میں بیشتر نظمیں مابعد آزادی کی ہیں اور ان کا لب و لہجہ بھی کلاسیکیت اور طرزِ قدیم کی گرفت سے آزاد ہے۔ نیز مواد بھی تحریکِ حصولِ آزادی کے دنوں کے آدرش واد کے بمقابلہ حقیقتوں کا زیادہ آئینہ دار ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ "آدرش واد" کی خواب ناک دھند چھٹ جانے کے بعد حقیقتوں کے سورج کی تیکھی روشنی شاعر کی آنکھوں کو چندھیا رہی ہے اور ماحول سے اُن کی بیزاری اور جھلاہٹ واضح طور پر ان کی نظموں میں بے ساختہ در آئی ہے۔ اُن کی طرزِ فکر ایک آدرش وادی قلم کار کی بجائے ایک عام آدمی کی سوچ کی سطح پر اُتر آئی ہے۔ اُن کی نظمیہ شاعری اسی لیے زیادہ سلیس اور عام قاری کے معیارِ تفہیم سے قریب تر ہوتی چلی گئی ہے۔ تقابلی جائزہ کے لیے "کائناتِ دل" کی ایک بہت ہی پسندیدہ نظم "حنا" کا ابتدائی بند ملاحظہ ہو:-

بہ مانند رازِ جو تھا رازِ سبز باغِ حنا   مشامِ جاں میں ہوا منتقل دماغِ حنا

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

نظر نوازِ مہ و خور ہے رنگِ داغِ جنا　　　بساطِ حسن میں لَو دے اٹھا چراغِ جنا

ریاضِ دوست کھلا دعوتِ نظر کے لیے

پیامِ عیش ملا فرحتِ جگر کے لیے ؎۱

اسی طرح نظم "نوروز" کا پہلا بند دیکھیے :

مردمِ دیدۂ اربابِ یقیں ہے نوروز　　　پیکرِ سالِ مسیحی کی جبیں ہے نوروز

خاتمِ حلقۂ دَوراں کا نگیں ہے نوروز　　　بڑھ کے ہر روز سے عظمت میں کہیں ہے نوروز

بن مریم کی ہے بیدار نصیبی اس سے

ہیں عیاں جوہرِ تہذیبِ صلیبی اس سے ؎۲

"کائناتِ دل" کی نظموں اور بعد کی نظمیات کے رنگ اور لفظیات میں اچھا خاصا فرق اور تغیر نظر آتا ہے۔ مذکورہ بالا بند جو برائے تقابل پیش کیے گئے، فارسیت سے لدے ہوئے ہیں۔ شاید اس زمانے کی شاعری کا پسندیدہ رنگ یہی تھا۔ "کائناتِ دل کی بیشتر نظمیں اسی نوع کی فارسیت کے مرعوب کن لہجے میں کہی گئی نظمیں ہیں جبکہ بعد کی نظمیں جو منوّر لکھنوی کے قلمی مسوّدوں میں درج ہیں۔ یا آزادیِ ہند کے بعد رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں وہ دقیق فارسی اور عربی الفاظ و استعارات سے پاک ہیں، جیسا کہ ذیل میں دی جانے والی مثالوں سے واضح ہو جائے گا۔

"شگفتہ عقیدے" اور "نقوشِ منوّر" کی بیشتر نظموں میں سیاسی اور مذہبی شخصیات کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ کچھ نظمیں کافی طویل ہیں اور کچھ نامکمل۔ مشمولات میں پنڈت جواہر لال نہرو، گورو ارجن دیو، سوامی دیانند، سردار ولبھ بھائی پٹیل، اور انڈین نیشنل کانگریس پر توصیفی نظمیں ہیں۔ مہاتما گاندھی، سر تیج بہادر سپرو، بریگیڈیر عثمان، لالہ لاجپت رائے، منشی دیانرائن نگم (ایڈیٹر "زمانہ") برجموہن دتاتریہ کیفی۔ عبداللہ بریلوی، ڈاکٹر رفیع احمد قدوائی وغیرہ کے نوحے ہیں۔ جنگِ آزادی کی تاریخ اور عظمتِ اسلام سے متعلق نظمیں ہیں۔ ان میں کچھ نظمیں ہنگامی نوعیت کی تو کچھ مستقل اہمیت کی ہیں۔ ایک نظم "ہم" میں سے کچھ اشعار دیکھیے۔ اس کے اشعار میں باپو گاندھی کے قتل کے سانحے پر قوم کی محسن

۱؎ کائناتِ دل (منور لکھنوی)، صفحہ ۱۰　　۲؎ کائناتِ دل (منوّر لکھنوی)، صفحہ ۱۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کُشی سے منوّر کی برہمی اور دل برداشتگی منعکس ہے۔ لیکن "کائناتِ دل" کی نظموں کے مقابلے میں اس نظم کا انداز سلیس اور لفظیات عام فہم ہیں :۔

بابو کے قتل کا ہے گنہ گار کون ؟۔ ہم | پاداشِ جرم کا ہے سزاوار کون ؟۔ ہم
رکھتے ہیں ساز باز وطن دشمنوں کے ساتھ | یہ ہنچار ہے ہیں قوم کو آزار کون ؟۔ ہم
اک بیکرِ وفا کے لہو سے ہیں سُرخ ہاتھ | ہیں مسلکِ جفا کے پرستار کون ؟۔ ہم
ہے سربلندیوں میں بھی افتادگی سے کام | کرتے ہیں نقلِ سایۂ دیوار کون ؟۔ ہم [۱]

پنڈت جواہر لال نہرو کے تئیں اظہارِ عقیدت ملاحظہ ہو۔ یہ اشعار بھی بالکل سادہ اور عام فہم زبان میں کہے گئے ہیں اور اخبارات میں مطبوعہ، منوّر لکھنوی کی ایک نظم کا حصّہ ہیں :۔

ہند کے تاجِ سر جواہر لال! | رشکِ لعل و گہر جواہر لال!
نیک فطرت ہے تم سے بڑھ کر کون؟ | پاک طینت ہے تم سے بڑھ کر کون؟
دی جلا کس قدر فراست کو | بے ضرر کر دیا سیاست کو
دل میں وسعت، نظر میں وسعت ہے | تم کو ہر قوم سے محبت ہے
ناخدا جب ہو تم تو ڈر کیا ہے | خوف کس بات کا خطر کیا ہے
مجھے کرنا نہیں قصیدہ پیش | میں نہیں شاعرِ تملّق کیش
کبھی غصّہ بھی تم پہ آتا ہے | دل مرا تم سے روٹھ جاتا ہے
تہمتیں لاکھ تم پہ دھرتا ہوں | پھر بھی میں تم کو پیار کرتا ہوں
غلطی کا قبول کر لینا | دل پہ اس کا نہ کچھ اثر لینا
ہے اسی میں کمالِ محبوبی | جانِ معقولیت ہے یہ خوبی [۲]

سردار ولبھ بھائی پٹیل کے کارناموں سے متاثر ہو کر منوّر لکھنوی نے جو نظم کہی، اخبارات سے لیے گئے اس کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ زبان اور لفظیات کی سلاست اور سادگی ان سے بھی مترشح ہے۔

پاسباں قوم کے ہیں، قوم کا دم بھرتے ہیں | بولتے کم ہیں مگر کام بڑے کرتے ہیں
چوٹ کھائے ہوئے شیروں کی گرج ہے ان میں | سُورماؤں کی دلیروں کی گرج ہے ان میں

۱۔ شگفتہ عقیدے (منوّر لکھنوی، قلمی مسوّدہ)۔ صفحات پر نمبر درج نہیں
۲۔ " " "

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

صاف باطن ہیں کوئی بات چھپاتے ہی نہیں
لاکھ گھیرو کسی جکڑ میں یہ آتے ہی نہیں
آن کی آن میں تیور جو بدل جاتے ہیں
حکمرانوں کے بھی دل ان سے دہل جاتے ہیں
غیر کے حلقۂ تزویر میں آنے کے نہیں
دانت جو منہ میں ہیں وہ صرف دکھانے کے نہیں [۱]

یہ اُس زمانے کی نظمیں ہیں جب آزادی کی نعمت ابھی تازہ تازہ ہاتھ آئی تھی۔ دلوں میں ایک جوش وخروش تھا، امیدیں تھیں اور روشن مستقبل کی اُمنگیں تھیں۔ جواہرلال، ابوالکلام آزاد سردار پٹیل، بابو راجندر پرشاد، جگ جیون رام، راج گوپال آچاریہ، رفیع احمد قدوائی جیسی قدآور ہستیاں ملک کی حکومت کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، حکومت بونوں کے ہاتھ میں منتقل ہوتی گئی۔ منوّر جیسے نرم رَو اور مرنجاں مرنج اہلِ قلم کو بھی اپنا توصیفی لہجہ بدلنا پڑا۔

منوّر کی قومی نظموں میں حب الوطنی اور قومی یک جہتی ہر دو جذبے دو توانا لہروں کی طرح دوش بدوش چلتے ہیں۔ یہ دونوں جذبے ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ مذہبی رواداری قومی یک جہتی کا لازمی عنصر ہے۔ منوّر لکھنوی محض ایک فرقے کے سیاسی رہنماؤں اور ادبی شخصیات کا سپاس گزار نہیں رہا بلکہ ہر مذہب وملت سے تعلق رکھنے والے شہیدوں اور قومی ہیروز کی مدح میں رطب اللسان ہے۔ وہ ہندوستان کو سبھی مذاہب اور فرقوں کے مقلّدین کا وطن تسلیم کرتا ہے اور ایک متحدہ قومیت پر بجا طور پر ناز کرتا ہے۔ کشمیر کی جنگ میں بریگیڈیر عثمانؔ کی شہادت پر منوّر کے تاثرات دیکھیے:۔

آفریں صد آفریں اے مردِ میدانِ جری
زندہ جاوید ہے تو مُر کے عثمانِ جری
سرورِ عالم سے دادِ حق شعاری مِل گئی
حضرتِ عثماں کی تجھ کو نامداری مِل گئی
بے جگر تو صورتِ شیرِ نیستاں بن گیا
مردِ مومن، مردِ غازی، مردِ میداں بن گیا۔
عرش پیما تھی صدا تیرے ضمیرِ صاف کی
آبرو تجھ سے بڑھی اجداد کی اسلاف کی
آئینہ تھا آئینہ جوہر تری ادراک کا
دل میں تیرے عشق تھا سچّا رسولِ پاک کا [۲]

۱۔ شگفتہ عقیدے (منوّر لکھنوی) قلمی نسخہ۔ نیز روزنامہ وطن میں سے تراشہ۔

۲۔ نقوشِ منوّر (منوّر لکھنوی۔ نظمیات کا قلمی مسودہ، صفحات پر نمبر درج نہیں۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ڈاکٹر رفیع احمد قدوائی (مرکزی وزیر خوراک) کی ناگہانی موت پر منوّر لکھنوی یوں ماتم کناں ہیں :-

ہائے اے وائے مرگِ قدوائی — لُٹ گیا سازو برگِ قدوائی
ہل گئی اِک بنائے محکم آہ! — گر گیا اِک ستونِ اعظم آہ!
دلِ نہرو کا رازداں نہ رہا — رازداں کیسا؟ پاسباں نہ رہا
ہاتھ سے آئینہ یہ چھُوٹ گیا — ایک سازِ خموش ٹوٹ گیا [1]

ادبی شخصیات میں سے علامہ برجموہن دتاتریہ کیفی کے نوحہ میں سے منوّر کا ایک بند دیکھیے :-

یہ موت اِک بزرگِ مقدّم کی موت ہے — یہ موت اِک کمالِ مجسّم کی موت ہے
یہ موت اِک ادیبِ مکرّم کی موت ہے — یہ موت اِک سخنورِ اعظم کی موت ہے
اِک ژرف بیں کی موت ہے اِک نکتہ داں کی موت
کیفی کی موت ہے کہ ہے اُردو زباں کی موت [2]

قومی زندگی کی حقیقی تصویر جو زمانۂ مابعدِ آزادی میں منوّر نے اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ اُس سے برگشتہ خاطر ہو کر اپنے شعری مجموعہ "سوزِ وطن" میں انھوں نے جگہ جگہ اپنی برہمی کا اظہار کیا۔ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں منوّر نے جو نظمیں کہی ہیں ان میں ملک کے سیاسی ماحول کے تئیں حد درجہ بیزاری، جھنجھلاہٹ اور تلخی کا واضح عکس ملتا ہے — یہی مایوسی اور برہمی منوّر لکھنوی کی اُس دَور کی غزلوں میں بھی نمایاں ہے۔ مذکورہ نظموں میں سے چند کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے :-

آج ہے ہندوستاں کا حال زار — آج ہر ہندی کا دل ہے بیقرار
آج آزادی بڑے خطرے میں ہے — یہ حسیں وادی بڑے خطرے میں ہے
آج جس کو دیکھیے ناسودہ ہے — آج جو دامن ہے گرد آلودہ ہے
خوشنما گو کاغذی آئین ہے — نقش یہ ہر شکل میں رنگین ہے

---

[1] سوزِ وطن (منوّر لکھنوی۔ نظمیات کا قلمی مسوّدہ) صفحات پر نمبر درج نہیں
[2] ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

وحدتِ ہندوستاں خطرے میں ہے
یہ چمن یہ گلستاں خطرے میں ہے
اور بھی ہونے کو ہے تقسیمِ ہند
پھر بدلنے کو ہے کچھ تقویمِ ہند
(۱۹۵۷ء کی ایک نامکمل نظم)

عقل کیا کام کرے ہوش ہی کھو بیٹھے ہیں
ہاتھ سرمایۂ ادراک سے دھو بیٹھے ہیں
ناخداؤں نے حماقت پہ حماقت کی ہے
بیچ منجدھار میں کشتی کو ڈبو بیٹھے ہیں [1]
(نظم: سیاسی صورتِ حالات)۔

قطعہ: ہائے یہ نقّار خانے کی صدائے دلخراش
اِس خرابے میں کہیں طوطی کی شنوائی نہیں
حل جو کر سکتا سہولت سے غذا کا مسئلہ
ایک بھی ان آدمی زادوں میں قدآوائی نہیں

قطعہ: وطن پرست تو دنیا سے ہو چکے رخصت
غرض پرست کا ہر سمت بول بالا ہے
گزر رہی ہے اندھیرے میں صاف باطن کی
سیاہ دل کے مکاں میں مگر اجالا ہے

قطعہ: پستی میں جارہے ہیں پھر آج ہم منوّر
عظمت کی اپنے سر سے دستار گر رہی ہے
مدّت سے ہل رہی ہے ایک ایک اینٹ اس کی
آزادیِ وطن کی دیوار گر رہی ہے

قطعہ: تہ و بالا نظامِ زندگی ہونے ہی والا ہے
نمایاں بہتری کی کوئی صورت ہو نہیں سکتی
تباہی سے بچالیں ملک کو اب جلد تر ورنہ
حکومت چھوڑ دیں جن سے حکومت ہو نہیں سکتی [2]

"سوزِ وطن" کی نظموں میں بھی تغزّل کی وہی آن بان، زبان و بیان کی وہی دل کشی، وہی بندش کی چستی اور محاورہ بندی جلوہ گر ہے جو "کائناتِ دل" کی نظموں میں ہے۔ لیکن "سوزِ وطن" کی منظومات کی سلاست اور فارسیت سے مبرّا زبان قاری کو زیادہ متاثر کرتی ہے۔ ۱۹۶۷ء کی درج ذیل تخلیق کی روانی اور اظہارِ حقیقت کی بیباکی ملاحظہ ہو۔ "محسوسات" ایک غزل نما نظم ہے جس میں سے ذیل کے اشعار منتخب کیے گئے ہیں۔

آب موتی سا جب اُتر جائے
چاہیے آدمی کو مر جائے
ڈوب جانا ہی پھر تو واجب ہے
سر سے پانی جہاں گزر جائے
خود سری اب ہے تنکے تنکے میں
آشیاں پھر نہ کیوں بکھر جائے
دیر لگتی نہیں چھلکنے میں
جب پیالہ کسی کا بھر جائے

[1-2] یہ نظمیات اور قطعات "سوزِ وطن" (غیر مطبوعہ) اور "بساطِ فکر" (غیر مطبوعہ بیاضِ غزلیات) دونوں میں درج ہیں۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

پیٹ بھرنے کو ہائے ملک اپنا مانگنے بھیک در بدر جائے
جس طرف دیکھیے لگی ہے آگ اب کہاں کوئی بھاگ کر جائے [۱]

۱۹۶۹ء میں جب کانگریس پارٹی دو دھڑوں میں منقسم ہوگئی، اُن دنوں کے سیاسی واقعات سے ظہور پذیر ہونے والی صورتِ حالات سے منوّر بہت زیادہ رنجیدہ اور متفکر نظر آتے ہیں اور اس صورتِ حال کو ان اشعار میں رقم کرتے ہیں :-

دل کانپتا ہے جس سے وہ صورت نظر میں ہے جمہوریت کا نام بھی لینا خطر میں ہے
امن و اماں سے، چین سے رہنا نہیں نصیب سودا فساد و شر کا رقیبوں کے سر میں ہے
خورشیدِ نو دمید کا رُخ پڑ گیا ہے زرد شامِ سیہ کا رنگ طلوعِ سحر میں ہے
خواب و خیال اب ہے نشیمن کی عافیت سازش جو لمحہ لمحہ بہ برق و شرر میں ہے [۲]

منوّر ہندوستان کے دِل دِلّی کے باشندہ تھے۔ جواہر لال نہرو کی وفات کے بعد پانچ چھ برسوں کی سیاسی ریشہ دوانیوں، حکمران پارٹی کی اندرونی پھوٹ، مرکز سے علیحدگی اور صوبائی خود مختاری کی قوت پکڑتی ہوئی تحریکوں، انتشار اور بدامنی کے رجحانات اندرونِ ملک کے خلفشار اور اقتصادی بحران، بڑھتی ہوئی مہنگائی، روز افزوں جرائم اور غنڈہ گردی، کمزور طبقوں کے استحصال، اقتصادی کرپشن اور بے ایمانی، کالا دھن جمع کرنے کے لیے سرمایہ داروں اور سیاسی نیتاؤں کی بڑھتی ہوئی دوڑ اور اخلاقی قدروں کا زوال دیکھ کر منوّر کا دل خون روتا تھا۔

ملک میں اشیائے خوردنی کی قلّت، ضروریاتِ زندگی کی اشیا کی ذخیرہ اندوزی اور عام صارفین کے استحصال سے جھنجھلا کر منوّر بڑے عام فہم اور سلیس الفاظ میں کہی ہوئی اس طنزیہ نظم میں فرماتے ہیں :-

اب ہے گیہوں چنے کی ضرورت ہی کیا، زہرِ غم پیٹ بھر بھر کے کھائیں گے ہم
کھیت بونے سے کچھ کام بنتا نہیں، کارخانوں سے غلّہ اگائیں گے ہم
اب ضرورت ہی پانی کی ہم کو ہو کیوں، اِک سینچائی کا ڈھنگ اور ہے ذہن میں
حق کی گردن پہ خنجر چلائیں گے ہم، خونِ ناحق کی نہریں بہائیں گے ہم

---

[۱] "سوزِ وطن" (قلمی مسوّدہ۔ منوّر لکھنوی)
[۲] ایضاً (غیر مطبوعہ قلمی بیاض منوّر لکھنوی)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

دیش کے ٹکڑے ٹکڑے کیے جائیں گے، یونہی دادِ حماقت دیے جائیں گے
دیش کی دھجیاں بھی اڑائیں گے ہم، دیش بھگتی کے گانے بھی گائیں گے ہم

سیاسی رہنماؤں کی ناعاقبت اندیشی، خانہ بر اندازی اور لوٹ کھسوٹ کا نقشہ منوّر نے ایک اور نظم میں کھینچا ہے جو درجِ ذیل ہے :۔

فتنے بیدار ہیں سے ہیں وطن میں اپنے ‌ ‌ آگ خود ہم نے لگائی ہے چمن میں اپنے
اب وہ شیرینیٔ گفتار کی لذت ہی کہاں ‌ ‌ تلخیاں آئیں یہ کس طرح دہن میں اپنے
رفتہ رفتہ ہوئیں سب کشتۂ دستورِ جدید ‌ ‌ خوبیاں جتنی تھیں آئینِ کہن میں اپنے
کیوں ہے رگ رگ کی طرف نشترِ فصّاد کا رُخ ‌ ‌ اب تو اک بوند نہیں خون بدن میں اپنے

مقامِ حیرت ہے کہ اس طرح کی انقلابی نظمیں تخلیق کرنے کے باوجود منوّر ترقّی پسند کہلانے کے مستحق نہیں ٹھہرے۔ ترقّی پسندوں یعنی اشتراکی ادیبوں نے انھیں تسلیم نہیں کیا۔

منوّر لکھنوی کے مذکورہ بالا قلمی مسودے جن کی اکثر نظمیں اخبارات ورسائل میں شائع ہو چکی ہیں، جہاں منوّر کی تلخ نوائی کے نمونے پیش کرتے ہیں، وہاں "کائناتِ دل" کی طرح ان میں قومی، مذہبی، روحانی اور صوفیانہ نظموں کا ایک رنگارنگ مرقّع بھی موجود ہے۔ ان کی مذہبی نظموں میں فرقہ وارانہ اتحاد اور مذہبی رواداری کی تلقین کا بنیادی نظریہ ساری وطاری ہے۔ قومی ایکتا ہمارے وسیع وعظیم ملک کی بقا اور ہمہ پہلو ترقّی کے لیے ناگزیر بھی ہے اور فطری تقاضا بھی۔ کیونکہ ہماری قومی ایکتا کی جڑوں میں سادھو، سنتوں، صوفیوں، رشیوں اور قلندروں کی ریاضت اور تپسیا کے ساتھ ساتھ منوّر جیسے دیانتدار، راست باز، منصف مزاج اور وسیع القلب شاعروں کی تبلیغ و رہنمائی بھی شامل ہے۔ اپنے مقالہ "منوّر اور مذاہب" میں راج نرائن رازؔ رقم طراز ہیں :۔

"منوّر عقیدت رکھتا ہے اور آنکھیں بھی۔ اس کی عقیدت، اس کی آفاقیت کو کسی طرح مجروح نہیں کرتی۔ بلکہ اسے چشمِ بینا دیتی ہے اور اسی چشمِ بینا کے صدقے وہ کام کی ہر شے کو چشم وسر سے لگانے کی خواہش رکھتا ہے۔" [1]

چنانچہ حضرت امام حسین کی شہادت کے سانحہ کے بارے میں منوّر فرماتے ہیں :

[1] منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (مرتب۔ راج نرائن رازؔ۔ صفحہ ۱۹۳، ۱۹۸۰ء)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہر چند غم فزا ہے شہادت حسینؑ کی — اِک ظلمِ ناروا ہے شہادت حسینؑ کی
اِک قہر اِک بلا ہے شہادت حسینؑ کی — ایماں کی انتہا ہے شہادت حسینؑ کی

پھر کیوں نہ اس کو ہمسرِ معراج مانیے
پھر کیوں نہ ان کی خاک کو اکسیر جانیے ۱؎

"عظمتِ اسلام کا راز"، کے زیرِ عنوان منوّر اپنی نظم میں کیا فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو :-

ہوتا نہ کہیں ذکرِ رسولِ عربی کا — لیتا نہ کوئی نام بھی اُس پاک نبیؐ کا
قرآن کے احکام کی توقیر نہ ہوتی — دنیا کبھی اسلام سے تسخیر نہ ہوتی
ایماں جسے کہتے ہیں وہ ایمان نہ ہوتا — اسلام کی توسیع کا امکان نہ ہوتا
توحید کے آئین جہانگیر نہ ہوتے — ممتاز شہادت سے جو شبیرؑ نہ ہوتے

اسلام نہ رہتا کسی تدبیر سے زندہ
اسلام ہے قربانیٔ شبیرؑ سے زندہ ۲؎

اِسی تاریخی واقعے کے متعلق ایک اور نظم منوّر لکھنوی کی غیر مطبوعہ بیاضِ نظمیات "شگفتہ عقیدے" کی زینت ہے۔ ملاحظہ ہو :-

دھبے پڑے ہیں جس کے سرِ آستینِ کفر — حیدر کا خون ہے، بنِ حیدر کا خون ہے
جس سے لہولہان ہے میدانِ کربلا — وہ ایک اُنس و خُلق کے پیکر کا خون ہے
ثابت ہوا جو نارِ جہنم برائے شمر — اِک جاں سپارہ مردِ دلاور کا خون ہے
اِس بندگی سے بڑھ کے عبادت ہے اور کون — پوچھو اِسے یہ سبطِ پیمبرؐ کا خون ہے ۳؎

ظاہر ہے کہ اسلام کی تاریخ میں سانحۂ کربلا کی اہمیت کا منوّر لکھنوی کو مکمل احساس تھا۔
قرآنِ کریم کی عظمت و تقدیس کے اعتراف و احترام میں منوّر کے یہ اشعار دیکھیے :-

قرآن ہے جو نام خدا کی کتاب کا — چہرہ ہے انبیائے فضیلت مآب کا

۱؎ شگفتہ عقیدے۔ (قلمی مسوّدہ۔ منوّر لکھنوی)
۲؎ " (غیر مطبوعہ قلمی بیاضِ نظمیات۔ منوّر لکھنوی)۔ نیز۔ منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (مرتبہ راج نرائن رازؔ)۔ صفحہ ۱۸۶-۱۸۷
۳؎ نقوشِ منوّر (غیر مطبوعہ قلمی بیاضِ نظمیات۔ منوّر لکھنوی)۔ صفحات پر نمبر درج نہیں۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

قرآن کی سطر سطر پہ قربان جایئے
کیا جائزہ لیا ہے گناہ و ثواب کا
اس کی حقیقتیں ہیں دوامی حقیقتیں
اس بارگہ میں دخل نہیں انقلاب کا
منشا یہ ہے کہ باز رہیں ہم گناہ سے
ہے بار بار ذکر جو روزِ حساب کا [۱]

حضرت علی کی منقبت ملاحظہ ہو :-

توصیف لبِ کلک پہ ہے خواہشِ نبیؐ کی
روداد خوش آہنگ ہے اک مردِ جری کی
تصویر کروں پیش میں کردارِ علیؑ کی
اس راہ میں احسن نہیں تقلید کسی کی
اَوروں کے نوالوں کو جو چباؤں تو مزا کیا
محدود ہے خلاقِ معانی کی عطا کیا

کعبے سے گر جتا ہوا جرّار وہ نکلا
سینے میں لیے گرمیِ پیکار وہ نکلا
مردانِ سلح پوش کا سردار وہ نکلا
جو صفِ شکن شرک تھا دیندار وہ نکلا
نظّارہ کرے غیر یگانہ اُسے دیکھے
انصاف کی آنکھوں سے زمانہ اُسے دیکھے [۲]

یہ نعتیہ نظمیں، نوحے اور منقبتیں منوّر کی انسان دوستی اور مذہبی رواداری پر مُہرِ تصدیق ثبت کرتی ہیں۔ انہی غیر مطبوعہ شعری بیاضوں میں بدھ مت، جین دھرم، سکھ پنتھ کے ہادیانِ دین اور حضرت یسوع مسیح کے لیے منظوم اظہارِ عقیدت بھی ملتا ہے۔ حضرت عیسیٰ کی شہادت پر منوّر لکھنوی کی نظم " امرِ حق " سے اقتباس ملاحظہ ہو :-

مَوت اور آئے ابنِ مریم کو
ذکر یہ کیا یہ بات ہی کیا ہے
کون ہے اس کو مارنے والا
کہیں مردِ خدا بھی مرتا ہے؟
دیکھنا یہ کہیں اجل تو نہیں
کون شرمندۂ مسیحا ہے؟
مَوت اس کو کبھی نہیں آتی
جاودانی خدا کا بیٹا ہے [۳]

اردو زبان کی عظمت پر منوّر لکھنوی کی ایک معرکہ خیز نظم "شگفتہ عقیدے" کے صفحات کی زینت ہے۔ اس کے دو تین بند درج ذیل ہیں۔ کس فنی التزام کے ساتھ اس پُر وقار زبان کی وکالت و حمایت کی ہے۔

---

[۱] شگفتہ عقیدے (غیر مطبوعہ قلمی بیاضِ نظمیات۔ منوّر لکھنوی)
[۲] " " " " "
[۳] " " " " "

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

یہ اپنی جنس ہے مالِ دکانِ غیر نہیں
برائے نام بھی اس میں نشانِ غیر نہیں
بیانِ غیر نہیں، داستانِ غیر نہیں
کسی طرح سے بھی اُردو زبانِ غیر نہیں
زبانِ دَیر، زبانِ حرم سمجھتے ہیں
خدا کی دین اِک اُردو کو ہم سمجھتے ہیں

عذاب اس میں کہاں ضامنِ ثواب ہے یہ
پسندِ خاطرِ ہر رند کامیاب ہے یہ
جو بے ضرر ہے وہ صہبائے انتخاب ہے یہ
جو سوم رس سے کشیدہ ہے وہ شراب ہے یہ
جھلک رہی ہے زُلیخا کی آن بان اس میں
شکنتلا کی جوانی کا ہے اُٹھان اس میں

شمال میں بھی وجود اس کا برگزیدہ ہے
دلِ جنوب کی بھی ترجمانِ چیدہ ہے
تمام مشرق و مغرب کی نورِ دیدہ ہے
مگر کچھ آج یہ انصاف نارسیدہ ہے
فروغ پا کے فقیروں میں بادشاہوں میں
کھٹک رہی ہے کچھ اصحاب کی نگاہوں میں [1]

مشرق کے مفکرِ اعظم اور شاعرِ منفرد مقام ڈاکٹر اقبال کی شخصیت اور فن سے منوّر لکھنوی کس قدر متاثر ہیں، ذیل کی غیر مطبوعہ نظم میں دیکھیے جو اُن کی غزلیات کے ایک قلمی مسوّدہ "تابانیاں" میں درج ہے :-

اقبال کے کلام کا لیتا ہوں جائزہ
اِسلام کا مفکرِ اعظم کہیں جسے
مہرِ زبانِ داغ لگی ہے کلام پر
ہر حرف وہ نگینۂ خاتم کہیں جسے
حیدرؑ کی ذوالفقار کا ہر لفظ میں جلال
فاروقؓ کا نشانِ مکرّم کہیں جسے
گفتارِ غیب بارشِ الہام کا جواب
افکار کی تراوشِ پیہم کہیں جسے
ملّت کی گمرہی پہ وہ اندازِ برہمی
آشفتگیٔ کاکلِ برہم کہیں جسے [2]

آج کی ابہام زدہ شاعری پر منوّر کا منظوم تبصرہ ملاحظہ فرمایئے :-

نہ تخیل نہ تصوّر، نہ ترنم، نہ اثر
آج کا شعر ہے یا بڑ کسی مجذوب کی ہے

---

[1] شگفتہ عقیدے (منوّر لکھنوی۔ قلمی نسخہ)

[2] تابانیاں (غیر مطبوعہ بیاض غزلیات۔ منوّر لکھنوی)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

حُسنِ بندش، نہ ہے الفاظ ہیں کوئی دروبست ‌ ‌ ‌ نہ تو ہئیت کی خبر کچھ ہے نہ اسلوب کی ہے

دریائے گنگا ہندوستان کی صدیوں پرانی تہذیب اور تمدن کے فروغ و عروج کا شاہد ہے اس کے کنارے عظیم اور مقدس بھارتی تہذیب کا مسکن و مرجع رہے ہیں۔ جواہر لال نہرو مرحوم نے اپنی وصیت میں بڑے جذباتی انداز میں اس مقدس ندی کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"گنگا بالخصوص ہندوستانی ندی ہے اور عوام کی محبوب۔ اس کے ارد گرد بھارت کی ناقابلِ فراموش یادیں، اس کی امیدیں و حسرتیں، اس کی فتح کے ترانے، اور اس کی فتوحات و شکستوں کے نقش ہیں۔ یہ بھارت کی صدیوں پرانی تہذیب و ثقافت کی مظہر رہی ہے۔ سدا رواں دواں اور سدا تغیر پذیر۔ مگر پھر وہی گنگا کی گنگا۔ یہ مجھے ہمالہ کی برف پوش چوٹیوں اور گہری وادیوں کی یاد دلاتی ہے جن سے میں نے ٹوٹ کر پیار کیا ہے۔ یہ مجھے نچلے وسیع اور خوبصورت و دلکش میدان یاد دلاتی ہے جہاں میری زندگی اور کردار وجود میں آئے۔" [1]

منوّر بھی بالکل اسی طرح کے جذبات کا اظہار گنگا جی کے بارے میں اس وصیت کے تحریر کیے جانے سے بہت پہلے کر چکے تھے۔ ۱۹۲۷ء کی اپنی ایک تخلیق بعنوان "گنگا" میں منوّر فرماتے ہیں:۔

اِک یمِ پاک ہے تُو نام ہے گنگا تیرا ‌ ‌ ‌ آبِ حیواں ہے مجھے آبِ مُصفّا تیرا
ترزباں وید مقدس تری توصیف میں ہیں ‌ ‌ ‌ خوب کھینچا ہے پُرانوں نے سراپا تیرا
سرفرازی تجھے کیلاش پتی نے بخشی ‌ ‌ ‌ پاؤں ہیں وشنو کے ہے مسکنِ زیبا تیرا
لے لیا گود میں بنگال کی کھاڑی نے تجھے ‌ ‌ ‌ عہدِ طفلی میں تھا کیلاش ہنڈولا تیرا
تجھ سے تاریخ سلف ہند کی وابستہ ہے ‌ ‌ ‌ داستاں اس کی وہی ہے جو ہے قصّا تیرا
دُور تر دامنی ہو جاتی ہے تیرے جل سے ‌ ‌ ‌ پار دنیا سے لگاتا ہے کنارا تیرا [2]

آخری شعر میں صنائع شعری کا حسین امتزاج ملاحظہ ہو۔ تردامنی، جل، پار لگانا اور کنارا جیسے الفاظ کی یکجائی سے صنعتِ تضاد نے شعر میں کیا کیفیت اور تلذذ پیدا کیا ہے۔ جل یعنی پانی میں غسل کرنے سے تردامنی کا دُور ہونا بظاہر متضاد بیان ہے اور کنارا کبھی مُسافر کو پار نہیں

---

[1] "پرواز ادب" (سہ ماہی جریدہ) پٹیالہ۔ نہرو نمبر۔ شمارہ نومبر دسمبر ۱۹۸۸ء صفحہ ۱۱۷ - ۱۱۸

[2] "کائناتِ دل" (منوّر لکھنوی) صفحہ ۲۰۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

لگاتا، سفینہ یا پُل یا تیرنے کا عمل پار لے جاتا ہے۔ لیکن یہاں معنوی تضاد نے عجب لطف پیدا کیا ہے۔ تر دامنی یہاں معصیت آلودگی اور گناہگاری کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور کنارے یا گھاٹ پر اشنان (غسل) کیا جاتا ہے۔ ہندو عقیدے کے مطابق گنگا اشنان بھوساگر (یعنی تناسخ یا دنیا میں بار بار جنم لینے کے چکر) سے پار لگا دیتا ہے۔

اسی طرح منوّر لکھنوی ایک اور نظم "گنگا جی" میں اس مقدّس ندی کے تئیں اظہارِ عقیدت کر چکے تھے۔ اس نظم کے کچھ بند حسبِ ذیل ہیں:-

نگاہوں میں کھنچا ہے تیرے طول و عرض کا نقشہ
ہزاروں میل طے کرتی ہوئی پہنچی ہے منزل پر
ترے دامن میں پھیلا تھا تمدن ہندوالوں کا
پڑی تہذیب کی بنیاد تیرے پاک ساحل پر

کیا رشیوں نے ماضی میں جو روشن شعلۂ عرفاں
ترا ساحل ہی اُس کو ہر طرف پہنچانے والا تھا
ہوئی سیراب کشتِ دل ترے شفاف پانی سے
ترے ساحل پہ ڈیرا مختلف قوموں نے ڈالا تھا[1]

ہر چند کہ "کائناتِ دل" کے بعد منوّر کی نظموں کا کوئی مجموعہ چھپ کر منظرِ عام پر نہیں آیا لیکن مذکورہ بالا قلمی بیاضوں کی بیشتر نظمیں ہندوستان کے مؤقر رسائل وجرائد اور روزناموں میں شائع ہو چکی تھیں۔ چوں کہ منوّر کی زیادہ تر توجہ ادبِ عالیہ کے تراجم اور ان کی اشاعت کی جانب منعطف رہی جسے اس نے افادیت کے اعتبار سے زیادہ معتبر اور مفید کام تسلیم کیا۔ اس لیے ان نظموں کی کتابی شکل میں اشاعت کا کام مسلسل التوا میں پڑتا گیا۔ تاہم یہ نظمیں منوّر لکھنوی کے تاریخی، مذہبی، سماجی، ثقافتی اور سیاسی شعور کی عکاس ہیں۔ ان میں اُس عظیم انسان اور دیانت دار شاعر نے انسانی رشتوں کی محبت، بھائی چارے، رفاقت، رواداری، اخوت، نیکی اور اخلاص کے پیغام کو سمویا ہے اور زندگی کی بدلتی ہوئی اقدار اور عصری تقاضوں کی توضیح و تشریح کی ہے، جو بیسویں صدی کے انسانوں کے ذہن و دل پر دستک دے رہے تھے۔ ان میں منوّر لکھنوی کے ساٹھ سالہ ادبی سفر کے تلخ و شیریں تجربات اور زندگی کی درسگاہ سے سیکھے ہوئے اسرار و رموز کا نچوڑ بھی شامل ہے اور اُس کا خونِ جگر بھی۔

---

[1] کائناتِ دل (منوّر لکھنوی) طبع اوّل۔ ۱۹۳۹ء صفحہ ۱۹۳-۱۹۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

باب سوم (ب)

منوّر بحیثیت غزل گو

منوّر کی غزل گوئی

- غزلوں کے مطبوعہ مجموعوں "نوائے کُفر" اور "ادائے کُفر" کا تنقیدی جائزہ۔
- غیر مطبوعہ تصانیفِ غزل "تابانیاں"، "تاثراتِ منوّر"، "بساطِ فکر"، اور "شاخِ مرجاں"، کی غزلوں نیز رسائل سے لی گئی غزلیات کا مطالعہ۔
- مجموعی تاثر

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منوّر لکھنوی بحیثیت غزل گو

اردو غزل کا مزاج صدیوں پُرانا ہے۔ اس صنف نے اپنی آفرینش اور ہندوستانی ادب میں اپنی ترویج کے لمحے سے لے کر اب تک کئی انقلاب دیکھے ہیں۔ اس کی اپنی کچھ روایات تھیں جو ہر دَور کے نئے تقاضوں سے متاثر ہوتی رہی ہیں اور قدم بقدم اپنا رُوپ بدلتی رہی ہیں۔۔۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ غزل کے خلاف بعض نامور نقادوں کی طرف سے مورچہ باندھا گیا۔ کلاسیکی غزل کے نام پر اس حسین و نازک صنف میں جو ابتذال دَر آیا تھا، اور بالخصوص لکھنوی اسکول میں اس کے جو منفی اثرات مرتّب ہوئے تھے اُن سے بعض ذی شعور ذہنوں کو اس قدر تکلیف پہنچی کہ الطاف حسین حالی جیسے متین و ذہین نقاد، جو خیر سے خود بھی شاعر تھے، یہ کہنے کی حد تک چلے گئے کہ:-

گنہ گار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنّم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

دراصل دِلّی کی بربادی کے بعد دربارِ اودھ مرکزِ شعر و سخن قرار پایا تو یہاں کی رنگینیوں نے غزل گوئی کو جنسی جذبات کے اظہار کا وسیلہ اور نشاطِ رندی کا آئینہ دار بنا دیا۔ غزل کو روایتی محبوب کے زلف و رُخسار، جام و مینا، اور عاشقِ نامُراد کی آہ و زاری کے دَور سے حقیقت پسندی، عصری تقاضات اور بدلتی ہوئی سماجی قدروں کی جانب زمام کش کرنے میں محمد حسین آزاد اور مولانا حالی کی تنقیدات کا نمایاں رول رہا۔

منوّر نے بھی حالی کی تحریک کا اثر قبول کیا۔ اگرچہ انھوں نے روایتی اسلوب سے انحراف

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

نہیں کیا۔ لیکن اُن کے یہاں موضوعات کی تازگی ہے۔ اُن کی غزل میں حسن وعشق کے روایتی رشتوں اور رنگ رلیوں، رقیب روسیاہ کی سازشوں، بادہ خانوں کی بدمستیوں اور طوائف کے کوٹھے کی شاعری کی پرچھائیں تک نہیں ملتی۔ منوّر لکھنوی کی غزل میں ذات وکائنات کے مسائل، کفر وایماں کے تذکرے، عشقِ حقیقی کے رموز واسرار، بندے اور خدا کے مابین روحانی رشتوں کی توضیحات اور عصری کرب وآگہی کے مناظر ملتے ہیں۔ عظمتِ انساں کے ساتھ ساتھ انسان کی مجبوری اور وقت کی مختاری پر تبصرہ آرائی ملتی ہے۔ سماج کی صالح اقدار کے انہدام وزوال کے نوحے ملتے ہیں اور مضامین کی تازہ کاری کے ساتھ ساتھ ہی شستہ اور شائستہ لکھنوی اردو کی نزاکت، شیرینی اور لطافت کے چٹخارے بھی۔

ذکاالدین شایاں کی رائے ہیں :-

"ابتدا ہی سے ہماری غزل میں دو لہریں متوازی چلتی رہی ہیں۔ ایک خاموش، گہری، متین اور فکر واحساس کا تازہ جمالیاتی رنگ لیے ہوتے اور دوسری ہزل، زٹل، مزاح، غیر سنجیدگی، فحشات، ہنگامہ خیزی اور چیخ وپکار کے عناصر کی نمائندہ ـــ اس کے علاوہ دو طرح کے غزل گو شعرا بھی اِس فن کی زمین پر موجود رہے ہیں۔ ایک وہ جو انتہائی خاموشی کے ساتھ ٹھوس ادبی جرائد اور کتب کے وسیلے سے معیاری ادب وشعر کے محدود حلقے میں متعارف ہیں۔ دوسرے وہ جو وقتی، رسمی اور فرسودہ غزل گوئی کی بنیاد پر عام سستے رسائل اور مشاعروں کی اداکاری سے پُر غنائی واویلا کے میدان میں عوامی تشہیر کو ادبی شہرت کا بدل سمجھ لیتے ہیں۔"[۱]

منوّر لکھنوی قبیلِ اوّل کا غزل گو ہے۔ وہ مشاعروں کا پیشہ ور شاعر نہیں ہے۔ غزل کو وہ کارگہِ شیشہ گری سمجھتا ہے۔ غزل کے بارے میں خود اُس کے کیا تاثرات ہیں، منوّر کے ذیل کے اشعار میں دیکھیے :

غرقِ یم صفات ہیں، جلوۂ ذات ہے غزل
روحِ وجود ہے غزل، جانِ حیات ہے غزل
فقر گواہ اور پھر حافظِ غیب داں گواہ
آبِ حیات ہے غزل، شاخِ نبات ہے غزل

ایک اور مقام پر غزل کی اہمیت وعظمت کو منوّر غزل ہی میں یوں بیان کرتے ہیں :-

[۱] ہماری زبان نئی دلی۔ شمارہ ۲۲ مئی ۱۹۸۸ء صفحہ ۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کیا بتاؤں میں تمھیں نکتۂ باریکِ غزل — ہوئی کس دردِ بلاخیز سے تحریکِ غزل
کھیل بچّوں کا اسے لوگ سمجھ بیٹھے ہیں — کوئی نا اہل نہ بھٹکے کبھی نزدیکِ غزل ۱؎

لہٰذا منوّر لکھنوی نے غزل کو ناپختہ ذہنوں کے تفننِ طبع کا کھلونا اور ذہنی عیّاشی کا آلۂ کار بنانے کی بجائے اس صنف کو بھی ایک مقدّس پیغام کا درجہ دیا ہے۔ اسے محض اس کے لغوی معنی ''عورتوں سے گفتگو یا عورتوں کے متعلّق گفتگو'' کی حدود سے باہر نکالا ہے۔ اس کی زبان میں لکھنؤ کی شائستگی کو برقرار رکھنے کے دوش بدوش اسے طہارت و پاکیزگی کے زیور سے بھی آراستہ کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ منوّر کی غزل کی زبان وہ نہیں ہو سکتی جو سعادت علی خاں اور غازی الدین حیدر کے لکھنؤ کی تہذیبی فضا کو منعکس کرے۔ نہ ہی وہ داغ کے عہد کے لذّت پرست سماج کی زبان ہو سکتی تھی جس کی بناوٹ سوقیانہ اور سستے قبیل کی عشق بازی کے لیے موزوں تھی۔ منوّر کے عہد کے تقاضے کچھ اور تھے۔ پروفیسر سید محمد عقیل فرماتے ہیں :-

''یہ سوچنا کہ غزل جو محض داخلی شاعری ہے۔ اس پر اُس فضا کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ جو شاعر کے گرد و پیش ہے۔ صحیح نہیں کبھی شاعر کی زبان روایت سے بغاوت کرتی ہے، اور کبھی بہت سی تہذیبوں کا احترام بھی لیکن ترسیل اُسے اپنے دَور کی لسانی بناوٹ سے الگ نہیں ہونے دیتی۔ چاہے خیالات کتنے ہی پیچ در پیچ راستوں سے ہو کر کیوں نہ چلے ہوں'' ۲؎

منوّر لکھنوی کی غزل کی زبان اور استعارات و علائم بھی عصری ماحول سے متاثر ہوئے اُن کا لب و لہجہ اور لفظیات سستی رومانی غزلیہ شاعری سے قطعاً مختلف ہیں اسلوبِ سخن بھی یکسر روایتی نہیں۔ تاہم منوّر نے روایت سے قطعی طور پر قطع تعلّق بھی نہیں کیا۔ روایتی اندازِ سخن میں بھی مضمون آفرینی اور عام روش سے ہٹ کر سنجیدہ مسائل کے در آنے سے منوّر کی غزل زیادہ وقیع اور وسیع ہو گئی ہے اور یہ ذہنی عیّاشی اور کوری رومان پرستی کی مظہر صنفِ سخن سے بالکل الگ اور منفرد دکھائی دیتی ہے۔

ماہنامہ ''پاسبان'' چنڈی گڑھ میں منوّر لکھنوی نے اپنے فن کے متعلّق ایک نثری مضمون میں یوں اظہارِ خیال کیا ہے :-

---

۱؎ ماہنامہ ''رہنمائے تعلیم'' دہلی۔ شمارہ مارچ ۱۹۹۱ء ۲؎ غزل کے نئے جہات (پروفیسر سید محمد عقیل) مطبوعہ ۱۹۸۹ء، صفحہ ۹۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

"بعض سطحی بیں اور رومان پسند حضرات میری غزلوں کو خانقاہی غزلیں کہا کرتے ہیں۔ ایک اسکول کا خیال ہے کہ مَیں میدانِ نظم کا شاعر ہوں، میدانِ غزل کا نہیں۔ یہ اپنی اپنی رائے ہے۔ میرے لیے اس کی تردید یا تائید کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص کی شخصیت اور اس کے واردات کے متعلق دو یا دو سے زائد رائیں ہوسکتی ہیں اور میں اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔"[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو ادیب بھی عام روش سے ہٹ کر اپنا اسلوب تحریر اختیار کرے گا، وہ اس طرح کے اعتراضات اور حرف زنی کا تختۂ مشق ضرور بنے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ منوّر کی غزل اپنے عہد کے مزاج، تہذیبی اور سماجی ڈھانچے، انسانی مسائل، نفسیاتی اور جذباتی کیفیتوں، نیز معاشی اور سیاسی حالات سے مستحکم رشتہ جوڑے ہوتے ہے۔ اس میں معاملاتِ عشق کی تہہ داریاں، راز و نیاز اور جاگیردارانہ سماج کا وہ رُسوائے زمانہ جنسی اختلاط و تلذذ مفقود ہے۔ منوّر کا عشق بھی طہارت و پاکیزگی کا سَتر پوش عشق ہے۔ کوری اور عریاں ہوس پرستی نہیں۔ یہ جذبۂ عشق کردار کی عظمت و شائستگی کی علامت یا سمبل SYMBOL ہے، اخلاقی گراوٹ اور نفس پرستی کا مظاہرہ نہیں۔ اس موضوع پر منوّر کی فکر کی تازگی اور جدّت، اظہار کے کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیے:-

- کیوں نہ بلائیں لیجیے حُسنِ ستم ظریف کی — آپ ہی آئینہ دکھائے آپ ہی خودنما بنے[2]
- کیا جانے کس سوال کا پایا ہے کیا جواب — آنسو بھرے ہیں دیدۂ امیدوار میں[3]
- دیکھ کر تکیۂ گُل مجھ کو خیال آتا ہے — تیرے زانو سے مرے سر کا تعلق کیا ہے[4]

- یہ آنکھیں کس لیے پھر اور دی ہیں دینے والے نے
  چراغِ حُسن کا پروانہ ہونا بھی ضروری ہے[5]
- نہ رات رات تھی اُس کی نہ اُس کی نیند تھی نیند
  کبھی کسی کو نہ جس نے شریکِ خواب کیا[6]

مذکورہ بالا اشعار میں منوّر کے ذوقِ نظر، تقدیسِ عشق، جمالیات کے نکھرے سنورے

---

[1] ماہنامہ "پاسبان" چنڈی گڑھ۔ شمارہ ماہ مئی ۱۹۵۹ء صفحہ ۲ (مقالہ نگار: منوّر لکھنوی، عنوان مقالہ: اکابرِ اردو ادب)

[2-3] نوائے کفر (منوّر لکھنوی)، طبع اوّل ۱۹۶۱ء، صفحات بالترتیب، ۹۳-۹۸

[4-5-6] ادائے کفر، " ۱۹۶۲ء " ۱۰۴-۱۰۹-۲۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ذوق اور شائستہ حُسن پرستی کی جھلک ملتی ہے۔ وہ حُسن کا ذکر بھی پرستش اور تعظیم کے پیرائے میں کرتے ہیں۔ اُن کے عشق میں سطحیت اور عامیانہ پن کا شائبہ تک نہیں۔ یہی تاثر اُن کے ذیل کے اشعار سے ملتا ہے۔

• ہوتے ہیں خموشی سے اُدا دِل کے مطالب ــــــ قائل جو ہو نغمے کا یہ وہ ساز نہیں ہے[1]

• ترا خیال مرے گلستانِ روح کا پھول ــــــ ترا خیال مرے دل کی انجمن کا چراغ[2]

• کسی کے سامنے کھلتی نہیں زباں میری ــــــ خبر نہیں کہ مرے دل کا مدّعا کیا ہے[3]

منوّر کا عشق محجوب اور محتاط عشق ہے شوخی و بے باکی، نظر بازی، آوارہ مزاجی، بے راہ رُوی اور ہوس پرستی سے کوسوں دُور۔ یوں تو ہر شاعر بقدرِ پیمانۂ احساس حُسن پرست ہوتا ہے اور اپنے عہدِ شباب میں عشق کے مختلف مراحل و کیفیات، تجربات و واردات سے گزر چکا ہوتا ہے۔ منوّر بھی اس سے مستثنا نہیں۔ لیکن منوّر کے گھر کا ماحول شاعرانہ اور اُدب پرور ہونے کے ساتھ ساتھ گہری مذہبیت کی دبیز چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ پھر منوّر کی غزلیات کے دونوں مجموعے "نوائے کفر" اور "ادائے کفر" اس وقت شائع ہوئے جب وہ اپنی عمرِ عزیز کی چونسٹھ بہاریں دیکھ چکے تھے۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ ایسے گرم و سردِ زمانہ چشیدہ اور عمر رسیدہ فنکار سے غمِ عاشقی کے حیاتی قصّوں اور عشق کے سوقیانہ پن کے مظہر مذاقِ عام کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی۔ معاملہ عشق و عاشقی کا ہو یا دوسرے موضوعاتِ شاعری کا۔ منوّر کے اِس دعوے کا اِطلاق مجموعی طور پر اس کی تمام شاعری پر ہوتا ہے کہ:۔

میرا مذاقِ خاص منوّر ہے دیدنی ــــــ مجھ سے مذاقِ عام بہت دُور ہے بہت[4]

منوّر اپنے اسی عقیدے کو گویا ذیل کے شعر میں دہراتا ہے:۔

مری نظر میں کبھی رنگ یہ چڑھا ہی نہیں ــــــ مرے کلام میں رُومان کی تلاش نہ کر[5]

لہٰذا منوّر نے غزل کی آڑ میں عُریانِ اُدب، اخلاق و اطوار کو بالائے طاق رکھ کر کھُل کھیلنے والا

---

[1] بساطِ فکر (غیر مطبوعہ بیاض۔ منوّر لکھنوی) [2] تابانیاں (غیر مطبوعہ قلمی مسوّدہ منوّر لکھنوی) صفحہ ۲

[3] تابانیاں (منوّر لکھنوی) (قلمی مسوّدہ) صفحہ ۱۰

[4] شاخِ مرجاں (غیر مطبوعہ بیاضِ غزلیات۔ منوّر لکھنوی) صفحہ نمبر درج نہیں

[5] بساطِ فکر (" ") صفحہ نمبر ۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ادب تخلیق نہیں کیا۔

مفکروں کا کہنا ہے کہ ادب نہ صرف حسن ہے بلکہ انسان کے جمالیاتی تجربات کی تخلیق ہے۔ جمالیات کا احساس و مشاہدہ صرف اپنے مجازی محبوب کے سراپا کو ٹٹولنے اور اس کے بدن کی بھول بھلیاں میں گم رہنے ہی تک محدود نہیں۔ یہ شاہدِ فطرت کے گوناگوں مناظر، نیز محبوب و معبودِ حقیقی کے کرشموں اور بوقلموں جلوؤں میں بھی وسیع امکانات رکھتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ دیکھنے والی آنکھ ہو اور شاعر شعور و وجدان سے عاری نہ ہو۔ یہ عشق خدا اور بندے کے مابین راز و نیاز کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح کی سرگوشیاں اور محبوبِ حقیقی سے اختلاط کے پہلو منوّر لکھنوی کی غزل میں بیشتر ملتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:۔

- ہری نظر نے مکمل ہر اشباب کیا — رہا نکھر کے سلیقہ مرے تقاضوں کا[1]
- جانے کی طرح جائے گی، جان یہ کب ترے لیے
  آنے کی طرح آئے گا مجھ کو خیال کب ترا؟[2]
- آنکھ بنتی ہے زبانِ حسن کی مداحی میں[3] — عمر مانع نہیں اس دشت کی سیاحی میں
- بیداریاں نثار ترے خوابِ ناز پر[4] — آئیں تجھے لٹاؤں بساطِ نیاز پر
- تو نظر آتا ہے اس میں یا نظر آتا ہوں میں[5] — آئینے میں شکل آخر کیا یہ پیدا ہو گئی
- جان ہوگی کبھی تصویر میں پیدا کہ نہیں؟[6] — آپ ہوں گے دلِ مشتاق سے گویا کہ نہیں؟

فراقؔ گورکھپوری غزل کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

"غزل انتہاؤں کا ایک سلسلہ SERIES OF CLIMAXES ہے۔ یعنی حیات و کائنات کے وہ مرکزی حقائق جو انسانی زندگی کو زیادہ سے زیادہ متاثر کرتے ہیں، تاثرات کی انہی انتہاؤں یا منتہاؤں کا مترنم خیالات و محسوسات بن جانا اور مناسب ترین یا موزوں ترین الفاظ و اندازِ بیاں میں ان کا صورت پکڑ لینا اسی کا نام غزل ہے۔"[7]

[1-2] ادائے کفر (منوّر لکھنوی) مطبوعہ ١٩٦٢ء۔ صفحہ ٧٩ - صفحہ ١٣ بالترتیب

[3-4] تابانیاں (منوّر لکھنوی۔ غیر مطبوعہ بیاضِ غزلیات) [5-6] نوائے کفر (منوّر لکھنوی۔ ایڈیشن ١٩٦١ء۔ بالترتیب صفحات ٢٥-٥٣ - [7] ماہنامہ "نگار" شمارہ جنوری فروری ١٩٥٧ء صفحہ ٣٠

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے فراقؔ لکھتے ہیں :-

"زندگی کے مرکزی اور اہم حقائق و مسائل غزل کے موضوع ہوتے ہیں۔ ان حقائق میں واردات عشق کو اوّلیت حاصل ہے...... غزل ہمیں جنسیت کی اہمیت کا احساس کراتی ہے اور جنسیت جب داخلی وغیبی تحریکوں سے عشق بن جاتی ہے تو اس عشق کے لا محدود امکانات کی طرف اس عشق کے ذریعے سے تعمیرِ انسانیت کی طرف غزل اشارہ کرتی ہے۔ عشق کا پہلا محرک محبوب کی شخصیت ہے۔ پھر یہی عشق حیات و کائنات سے ایک ایسا والہانہ لگاؤ پیدا کر دیتا ہے کہ جنسیت کے حدود سے گزر کر عشق ایک ہمہ گیر حقیقت بن جاتا ہے۔"[۱]

منورؔ لکھنوی کے مذکورہ بالا اشعار فراقؔ کے اس قول کی صداقت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں اور اس معیار پر پورے اُترتے ہیں۔

منورؔ کے گھر کے مذہبی ماحول کے مثبت اثرات منورؔ کے کردار و افکار پر بھی مرتب ہوئے۔ لہٰذا انسانیت کی اعلیٰ قدروں، مذہبی رواداری، خدا پرستی، انسان دوستی، بلند اخلاقی، عدم تشدّد، شرافت، دوسرے فرقوں اور اُن کے عقائد کا احترام منورؔ کی زندگی اور اُس کے تخلیقی عمل کا جزوِ لاینحل بن گئے اور انھوں نے اپنی غزل سے اِن رُویوں اور مثبت اقدار کے ابلاغ کا کام لیا۔ ان کی غزلوں میں سے چند نمونے دیکھیے :-

وہ خواہ مینا ہو خواہ ساغر، وہ خواہ قرآں ہو، خواہ منبر
لگائیں گے اُس کو چشم و سر سے جو شئے ہمیں کام کی ملے گی [۲]

- صورت رہے نہ آپ کی محتاجِ آئینہ — جو خود ہی آئینہ ہو وہ صورت بنائیے [۳]
- رہا ہوں دُور ہمیشہ زمانہ سازی سے — مری سرشت یہ میرا ضمیر کیا ہوگی؟ [۴]
- بھول جائیں وجود ہم اپنا — بخدا بندگی یہی تو ہے [۵]
- جو میرے دل سے نکل کر فروغ دہر بنے — مری نظر میں اُجالا وہی اُجالا ہے [۶]

۱؎ ماہنامہ "نگار" شمارہ جنوری، فروری ۱۹۵۷ء صفحہ ۴۰

۲؎ نوائے کفر (منورؔ لکھنوی) طبع اوّل ۱۹۶۱ء صفحہ ۶۳

۳؎ ۴؎ ادائے کفر (" ") ۱۹۶۲ء صفحہ ۹۸۔۸۶ بالترتیب

۵؎ تابانیاں (غیر مطبوعہ بیاضِ غزلیات۔ منورؔ لکھنوی)

۶؎ " (" " " ")

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

• کیا بتائیں تمھیں ہم کفرِ حسیں کا اعجاز — دیر میں جائیں تو کعبے کی زیارت ہو جائے[۱]
• ملتیں یوں نہ اُڑاتیں کبھی ایماں کا مذاق — دیر و کعبہ کی کلیسا کی ضرورت کیا تھی[۲]
• ہر شخص کے فروغ میں میرا فروغ ہے — اپنا ہی خود بلند ستارا کروں تو کیوں[۳]

اپنی تالیف "آزادی کا ادب" میں گوپال متل فرماتے ہیں :-

"سچے ادیب اور شاعر فطرتاً انفرادیت کیش اور تنہا رو ہوتے ہیں۔"[۴]

لیکن انفرادیت کے حصول کے لیے یہ امر لازمی نہیں کہ روایت سے بغاوت کی جائے شمیم حنفی اپنی تصنیف "غزل کا نیا منظر نامہ" میں فرماتے ہیں :

"روایت کی حیثیت فن اور فکر کے ارتقا میں اساسی ہوتی ہے۔ اس حقیقت سے قطع نظر زندہ اور فعّال حقیقتوں سے مملو روایت بیک وقت آئندہ حقیقتوں کے محرک اور اُن کے امتحان کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ وہ ماضی اور حال دونوں زمانوں میں ایک ساتھ زندہ رہتی ہے اور وقت سے اس کا رشتہ محض ایک تاریخی واقعے یا پس منظر کی شکل میں نہیں استوار ہوتا بلکہ ارتقا پذیر میلانات کے ساتھ اس کے وجود اور معنویت کا احساس اور زیادہ مستحکم ہوتا جاتا ہے۔"[۵]

روایت کے متعلق موصوف ایک اور مقالے میں لکھتے ہیں :-

"تسلیم شدہ روایتیں، ایسی روایتیں جن کی جڑیں کافی گہری اور مضبوط ہو چکی ہوں اور جن کی تہہ میں رواجِ زمانہ کے بجائے سچی تخلیقی لگن کا دخل رہا ہو یقینی طور پر انفرادیت کے راستے کی دیوار نہیں بنتیں۔"[۶]

منوّر لکھنوی کی غزل مذکورہ بالا اقوال کی تائید کرتی ہے۔ غزل کے موضوعات میں منوّر نے جو جدّت طرازیاں کی ہیں وہ روایتی لکیر سے ہٹ کر ہیں۔ سپاٹ اور سطحی خیالات اور

۱۔ تابانیاں (غیر مطبوعہ بیاض غزلیات۔ منوّر لکھنوی)
۲۔ ۳۔ نوائے کفر (منوّر لکھنوی) صفحہ ۱۰۶ ۔ صفحہ ۱۴۱ بالترتیب
۴۔ آزادی کا ادب حصّہ اوّل (مؤلف گوپال متل) ایڈیشن ۱۹۵۴ء۔ صفحہ ۶
۵۔ غزل کا نیا منظر نامہ (شمیم حنفی) طبع اوّل ۱۹۸۱ء۔ صفحہ نمبر ۱۱
۶۔ مقالہ "احاطۂ غزل میں کفر کی حقیقتِ بسیط" (ڈاکٹر شمیم حنفی) دو ماہی شاخسار کٹک۔ جلد ۵۔ شمارہ ۲۲-۲۳، ۱۹۶۹ء صفحہ ۵۶

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

روایتی حُسن پرستی کی جگہ عصری آگہی، حالاتِ حاضرہ اور سیاسی اور سماجی مسائل نے لے لی عرفانِ ذات اور اپنے خالق سے رُوحانی اور جذباتی رِشتے کو استوار کرنے کی نئی نئی راہیں تلاش کی گئی ہیں۔ منوّر کی غزلیات کے دونوں مطبوعہ مجموعوں کے نام "نوائے کفر" اور "ادائے کفر" اسی رجحان کے مظہر ہیں اور شاعر کے اعلیٰ فکری رویّے، سنجیدگیِ سخن اور پختہ مذاق کی دلالت کرتے ہیں۔ کفر و ایمان، حیات و مَوت، فنا و بقا، خودی و بے خودی، عرفانِ ذات اور ذرّے ذرّے میں سمائی ہوئی کائناتی روح اس کے گوناگوں جلووں کے مشاہدات، حسنِ ازل کی تلاش و جستجو اور خود آگہی و عبودیت کے معاملات پر منوّر سے بہتر اشعار کون کہے گا۔ انہی مضامین پر منوّر لکھنوی کی غزلیات میں سے چند اشعار دیکھیے۔ جن میں مذکورہ فلسفیانہ امور کو منوّر نے کمال مشّاقی اور سلیقے سے نظم کیا ہے۔

- نہیں محال تجھے زندگی میں پا لینا — مگر ہے شرط تری جستجو میں کھو جانا [1]
  ذرا سنبھل کے منوّر ہے مرحلہ نازک — خودی کے جوش میں آ کر خدا نہ ہو جانا [2]
- خود کو محیطِ کون و مکاں پا رہا ہوں میں — اس آئینے میں صاف نظر آ رہا ہوں میں [3]
- سرِ نیاز کسی آستاں پہ کیا جھکتا — نہ ہو سکی کبھی اپنی بھی بندگی مجھ سے [4]
- فنا کا کیا اثر مجھ پہ بقا کا کیا اثر مجھ پر — طریقِ عشق میں ایسے مقام آتے ہی رہتے ہیں
  طلوعِ زندگی کیا ہے غروبِ زندگی کیا ہے — یہ منظر دیکھنے میں صبح و شام آتے ہی رہتے ہیں [5]
- بہت دیکھے ہیں اپنے در پہ مہر و ماہ کے سجدے — کبھی تم نے مری شانِ جبیں سائی بھی دیکھی ہے [6]
- ازل سے جو تعلق ہے کبھی وہ مٹ نہیں سکتا — یہ نکتہ ہم نے ربطِ ساحل و دریا سے جانا ہے [7]

خدا کے بارے میں بھی منوّر ایک خصوصی تصور اور جداگانہ عقیدہ رکھتے ہیں اور اپنے اور خدا کے مابین کے اس مقدّس رشتے میں کسی کی مداخلت گوارا کرنے کو تیار نہیں۔ ان کا کہنا ہے :-

کاش تم اس کا فیصلہ میرے ہی دل پہ چھوڑ دو — کس کی میں بندگی کروں کون مرا خدا بنے [8]

ایک مفکّر کا کہنا ہے :-

---

[1]، [2]، [3]، [4]، [5] نوائے کفر (منوّر لکھنوی) طبع اوّل ۱۹۶۱ء صفحات بالترتیب ۱۹، ۱۹، ۶، ۵، ۲۱، ۲۷

[6] تابانیاں (غیر مطبوعہ بیاض) منوّر لکھنوی

[7] " " "

[8] نوائے کفر (منوّر لکھنوی) صفحہ ۹۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

" زیادہ گھروں کا مہمان بھوکا ہی رہتا ہے اور دو کشتیوں کا سوار ڈوبتا ہی ہے۔ دراصل منشیہ کو شروع میں ہی خوب سوچ وچار کر کے اپنا اشٹ نرد ھارت کرنا چاہیے۔ بعد ازاں اس میں کسی حالت میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کرنی چاہیے۔ کیوں کہ اپنی مرضی کے انوسار جب اشٹ دیوتا کو چن کر اس کے گلے میں ور مالا ڈال دی جائے وہ ہمیشہ کے لیے پتی یا سوامی بن جاتا ہے جس طرح پتی ورتا استری اپنے پتی پر میشور پر پوری نشٹھا رکھتی اور پرائے پرش کا خواہ وہ کتنا ہی امیر، شکتی شالی، خوبصورت اور گن وان کیوں نہ ہو اپنے دماغ میں خواب میں بھی خیال تک نہیں آنے دیتی یہی ستھتی منشیوں کی اپنے اشٹ کے بارے میں ہونی چاہیے "[1]

بالکل یہی یقین محکم اور راسخ اعتقاد منوّر کی عرفانیت وعبودیت کا سنگ بنیاد ہے۔ وہ ڈنکے کی چوٹ یہ کہتے ہیں :

چاہے یہ اب شرک ہو چاہے یہ اب کفر ہو جس کو خدا کہہ دیا اُس کو خدا کہہ دیا[2]

اور اسی قبیل کے چند مزید اشعار ملاحظہ کیجیے :-

ہزار کفر ہیں اک چشم پارسا میں تری بھری ہوتی ہے شرارت ادا ادا میں تری
یہ کس مقام سے تو نے خطاب فرمایا سنی گئی مری آواز بھی صدا میں تری[3]

منوّر فلسفۂ اجر وعمل اور تناسخ روح میں پختہ یقین رکھتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں ہر انسان کے اعمال کا محاسبہ لحہ بہ لحہ ہو رہا ہے۔ ذات ازلی کے اچوک اور بے خطا کمپیوٹر اور کارکنانِ قضا وقدر ہر ذی روح کے افعالِ نیک وبد کا حساب رکھے ہوئے ہیں اور ان میں کسی سہو اور غلطی کا امکان نہیں۔ انسانی روح ایک قفسِ عناصر سے آزاد ہوتی ہے تو اُسے اپنے اعمال کے حساب کے مطابق نیا چولا یعنی نیا جنم مل جاتا ہے، اور وہ پھر سے دنیاوی نشاط والم کے چکّر میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ اس دائرے کے سفر کی انتہا نا معلوم ہے۔ چنانچہ منوّر لکھنوی نے اپنے اس عقیدے کو اپنی غزلیات میں اکثر دہرایا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

- خاتمہ جب مری ہستی کے سفر کا ہوگا نہیں معلوم کہ پھر قصد کدھر کا ہوگا
کیا کہوں تم نے ابھی میں نے اٹھایا ہے قدم خاتمہ جا کے کہاں راہ گزر کا ہوگا[4]

---

[1] ماہنامہ "اوم" شمارہ مئی ۱۹۹۱ء صفحہ ۲۴ [2] تابانیاں (منوّر لکھنوی۔ قلمی نسخہ)

[3] ادائے کفر (" ") مطبوعہ ۱۹۶۲ء صفحہ ۷۹

[4] تابانیاں (منوّر۔ قلمی نسخہ)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کس کو ہم مسکنِ جاوید منوّرؔ سمجھیں — رُوح اپنی ابھی گھر اور بہت بدلے گی [1]

جمیل ذوقِ فنا جو ہو گا تو جاں فزا موت بھی ملے گی
تجھے مبارک ہو مرنے والے کہ اک نئی زندگی ملے گی [2]

لیکن انسان تناسخ کی زنجیر کا قیدی ہونے کے باوجود بالکل بے دست و پا نہیں ہے منوّرؔ کی نگاہ میں روحِ انساں وہ قوی اور معجزاتی ہستی ہے جو نیک راہ پر چلے اور ذاتِ ازل سے خلوص و عقیدت کا رشتہ استوار کرے تو اس کے قدموں میں بلند سے بلند منازل و مقامات بھی گردِ راہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ بشرطیکہ انسان اس رُوحانی ارتقا کی جانب اپنی قوتیں صَرف کرے۔ عظمتِ انساں منوّرؔ لکھنوی کی نگاہ میں کیا ہے، ان اشعار میں ملاحظہ ہو:۔

- اک دل میں کائناتِ دو عالم سما گئی — اک پھول نے سمیٹ لیا ہے چمن تمام [3]
- کھٹکتا ہے بہت جبریل و شاہیں کی نگاہوں میں
  مرا بے بال و پر ہوتے ہوئے پرواز کر جانا
- یقیں ہوتا ہے مستحکم جہاں ایمان ہوتا ہے — وہیں انسان کی تکمیل کا سامان ہوتا ہے [4]
- مری فنا کا نہایت بلند رتبہ ہے — چراغِ صبح نہیں، آفتابِ شام ہوں میں [5]
  روزِ ازل سے ہے مرے ایماں میں پختگی — مجھ سے طریقِ خام بہت دُور ہے بہت
- میرے طلوع کو نہیں کھٹکا غروب کا — میری سحر سے شام بہت دُور ہے بہت [6]

غالب نے کہا تھا:۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

منوّرؔ لکھنوی کا غزلیہ کلام بھی "بادہ و ساغر" اور رندی کے ذکر سے خالی نہیں۔ خمریات منوّرؔ کا محبوب موضوع رہے ہیں، لیکن منوّرؔ جو متقی اور پرہیزگار منُش تھے اپنے دامن کو ٹھیکے کی شراب کی گلکاریٔ عصیاں سے نہیں رنگ سکے۔ انھوں نے رندی و مستی کو بھی عشقِ حقیقی اور انسان کی

---

[1] ادائے کفر (منوّرؔ لکھنوی) صفحہ ۸۵۔
[2] نوائے کفر (") صفحات بالترتیب ۶۲ — [3]-[4] نوائے کفر صفحہ ۸۶ و ۱۰۷
[5] " (") صفحہ ۵۷
[6] بساطِ فکر (" قلمی مسودہ)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

رُوحانی ترنگ و تاز کے سمبل (استعارہ) کے طور پر استعمال کیا ہے۔ چند اشعار اس موضوع پر ملاحظہ کیجیے :۔

- سب ارتقائے رُوح کے سامان بن گئے — پی ہم نے جب شراب تو انسان بن گئے [۱]
- کیا میری تشنگی کو مٹانے کی ہے یہ شکل — میرے لبوں سے جام بہت دور ہے بہت [۲]
- کھول دیں بادۂ گُل گوں نے منوّر آنکھیں — آگیا ہوش مجھے ہاتھ میں جام آتے ہی [۳]
- ہر وقت ہر مقام پہ کُھل کر کرے گا نوش — صہبائے خانہ ساز منوّر کے بعد کون ہے [۴]

قاری بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ منوّر کی "صہبائے خانہ ساز" کا وہ جام لبریز کون سا ہے جو نشہ آور ہونے کی بجائے ہوش آور ہے اور جو انسان کے لیے نہ صرف وجہ خود آگہی و بیداریِ رُوح بن جاتا ہے بلکہ "ہر وقت اور ہر مقام" پر نوش کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر شمیم حنفی اپنی تنقیدی تصنیف "غزل کا نیا منظر نامہ" میں رقم طراز ہیں کہ :۔

" روایت کا وہی حصہ قابلِ قبول ہو سکتا ہے جو حال کی تشکیل، تفہیم اور تجزیے میں مدد دے سکے۔ روایت کا یہ تعارف جدت پر ایک حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔ " [۵]

مذکورہ بالا حوالے کی حد تک منوّر نے بھی روایت سے مفید کام لیا ہے۔ ان کی غزل میں اُردو شاعری کی صحت مند روایات سے ہم آہنگی کے باوجود ایک نئی فضا، اور طرزِ فکر و اظہار میں ایک خوش گوار اور ارتقائی تغیر کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی غزل کے مضامین میں جو تنوّع، جدت آفرینی اور بوقلمونی نظر آتی ہے، وہ غزل کے روایتی سانچوں میں متشکل ہے معنوی اعتبار سے انھوں نے روایات کی بندشیں توڑی ہیں لیکن وہ مُروّجہ ہیئتوں کے دائرے سے باہر نہیں نکل پاتے۔ تاہم ان کی صالح و معتمد کلاسیکیت کے ساتھ لفظیات کا نیا پن، مضامین کی تازگی اور اسلوب و لہجے کی طرح داری قاری کو متاثر کرتی ہے۔ اس اندازِ سخن میں زبان کا چٹخارہ اور لکھنویت کی لطافت، تہذیبِ غزل کے دوش بدوش برقرار و محفوظ ہے۔ زبان کے اشعار میں

۱۔ بساطِ فکر (منوّر لکھنوی قلمی مسودہ)

۲۔ تابانیاں (" ")

۳۔ ۴۔ ادائے کفر (منوّر لکھنوی) بالترتیب صفحات ۸۳-۶۷

۵۔ غزل کا نیا منظر نامہ (ڈاکٹر شمیم حنفی) ایڈیشن ۱۹۸۱ء صفحہ ۱۴۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بات کہنے کا سلیقہ، نفاست، لطافت، محاورہ بندی اور بندش کی چستی ایسی کہ جو قاری کے دل کو گدگداتی ہے۔ ایسی کچھ مثالیں درج ذیل ہیں۔ شستہ اور منجھی ہوئی زبان کی لذت کے ساتھ ان اشعار میں صنائع و بدائع کی جلوہ افروزی بھی ملے گی۔

خودی سامنے ین کے آئینہ آئی
بھلائی نہ آئی بُرائی نہ آئی[1]

(صنعتِ تجنیسِ مفروق کے ساتھ صنعتِ تضاد دوسرے مصرعے میں قافیہ کے تصرف نے صنعتِ تجنیس کا لطف دوبالا کر دیا ہے)

میں جس سے تھا سُبک وہ گرانی چلی گئی
سر سے ہوائے عالمِ فانی چلی گئی[2]

(صنعتِ تضادِ ایجابی ملاحظہ ہو "سُبک" کے ساتھ "گرانی" کے تضاد اور سُبک کے محاوراتی استعمال نے سادگی میں پُرکاری بھی ملا دی ہے)

مرے ہی دل نے ستم مجھ پہ ڈھائے ہیں کیا کیا
برنگِ بادِ صبا گُل کھلائے ہیں کیا کیا[3]

(محاورہ "گُل کھلائے" کا معنوی تاثر اور ایہامِ تناسب کی خوبصورتی ملاحظہ ہو اِس شعر میں)

نہ آیا پھر بھی پانی کو مرے سر سے گزر جانا
ترقی کی بہت دریا کی موجوں نے تلاطم میں[4]

(محاورہ بندی اور صنعتِ ایہامِ تناسب۔ پانی کا سرے گزر جانا معنوی لطافت پیدا کر رہا ہے)

اوس پڑ جائے تو کیوں آس لگائے رکھوں
نہیں امید کہ شاداب ہو دل کی کھیتی[5]

(صنعتِ اشتقاق کے ساتھ محاورہ بندی اور صنعتِ تجنیس بھی)

کسی کی آبرو پہ حرف ہم آنے نہیں دیتے
گہر ہو، آئینہ ہو، سنگریزہ ہو کہ دریا ہو[6]

(صنعتِ مراعات النظیر کے ساتھ محاورہ بندی کا سلیقہ ملاحظہ ہو)

مرے زخموں پہ کھنے کی طرح مرہم نہیں رکھتے
جراحت آزما ہو کر علاجِ غم نہیں رکھتے[7]

---

[1] رامائن بالمیکی (نثری ترجمہ۔ منوّر لکھنوی) طبع اوّل ۱۹۳۱ء دیباچہ صفحہ ۶
[2] نوائے کفر (منوّر لکھنوی) صفحہ ۲۴
[3] ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ ۹۵
[4] " " " " ۱۰۷
[5] " " " " ۶۵
[6] " " " " ۵۵
[7] بساطِ فکر۔ غیر مطبوعہ۔ بیاضِ غزلیات۔ منوّر لکھنوی) صفحہ ۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

(لکھنؤ کی ٹکسالی زبان اور نفاست کے ساتھ ساتھ حسن تشابہ الاطراف)

پھول ہی صرف سینہ چاک نہیں بے کلی ہیں کلی کلی بھی ہے [1]

(صنعت تجنیس تام اور مراعات النظیر)

متقدمین شاعری میں زبان کے کمالات، الفاظ و تراکیب کی شعبدہ بازی اور فنی چابکدستی کا مظاہرہ متعدد ذرائع اور پیرائے میں کرتے تھے۔ منوّر لکھنوی کے والد ملک الشعرا اُفق لکھنوی کی راماتن یک قافیہ اُردو حلقوں میں بہت مقبول ہوئی تھی۔ منوّر کے خسر صدر لکھنوی کی "صدر کی گیتا" میں ایک مثنوی بعنوان "سُداما" شامل ہے جو پوری کی پوری غیر منقوط ہے۔ اس تخلیق میں جو ایک سو اکہتر (۱۷۱) اشعار پر مشتمل ہے ایک بھی لفظ ایسا نہیں جس کے حروفِ تہجی میں نقطہ شامل ہو۔ منوّر کی غزلیات میں بھی اس طرح کے تجربات اور کمالات کا مظاہرہ کہیں کہیں ملتا ہے۔ اُن کی ایک بہ یک قافیہ غزل درج ذیل ہے۔ یہ کرشمہ بھی دیدنی ہے کہ اس تخلیقی کاوش میں کہیں بھی آورد دکھائی نہیں دیتی۔ ہر شعر سانچے میں ڈھلا ہوا ہے اور ایک منفرد شانِ نزول رکھتا ہے۔ مضمون آفرینی اور معنوی رنگارنگی، بندش کی چُستی اور اشعار کا مجموعی تاثر دیکھ کر منوّر لکھنوی کے فنی کمالات اور زبان و بیان پر ان کی قابلِ رشک گرفت کی داد دینی پڑتی ہے۔

غزل ملاحظہ کیجیے:

نہ ہے شبنم میں، نہ گوہر میں، نہ آئینے میں بخدا کتنی صفائی ہے مرے سینے میں

کچھ اس انداز سے پڑتا ہے جبیں کا پرتو حرفِ قسمت کے نمودار ہیں آئینے میں

کیا سے کیا کر نہ دیا آپ نے آئینے کو کیا سے کیا ہو نہ گئے آپ خود آئینے میں

کس قدر حُسن کے اسرار میں گہرائی ہے دیکھیے اور ذرا ڈوب کے آئینے میں

دسترس آپ تک اس شکل میں حاصل ہے مجھے آئینہ ہاتھ میں ہے آپ ہیں آئینے میں

کیجیے شوق سے آرائشِ گیسوئے جمال نہ پڑے بال مگر ایک بھی آئینے میں

پاس رہ کر تو دکھاتے نہیں صورت اپنی نظر آتے ہیں مگر دُور تک آئینے میں

ایک تصویر سے دونوں کو سجا رکھا ہے میرے دل میں ہیں اِدھر اور اُدھر آئینے میں

آئینہ آپ سے معیار ہے آئینے کا آئینہ آپ میں ہے آپ ہیں آئینے میں

---

[1] نوائے کفر (منوّر لکھنوی) صفحہ ۳۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

دم بخود صورتِ آئینہ منوّر میں ہوں
سانس لینے سے پڑے بال نہ آئینے میں[1]

سبھی اشعار ایک راتی ہار میں درخشندہ نگینوں کی صورت جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ پوری غزل ایک مکمل آئینہ خانہ کا روپ اختیار کیے ہوئے ہے۔ تصنع، آورد، مبالغہ اور میکانکی شعر سازی کی پرچھائیں تک نظر نہیں آتی۔ کہیں کہیں اردو اور ہندی بحروں کے امتزاج اور باہمی اتصال نے منوّر کی غزلوں کی غنائیت اور موسیقیت کو بادۂ دو آتشہ بنا دیا ہے۔ منوّر نے جہاں اپنی شاعری میں ایرانی عربی تلمیحات و استعارات بکثرت استعمال کیے ہیں۔ وہاں ہندو دیومالا اور آریوں کے کلچرل ورثہ سے بھی استعارات و علائم اخذ کیے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ و ثقافت اور وسیع اساطیری سرمایہ سے استفادہ کر کے منوّر نے اپنی غزل پر کہیں کہیں خالص ہندوستانیت کی چھاپ لگا دی ہے۔ تشبیہوں اور ترکیبوں کی اس ندرت، جدت اور تازگی نے غزل میں منوّر کی جذبات نگاری کو ایک نیا آہنگ عطا کیا ہے۔ کچھ مثالیں درجِ ذیل ہیں:

معصومیت جمال کی جن میں بھری ملے
کیوں ایسے آنسوؤں کو نہ گنگا کا جل کہوں[2]

تاثرات کی رادھا کا عکس پڑنے سے
تخیلات کی جمنا حسین ہے کتنی[3]

یہ مانا میرے دل میں ہر دم آگ سی جلتی ہے
راگی مجھ کو کیوں چھیڑا ہیں کچھ میں دیپک راگ نہیں

اب نہ عبیر اڑتا ہے کہیں اب گلال آتا ہے نظر
رنگ ہوا بد رنگ ایسا پھاگ ہے پھر بھی پھاگ نہیں

مَن کی بھینٹ میں سب کچھ ہے کچھ تو مول لگے اس کا
کیا یہ سداما کے تندل کیا یہ بدر کا ساگ نہیں ؟

میرے سر پر رکھ کر پاؤں تان چھڑے بنسی کی تان
کرشن کنھیا تم ہو اگر کیا میں کالی ناگ نہیں ؟[4]

تجھ میں گنگا، تجھ میں جمنا
تو ہی تربینی کا سنگم[5]

زندگی ہی شاعری کی جولاں گاہ ہے۔ اپنے زمان و مکاں اور گرد و پیش کے مسائل و واقعات

---

[1] نوائے کفر (منوّر لکھنوی)۔ صفحہ ۶۹-۷۰
[2]-[3] ایضاً 〃 صفحات بالترتیب ۷۶-۱۰۱
[4] 〃 〃 صفحہ ۷۶
[5] اداۓ کفر ۴۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سے اس کا اثر پذیر ہونا فطری عمل ہے۔ اپنے فن میں اپنے دَور اور اس کے مسائل کی نشان دہی کرنا اس کا فرض بھی بن جاتا ہے اور ایک طرح کا غیر شعوری ردِّ عمل بھی۔ فراقؔ گورکھپوری کے الفاظ میں :-

"غزل کے لیے کوئی موضوع یا مضمون شجرِ ممنوع نہیں۔ البتہ ہر شجرِ خام غزل کے لیے شجرِ ممنوع ہے۔" [۱]

شاعر اپنے دَور کے انسان، اُس کے نشاط و اَلم اُس کی مشکلات و مسائل کی ترجمانی کرتا ہے اور ان مسائل کے حل میں ممد و معاون بھی ہوتا ہے۔ منوّرؔ لکھنوی نے بھی اپنے عہد کے مسائل، عام انسانوں کی مشکلات اور ان کے دُکھ درد کے تئیں آنکھیں موند کر اپنے تخلیقی عمل کو جاری نہیں رکھا۔ تاہم وہ تخریب اور تشدّد کی تلقین نہیں کرتے۔ وہ عدم تشدّد کے حامی ہیں۔ عوامی مشکلات اور اُن کے لیے ذمّہ دار عناصر کو تنبیہ کرنے میں بھی وہ رمزیت و اشاریت سے کام لیتے ہیں لیکن حق گوئی اور صاف بیانی سے پہلو تہی نہیں کرتے۔ ان کی غزلوں کے بہت سے اشعار ان کے عہد کے سیاسی اور سماجی نظام کے متعلق کنایتاً احتجاج کرتے ہیں۔ مثلاً :

- بات کیا ہے کہ نہیں سامنے ہوتیں آنکھیں ۔۔۔ کیجیے غور کچھ اسبابِ پریشانی پر [۲]
- لمحے لمحے کو جاں ستاں کہیے ۔۔۔ زندگی کو اک امتحاں کہیے
  آج ہندوستاں جہنّم ہے ۔۔۔ کیوں اسے غیرتِ جناں کہیے [۳]
- کھُلتے ہی آنکھ قوتِ پرواز چھن گئی ۔۔۔ کیا جانے کس گھڑی میں ہمیں بال و پر ملے [۴]
- اِک پھول کو بھی ہاتھ لگانے کا حق نہیں ۔۔۔ ہونے کے واسطے تو ہے اپنا چمن تمام [۵]
- کیسے کہیں، ہم تم کو ستم گر نہیں کہتے ۔۔۔ کہتے تو ہیں لیکن کبھی کھُل کر نہیں کہتے [۶]

یہ مسلّم ہے کہ اِنکار کی جسارت اقرار کے بمقابلہ حد درجہ حوصلے اور بے باکی کا کام ہے۔

---

[۱] ماہنامہ نگار۔ جنوری فروری ۱۹۵۷ء۔ صفحہ ۴۳
[۲،۳] بساطِ فکر (غزلوں کی غیر مطبوعہ بیاض۔ منوّرؔ لکھنوی)
[۴] نوائے کفر (منوّرؔ لکھنوی) صفحہ ۲۰
[۵] تاثرات (غیر مطبوعہ بیاضِ غزلیات منوّرؔ لکھنوی)
[۶] نوائے کفر (منوّرؔ لکھنوی)۔ صفحہ ۸۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منوّر لکھنوی جیسے نرم دل، مرنجاں مرنج اور شریف انسان کے لیے نامساعد حالات وطن اور سیاسی نظام کی چیرہ دستیوں اور غفلتوں پر جھنجھلانا اور اس کے نتیجے میں چلّانا اور چنگھاڑنا خلاف توقع بات تھی۔ تاہم سازشی عناصر کی نقاب کشائی اور حالات کی ناسازگاری سے عوام کی بڑھتی مشکلات اور بے اطمینانی کی ترجمانی طنزیہ اور ایمائی انداز میں منوّر نے اپنی نظموں اور غزلوں دونوں میں اکثر کی ہے۔ سیاست دانوں کی خود غرضی اور عوام کی بے بسی اور بد حالی کا نقشہ انھوں نے غزلوں کے اشعار میں کچھ اس طرح کھینچا ہے:

- جس طرح چاہتے تھے نہ بدلے یہ روز و شب ۔۔۔ اک عمر کٹ گئی ہوسِ انقلاب میں ۱
- سانپ بن کر کبھی ڈس جائے گی زر داروں کو ۔۔۔ جو غریبوں کے نہ کام آئے وہ دولت کیا ہے ۲
- اُس سے تو اپنے حق میں اندھیرا ہی خوب تھا ۔۔۔ بے نور ہو گئے ہیں نئی روشنی سے ہم ۳
- سمجھے گا آدمی کو جب انسان آدمی ۔۔۔ وہ دَور وہ نظام بہت دُور ہے بہت ۴
- معاملہ ہی کچھ ایسے مقام تک پہنچا ۔۔۔ مرا فسانۂ غم خاص و عام تک پہنچا
- خدا کی شان، وہ اب میکدوں کو تھامے ہے ۔۔۔ کبھی جو ہاتھ سُبو تک نہ جام تک پہنچا ۵

مذکورہ بالا اشعار میں اُس رمز و اشاریت کی روشن مثالیں بھی ملتی ہیں جو آج کل کی جدید شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں لیکن منوّر لکھنوی کی اشاریت بعض بزعمِ خود غلط جدیدیوں کی اشاریت کی طرح مہمل اور ابہام زدہ نہیں جو شعر کو چیستان بنا کر رکھ دیتی ہے۔ اشاریت تو واقعیت میں مروجہ یا نو دریافت علائم کو نئے مفاہیم عطا کرنے کا نام ہے۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید اشاریت کی ابتدا اور اس کے تاریخی تناظر کو یوں بیان کرتے ہیں:-

"چوں کہ دستورِ زباں بندی عام تھا، شاعروں نے ابتداً زبان میں کوئی ندرت نہ پیدا کی ہو لیکن اپنا اندازِ بیاں ضرور بدل دیا کہ وہی مروجہ اور روایتی الفاظ تشبیہات، استعارات اور اشارات نئی طرح داری معنویت کے حامل ہو گئے۔ اردو

۱۔ تاثرات۔ (قلمی مسودہ۔ منوّر لکھنوی)

۲۔ ۳۔ ادائے کفر (منوّر لکھنوی) مطبوعہ ۱۹۶۲ء بالترتیب صفحات ۱۰۳۔ ۴۵

۴۔ تاثرات (غیر مطبوعہ قلمی مسودہ۔ منوّر لکھنوی) صفحہ نمبر درج نہیں

۵۔ ادائے کفر (منوّر لکھنوی۔ صفحہ ۱۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

شاعری اور خاص طور پر غزل میں یہ تبدیلی نئی وسعتوں اور نئے امکانات کا پتہ دیتی ہے اور عصری معاشرات کے تقاضوں کی تکمیل بھی کرتی ہے۔ یہاں شاعر صرف غزل خواں نہیں رہتا بلکہ وہ فکر کی نئی جہتوں سے گزرتا اور مفاہیم کی نئی سطحوں سے ہمکنار ہوتا ہے۔"[۱]

منورؔ لکھنوی کی اشاریت ترسیل کی جدیدیت کی علم بردار غزل کی طرح ناکامی کا المیہ نہیں۔ اس کی تفہیم کے لیے قاری کو ذہنی جمناسٹک کے امتحانی مراحل سے نہیں گزرنا پڑتا — اشاریت ان کے کلام میں جگہ جگہ دکھائی دیتی ہے لیکن اس کے رمز و کنایہ کو بڑی آسانی سے بلا توقف سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ پڑھنے والے کو دو گنے لطف و تلذذ سے ہم کنار کرتی ہے۔ اشاریت سے بھرپور کچھ اور اشعار دیکھیے:۔

- جو راز تھا مری آوارگی پہ افشا تھا — طلسم بن گئی دنیا مرے قیام کے بعد[۲]
- شناور نہ کھا جائیں دریا سے دھوکا — یہ حدِ نظر ہے کنارا نہیں ہے[۳]
- جو بوسیدہ نظامِ زندگی ہے ختم ہو جائے — بجا ہے جسم سے ملبوسِ کہنہ کا اتر جانا[۴]
- وابستگی بھی کوئی دلیلِ وفا نہیں — ساحل قریب رہ کے سمندر سے دور ہے[۵]
- خدا کی شان بتاتے ہیں تیرہ دل مجھ کو — وہی چراغ جو لیتے تھے روشنی مجھ سے[۶]
- مآلِ کار کی اب شکل دیکھیے کیا ہو — جنوں کا ہاتھ کفِ چارہ گر میں رکھتا ہوں[۷]

منورؔ لکھنوی کے آخری ایام کی شاعری پر قنوطیت اور نراشا کی گہری پرچھائیاں صاف نظر آتی ہیں۔ وہ شاعر جو عزم و حوصلہ کا پاسدار تھا اور اپنے آدرشوں اور اصولوں کا دامن پختگی سے تا زندگی تھامے رہا۔ ناقدریِ زمانہ اور ادبی شہرت کے ٹھیکے داروں کی گروپ بندیوں سے نالاں

۱۔ اردو شاعری میں اشاریت (ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید) ایڈیشن نومبر ۱۹۸۳ء، صفحہ نمبر ۶۳ (مضمون: اشاریت۔ تحریک سے قبل)

۲۔ ادائے کفر (منورؔ لکھنوی) صفحہ ۳۹

۳۔ ایضاً ایضاً صفحہ ۱۰۸

۴۔ نوائے کفر ایضاً ″ ″

۵۔ ادائے کفر ایضاً ″ ۱۰۶

۶۔ ۷۔ نوائے کفر ″ صفحات ۲۰۔ ۱۸

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اور ہراساں دکھائی دیتا ہے۔ غلط کار عناصر سے نبرد آرائی کے عزم کی جگہ بے ہمت و پائی اور معذوری کے احساس نے لے لی۔ تیزی کے ساتھ قوا کے بڑھتے ہوئے اضمحلال، سیاسی اور سماجی ماحول میں کرپشن، بے ایمانی اور خود غرضی کے دخول اور سچّے اور کھرے فنکار کی حوصلہ شکنی و حق تلفی کے شدید احساس نے پسپائی اور بے بسی کے رُویّے کو منور کی غزل میں نمایاں کر دیا۔ رشتوں کی شکست اور ادبی بد دیانتیوں کا ردِّ عمل اُن کے اشعار میں کیسے اُبھر کر آیا ہے، ملاحظہ ہو:-

- جنوں خفا ہے، کشیدہ ہے آگہی مجھ سے — ہر ایک چیز مقدّر نے چھین لی مجھ سے
  ستم ظریفیِ تقدیر کوئی دیکھے — جو دل شکن ہیں وہ کرتے ہیں دل لگی مجھ سے [۱]
- خدا ہے اگر وہ تو کیا مجھ کو حاصل — مرے کام جس کی خدائی نہ آئی [۲]
- ہاتھ دنیا سے اُٹھائے ہوئے بیٹھا ہوں میں — جس کو ہنسنا ہے وہ ہنس لے مری حیرانی پر [۳]
- نہ مجھے کہیں کا رکھا مری پاک دامنی نے — مری قدر اور بڑھتی جو گناہ گار ہوتا [۴]
- مری ہار آخر، مری ہار اوّل — مری زندگی ہے شکستِ مسلسل [۵]
- جہاں بھی دیکھیے اہلِ نظر کا خون ہوتا ہے — یہ ناقدری جنسِ آگہی دیکھی نہیں جاتی [۶]
- وقت جب آئے گا تقدیر پلٹ جائے گی — عمر کی عمر اسی آس میں کٹ جائے گی [۷]

اس طرح کے یاس آمیز اور شکست خوردگی کے شدید احساس سے لبریز اشعار منوّر لکھنوی کی عمرِ عزیز کے آخری پانچ چھ برسوں کی تخلیقات میں وافر تعداد میں ملتے ہیں۔

منوّر ناقدریِ فن پر شاکی اور قدرے مایوس و برہم تو ہیں لیکن کسی احساسِ کمتری کا شکار نہیں۔ انھیں اپنی عظمتِ ہنر اور خلوصِ فن کا احساس بھی ہے اور اس پر ناز و افتخار بھی۔ انھیں اپنے منفرد رنگِ سخن اور لب و لہجے کی امتیازی آن بان کا دعویٰ ہے۔ سلیم اختر اپنے ایک مضمون میں یوں اظہارِ رائے کرتے ہیں:-

---

[۱] نوائے کفر (منوّر لکھنوی) صفحہ ۲۰

[۲] تاثرات (قلمی مسوّدہ۔ غیر مطبوعہ۔ منوّر لکھنوی)

[۳، ۴] بساطِ فکر (ایضاً)

[۵، ۶] ادائے کفر (منوّر لکھنوی) صفحات: ۴۵، ۴۵، ۴۸ بالترتیب

[۷] ماہانیاں (غیر مطبوعہ بیاضِ غزلیات۔ منوّر لکھنوی)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

"سب سے جُدا گانہ ہونے کا احساس عموماً نرگسیت کے باعث ہوتا ہے۔ ورنہ نرگسیت پر منتج ہونا تو یقینی ہوتا ہے لیکن منوّر کے ہاں یہ رُجحان نرگسی مریضانہ خود پسندی کی صورت اختیار کرنے کے برعکس جائز حدود میں اور نازل رہنے کے باوجود بھی ایک لحاظ سے شاعرانہ احساس کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔" [1]

اُن کی رائے میں کمالِ فن کا یہ احساس شاعر کو ایک نفسی تسکین مہیا کرتا ہے۔ عظمتِ فن اور اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے اس احساس نے منوّر لکھنوی کی غزلوں میں اظہار کی کئی راہیں ڈھونڈی ہیں، مثلاً ان اشعار میں:-

- ہر شرط ہم نے تا دمِ آخر نباہ دی — صد شکر زندگی سے پشیماں نہیں رہے [2]
- ہر اک کے تجربے سے مختلف ہے تجربہ میرا — نہ کیوں سب سے الگ ہو زندگی پر تبصرہ میرا [3]
- کہاں سے لائے گا کوئی مرے احساس کی ندرت — کسی سے میں دلِ درد آشنا بدلوں تو کیا بدلوں [4]
- مرے کلام سے خونِ جگر ٹپکتا ہے — قبولِ عام کی پھر بھی سند نہیں ملتی [5]
- کوئی ان میں ہے منوّر کی طرح خوددار بھی؟ — محفلِ اردو میں یوں تو ہیں سخنداں سینکڑوں [6]
- کیا دکھائیں کمالِ فن اپنا — وحی ہے وحی ہر سخن اپنا [7]

ان دعوؤں کے ساتھ منوّر لکھنوی کو یہ احتیاط بھی پیشِ نظر ہے کہ وہ اپنے ان اسلاف کی صحیح نمائندگی اور ہمسری بھی کر پائیں گے یا نہیں جن سے انھوں نے روشنی پائی ہے اور تخلیقِ ادب میں جن کی فنی کامیابیوں کو انھوں نے اپنا آدرش مانا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:-

---

[1] منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (مرتبہ راج نرائن راز) صفحہ ۹، (مقالہ منوّر غزل کے آئینے میں۔ از سلیم اختر)

[2] نوائے کفر (منوّر لکھنوی) صفحہ ۸۹

[3] اوائے کفر (ایضاً) " ۱۵

[4] نوائے کفر " ۱۰۰

[5] کائناتِ دل (منوّر لکھنوی) مصنف کی تصویر کے نیچے درج شعر۔

[6] تابانیاں (منوّر لکھنوی۔ غیر مطبوعہ بیاضِ غزل)

[7] بساطِ فکر (ایضاً)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سوچتا ہوں میں یہ رہ رہ کے منوّر دل میں
بارِ حکیت و نظر مجھ سے اُٹھے گا کہ نہیں [1]

منوّر لکھنوی کی مطبوعہ تصنیفِ غزلیات "نوائے کفر" کے اندرونِ سرورق مولانا نیاز فتحپوری نے یوں اظہارِ رائے فرمایا ہے :۔

"اردو شاعری میں غزل سے زیادہ نازک صنفِ سخن کوئی نہیں اور اس کارگہِ شیشہ گری کا رکھ رکھاؤ بڑا دشوار ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ ہماری نئی نسل نے شاعری کی زیادہ آسان راہیں اختیار کر لیں اور شاعروں کی پیداوار میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ لیکن قدر اوّل کے شعراب بھی غزل کی زمین سے اُبھرتے ہیں اور انھیں میں ایک منوّر صاحب ہیں ....."

غزل کے باب میں خود منوّر صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے :۔

شاعری وحی ہے الہام سے آگے نہ بڑھی　　اِک قدم بھی روشِ عام سے آگے نہ بڑھی

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فکرِ شاعرانہ کا نقطۂ نظر کتنا بلند ہے۔ [2]

منوّر لکھنوی کی غزل فنی عیوب سے یکسر پاک ہے اور روایتی غزلیہ شاعری کی بے کیف یکسانیت سے مبرّا۔ اس کی تازگی اور انفرادیت کے ہم دوش اس کی امتیازی اور اضافی خصوصیات ہیں، اس کی شستگی، شائستگی اور پاکیزگی۔ منوّر کا خلاّقانہ اجتہاد، اس کے مضامین کا تنوّع۔ تہذیب غزل کا رکھ رکھاؤ، احترامِ انسانیت کا عقیدہ، جذبے کی عالی نسبی، اسلوب و لہجے کی طرح داری، تشبیہات اور ترکیبوں کی ندرت، لہجے کی شیرینی کے ساتھ سنجیدگی اور متانت، ان سب محاسن نے صنفِ غزل کو ایک وقار عطا کیا ہے۔ ان کی غزلیں ان کی داخلی شخصیت کی پرتو طرازی کے لیے آئینہ در آئینہ کا نظام پیش کرتی ہیں۔ ان کے کلام میں خود طلبیی اور خود کلامی کی جو فضا ملتی ہے وہ اردو شاعری کے لیے ایک نادر سوغات ہے۔ نقادوں اور تذکرہ نگاروں کی عدم توجہی اور بے نیازی کے باوصف منوّر لکھنوی نے اُردو غزل کے سرمایہ کو جو تموّل بخشا ہے اور جو بیش بہا اضافے کیے ہیں وہ اُدب کے سنجیدہ قاری کو متوجہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے اور ان کے اس اعلان کو صحیح ثابت کرتے ہیں کہ:

خود اعتمادی یہ کہہ رہی ہے مرے اِک اِک لفظ سے منوّر
مذاق نکھرے گا شاعری کا اُدب کو شائستگی ملے گی [3]

---

[1] نوائے کفر (منوّر) صفحہ ۵۵
[2] 〃 〃 مطبوعہ ۱۹۶۱ (مولانا نیاز فتحپوری کی مطبوعہ رائے)
[3] 〃 〃 صفحہ ۶۳

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

باب سوم (ج)

منوّر کی رباعی گوئی

رُباعی گوئی کے فن پر منوّر کی گرفت

- مطبوعہ مجموعہ رُباعیات "نذرِ ادب" اور غیر مطبوعہ "زیرۂ گُل" کا تنقیدی مطالعہ۔
- خمریاتی رباعیات۔
- رُباعیات میں مشاہدۂ حق اور فلسفیانہ مسائل۔
- مناظرِ فطرت کی عکاسی اور جمالیاتی رُباعیات
- منوّر کی غزل اور رُباعی میں معنوی ہم آہنگی
- متفرق رباعیات و قطعات
- حاصلِ مطالعہ

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منوّر کی رُباعی گوئی

رُباعی ایک خاص بحر میں ہی کہی جاسکتی ہے۔ ماہرینِ عروض نے رُباعی کے لیے ایک مخصوص بحر اور چوبیس اوزان مقرر کیے ہیں۔ اس بحر کا نام بحرِ ہزج ہے۔ اسی بحر سے یہ چوبیس اوزان متعلق ہیں۔ اس کا صدر و ابتدا ہمیشہ اخرب ہوتا ہے یا اخرم۔ ہر مصرعے کا پہلا رُکن مفعول یا مفعولن ہوتا ہے۔

قطعہ اور رُباعی میں فرق لطیف سا ہے۔ اگرچہ اہلِ فن اس کی شناخت و تمیز رکھتے ہیں، پھر بھی اس لطیف فرق کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی فرماتے ہیں:-

"رباعی بڑی صبر آزما صنفِ سخن ہے۔ اس میں اکثر یہ ہوتا ہے" کہ پکائی تھی کھیر ہو گیا دلیا۔ رُباعی کو قطعہ بنتے دیر نہیں لگتی۔"[1]

جوش ملیح آبادی کا کہنا ہے:-

"رُباعی ایک بہت بڑی بلا، ایک نہایت جان لیوا صنفِ کلام ہے۔ یہ کم بخت چالیس برس سے بیشتر کسی بڑے سے بڑے شاعر کے بھی بس میں آنے والی چیز نہیں۔"[2]

برج لال جگی رعنا کے مجموعۂ رُباعیات "رعنائیاں" کے دیباچہ میں جوش ملیح آبادی لکھتے ہیں:-

"رباعی ایسی کم بخت صنف ہے جو سارا جوبن کھالے تو ایک بالک بالے کی طرح چالیس برس کی

---

[1] "ہماری زبان"، شمارہ ۲۲، اپریل ۱۹۸۹ء، صفحہ ۶

[2] منوّر لکھنوی، شخصیت اور شاعری (مرتب راج نرائن راز) ایڈیشن ۱۹۷۰ء، صفحہ ۱۱۸ (مقالہ رباعیاتِ منوّر۔ از نریش کمار شاد)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

مشاقی کے بعد کہیں جاکر قابو میں آتی ہے۔"[1]

ڈاکٹر اقبال کے مطابق :۔

"رباعی خالص ایرانی چیز ہے۔ وہ ایران میں پیدا ہوئی اور وہیں اس نے پرورش پائی اس کا نام اگرچہ ایرانی نام ہے لیکن یہ نام اسے بہت زمانے کے بعد دیا گیا۔ ایران میں پہلے "ترانہ" اور "دوبیتی" کے نام سے موسوم رہی۔"[2]

فارسی میں رُباعی گوئی کا سلسلہ شیخ ابوالحسن خرقانی سے شروع ہوا۔ انہی کے ہم عصر صوفی بابا طاہر عریاں ہمدانی نے بھی رباعیات لکھیں۔ ان کے علاوہ ابوسعید ابوالخیر، فریدالدین عطار، مولانا رومی، عمر خیام، انوری، خاقانی، فردوسی، نظامی، حافظ اور شیخ سعدی جیسے مشاہیر نے بھی رُباعی کے مضامین کو تنوّع عطا کیا۔ خیام کی رندانہ رباعیات کی غیر معمولی مقبولیت نے اُردو شعرا کو بھی رُباعی گوئی کی طرف راغب کیا۔

نرلیش کمار شاد اپنے مقالہ "رُباعیاتِ منوّر" میں رقمطراز ہیں کہ :۔

"اردو کا کم و بیش ہر شاعر عشق کرے یا نہ کرے اور شراب پیے یا نہ پیے، لیکن عاشق اور شرابی ہونا تو اپنا شاعرانہ فرض خیال کرتا ہے۔ چنانچہ اس فرض کو ادا کرتے ہوئے منوّر لکھنوی صاحب نے بھی متعدد رندانہ رباعیات کہی ہیں۔۔۔۔۔ ذاتی طور پر منوّر صاحب نہایت پرہیزگار اور صوفی منش بزرگ ہیں۔ ان کی طبع زاد رندانہ رباعیات کے بے عیب ہونے کے ساتھ بے کیف ہونے کی وجہ بھی غالباً یہی ہے کہ انھوں نے یہ رباعیاں محض رسمی اور روایتی طور پر کہی ہیں۔"[3]

لیکن نرلیش کمار شاد کی اِس رائے کو "حرفِ آخر" نہیں مانا جاسکتا۔ محض رُباعی کے مجموعی تاثر اور عروض پر کامل گرفت ہی کو اچھی رباعی کا معیار تسلیم کرکے منوّر لکھنوی کی رباعی کو نظرانداز کردینا صریحاً ناحق ہوگی۔ محض رسمی اور روایتی طور پر رُباعی کہنے والا شاعر سینکڑوں رُباعیوں کا خالق نہیں ہوسکتا۔ اسے خود کو رباعی گو شعرا میں اپنا شمار کروانے کے لیے محض گنی چُنی تعداد میں رباعیات کہہ دینا ہی کافی ہوتا ہے لیکن منوّر لکھنوی نے رباعیات کے دو ضخیم مجموعے، جن میں تھوڑے سے قطعات بھی شامل

۱؎ "ہماری زبان"، نئی دہلی۔ شمارہ ۱۵ جنوری ۱۹۸۹ء۔ صفحہ ۱

۲؎ رباعیاتِ محروم (تلوک چند محروم) مطبوعہ ۱۹۴۲ء پر ڈاکٹر اقبال کے تحریر کردہ دیباچہ سے اقتباس

۳؎ منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (مرتب راج نرائن رازؔ)۔ صفحہ ۱۲۰ (نرلیش کمار شاد کا مقالہ "رباعیاتِ منوّر")

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہیں، اُردو ادب کو دیے ہیں۔ ان کی رباعیات کا مجموعہ "نذرِ ادب" جیبی ایڈیشن کی صورت میں ۱۹۲۹ء میں شائع ہوکر منظرِ عام پر آیا۔ دوسرا مجموعہ رباعیات "زیرۂ گل" ان کی حیات میں زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکا۔ پہلے ہم ان کے مطبوعہ مجموعہ رباعیات "نذرِ ادب" کا جائزہ لیں گے۔ کوائفِ اشاعت حسبِ ذیل ہیں :

نام کتاب : نذرِ ادب (جیبی ایڈیشن)

ناشر : باہتمام قطب الدین احمد، پروپرائٹر نامی پریس لکھنؤ

مطبوعہ : بارِ اوّل، مارچ ۱۹۲۹ء

ضخامت : ۹۶ صفحات

یہ رُباعیاں منوّر لکھنوی کی شاعری کے ابتدائی دور کی تخلیقات ہیں۔ مجموعہ کے ابتدائی صفحہ پر "عرضِ حال" کے زیرِ عنوان منوّر قارئین سے یوں مخاطب ہیں :

"دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اربابِ سخن اور کاملانِ فن کی خدمتِ عالی میں اپنی رباعیوں کا ایک مختصر مجموعہ بکمال ادب پیش کرتا ہوں.....
.... پرماتما سے ملتجی ہوں کہ ان رُباعیات کی اشاعت سے والدِ مرحوم قبلہ ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد صاحب اُفق لکھنوی اور اُستادِ مغفور منشی نوبت رائے صاحب نظر کی شہرت میں اور اضافہ ہو اور میں بدنام کنندۂ نکو نامے چند نہ ثابت ہوں۔"[1]

کمال انکسار و نیازمندی کے ساتھ کی گئی اس پیش کش سے قبل ایک قطعہ بھی منوّر نے درج کیا ہے :-

ملا تھا ورثۂ اجداد میں جو باغِ سخن — وہ پائمالِ ستم گاریِ خزاں نہ ہوا
اُفق کے فیض کا دریا ہے رات دن جاری — ہزار شکر کہ میں ننگِ خانداں نہ ہوا[2]

"نذرِ ادب" کی رباعیات کا بیشتر حصّہ رندانہ اور خمریاتی رنگ میں ہے۔ کچھ رباعیات اخلاقی اور رُوحانی مضامین کی حامل ہیں لیکن منوّر کی مے بادۂ عرفاں ہے جس کے بارے میں باباگورو نانک دیو نے فرمایا تھا :-

ع۔ نام خماری نانکا چڑھی رہے دن رات

---

[1] عرضِ حال (دیباچہ) نذرِ ادب (مصنّف کی طرف سے) منوّر لکھنوی، طبع اوّل ۱۹۲۹ء صفحہ ۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اُردو شاعری میں بھی خمریات ایک مرغوب و محبوب موضوع رہی ہیں۔ بعض شعرا جو اپنی عملی زندگی میں متّقی اور پرہیزگار ہے، فیشن کے طور پر خمریات کو موضوعِ سخن بناتے رہے۔ صنفِ غزل تو بالخصوص خمریاتی رنگ اور بادہ و ساغر سے وابستہ رنگیں کلامیوں کا مرکز و مرقع بنتی رہی۔ بعض شعرا نے خمریات کو بطور علائم و استعارات استعمال کیا۔ معنوی لحاظ سے ان کا اشارہ کسی اور جانب ہوتا تھا، کیوں کہ غزل اشاروں کی زبان میں بات کرتی ہے۔ آل احمد سرور "اُردو شاعری میں خمریات" کے زیرِ عنوان رقم طراز ہیں:۔

"اقبال نے سب سے پہلے خمریات کے پُرانے کوچے میں ایک نیا ساز چھیڑا۔ "بانگِ درا" میں وہ ساقی سے خطاب کرتے ہیں:۔

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے　　مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی!
جو بادہ کش تھے پُرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں　　کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی!

لیکن اِس سے اہم ان کا "ساقی نامہ" ہے جو بالِ جبرئیل میں شامل ہے:۔

وہ مے جس سے روشن ضمیرِ حیات　　وہ مے جس سے ہے مستیِ کائنات
وہ مے جس سے ہے سوز و سازِ ازل　　وہ مے جس سے کُھلتا ہے رازِ ازل
اٹھا ساقیا پردہ اُس راز سے　　لڑا دے ممولے کو شہباز سے[1]

جگر خالص شراب چاہتا ہے۔ چکبست نے بادہ و ساغر کے پردے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو کی ہے اور "نوحۂ قومی" چھیڑا ہے۔ اپنے زمانے کی نیم مختار حکومتوں کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں:۔

ایک ساغر بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے　　ساقیا جاتے ہیں، محفل تری آباد رہے
یہ کیسی بزم ہے اور کیسے اس کے ساقی ہیں　　شراب ہاتھ میں ہے اور پلا نہیں سکتے

مینا و ساغر کو منوّر لکھنوی نے مئے عرفان و عبودیت کے استعارات بنا کر ان سے کام لیا ہے۔ ان کی چند خمریاتی رباعیات بطورِ نمونہ درج ذیل ہیں:۔

خود اپنی کشید کی ہوئی پیتا ہوں　　لگتے نہیں دام مفت کی پیتا ہوں
رہتا ہے خیال دین و دنیا کا مجھے　　جو مئے ہے حلال وہی پیتا ہوں[2]

---

[1] تنقیدی اشارے (آل احمد سرور) ایڈیشن ۱۹۶۸ء صفحہ ۴۴

[2] نذرِ ادب (مجموعۂ رباعیات۔ منوّر لکھنوی) ایڈیشن، مارچ ۱۹۲۹ء صفحہ ۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

- ہنگامہ یہ ہر سمت ہے برپا کیسا؟ مے خانے میں چھایا ہے اندھیرا کیسا؟
ساغر ہیں جُدا جُدا اگر ہے مے ایک پینے والوں میں پھر یہ جھگڑا کیسا؟ ؎ۛ

اُوپر دی گئی رباعیات سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ منوّر کا اشارہ معرفت کے نشّے اور دیدہ یاری کی مے کی طرف ہے۔ اِن رُباعیات کا اصل موضوعِ سخن عشقِ الٰہی اور مشاہدۂ حق ہے۔ اسی سلسلے میں مزید رُباعیات دیکھیے:

- کہتا ہے تجھے بیش و کم منوّر پی لے بیخود بن جا شرابِ احمر پی لے
دُنیا کی طرف سے بند کر لے آنکھیں چُپکے سے خدا کا نام لے کر پی لے ؎

- ہونے کو ہے آفتاب مشرق میں طلوع دنیا اس وقت یادِ حق میں ہے رجوع
موجود مرے سامنے ہیں بادہ و جام مَیں بھی کرتا ہوں اپنا شغل شروع ؎

- کیا چیز شریعت ہے طریقت کیسی وید اور قرآن کی اطاعت کیسی
جو روزِ ازل سے وقفِ مے خواری ہو اُس کے لیے پینے کی اجازت کیسی ؎

مندرجہ بالا رباعیات منوّر کی خدا پرستی کے ساتھ اس کی وسیع المشربی اور کشادہ ظرفی کی بھی آئینہ داری کرتی ہیں۔ وہ دیدِ حق کے لیے کسی واحد راستے کا قائل کٹر پنتھی اور لکیر کا فقیر نہیں۔

نریش کمار شاد کا یہ اعتراض کہ "ریاض خیر آبادی کے رندانہ شعروں کی طرح منوّر صاحب کی رندانہ رُباعیات میں بھی اسلوب کی صفائی، روانی اور چاشنی اور بے تکلفی تو ہے لیکن ان میں وہ والہانہ سرمستی اور تجربے کی سچائی اور گہرائی نہیں جو مثال کے طور پر جوش یا فراق کی خمریاتی رباعیوں میں جاتی ہے۔"؎ خود بخود اس بنا پر رد ہو جاتا ہے کہ فراق اور جوش ملیح آبادی کی مے نوشی کی طرح منوّر کی "شرابِ طہور" کا نشّہ کسی ٹھیکے یا فوجی کینٹین کی فراہم کردہ صہبا کا سرور نہیں۔ یہ نشّہ ایک غیر دنیاوی اور الہوی چیز ہے۔ مندرجہ ذیل رباعیات اس کا ثبوت فراہم کرتی ہیں:۔

؎ مذرِ ادب (منوّر لکھنوی) صفحہ ۱۱

؎ ؎ ؎ ایضاً صفحہ ۱۳، ۱۸، ۳۶ بالترتیب

؎ منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (مرتب راج نرائن) صفحہ ۱۲۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

- رندی کیا شے ہے مے پرستی کیا ہے　　جو عارضی ہو لطفِ ہستی کیا ہے
  رہتا ہوں میں بے پیے منوّر مخمور　　جو ہو محتاجِ مے وہ مستی کیا ہے لے

- عالمِ مستی کا یہ دکھاتا ہے کہیں　　چھپکے سے قدم اپنا اٹھاتا ہے کہیں
  دریا میں سمائی ہے کسی مست کی روح　　گرتا پڑتا چلا ہی جاتا ہے کہیں ٢ے

- پی جس سے ترے حلق میں کانٹا نہ پڑے　　پی عقل پہ جس سے تری پردا نہ پڑے
  پی ایسی شراب جس کے پینے سے کبھی　　خمیازہ تجھے مفت اٹھانا نہ پڑے ۳ے

- کوئی ہو رسول و غوث یا ہو نبی　　کوئی ہو گدا ہو شاہ ہو یا ولی
  مستوں میں شمار ہے منوّر سب کا　　ایسا ہے کون جس نے صہبا نہیں پی ۴ے

- مٹی ہو مری خراب توبہ توبہ!　　دوزخ کا ملے عذاب، توبہ توبہ!
  جا راستہ لے اپنا تو اے زاہدِ خشک　　میں ترک کروں شراب توبہ توبہ! ۵ے

اس مشربِ رندی میں منوّر لکھنوی کو عمر خیام سے والہانہ عقیدت ہے وہ اس سے کس درجہ متاثر ہے اس رباعی میں دیکھیے :۔

- رندانہ جھلک میرے مطالب میں ہے　　ڈوبا ہر لفظ رنگِ غالب میں ہے
  مانع ہے ادب نہیں تو کہہ اٹھتا میں　　خیام کی روح میرے قالب میں ہے ٦ے

رباعی گوئی میں اخلاقیات منوّر کا محبوب اور پسندیدہ موضوع رہا۔ "نذرِ ادب" کے آخری حصے کی رباعیات اخلاقیات کی تعلیم انسانی اور روحانی قدروں کی تبلیغ، اصلاحِ نفس کی تلقین اور پند و نصائح کی حامل ہیں۔ کچھ نمونے ملاحظہ ہوں :۔

لے ، ٢ے ، ۳ے ، ۴ے ، ۵ے ۔ نذرِ ادب (منوّر لکھنوی) جیبی ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۲۹ء ۔ صفحات بالترتیب ۲۴، ۵۰، ۵۵، ۴۴، ۲۳

٦ے : نذرِ ادب (منوّر لکھنوی) صفحہ ۲۳

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

• کر صاف خدا کے واسطے سینے کو
لے دولتِ سرمدی کے گنجینے کو
دنیا کو سمجھ رکھا ہے اس سے محروم
کیوں پشت سے دیکھتا ہے آئینے کو ؎۱

• مَیں دفعِ مَلال کے لیے آیا ہوں
تزئینِ مآل کے لیے آیا ہوں
پیدا مرے نفس میں نفاست ہو جائے
اصلاحِ خیال کے لیے آیا ہوں ؎۲

• حیف اُس پہ جو قائل تری قدرت کا نہیں
حیف اُس پہ جو شاغل تری اُلفت کا نہیں
قسمت ہی خراب ہے الٰہی اُس کی
طالب تجھ سے جو تیری رحمت کا نہیں ؎۳

"نذرِ ادب" کی اشاعت کے لگ بھگ بیس برس بعد منوّر لکھنوی نے اپنی رباعیات و قطعات کا دوسرا مجموعہ "زیرۂ گُل" کے نام سے مُرتّب کیا، لیکن اس کی اشاعت کا خواب ان کی حیات میں شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

"زیرۂ گُل کا قلمی مسوّدہ لگ بھگ ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ "احوالِ واقعی" کے زیرِ عنوان تحریر کردہ مختصر پیش لفظ میں رقم طراز ہیں :-

"میری رباعیوں کا مجموعہ کہیں گم ہو گیا ہے۔ خیال ہے کہ کسی مشاعرے یا کسی دوسری ادبی نشست میں رباعیاں پڑھنے کے لیے مجموعہ اپنے ہمراہ لے گیا ہوں گا وہیں بھول آیا۔ ..... پہاڑ گنج دہلی میں جب، بزمانہ ۱۹۲۹ء رہتا تھا، بہت سا کلام کچھ نادان پڑوسی بہنوں کے لیے آگ جلانے میں کام آیا۔ وہاں نقلِ مکان کرتے وقت جو مکان چھوڑ رہا تھا وہیں بھول آیا....... ؎۴

لہٰذا زیرۂ گُل کے قلمی مسوّدے میں صرف وہی قطعات و رباعیات نقل کیے گئے ہیں جو منوّر کی یادداشت میں محفوظ رہ گئے تھے یا رسائل میں شائع ہو چکے تھے۔ مذکورہ بالا پیش لفظ ۳ اکتوبر ۱۹۵۲ء کا تحریر کردہ ہے۔

"نذرِ ادب" کے بمقابلہ "زیرۂ گُل" کی رُباعیات و قطعات میں زیادہ رنگارنگی، بوقلمی اور تنوّع قاری کو متوجہ کرتے ہیں۔ اس مجموعۂ رُباعیات میں جمالیاتی، رُومانی، اخلاقی عرفانی، ذاتی، کائناتی اور مقصدی موضوعات پر منوّر کے افکارِ گراں مایہ کا عکس ملتا ہے۔ ان رباعیوں

؎۱ ؎۲ ؎۳ نذرِ ادب (جیبی ایڈیشن) صفحات بالترتیب ۲۲، ۷، ۶۳

؎۴ زیرۂ گُل (منوّر لکھنوی قلمی مسوّدہ) صفحات پر نمبر درج نہیں۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

میں رندی و مستی بھی ہے۔ عبودیت اور تصوّف بھی۔ طنز و تشنیع بھی ہے اور وارداتِ قلبی بھی۔ نیز ادبی احباب کی مدح و توصیف اور خوش گوار و شیریں چھیڑ چھاڑ بھی۔ ان ادب پاروں سے نریش کمار شادؔ کے اس تبصرے کی نفی و تنسیخ ہو جاتی ہے کہ منوّرؔ کی شاعری "نئے دور کے تقاضوں کو کسی حد تک پورا کرنے کے باوجود پورے طور پر ان کا ساتھ نہ دیتی ہے اور نہ دے سکتی ہے۔"[1] یہ رائے قطعاً صحیح نہیں ہے کہ منوّرؔ کی پرہیزگاری اور شرافت، متانت اور سنجیدگی اس کی رنگینیٔ گفتار اور حسنِ تخیّل پر پہرے بٹھا سکتی ہے۔

زیرۂ گُل کی چند جمالیاتی اور عاشقانہ رُباعیات، نیز قطعات، منوّرؔ لکھنوی کی بنیادی اور باطنی حسن پرستی اور ذوقِ جمال کی شاہد ہیں جو مزاجِ شاعر کا خاصہ ہیں۔ درجِ ذیل رُباعیوں سے قاری کیا تاثر لے گا۔؟

ہوتا ہے شریکِ رنگ و روغن ہے ہے ڈھلتا ہے جوانی میں لڑکپن ہے ہے
شاعر کے سوا کون سمجھ سکتا ہے نورس کلیوں کے دل کی اُلجھن ہے ہے[2]

"تاثراتِ حُسن" کے عنوان سے منوّرؔ کی کچھ رُباعیات دیکھیے کیا یہ قاری کے دل کو گدگداتی اور اس کے ذوقِ جمال اور جذبۂ عشق کو مہمیز نہیں لگاتی ہیں؟

- بچپن میں بھی دل دادۂ رعنائی تھا میں اُس کا جوانی میں بھی شیدائی تھا
  ایک ایک ادا پر تھیں یہ آنکھیں قرباں میں حُسن کا ہر رُخ سے تماشائی تھا[3]
- جب روئے حسیں دیکھ لیتا ہوں کوئی جب ماہ جبیں دیکھ لیتا ہوں کوئی
  رہتا نہیں ایمان ٹھکانے میرا جب دشمنِ دیں دیکھ لیتا ہوں کوئی[4]
- آگاہ رموزِ سنگ و تیشہ سے ہوں دل باختہ عشقِ کفر پیشہ سے ہوں
  کیوں آج مجھے دیکھ کے حیران ہو تم میں حُسن پرست تو ہمیشہ سے ہوں[5]
- عُریاں جو کسی کے بازوؤں کو نہ کیا برہم جو کسی کے گیسوؤں کو نہ کیا
  محرابِ حرم کی پھر پرستش ہی کیا سجدہ جو کسی کے ابروؤں کو نہ کیا[6]

رنگینیٔ سخن اور جذباتِ شوق کی وارفتگی کے والہانہ بیان کی اس سے عمدہ مثالیں کہاں

۱۔ منوّرؔ لکھنوی شخصیت اور شاعری (راج نرائن رازؔ) صفحہ ۱۲۶

۲، ۳، ۴، ۵، ۶ "زیرۂ گُل" (منوّرؔ لکھنوی غیر مطبوعہ بیاضِ رباعیات قلمی نسخہ) صفحات پر نمبر درج نہیں۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ملیں گی، شاعر کی فطری رومان پسندی اور جمالیاتی حس کی جاودانی بیداری کا ثبوت اس رباعی میں دیکھیے۔ جسے شاعر نے عنوان دیا ہے "ایک سانولی لڑکی کو دیکھ کر"۔

اس سانولی صورت کی ہے چھب کتنی انوپ	نیلے بادل پہ جیسے چھٹکی ہوئی دھوپ
اک لعبتِ رعنا کا ہے اندازِ حسین	یہ کرشن کا رنگ اور رادھا کا یہ روپ [۱]

اور اسی رنگ کے دو درج ذیل قطعات ملاحظہ ہوں:۔

- شباب آتا ہے جب اک حشر برپا ہو ہی جاتا ہے	تلاطم خیز طوفاں بھی یہ دریا ہو ہی جاتا ہے
ادا کے ساتھ جب گلشن میں کلیاں مسکراتی ہیں	کوئی منہ چومنے والا بھی پیدا ہو ہی جاتا ہے [۲]

- عشق وہ جذبۂ مقدس ہے	جو فرشتوں کو بھی نصیب نہیں
اس مرض کا نہیں کہیں بھی علاج	اس مرض کا کوئی طبیب نہیں [۳]

جوانی کی مستانہ لغزشوں اور گلکاری عصیاں سے دامنِ روح کو رنگین کرنے کا ایسا کھلا اور صدقدلانہ اعتراف CONFESSION اور یہ اخلاقی جرأت اور کہاں ملے گی، جس سے کہ اردو شاعری کا قاری منورؔ لکھنوی کی رباعیات میں دوچار ہوتا ہے۔ منورؔ کی ایک رباعی کا عنوان ہے "خطاوار"، رباعی ملاحظہ ہو:

- مال و زر و زن کے اک تمنائی نے	بے کیف مناظر کے تماشائی نے
بہکا کے مجھے بھی کر دیا تھا گمراہ	اک عقلِ زیاں کار کے سودائی نے [۴]

چند اور رباعیات اسی سلسلے میں:۔

- کیا دل کا تقاضا تھا یہ میں بھول گیا	کیا ذہن میں نقشا تھا یہ میں بھول گیا
اس ہوش ربا دہر کے ہنگامے میں	کیا مرتبہ میرا تھا یہ میں بھول گیا [۵]

- تھی قابلِ رشک ارجمندی میری	کس شان کی تھی علو پسندی میری
گر کر پستی میں کچھ لگی چوٹ ایسی	روتا ہوں کہ ہائے وہ بلندی میری [۶]

منورؔ مذہب پرست، توکل شعار، سراپا تحمل و انکسار اور راضی برضائے الٰہی ہو کر کبھی

۱۔ زیرۂ گل (منورؔ لکھنوی۔ قلمی بیاضِ رباعیات)

۲، ۳، ۴۔ ایضاً

۵، ۶۔ زیرۂ گل (غیر مطبوعہ بیاضِ رباعیات۔ منورؔ لکھنوی) نیز ماہنامہ "نئی روشنی" شاہ آباد شمارہ جون ۱۹۵۴ء

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سلوکِ دنیا پر برہم ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی خدا سے بھی شکوہ کر بیٹھتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ مثالیں لائقِ توجہ ہیں :-

- دِل مائلِ اختلاج ہو جاتا ہے — برہم مرا مزاج ہو جاتا ہے
  تو ہینِ وفا سے چیخ اُٹھتا ہوں میں — جب درد یہ لا علاج ہو جاتا ہے [۱]

- ہاں شوق سے تکلیف مری دُور نہ کر — کہتا ہوں علاجِ دلِ رنجور نہ کر
  اتنی تو مری بات بھی رکھ لے یارب — اظہارِ طلب کے لیے مجبور نہ کر [۲]

دُورِ حاضر میں اخلاقی پستی، انسانی خود غرضی اور نفسا نفسی کے مناظر پر، شرافت اور مروّت کی پُرانی اقدار کے انہدام اور لادینیت پر، نیز راہِ خدا سے انسان کی لاتعلّقی و بے نیازی پر منوّر لکھنوی اپنی رباعیات میں یوں نوحہ خوانی کرتے ہیں :-

- کچھ حمد و ثنا کی اب ضرورت ہی نہیں — کچھ دستِ دعا کی اب ضرورت ہی نہیں
  کیا خوب ہے شانِ بے نیازی واللہ — بندوں کو خدا کی اب ضرورت ہی نہیں [۳]

- سرگشتہ و حیراں مجھے کر دیتا ہے — انگشت بدنداں مجھے کر دیتا ہے
  جس دَور کو دیکھتی ہیں آنکھیں میری — وہ دَور پریشاں مجھے کر دیتا ہے [۴]

" زیرۂ گُل " میں فطرت کی منظر کشی اور حسنِ قدرت کے جلوہ ہائے صد رنگ بھی دِکھائی دیتے ہیں۔ شاعر نے رباعی کے دامانِ تنگ میں منظر نگاری کے سہارے فسانۂ زیست کے مختلف النوع موضوعات کو انتہائی سلیقے کے ساتھ جگہ دی ہے۔ انسان روزِ ازل ہی سے نگارِ فطرت کا پرستار رہا ہے اور اس کے دل کش و جانفزا مناظر سے نشاط کش اور لطف اندوز ہوتا رہا ہے۔ منوّر ان جلووں کی رنگینیوں کو رُباعی کے پیکر میں یوں ڈھلتے ہیں :-

- گوشے گوشے کو جگمگا دیتی ہے — اِک رشکِ ارم چمن بنا دیتی ہے
  دل کس لیے آخر نہ ہو قُربانِ بہار — اِک آن میں سَو رنگ دِکھا دیتی ہے [۵]

- جاڑے کے اُتار کا زمانہ آیا — مستی کے اُبھار کا زمانہ آیا
  بدلا بدلا وہ رُخ ہَوا کا بدلا — دیکھو کہ بہار کا زمانہ آیا [۶]

---

۳ ۴ " زیرۂ گُل " (غیر مطبوعہ بیاضِ رباعیات۔ منوّر لکھنوی) نیز ماہنامہ " نئی روشنی " شاہ آباد۔ شمارہ جون ۵۴ء ۱۹

۵ " زیرۂ گل " (منوّر لکھنوی) قلمی مسوّدہ ۶ منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (راج نرائن راز) صفحہ ۱۲۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہر گُل مجھے پیمانہ نظر آتا ہے ۔۔۔ گلشن مجھے مے خانہ نظر آتا ہے
جُھرمٹ مرغانِ خوشنوا کا ہر سمت ۔۔۔ اک مجمعِ رندانہ نظر آتا ہے[۱]

منوّر لکھنوی کی کچھ اور منظری رباعیات کی غنائیت شعریت، دل کشی اور جامعیت ملاحظہ ہو۔

طلوعِ سحر کے نرم و نازک اور کیف انگیز ماحول کی منظر کشی دیکھیے :۔

- یہ صبح کے وقت نغمہ سنجیِ طیور ۔۔۔ اشجار کی شاخوں پہ یہ رقصِ مسرور
ہم رنگِ خرامِ صد بتانِ شنگول ۔۔۔ رفتہ رفتہ فلک سے یہ بارشِ نور[۲]
- بخیے شبِ تار کے اُدھڑنا ہے ہے ۔۔۔ نقشے مہ و انجم کے بگڑنا ہے ہے
کرنوں کا زمیں پہ یہ ضیا در آغوش ۔۔۔ اک بار فلک سے کود پڑنا ہے ہے[۳]

لیکن منوّر کا فن اپنے اصلی رنگ میں اُن کی اخلاقی اور رُوحانی رباعیات و قطعات میں جلوہ افروز ہوتا ہے۔ اُن کی اپنی شرافتِ نفس، انسانیت پرستی، وسعتِ قلب و روح اور سیکولر نقطۂ نظر انھیں ہر مذہب کی تعظیم بجالانے کا درس دیتے ہیں اور اسی مقدّس درس کو وہ اپنی رباعیات و قطعات کا رُوپ دے کر بنی نوعِ انسان کے ذہن و دل تک پہنچانے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ فرقہ پرستی اور مذہبی تنگ نظری سے گزیدہ ذہنوں پر یوں دستک دیتے ہیں :۔

- گُمراہیِ دَورِ نو سے حیران نہ ہو ۔۔۔ مذہب کی مذمّت سے پریشان نہ ہو
ممکن نہیں آدمی منوّر کوئی ۔۔۔ بندہ ہو خدا کا اور انسان نہ ہو[۴]
- مذہب جور و جفا پہ مائل ہی نہیں ۔۔۔ مذہب مہر و وفا میں حائل ہی نہیں
مذہب ہے ہم آہنگیِ ارواح کا نام ۔۔۔ مذہب حد بندیوں کا قائل ہی نہیں[۵]
- مذہب نے کیا نہ کچھ ایماں نے کیا ۔۔۔ یزداں نے کیا نہ کچھ شیطاں نے کیا
اپنا تو مشاہدہ منوّر ہے یہی ۔۔۔ ہر ظلم غرض مندیِ انساں نے کیا[۶]
- دیدار سے ارجمند کرلیں آنکھیں ۔۔۔ اوپر دیکھا بلند کرلیں آنکھیں
کچھ ایسے مناظر نظر آئے مجھ کو ۔۔۔ دنیا کی طرف سے بند کرلیں آنکھیں[۷]

۱؎ منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (راج نرائن رازؔ) صفحہ ۱۲۶

۲؎، ۳؎ زیرۂ گُل (منوّر لکھنوی) قلمی مسوّدہ ۴؎، ۵؎، ۶؎، ۷؎ زیرۂ گُل (منوّر لکھنوی. غیر مطبوعہ بیاضِ رباعیات. مختلف صفحات)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سنت کوی گوسوامی تلسی داس کے ایک قول کا ترجمہ منوّر لکھنوی نے رُباعی میں کس خوبصورت پیرائے میں کیا ہے، ملاحظہ ہو :-

• رُتبہ ترا دنیا میں اس سے اعلیٰ ہوگا | عقبےٰ میں بھی بول اس سے بالا ہوگا
دہلیز پہ لب کی شمع ذکرِ حق رکھ | اندر باہر تمام اُجالا ہوگا [۱]

عمر کی ڈھلان پہ شاعر کے احساسِ خستگی و درماندگی نے اس سے اس طرح کی رُباعیات بھی کہلوائی ہیں۔ ان رُباعیات کی شدّتِ احساس اور کربِ باطن کو کوئی درد مند دل ہی سمجھ سکتا ہے۔ منوّر ذیل کی رُباعیات میں فرماتے ہیں :-

• ٹوٹی ہوئی زنجیر سمجھیے مجھ کو | سوئی ہوئی تقدیر سمجھیے مجھ کو
کچھ دیر کا اور ہے رنگ و روغن | مٹتی ہوئی تصویر سمجھیے مجھ کو [۲]

• سرگشتۂ ایّام ہوا جاتا ہوں | شرمندۂ انجام ہوا جاتا ہوں
اب ڈوبنے میں کیا ہے کسر کچھ باقی | خورشیدِ سرِ شام ہوا جاتا ہوں [۳]

لیکن بقولِ غالب۔ ع ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا ـــــ منوّر کے اندر کا شاعر ایک حسرت کی تکمیل کے لیے اِس عمر رسیدگی کے باوجود سرگرمِ کار رہنے کا مشورہ دیتا ہے۔ وہ اپنے عزم کو اس رُباعی میں دوہراتے ہیں :-

• حاصل عمرِ دوام کرنا ہے مجھے | خود کو ارفع مقام کرنا ہے مجھے
آتی ہے یہ آواز ہر اک سانس کے ساتھ | جب تک جینا ہے کام کرنا ہے مجھے [۴]

"زیرہ گُل" میں رندانہ رُباعیات کے علاوہ منوّر لکھنوی نے رندانہ قطعات بھی جا بجا تحریر کیے ہیں۔ خمریاتی رنگ کے کچھ قطعات ملاحظہ کیجیے :-

• قابلِ دید ہے انداز مرے پینے کا | نہ ہے انجام نہ آغاز مرے پینے کا
کیسی پیتا ہوں میں کب پیتا ہوں کیوں پیتا ہوں | آج تک کھُل نہ سکا راز مرے پینے کا [۵]

• ساقی کی اِک نگاہ سے ہر کام بن گیا | دِل شغلِ مے کشی کے لیے جام بن گیا
رگ رگ میں اس نے ایک نئی رُوح پھونک دی | جو خون تن میں تھا، مئے گلفام بن گیا [۶]

رباعی کے متعلق سردار جعفری فرماتے ہیں :-

---

[۱] تا [۶] زیرہ گُل (منوّر لکھنوی۔ قلمی مسوّدہ) مختلف صفحات

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

"رباعی اس اعتبار سے بڑی کافر صنف ہے کہ وہ چار مصرعوں میں ابتدا، ارتقا اور انتہا کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس طرح شاعر چار مصرعوں میں کہانی نہیں داستان کہتا ہے"[۱]

یہ قول منوّر لکھنوی کی بیشتر رباعیوں پر صادق آتا ہے۔ بالخصوص ان کی غیر مطبوعہ بیاض رباعیات "زیرۂ گل" کی رباعیوں پر۔ بلاشبہ اس صنف کی فنی عظمت کا گہرا احساس منوّر کے یہاں ملتا ہے۔ اس صنفِ سخن کے لیے زبان و بیان کی جو پختگی، شعریت و غنائیت عروضی مہارت اور فنی گرفت درکار ہے وہ منوّر کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس مشکل صنف میں طبع آزمائی کرتے ہوئے انھوں نے کہیں ٹھوکر نہیں کھائی۔ بیشتر رباعیات میں انھوں نے مصرعۂ چہارم میں زیرِ اظہار موضوع کو اپنے نقطۂ عروج پر پہنچا کر حق ادا کیا ہے۔ رباعی کی شانِ نزول کو منوّر لکھنوی رباعی ہی میں یوں بیان کرتے ہیں :-

- ہاتف کا تراشیدہ نگینہ ہے یہ
لب جس پہ ہوں میں جس کا وہ حسینہ ہے یہ
کیا خوب یہ رات کو رباعی کا نزول
اِک ساغرِ بادۂ شبینہ ہے یہ[۲]

- کہیے فی الفور اور اچھی کہیے
فرمائیے یوں بدیہہ گوئی کہیے
فرمائشِ غیبی کے منوّر صدقے
کیا خوب کہ برجستہ رباعی کہیے[۳]

منوّر کی غزل اور رباعیات میں کسی حد تک معنوی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے بھی ان میں یکسانیت اور مشترک مقاصد کی تکمیل کا عزم کارفرما دکھائی دیتا ہے منوّر لکھنوی کی رباعیات میں وہی جمالیاتی تجربے، وہی فلسفیانہ مضامین، تہذیبِ اخلاق کے مشورے، بلندیِ کردار کی تبلیغ و تدریس، وہی بادۂ عرفاں کی لذت چشی و سرمستی، وہی کفر و ایماں کے مسائل، مذہبی تعصبات سے بالاتر خدا پرستی اور انسان دوستی کی تلقین، عشق کی طہارت اور حسن کی ہوس کی بجائے اس کی پرستش کا وہی جذبہ اظہار پاتے ہیں جو اُن کی غزل کے امتیازی عناصر ہیں۔

منوّر لکھنوی رباعی کو اصنافِ شاعری میں کیا مقام دیتے ہیں اور اس دل نشیں وسیلۂ اظہار و ابلاغ کے بارے میں وہ خود کیا رائے رکھتے ہیں۔ اس کا اظہار بھی انھوں نے چند

۱۔ ہماری زبان نئی دہلی۔ شمارہ ۱۵ر جنوری ۱۹۸۹ء (اقتباس از "رباعیاں"، مصنّفہ سردار جعفری ہندوستان بک ٹرسٹ بمبئی

۲۔ ۳۔ زیرۂ گل (منوّر لکھنوی۔ قلمی نسخہ)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

رباعیات میں کیا ہے اور یہ رباعیات بھی خاصے کی چیز ہیں۔ ان میں سے کچھ رباعیات درجِ ذیل ہیں:۔

• اِس میں گنجائشِ بیاباں بھی ہے — اِس میں زیبائشِ گلستاں بھی ہے
عاشق ہیں رُباعی کے جہاں جوشؔ و فراقؔ — محبوبِ منوّرِؔ غزل خواں بھی ہے ہے[1]

• جب نظم و غزل سے فکر کتراتی ہے — جب دل کو نئے حوصلہ گرماتی ہے
برسوں کا یہ تجربہ منوّرؔ ہے مرا — اچھی سی رُباعی کوئی ہو جاتی ہے[2]

• ہے قدرتِ قادر سے رُباعی کی نمود — ہے اوّل و آخر سے رُباعی کی نمود
کونین کی وسعت سے ہوئی ہے تشکیل — ہے چار عناصر سے رباعی کی نمود[3]

• اِک جذبہ و تاثیر کی تدبیر ہے یہ — اِک معنی و الفاظ کی تعمیر ہے یہ
ہوتا ہے رُباعی سے تخیل بیدار — اِک خوابِ دلآویز کی تعبیر ہے یہ[4]

• ہے بلبلِ خوش نوا، گلِ تر بھی ہے — شبنم بھی ہے تاثیر میں اخگر بھی ہے
ہے تنگیٔ ظرف پر بھی اتنی وسعت — کوزہ بھی رُباعی ہے، سمندر بھی ہے[5]

اور یہ کوزہ میں سمندر کو بند کرنے کا جادو یعنی پُرتاثیر رُباعی کہنے کا سلیقہ منوّرؔ لکھنوی جیسے اہلِ زباں اور خاندانی شاعر ہی کا حصہ ہے، اور یہ اُن کی فنی استعداد و صلاحیت کا غمّاز ہے۔ اسی لیے اپنے چند اعتراضات کے باوجود نریش کمار شادؔ کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ " —— یہ تو ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ موجودہ رباعی گو شعرا میں جوشؔ (ملیح آبادی) اور فراقؔ کے بعد منوّرؔ ایسے اہم ترین رُباعی گو شاعر ہیں جو رُباعی کی فنی باریکیوں اور لطافتوں کو بخوبی سمجھتے ہیں"[6]

---

[1] تا [5] شاخِ مرجاں (منوّرؔ لکھنوی کی غزلیات کی آخری بیاضِ غیر مطبوعہ میں یہ رباعیات درج ہیں)
[6] منوّرؔ لکھنوی شخصیت اور شاعری (راج نرائن رازؔ) مقالہ: "رباعیاتِ منوّرؔ" از نریش کمار شادؔ، صفحہ ۱۲۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

باب چہارم

منوّر لکھنوی کی فارسی شاعری

اور تراجم

- فارسی زبان و بیان پر قدرت
- غزلیات کا روایتی رنگ و آہنگ
- منوّر کے فارسی دیوان "طوافِ عجم" پر تنقیدی نظر
- فارسی ادب پاروں کے اُردو تراجم: رُباعیات و قطعاتِ بابا طاہر ہمدانیؔ الہاماتِ ایرانی سوزِ اقبالؔ (ارمغانِ حجاز)
- میری یادداشتیں اور وجدانِ حافظؔ کا تنقیدی مطالعہ

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منوّر لکھنوی کی فارسی شاعری

منوّر لکھنوی اور ان کے بزرگوں کی فارسی شعرگوئی کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ این خانہ ہمہ آفتاب اُست۔ اس خاندان کی فارسی شعرگوئی کا سلسلہ منوّر کے جدِ امجد (پر دادا) منشی اودے راج مطلع سے آغاز پذیر ہوا۔ مطلع کے صاحبزادے منشی ایشوری پرشاد شعاعیؔ بھی فارسی میں شعر کہتے تھے اور اُن کے فارسی کلام کا ایک قلمی نسخہ "رقعاتِ شعاعی" کے نام سے یادگار ہے۔ یہ حضرت مرزا قتیلؔ کے شاگرد تھے۔ منوّر کے چچا صاحبان منشی رام سہائے تمنّاؔ اور منشی ماتا پرشاد نیساںؔ بھی گاہے بگاہے ایرانی زبان میں شعرگوئی کرتے تھے۔ لیکن منوّر کے والد ملک الشعرا دوارکا پرشاد اُفقؔ لکھنوی مرحوم تو فارسی شعرگوئی پر کامل عبور رکھتے تھے۔ موصوف نے میر محبوب علی خاں نظامِ حیدرآباد اور کچھ دیگر امرائے دکن کی ستائش میں جو قصائد قلم بند کیے وہ منفرد ادبی اہمیت کے حامل تھے۔ اُفقؔ نے حیدرآباد کے راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ مرحوم کے خاندانی حالات بھی زبانِ ایرانی میں نظم کیے تھے جو زبان و بیاں کے محاسن سے مالا مال ہیں۔

منوّر کلاسیکی فارسی شاعری کی فصاحتِ زباں اور لطافتِ فکر کے قائل تھے اور انھوں نے اوائلِ عمر ہی میں مشاہیرِ ادبِ فارسی کی تصانیف کا عقیدت اور یکسوئی سے مطالعہ کیا تھا۔ خواجہ حافظ شیرازی، حکیم قاآنی، عمر خیام، مرزا صائب، ظہیر فاریابی بالخصوص ایسے فارسی شعرا تھے دیوانِ حافظ کے بہت سے پسندیدہ اشعار کا ان کا ترجمہ "وجدانِ حافظ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اسی طرح بابا طاہر ہمدانی کی رباعیات کا منظوم ترجمہ بھی منوّر نے کیا تھا۔ ڈاکٹر اقبال کی "ارمغانِ حجاز" کا اُن کا ترجمہ "سوزِ اقبال" کے نام سے شائع ہوا۔ فارسی کی ایک نثری تصنیف یادداشتہائے من کا ترجمہ منوّر نے اردو میں میری یادداشتیں کے نام سے کیا —— یہ

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

افغانستان کے مارشل ولی خان کی تاریخی تصنیف تھی اور اس کا اردو ترجمہ انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز نے شائع کروایا۔ فارسی کے کچھ دیگر شعرا اور اہل قلم کے افکار و اشعار کے اردو ترجمے بھی منوّر نے کیے، جن کا قلمی مسوّدہ "الہامات ایرانی" موجود ہے۔ ان سب تصانیف کا تنقیدی جائزہ زیر نظر باب میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اگرچہ فارسی شعر و ادب کا مطالعہ منوّر کا محبوب مشغلہ رہا تھا، تاہم انھیں فارسی شعر گوئی کی تحریک و ترغیب علامہ پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی کی صحبت سے حاصل ہوئی جنھوں نے دہلی میں ایک "بزم سخن" قائم کر رکھی تھی اور جس کی ادبی نشستوں اور مشاعروں کے اہتمام میں پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی، علامہ امرناتھ ساحر کے چھوٹے بھائی دینا ناتھ مسعجز دہلوی اور پنڈت برج کشور شور دہلوی کی مساعی جمیلہ کا سرگرم دخل تھا۔ یہ بزم ہر سال ایک اردو مشاعرہ اور ہندی کوی سمیلن کے علاوہ فارسی مشاعرہ بھی منعقد کرتی تھی۔ علامہ ساحر کو ایرانی زبان کے مشاعروں میں علامہ منوّر لکھنوی کی عدم شرکت کا شکوہ اکثر رہتا تھا۔ چنانچہ ایک بار ۱۹۳۸ء میں علامہ ساحر دہلوی نے منوّر لکھنوی اور گوپی ناتھ امن لکھنوی دونوں حضرات سے اس سلسلے میں اپنی مایوسی کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ فارسی شاعری کے میدان میں قدم بڑھانے کے لیے اصرار کیا۔ بقول جناب کالی چرن اثر، علامہ ساحر دہلوی کے شفقت آمیز کلمات کا اثر منوّر لکھنوی کے دل پر بہت گہرا ہوا اور اسی روز انھوں نے اپنے گھر پہنچ کر "بزم سخن" کے سالانہ فارسی مشاعرہ برائے ۱۹۳۸ء کی طرحی زمین میں ایک کامیاب غزل کہہ ڈالی — فارسی غزل گوئی کے میدان میں یہ منوّر کی پہلی جست تھی۔ اسی غزل کے چند اشعار دیکھیے :-

جاں دادہ ام بہ شوخیِ ناز و ادائے تو — انگیز می کنم ستم ناروائے تو
ناآشنائے تو کہ کیے آشنائے تو — سرگرم التجاست وجویدعطائے تو
کارت بخود گزار و مکن احتیاج غیر — فرسودہ نیست ناخن عقدہ کشائے تو
تسلیم شیوہ دارم و مشق فنا کنم — راہِ بقا بمن بنماید رضائے تو

دامن بدست نیست منوّر فغاں بلب
در کوچہ نیاز بنالد گدائے تو[۱]

---

[۱] منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (راج نرائن راز) صفحہ ۱۴۰۔ مقالہ: منوّر کی فارسی شاعری پر ایک نظر۔ از کالی چرن اثر

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہر چند کہ منوّر جیسے جیّد عالم کو فارسی شعر گوئی کے لیے کسی کی رہبری کی حاجت نہ تھی پھر بھی انھوں نے فارسی کے ایک باکمال شاعر اور کاملِ فن کو اپنا فارسی کلام نظرِ ثانی کی خاطر دکھانے میں تامّل نہیں کیا۔ ایرانی زبان کے یہ ماہرِ فن متعلقہ دریا آباد، موضع بارہ بنکی کے رئیس رائے سدھ ناتھ بلی فراقؔ تھے جو فارسی کے باکمال شاعر تھے جن سے منوّر اپنے ابتدائی فارسی کلام پر مشورۂ سخن کرتے رہے۔ یہ سلسلہ چند برسوں تک جاری رہا۔ چوں کہ آزادیِ ہند کے بعد فارسی زبان کی قدر و منزلت بتدریج کم ہوتی گئی اور فارسی کی وہ دیرینہ ادبی محفلیں قصّۂ ماضی بن کر رہ گئیں اس لیے منوّر کی توجہ بھی فارسی شعر گوئی کی جانب کم ہوتی گئی۔ منوّر لکھنوی کا غیر مطبوعہ فارسی دیوان "طوافِ عجم" جو غزلیات، نظموں اور رباعیوں پر مشتمل ہے، ان کی پختہ گوئی اور فنّی مہارت پر دال ہے۔ اس طبعزاد شعری مجموعے کے سرورق پر مرقوم دو اشعار منوّر کی فارسی غزل کے مزاج کی آئینہ داری کرتے ہیں اور اُن کے رنگِ سخن کی بھی۔ یہ اشعار درجِ ذیل ہیں :۔

منم مرکزِ دورِ سیّار و انجم — زمانہ بشکلِ طواف است ما را

دوسرے شعر میں منوّر فارسی زبان کی عظمت و فضیلت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے "زبانِ اہلِ دل" قرار دیتے ہیں، اور فرماتے ہیں :۔

ہست نامم ترجمانِ اہلِ دل — در دہن دارم زبانِ اہلِ دل

اس بیاض کے اگلے صفحے پر معبودِ ازل کو مخاطب کر کے منوّر نے کیا لطیف اشارہ کیا ہے ذیل کے شعر میں :۔

بود در نغمۂ خاموش حیاتِ جاوید — لب کشائی بتو گردن زدنی بود مرا ۔

اپنے خالق سے لطیف گفتگو، عبودیت اور معرفت کا یہی منفرد رنگ منوّر کی فارسی غزلیات میں مجموعی طور پر ساری و طاری نظر آتا ہے۔ ان کی نظمیں اور رباعیاتِ فارسی بھی مقصدیت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں اور اُن کی زبان شستہ اور اسقام سے پاک ہے۔

مصنّف کی حیثیت سے اپنا تعارف دیتے ہوئے منوّر اگلے صفحے پر "من آنم کہ من دانم" کے زیرِ عنوان اپنے سوانحِ حیات کی جانب مختصر اشارے کرتے ہیں۔ تعارف یوں شروع ہوتا ہے :۔

" دیدۂ ہستی را در سنۂ یک ہزار ہشت صد و نود و ہفت بمقام لکھنؤ کہ معمورۂ اصفاہانِ ہند ہست ·

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کشادہ کردم۔ نسبتِ فرزندی از ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد اُفق خلد آشیانی دارم۔ بعد از وفاتِ برادرِ گرامی رائے رام شنکر پرشاد بہ سنۂ یک ہزار نہ صد وسیزدہ پرچم سخن از پدرِ بزرگوار در دست گرفتم۔ آنحضرت بہ صدمۂ فراقِ جگر پارۂ کلاں از نورِ بصر محروم شدند وہمیں در سنۂ یک ہزار نہ صد وسیزدہ (۱۹۱۳ء) بماہِ ستمبر بعالمِ بقا جادہ گرفتند۔[1]

اس پیراگراف میں منوّر لکھنوی نے اپنی وِلادت، ولدیت اور اپنے بڑے بھائی اور والد کے ۱۹۱۳ء میں انتقال فرمانے کے بعد اُن کے ہاتھوں سے پرچم سخن کو اپنے ہاتھوں میں منتقل کیے جانے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اگلے پیراگراف میں منوّر نے اپنے اسلاف کی ادبی خدمات کا ذکر کیا ہے. اس تعارف میں سے ایک مختصر اقتباس مزید درجِ ذیل کیا جا رہا ہے۔

"شوقِ سخن سنجی بمقتضائے فطرت یافتہ ام۔ اُمرِ حق اینست کہ توجہ سوئے این فنِ لطیف بتوسّلِ اسلاف دارم۔ نا میکے قبلہ وکعبہ حضرتِ اُفق در تمام اکنافِ ہند پیدا کردند، بہ صورتِ روزِ روشن آئینہ ہست وتا بہ امروز غلغلۂ سخنش از کشامرتا دکن باقی ہست۔ یکے از عمِ مکرم رائے رام سہائے تمنّا بودند ودیگرے ماتا پرشاد نیساں۔"

اپنے اس تعارفی مضمون میں منوّر صاحب نے اپنے اُستاد منشی نوبت رائے نظرؔ اور اپنے خُسر صدرِ لکھنوی سے جو آغا سنجر ایرانی کے شاگرد تھے۔ فارسی شاعری میں مشورۂ سخن کرنے کا ذکر بھی کیا ہے۔

"طوافِ عجم" کے اگلے چند صفحات میں فارسی جریدہ "یالی گلات" میں سے نقل کیا گیا ایک مضمون درج ہے، اِس جریدہ کے ماہ اگست ۱۹۵۶ء کے شمارے میں مذکورہ مضمون منوّر لکھنوی کی حیات اور فارسی شاعری کے متعلّق شائع ہوا تھا۔ اس کے مختصر اقتباس نیچے دِیے جا رہے ہیں۔ اِس مضمون میں مدیرِ جریدہ رقم طراز ہے کہ جس طرح فخرِ ہند سر رابندر ناتھ ٹیگور نے جنھوں نے ایران کا بھی سفر کیا تھا، کسی یونیورسٹی سے تعلیم نہیں پائی تھی، اِسی طرح منوّر بھی فارسی کے مسلّمہ شاعر ہیں حالانکہ اُنھوں نے فارسی کی ڈگری کسی یونیورسٹی یا دانش کدے سے حاصل نہیں کی۔ مدیر لکھتا ہے :۔

---

[1] تعارفی مضمون "من آنم کہ من دانم" طوافِ عجم (غیر مطبوعہ بیاضِ کلامِ فارسی۔ منوّر لکھنوی)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

"علامہ بشیشور پرشاد منورؔ لکھنوی ہم کہ از سخن وران بزرگ فارسی زبان ہند بشمار می رود، ہیچ دسیلم ز زبانِ فارسی بدست نیاوردہ است۔ ولے در کودکی چند کتاب درسی فارسی پیشِ پدر خود ملک الشعرا دوارکا پرشاد اُفقؔ کہ شاعر و روزنامہ نگار و درماں نویس بزرگ عہد بود، خود خواند و بمطالعہ کلام سعدیؔ و حافظؔ و خیامؔ و سرمدؔ و نظیریؔ و عرفیؔ و ظہیر فاریابی و صائب تبریزی پرداخت امروز ہم شعر فارسی منورؔ از ہماں شعرائے بزرگ ایران می باشد۔ خود ایں شاعر ہندی اعتراف کردے۔

گلشنِ ہند زاد بود من است   لیک در رنگ و بوئے ایرانم"

"طوافِ عجم" کی نظمیں منورؔ لکھنوی کے عہد کے عصری قومی اور سماجی مسائل، عظیم روحانی ادبی اور سیاسی شخصیتوں کے کارناموں اور واقعات و واردات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان نظموں میں "طوافِ عجم" "صبحِ آزادی" "بہ نجابت نجیب" "ترانۂ وطن" "ہند و کشمیر" "خطاب بہ پیغمبر جدید" "ظہیر فاریابی" "بدرگاہِ نظام الدین اولیا" "بیادِ علامہ اقبالؔ" وغیرہ منورؔ کے عصری شعور اور کشادہ ظرفی کی آئینہ دار ہیں۔ لطفِ زباں اور حسنِ بیاں کے ساتھ یہ شاعر کے بیدار اور حساس دل اور وقتی مسائل پر اُس کے متین اور پختہ اندازِ فکر و نظر کی عکاسی کرتی ہیں۔ "طوافِ عجم" کے زیرِ عنوان ایک غزل نما نظم اس شعری مجموعے کے شروع میں ہی مرکزِ نگاہ بنتی ہے جو شاعر کے روحانی اور تخلیقی نظریے کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس نظم کے چند اشعار دیکھیے:-

بہ رندی کجا اعتراف است مارا   کہ تقوئے زِ صہبائے صاف است مارا
میارائے ہوس ابر لبت حرفِ سودا   کہ لاف است مارا، گزاف است مارا
حیاتم مماتم رضائے تو دارد   کجا طاقتِ انحراف است مارا
چہ دریا چہ صحرا چہ معدن چہ مخزن   بہر گوشہ اے اعتکاف است مارا
منم مرکزِ دورِ سیارہ و انجم   زمانہ بشکلِ طواف است مارا
فرو آورم گاہ، گاہے بپوشم   کہ ایں جسمِ خاکی غلاف است مارا
بہر رازِ سربستہ سربستہ باشم   بہر انکشاف انکشاف است مارا

اس نظم میں منورؔ کے روحانی نظریات، رشتۂ جسم و جاں، مسئلہ تناسخ، صبر و قناعت، راضی برضائے الٰہی رہنے اور عظمتِ انساں کی جانب واضح اشارات ملتے ہیں۔ عابد و معبود کے رشتے کو واضح کیا گیا ہے۔ منورؔ جسمِ خاکی کو ایک لباس قرار دیتے ہیں جسے روح کبھی اُتار

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

دیتی ہے اور کبھی پہن لیتی ہے۔ حیات و ممات کی بس اتنی سی حقیقت ہے۔ معبودِ حقیقی کے روبرو خود سپردگی اور اُس کی ذات پر اعتمادِ کامل منوّر کے نظریاتِ زندگی ہیں جن کے اظہار کا وسیلہ اس نظم کو بنایا گیا ہے۔

موضوعاتی نظموں میں سے "صبحِ آزادی" میں منوّر اِن الفاظ کے ساتھ وطنِ عزیز کی آزادی کی صبح کا خیر مقدم کرتے ہیں :-

فضائے صبحِ آزادی جمیل است　　　برائے نغمۂ شادی دلیل است

مہیا تشنہ کاماں را سبیل است　　　دل از گنگ و چمن سیراب گشتہ

وطنِ عزیز کا جو بھی باشندہ اپنے وطن سے غداری کرتا ہے وہ منوّر جیسے وطن پرست شاعر کی نگاہ میں بندۂ رذیل ہے اور محبِ وطن اس کی نظر میں شرافت کا پیکر :-

حقیر است و رذیل است و ذلیل است　　　کشد سر ہر کہ از مُلکش زکینہ

شریف است و نجیب است و اصیل است　　　بدارد ہر کہ در خاطر وطن را

کشمیر وطنِ عزیز کا اٹوٹ حصّہ ہے۔ اِس جنّت نظیر خطّے سے اہلِ وطن کے کیا جذبات اور آرزوئیں وابستہ ہیں۔ ان اشعار میں دیکھیے (جو غالباً کشمیر پر پاکستان کی حمایت کے ساتھ ہونے والے قبائلیوں کے حملے کے زمانے میں کہے گئے ہوں گے)

تمام ہند بکشمیر جاں سپار شود　　　تمام ہند بکشمیرِ جاں نثار شود

تمام ہند بہ کشمیر بے قرار شود　　　تمام ہند فشاند سرشکِ خوں بہ غمش

عدو در آتشِ پیکار خاک خواہد شُد

زپاک خطّۂ کشمیر پاک خواہد شُد

ترانۂ وطن میں" منوّر لکھنوی نے اپنی مادرِ وطن کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے :-

نسبت سازد با یزدانے　　　عصمت یابد از ایمانے

ہمت دارد در میدانے　　　وسعتِ بے حد در امکانے

مُلکِ یگانہ ہندُستانے

فخرِ زمانہ ہندُستانے

اگلے بندوں میں منوّر بھارت کی خودداری، خود اعتمادی اور عزمِ تعمیر و ترقی پر

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

نازاں دکھائی دیتے ہیں اور اس کے روشن مستقبل کے لیے پُر امید و دعا گو ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

اکنوں ہست نظر بر جادہ　　　اکنوں ہست بکار آمادہ
اکنوں ہست ز خود اِستادہ　　　اکنوں نیست فرو افتادہ
مُلکِ یگانہ ہندُستانے
فخرِ زمانہ ہندُستانے

منوّر کی خالص اُدبی نظموں میں "ترانۂ رِنداں" بڑی پسندیدہ نظم ہے جو ایرانی تبصرہ نگاروں میں بھی مقبول ہوئی اور جس کے حوالے ایرانی ناقدوں نے اپنے مضامین میں دیے ہیں، اس کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:۔

در بازارِ بادہ فروشاں　　　من می رقصم جوشاں جوشاں
گریاں بر عقلِ معقولاں　　　خنداں بر ہوشِ مدہوشاں
رمقے نیست تری در دامن　　　لے قربانِ صہبا نوشاں
از حرفِ قسمت آسودہ　　　بایں ہمہ ہر لحظہ کوشاں
نیست چُوں تابِ حرفِ منوّر
لب مکشا در نکتہ نیوشاں

"بعد از نیم شبی" میں منوّر کی یہ تلقین و تاکید ملاحظہ ہو:۔

سلسلہ جُنباں بہ عشرت باش، ساعت را مبیں　　　نغمہ گوشو، تنگیٔ دامانِ فرصت را مبیں
ایں عبادت بر تو کفر ست و بمن ایمان است　　　از نگاہِ کم پرستارِ محبت را مبیں

منوّر جن روحانی اور ادبی شخصیات سے متاثر ہوئے، اُن کے تئیں اپنی فارسی نظموں میں انھوں نے بڑے کُھلے دل سے اظہارِ عقیدت کیا ہے۔ ظہیر فاریابی کے کلام کا عمیق مطالعہ کرنے سے قبل منوّر اس شاعر کے کمالِ فن سے زیادہ متاثر نہ تھے لیکن اس کی شاعری کے مطالعے کے بعد انھیں اپنی اس غلط فہمی اور ناقدر شناسی پر تاسف ہوا جس کا اظہار و اعتراف انھوں نے اپنی ذیل کی نظم میں کیا:۔

خوشا قسمت کہ یا بم باریابی　　　بدیوانِ ظہیرِ فاریابی
مضامینش لطیف و دلربا ہست　　　ہزار آیئنہ ہا اندر صفا است

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

غزل را جوہر اجمال دادہ | بہ ہر بیت یک مرجاں نہادہ
کشش خواہد کہ در گنجد بہر حرف | دریں پیمانہ رقصد وسعتِ ظرف
اگرچہ مستی حافظ ندارد | اگرچہ حکمت سعدی ندارد
اگرچہ رعب خاقانی نہ اینجاست | اگرچہ کیف قاآنی نہ اینجاست
بتودم قائلش من اوّل اوّل | گمانم آخر آخر شُد مبدّل
غلط رو بُد نگاہِ خوردہ گیرم | کنوں گویم بسوگندِ ضمیرم
اگرچہ بیشتر کم در شمارند | مگر اشعار دُرِّ شاہوارند
دلِ من را چوں ناخن می خراشند | ازیں الماس آئینہ تراشند

اپنی نظم "برمزارِ غالب" میں وہ غالب کو نذرانۂ احترام و ارادت پیش کرتے ہوئے اس کی تقلید کا اعتراف کرتے ہیں، اور غالب کو ایک عہد آفریں شاعر قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

- می خورم بادۂ الہام زِجامِ غالب | کامِ من سلسلہ جنباں ست بہ کامِ غالب
ذہنم ز آرزوئے فیض کشادہ تیہم | بارشِ جلوۂ معنی ست کلامِ غالب

- منم ناسودہ از شامم سحر اندر سحر دارم | حیاتِ تازہ می جویم اگرچہ فرق بر دارم
منوّر می کنم سیراب از خونم جہانے را | مزارِ غالبِ دُور آفریں را در نظر دارم

شاعرِ مشرق اقبالؔ کو ہدیۂ نیاز پیش کرتے ہوئے منوّر اپنی نظم "بیادِ اقبالؔ" میں موصوف کی حب الوطنی اور قوم پرستی کا ذکر کن پُر احترام الفاظ میں کرتے ہیں۔ درج ذیل اشعار میں دیکھیے:-

روحِ نورِ امنتقل در قالبِ شعر و سخن کرد | خلوتِ رازِ خودی را انجمن در انجمن کرد
آنچہ در دل بُود بر انفاس شد صوتِ قلندر | نعرۂ منصور را آوازۂ شعر و سخن کرد
گشت از بانگِ درا بیدار ہر خوابیدہ بختے | کارواں را در رہِ دشوارِ ہستی گامزن کرد
بوئے اسرارِ خودی داد و رموزِ بے خودی ہم | بالِ مورِ خستہ جاں را بازوئے خیبر شکن کرد
از عراق و ہند یکساں ساخت خاطر را تعلق | در فرات و دجلہ واصل موجۂ گنگ و جمن کرد

ہند و پاکستاں پئے اقبالؔ یکساں جاں سپارند
تا بایں دم در خیالِ جاں گدازش بے قرارند

ڈاکٹر اقبالؔ کی آخری شعری تصنیف "ارمغانِ حجاز" کے فارسی حصّے کا جو ترجمہ "سوزِ اقبالؔ" کے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

نام سے ۱۹۷۰ء میں انجمن ترقی اردو ہند دلی نے شائع کیا۔ اس میں منور لکھنوی کی چودہ اشعار پر مشتمل ایک فارسی نظم شامل ہے جس میں اقبال کی تمام تصانیف کی کھل کر داد دی گئی ہے لیکن اس میں ایک شکوۂ خلوص بھی فارسی قطعہ کی صورت میں شامل ہے۔ ان اشعار پر فارسی کتب کے منور کے تراجم میں مفصل بحث کی جائے گی۔

اسی طرح مذہبی اور سماجی پیشواؤں میں سے سوامی دیانند کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے منور نے اپنی نظم "خطاب بہ پیغمبر جدید" میں جو آریہ سماج کے جریدہ "ریفارمر" دلی میں شائع ہوئی، دیانند کی دینی اور سماجی خدمات کی ستائش کی ہے۔ ہندو سماج کی اصلاح و احیا کے لیے اس فقیر نے اسے مساوات کا راستہ دکھایا اور اسے خونِ تازہ دے کر مسیحا کا کام کیا۔ منور اس نظم میں فرماتے ہیں:۔

دلش جاندار دچنیں و چناں را زبستی برا فراخت باز آسماں را
مسیحا شدے عالم مرد ماں را حیاتِ نوی دادہ اش ہندوآں را

فقیرے عجیبے دیانند بودے

نظر کرد ہر قصۂ پیش و پس را بدریا در انداخت دامِ ہوس را
بر آورد خورشیدِ صبح نفس را رگِ شعلہ زا ساخت خاشاک و خس را

فقیرے عجیبے دیانند بودے

"بدرگاہِ خواجہ نظام الدین اولیا" کے زیرِ عنوان جو نظم خواجہ کے عرسِ مبارک میں ۱۶ جنوری ۱۹۵۲ء کو منور لکھنوی نے پڑھی، میں سے ایک اقتباس درج ذیل ہے:۔

عارفِ باکمال را سالکِ بے مثال را پیش کنم نیاز ہا خواجۂ لازوال را
من چوں فدائے آں شوم رفتہ ز جسم و جاں شوم ہر کہ بدست آورد خالقِ ذوالجلال را

مذکورہ بالا اشعار و اقتباسات جو منور لکھنوی کی چیدہ نظموں سے لیے گئے ہیں منور کے اس بیان پر مہرِ توثیق ثبت کرتے ہیں کہ

کشفِ ایں نیست بر غزل موقوف
نظمِ ما ہم وظیفۂ جاں است

منور لکھنوی کی فارسی بیاض "طوافِ عجم" کی غزلیں بھی حسین و دل نواز ہیں۔ کالی چرن اثر مولانا شبلی کی "شعر العجم" کے حوالے سے رقم طراز ہیں:۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

عربی شاعری کے زیرِ اثر " ایران میں شاعری کی ابتدا مدحیہ اور قصیدہ گوئی سے ہوئی، مگر قصیدہ گوئی کا رواج شاہانِ پیشین کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔ اس کے بعد مسلسل غزلیں کہی گئیں اور آخر میں فارسی شاعری تمام تر غزلوں پر مشتمل ہوگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایرانی زبان میں اردو غزل کو ایک لافانی حیثیت حاصل ہوگئی، اور شعرائے ایران نے اس صنفِ سخن میں جو نغز گوئیاں کی ہیں ان کو ہر لحاظ سے صرف ایران ہی نہیں بلکہ آفاقی ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہے .... چناں چہ بتقاضائے وقت " طوافِ عجم " میں بھی غزلیات کی تعداد دیگر منظومات کے بمقابلہ زیادہ پائی جاتی ہے "۱

منوّر لکھنوی کی فارسی شاعری اسلوب و تکنیک میں اگرچہ کلاسیکی فارسی شعرا سے بہت حد تک متاثر ہے، لیکن منوّر کی فارسی غزلوں میں ان کا وہی منفرد رنگ غالب ہے جو انھوں نے اپنی اردو غزلوں میں اپنایا ہے جس طرح اُردو میں انھوں نے "عشق گزیدہ" غزل کو نئی معنویت عطا کی ہے، اسی طرح اپنی فارسی غزلوں کو بھی انھوں نے گُل و بلبل، رقیب و ناصح اور ہجر و وصال کے روایتی قصّوں کا پلندہ نہیں بننے دیا، بلکہ ان فارسی غزلوں میں بھی وہی معرفت، خدا پرستی، رُوحانیت، توکّل و تشکّر، انسان دوستی اور کردار اور اخلاق کی رفعت کے مضامین حاوی ہیں جو منوّر کی اردو غزل کے نمایاں عناصر ہیں۔ ان کی فارسی غزلوں میں سے چند اقتباسات درجِ ذیل ہیں:-

ہر سنگِ میل فرق زخجلت نہادہ بُود
منزل بسا بعید زتکمیلِ جادہ بُود

چنداں کہ بابِ رحمتِ ساقی کشادہ بُود
در چشمِ شوق بادہ بہر رنگ بادہ بُود

ایں ہم بگو شوارۂ یزداں نہ فرق زد
ہر شئے کہ یافتیم زقسمت زیادہ بُود

بابے کہ بُود بند بہ واعظ زمصلحت
از رحمتِ کریم بَر رنداں کشادہ بُود

مسلکِ رندی و مستی کی فضیلت جو واعظ کی تنگ نظری کے مقابلے میں مذکورہ بالا اشعار میں واضح کی گئی ہے، وسیع القلبی کا استعارہ اور علامت بن کر آئی ہے، ورنہ منوّر نے زندگی بھر شراب تو کیا کسی معمولی سی نشہ آور شے کا بطورِ دوا بھی استعمال نہیں کیا۔ اس پاک باز اور نیک خصلت انسان کی شاعری میں رندی کا تصوّر یکسر جداگانہ ہے۔ منوّر کی شراب بادۂ معرفت ہے یا انسان

---

۱ منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (راج نرائن راز) صفحہ ۱۴۴۔ مقالہ: منوّر کی فارسی شاعری پر ایک نظر از کالی چرن اخگر

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

دوستی اور بنی نوعِ انسان کی باہمی محبت و مُروّت کی شراب۔ بلکہ اسی غزل میں بھی منوّر نے شراب کی لب چشی سے معذوری کا اظہار یہ کہہ کر کیا ہے کہ ع

در چشمِ شوق بادہ بہر رنگ بادہ بُود

اسی طرح منوّر کا عشق بھی عامیانہ عشق نہیں، ہَوس پرستی اور تعیش کوشی نہیں۔ اس کے عشقِ خالص کو نہ مُوت کا دھڑکا ہے اور نہ غمِ زیست کی پروا۔ ملاحظہ ہو:۔

رشتۂ عشق و خاطرِ من بیں — التفاتِ شرار و خرمن بیں
چشم بکشا و جانبِ من بیں — از غمِ زیست و مرگ ایمن بیں
آسماں نیز فرش پائے تو ہست — مہر و مہ را بزیرِ دامن بیں

انسان کی قوتِ پرواز اور رُوحانی شکتیوں کے آگے آسمان اور سیارے گردِ راہ سے زیادہ اوقات نہیں رکھتے۔ اس اعتبار سے منوّر بلاشبہ اقبال کے ہم نوا ہیں، جو فرماتے ہیں:۔

عشق کی اک جست نے ہی کر دیا قصہ تمام — اس زمین و آسمان کو بیکراں سمجھا تھا میں

ایک اور غزل کے اشعار:۔

با سبک رُوحی گراں جانی ہنوز — قصّہ کوتہ کُن کہ طولانی ہنوز
دل بشوق اندر غبارِ آئینہ ایست — جمعِ خاطر را پریشانی ہنوز

رُوحِ انساں اپنے محبوبِ ازلی سے ملنے کے لیے کس درجہ بیتاب ہے اور زنجیرِ آوارگی و قیدِ تناسخ سے چھٹپٹا کر آزاد ہونا چاہتی ہے۔ وہ اپنے محبوبِ حقیقی سے کیا طلب کرتی ہے۔ مُلاحظہ ہو:۔

دامِ امل را ہر عُقدہ وا کُن — تنگ است قیدِ زود ے رہا کُن
در کاروانم سیر است جانم — بانگِ نفس را شورِ درا کُن
کارِ جبینم تکمیل فرما — دستِ و غارا صرفِ دُعا کُن

رُوحِ انساں اس بزمِ ہستی کی نیرنگیوں کی کشمکش میں گرفتار بھی ہے اور اس کی تماشائی بھی۔ اس کے کائناتی نغمے سُننے کے لیے سراپا گوش بھی۔ غزل کے اشعار میں منوّر کہتے ہیں:۔

ہمہ تن چشمِ زشوقیم و سراپا گوشیم — شکلِ تصویر دریں بزمِ جہاں خاموشیم
مژدۂ زیست بدہ باز، ہلاکِ ہوشیم — زخمہ بر سازِ ازل زن کہ سراپا گوشیم
ایں چہ سیر است منوّر کہ دریں باغِ جہاں — بگرفتاریِ خود دامِ بلا بر دوشیم

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منوّر کے عقیدے کے مطابق روحِ انساں نے اجر و عمل کا دام بلا خود اپنے کندھے پر اُٹھایا ہوا ہے اور یہی اعمال اس کی جنموں جنموں کی آمد و شد (تناسخ) کا سبب بنتے ہیں، اور یہ روح زندانِ حیات میں بار بار گرفتار ہوتی ہے۔

ہستیِ یزداں ایک رازِ سربستہ ہے تو شاعر کی رُوح اس رازِ سربستہ کے اظہار کا وسیلہ۔ جوں جوں انسان عمر رسیدہ ہوتا جاتا ہے اس کے قوا مضمحل ہوتے جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ جسمانی معذوریاں اسے گھیر لیتی ہیں، لیکن اس کی رُوح بلوغت، پختگی اور رفعت کے مراحل درجہ بدرجہ طے کرتی ہے اور "ہمہ اوست" اور خدا اور بندے کے وصال اور ہم آہنگی کے احساس کی طرف رجوع کرتی ہے۔ وہ "انا الحق" اور "ربِ ارنی" کے دعوے کے قابل ہو جاتا ہے۔ منوّر کہتے ہیں:-

بہ نگاہِ سنِ معذور مرا باید دید | بخدا بندۂ مجبور مرا باید دید
گُل پژمُردہ نیم، شعلۂ افسردہ نیم | جلوہ دارِ ارم و طُور مرا باید دید
در گلو شعلۂ آوازِ حقیقت دارم | بر رسن صورتِ منصور مرا باید دید

درجِ ذیل غزل میں منوّر لکھنوی نے اپنے عقیدۂ شاعری اور تخلیقی عمل کے نصب العین کو کھُل کر بیان کیا ہے:-

ذکرِ بے مہریِ خدا نکنم | شکوۂ بختِ نارسا نہ کُنم
برضائے تو سر نہادہ شوَم | بابِ ردّ و قبول وا نہ کُنم
در رگ و ریشہ غیر چیزے نیست | چہ کُنم نیز اگر وفا نہ کُنم

لبِ من بہرِ ایں منوّر نیست
نکنم عرضِ مدّعا نہ کُنم

ایسے لوگ جو خدا کے طالب ہونے کے بجائے اپنی دنیوی اغراض کی تکمیل کے لیے خدا کی عبادت کرتے ہیں اور ایسی اغراض کی خاطر ہی اُس ذاتِ کریم سے دعا مانگتے ہیں۔ کاؤنٹ ٹالسٹائی کے الفاظ میں یہی لوگ ہیں جو خدا کے خادم ہونے کے بجائے خدا کو اپنا خادم بنانا چاہتے ہیں۔ ان کی بھگتی اور عبادت خود غرضی سے خالی نہیں ہوتی۔ وہ اپنی مُرادیں حاصل کرنے، خود کچھ ہونے اور بننے کے طلب گار رہتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بھلا نہیں سکتے اور نہ ہی خدا ان کا مقصود ہوتا ہے۔ وہ تو خدا یا ایشور کو اپنی کامیابی کے ایک مؤثر وسیلے کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ وہ عبادت کیا جس میں "حرفِ مدّعا" کو دخل ہو۔ اسی لیے منوّر نے مذکورہ بالا غزل کے مقطع میں بصد عجز و نیاز یہ واضح

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کر دیا ہے کہ "نکنم عرض مدعا نہ کنم۔"

"طواف عجم" میں منور کے کچھ قطعات و رباعیات شامل ہیں جو اُن کی خدا پرستی، بھگتی اور معبودِ ازل کے تئیں ان کی گہری عقیدت کی مظہر ہیں۔ مثلاً ذیل کی رُباعیات :۔

- یادت پئے خار و خس شرارے دارد — یادت بہ نفس بہارے دارد
  من پاک شوم، شاد شوم مست شوم — یادت چو شراب صد خمارے دارد
- یادت بنظر تمام وسعت بخشد — یادت بہ جگر تمام راحت بخشد
  یادت آید مدام مقراض بدست — یادت از دامِ غم فراغت بخشد
- یادت بدہد آتشِ خاموش بمن — یادت بچکد بادۂ سر جوش بمن
  زیں گرمی و مستی بنما بد خود را — یادت بشود جلوہ در آغوش بمن

خیام نیم و لے ز عشقت مستم — عطار نیم و لے فنا در دستم
دانم کہ تعلق من و تو ایں است — از من تو ہستی و من از تو ہستم[۱]

غرض یہ کہ منور لکھنوی نے اپنے اسلاف کے نقوشِ قدم پر گامزن رہتے ہوئے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو فارسی ادب کی تخلیق کے لیے کسی حد تک وقف کیا اور بقول ستیہ نند جاوا "وہ روحانی رابطہ جو امیر خسرو، عرفی، فیضی، نظیری، ظہوری، غنی، صائب کلیم، بیدل، غالب، اقبال اور سینکڑوں دوسرے ہندوستانی شاعروں نے ہند و ایران کے درمیان قایم کیا"[۲] اُسے مزید تقویت دینے کی جہت میں منور نے بھی قدم بڑھایا۔ اگرچہ اہلِ ایران تو اس بات پر بھی اظہارِ تعجب کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ابھی تک سخنورانِ فارسی موجود ہیں۔

۱۔ طوافِ عجم (قلمی مسودہ۔ منور لکھنوی) مختلف صفحات :

۲۔ منور لکھنوی شخصیت اور شاعری (راج نرائن راز) جنوری۔ صفحہ ۱۲۸۔ مقالہ منور کی فارسی شاعری۔ از ستیہ نند جاوا۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

فارسی کتب کے تراجم

رباعیات وقطعاتِ باباطاہر ہمدانی

عالمی ادبِ عالیہ کو اردو زبان میں منتقل کرنے کا مفید اور بامقصد کام مقدار کے اعتبار سے ہو خواہ تعداد کے لحاظ سے موجودہ صدی میں منوّر لکھنوی سے زیادہ شاید ہی کسی ادیب نے کیا ہو۔ جہاں تک منظوم ترجموں کا سوال ہے منوّر اس صف میں سب سے آگے دکھائی دیتے ہیں. فارسی کے متعدد ادبی شاہکاروں کے منظوم ترجمے منوّر لکھنوی نے اردو زبان میں کیے ہیں۔ جن میں سے بیشتر زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ان کے غیر مطبوعہ تراجم کے قلمی مسودوں میں باباطاہر ہمدانی کے قطعات و رُباعیات کا منظوم ترجمہ دستیاب ہوا ہے۔ منوّر لکھنوی کی یہ بیاض ۳۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ترجمہ منوّر نے ۲، جولائی ۱۹۶۷ء کو شروع کیا تھا اور یہ ۳۰، اکتوبر ۱۹۶۷ء کو تکمیل پذیر ہوا۔

ابتدائی صفحات میں منوّر لکھنوی نے باباطاہر ہمدانی کو مخاطب کرکے کچھ توصیفی رباعیات کہی ہیں، جو درج ذیل ہیں :۔

(۱)

اے عارفِ حق نژاد باباطاہر — اے شاعرِ خوش نہاد باباطاہر
اُردو میں جو مَیں نے ترجمانی کی ہے — ہو آپ کا اس پہ صاد باباطاہر

(۲)

ذاتِ اطہر تھی ذاتِ باباطاہر — تھی عینِ فنا حیاتِ باباطاہر
میری جانب سے پیش اُردو میں ہیں — قطعات و رُباعیاتِ باباطاہر

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

(۳)

اے طاہر حق شناس تیرے صدقے — درویش فنا اساس تیرے صدقے
بوسہ ترے دامن کا میسر آجائے — دانائے بقا لباس تیرے صدقے[۲]

(۴)

طاہر کے کلام میں ہے تلسی کا نیاز — طاہر کے کلام میں ہے میرا کا گداز
طاہر کے سخن میں ہے سُور کی مستی — طاہر کے کلام میں ہے سرا پا اعجاز[۳]

مذکورہ رباعیات میں بابا طاہر کے کلام کا اعجاز اور اُس کے فلسفیانہ افکار کی صداقت و عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے منوّر لکھنوی نے اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ آخری رباعی میں منوّر اعتراف کرتے ہیں کہ انھیں طاہر کے کلام ارفع مقام میں بھارت کے باکمال سنت شاعر گوسوامی تلسی داس کا نیاز، بھگتی رس میں سرشار شاعرہ میراں بائی کا گداز، اور بھگوان کرشن کے شیدائی بھگت گیت کار سُور داس کی مستی نظر آئی ہے جس سے متاثر ہو کر انھوں نے بابا طاہر کی رُباعیات وقطعات کو اُردو کا لباس پہنانے کا ارادہ کیا۔ منوّر نے کس جانفشانی، خلوص اور صحتِ زباں کے ساتھ ان کے ترجمے کا حق ادا کیا ہے۔ ذیل کے تراجم کی روشنی میں اس کی پرکھ پہچان ہو سکے گی۔

اردو ترجمہ از منوّر لکھنوی	بابا طاہر کی اصل رُباعی
وہ دردِ اجل ہے نہیں کچھ جس کا علاج	دردیست اجل کہ نیست درماں اورا
ہر شاہ و وزیر پر اُسی کا ہے راج	ہر شاہ و وزیر است زیرِ فرماں اورا
کل تک کرِماں پہ تھی حکومت جس کی	شاہے کہ بحکم دوش کرِماں می خورد
کھاتے ہیں اُسے کرم تہہ مدفن آج[۴]	امروز ہمی خورند کرماں اورا

موت ایک اٹل حقیقت ہے، اس سے کسی کو رستگاری نہیں۔ فارسی کی صوفیانہ شاعری میں اس حقیقت کا بار بار احساس کرایا جاتا ہے —— نیز دُنیا کی ناپائیداری، گردشِ روزگار،

---

[۱] ۲ رباعیات وقطعات بابا طاہر ہمدانی (غیر مطبوعہ قلمی مسودہ۔ منوّر لکھنوی) صفحہ ۵
[۳] مسودہ رباعیات وقطعات بابا طاہر ہمدانی (منوّر لکھنوی) صفحہ 6
[۴] ایضاً ایضاً ″ 7

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تغیرِ زمانہ، حیاتِ بشر کی قلیل مدت میں خوشی کے بمقابلہ غم کی فراوانی، منصب و مال کی بے ثباتی اور ہر شے کا فنا انجام ہونا وغیرہ مضامین بکثرت نظم کیے جاتے رہے ہیں۔ بابا طاہر کے کلام میں مجموعی طور پر صوفیانہ رنگ ساری و طاری ہے۔ نشاط و غم کا لازم و ملزوم ہونا اور تغیرِ زمانہ کا چکر ذیل کی رُباعی کا مرکزی خیال ہے۔ اس کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے۔ اپنے مفہوم کے کس قدر قریب ہے۔

ترجمہ از منوّر لکھنوی	بابا طاہر کی اصل رُباعی
ہے مشغلۂ آہ و خروش آج کی رات	کارِ ہمہ نالہ و خروش است امشب
ہے صبر نہ ہے صورتِ ہوش آج کی رات	نہ صبر بدیدست و نہ ہوش است امشب
کل خوش تھے اسی لیے اُٹھاتے ہیں ہم	دوشم خوش بودے ساعتے پندارے
خمیازۂ انبساطِ دوش آج کی رات [۱]	کفارۂ خوش دلی دوش است امشب

اوپر کی دونوں رُباعیات میں ایک دو دقیق فارسی الفاظ کو عین اصل حالت ہی میں ترجمے میں اپنانا ضرورتِ شعری سے لازمی تھا۔ ایک تو رباعی یوں بھی بہت دشوار اور صبر آزما صنف ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی ہوئی اور شاعر رباعی کی بحر سے خارج ہوا۔ پھر رباعی کا رُباعی ہی میں ترجمہ اور بھی احتیاط طلب اور جوکھوں کا کام ہے، لیکن منوّر نے اس مشکل کام کو بڑی کامیابی اور خوش اسلوبی سے نبھایا ہے۔ پہلی رُباعی میں کرمان ایسا لفظ ہے جو مختلف قسم کے دو مفاہیم کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اور معانی کے اس دوہرے پن ہی نے رُباعی میں لطف پیدا کیا ہے اور چوتھے مصرعے میں اسے نقطۂ عروج تک پہنچایا ہے۔ تیسرے مصرعے میں کرمان مملکتِ ایران کے ایک علاقے کے نام کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ مصرعہ ثانی میں یہ لفظ کرم (کیڑے یا جراثیم) کے اِسم جمع کی صورت میں مختلف مفہوم کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے، اس لیے اس کا جوں کا توں ترجمہ میں لایا جانا ضروری تھا۔ یعنی کل اہلِ کرمان اپنے جس حکمران کے حکم سے نوالہ منہ میں ڈالتے تھے۔ آج اُسی کو قبر میں "کرمان" (کیڑے) کھا رہے ہیں۔

دوسری رُباعی میں انبساطِ دوش اگر چہ قدرے سلاست سے دُور ترکیب ہے جو زیرِ استعمال لائی گئی ہے لیکن رباعی کے صحیح وزن اور عروض کی پابندی کی تلوار جہاں شاعر کے سر پر ہر وقت لٹکی ہو اُسے بحر اور وزن کو سلامت رکھنے کے لیے ضرورتِ شعری سے بعض مرتبہ ایسی تراکیب و الفاظ کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ مفہوم کی صحت و صداقت کا خیال رکھنے کے لیے بھی شاعر ایسا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

---

[۱] رباعیات و قطعات بابا طاہر ہمدانی (منوّر لکھنوی) صفحہ، قلمی مسودہ۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

باباطاہر کی رُباعی

دی اسپ مرا گفت دریں چہ شک است
کاصطبل تو از زاویہ ہائے فلک است
نے آب دراں نہ سبزہ، گاہ وُ نے، جَو
ایں جائے ستر نیست، جائے مَلک است

ترجمہ اُردو میں از منوّر لکھنوی

"بے شک" کل مجھ سے مرا گھوڑا بولا
اک گوشۂ آسماں ہے اصطبل تیرا
پانی ہے نہ دانا ہے نہ سبزہ ہے نہ گھاس
چوپاؤں کا گھر نہیں، فرشتوں کی ہے جا[1]

خوشا آناں کہ اللہ یارشوں بے
بحمد و قل ہو اللہ کارشوں بے
خوشا آناں کہ دائم در نمازن
بہشت جاوداں بازارشوں بے

خوش ہیں وہ لوگ دوست جن کا ہے خدا
کرتے نہیں کچھ جو ذکرِ باری کے سوا
خوش ہیں نمازی جو دائم ہیں محو
بازار ہے فردوسِ دوامی جن کا[2]

نگارِ تازہ خیزِ موکجائی ؟
بچشموں سُرمہ ریزِ موکجائی ؟
نفس بر سینۂ طاہر رسیدہ
دم رفتن عزیزِ موکجائی ؟

اے دلبرِ تازہ خیز، آجا، ہے کہاں؟
آنکھوں میں ہو سُرمہ ریز! آجا، ہے کہاں؟
دم سینۂ طاہر تک اب آ پہنچا ہے
چلتے وقت اے عزیز، آجا ہے کہاں؟[3]

باباطاہر کے کلام میں سے چند جمالیاتی اور رومان انگیز رباعیات کا رنگ بھی ملاحظہ ہو، اگرچہ ان میں بھی روئے سخن محبوبِ مجازی کی بجائے محبوبِ حقیقی کی طرف بھی ہو سکتا ہے۔

کربِ ہجر و ایذائے فرقت کی شدّت ہو یا تخیّلِ جاناں اور قربتِ وصل کے تصوّر کی لذّت شاعر کا جذبۂ شوق دیدنی ہے۔

نسیمے کز بُنِ آں کاکل آید
مرا خوشتر ز بوئے سنبل آید
بشب گیرم خیالش را در آغوش
سحر از بسترم بوئے گُل آید

اُس زلف سے آتی ہے ہوا جو اکثر
بوئے سنبل سے ہے وہ مجھ کو خوشتر
ہے شب کو تصوّر اُس کا زیبِ آغوش
بستر دیتا ہے بوئے گُل وقتِ سحر

۱، ۲، ۳ رباعیات و قطعات بابا طاہر ہمدانی (منوّر لکھنوی، تراجم کا قلمی مسودہ) صفحات ۸- ۲۸- ۳۷ بالترتیب

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

فارسی رُباعی باباطاہر	اردو ترجمہ از منوّر لکھنوی
بے تہ اشکم ز مژگانِ تر آید	پلکوں سے ترے بغیر آنسو ہیں رواں
بے تہ نخلِ امیدم بے بر آید	نخلِ امید بے ثمر ہے اے جاں
بے تہ در کنجِ تنہائی شب و روز	رہتا ہوں ترے بغیر تنہا شب و روز
نشینم تاکہ عمرم بر سر آید	مٹ جائے گا یونہی مری ہستی کا نشاں[1]

باباطاہر ہمدانی کی رباعیات وقطعات میں کلیدی طور پر صوفیانہ خیالات ہی کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ ان کی زبان بھی قدرے غیر مانوس اور زمانۂ حال کی مروّجہ فارسی سے کچھ جُدا گانہ ہے۔ تاہم منوّر نے باباطاہر کی شاعری کے ایک پرستار و مدّاح کی حیثیت سے ان کی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کرنے اور ان کے افکار کو اردو کے قارئین تک پہنچانے کے مقصد سے ان کی رُباعیات کا اردو زبان میں احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ ترجمے منوّر کی پُرگوئی اور شعری استعداد پر دال ہیں۔

الہاماتِ ایرانی

منوّر لکھنوی کا یہ غیر مطبوعہ قلمی مسودہ ۸۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے مشمولات میں مختلف فارسی شعرا کے منتخب اشعار کے ترجمے ہیں جو منوّر نے مختلف اوقات پر کیے۔ مسوّدہ میں تاریخِ آغاز اور تاریخِ تکمیل مذکور نہیں ہے۔ البتہ آخری صفحات میں جو تراجم درج ہیں ان پر مارچ ۱۹۶۱ء کی تاریخ درج ملتی ہے۔ سرورق پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے۔

الہاماتِ ایرانی

فارسی زبان کے کئی سو مقبولِ عام اشعار اُردو شعریت کے قالب میں

(پیش کردہ منوّر لکھنوی)

سرورق کی پیشانی پر یہ شعر درج ہے

معجزہ ایں بچشم حیراں ہیں
دست در دست ہند و ایراں ہیں

---

[1] مسوّدہ رباعیات وقطعاتِ باباطاہر ہمدانی (منوّر لکھنوی) صفحہ ۲۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ان تراجم میں غالبؔ، اقبالؔ، صائبؔ، حافظؔ شیرازی، نظیریؔ وغیرہ مشاہیرِ ادبِ فارسی کے منتخب اشعار کے مفہوم کو اردو کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ بیشتر اشعار کے مقابل ان کے اصل خالق یا ماخذ کا نام درج نہیں کیا گیا۔ حافظ شیرازی کے اشعار کے تراجم منورؔ کے مطبوعہ ترجمہ "وجدانِ حافظ" میں شائع ہو چکے ہیں جس کا تنقیدی جائزہ الگ سے اس باب کے آخر میں پیش کیا جا رہا ہے۔

الہاماتِ ایرانی میں سے کچھ منتخب تراجم بطورِ نمونہ درج ذیل ہیں:-

فارسی اشعار	منظوم اردو تراجم از منورؔ لکھنوی
آسودہ باد خاطرِ غالبؔ کہ خوئے اوست	غالبؔ ہے سیر کام کہ عادت کچھ اُس کی ہے
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را	آمیزشِ گلاب شرابِ طہور میں[۱]
(غالبؔ)	
ما نہ بودیم بایں مرتبہ راضی غالبؔ	مَیں تو راضی نہ تھا اس عزّ و شرف پر غالبؔ
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما	شعر کو خود ہی تھا منظور مرا فن ہو جائے[۲]
(غالبؔ)	
ندیدم خوشتر از شعرِ تو حافظؔ	ترے سینے میں جو قرآن ہے حافظؔ قسم اُس کی
بقرآنے کہ اندر سینہ داری	ترے شعروں سے بڑھ کر شعر دیکھے ہی نہیں مَیں نے[۳]
(حافظؔ)	
حدیثِ حُسن و مشتاقی میانِ پردہ پنہاں بود	تھی نہاں پردے کے اندر داستانِ حُسن و عشق
برہ آمد شوق از خلوت نہاد ایں راز بر صحرا	شوق نے باہر نکل کر راز افشا کر دیا[۴]
(نظیریؔ)	
چہ شور است ایں کہ در آب و گل افتاد	کیا شور اُٹھا ہے بزمِ آب و گل سے
زیک دل عشق را صد مشکل افتاد	ہے عشق کو سامنا بڑی مشکل سے
قرارِ یک نفس بر من حرام است	ہے ایک نفس کا بھی مجھے چین حرام
بمن رحمے کہ کارم با دل افتاد	کر رحم کہ پڑ گیا ہے پالا دل سے[۵]
(اقبالؔ)	

---

[۱] تا [۵] الہاماتِ ایرانی (منورؔ لکھنوی۔ غیر مطبوعہ قلمی مسودہ) بالترتیب صفحات ۱، ۷۷، ۸۱، ۸۰، ۱۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

نہ گویمت کہ ہمہ سال مے پرستی کُن
سہ ماہ مے خور و نہ ماہ پارسا می باش

نوَ مہینے پارسائی، مے کشی ہو تین ماہ
مَیں نہیں کہتا کہ سارے سال تم پیتے رہو[1]

مندرجہ بالا اردو تراجم میں بندش کی چُستی، زبان کی بے ساختگی اور مطالب کی صحیح عکاسی ایک انوکھا لطف اور چٹخارہ دے رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مزاج اور سرمایۂ الفاظ کے اعتبار سے اُردو اور فارسی میں کافی حد تک مماثلت اور قربت ہے۔ لیکن دونوں زبانوں کے مصادر اور افعال میں باہمی بُعد بھی اُسی قدر ہے۔ باہمی ہم آہنگی خواہ کتنی بھی ہو، اگر مترجم کے یہاں مذاقِ شعری، بندش کی چُستی، متغزلانہ لب و لہجہ اور بات کہنے کا سلیقہ نہ ہو تو منظوم ترجمے میں جان پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور اس طرح کا لطف اور کیف آور شیرینی نہیں آ سکتی جیسی کہ منوّر کے تراجم میں ملتی ہے۔ کچھ اور تراجم ملاحظہ کیجیے :۔

تاریخِ واقعاتِ شہاں نانوشتہ اند
افسانۂ کہ گفت نظیری کتاب شُد
(نظیریؔ)

حال جو شاہوں پہ گزرا بے لکھا ہی رہ گیا
بن گیا دفتر جو افسانہ نظیریؔ نے لکھا[2]

گرچہ بپیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر
کہ سحر گہ زِ کنارِ تو جواں برخیزم

ہوں تو بوڑھا رات کو تو مجھ سے ہو جا ہم بغل
جب اُٹھوں وقتِ سحر تو مَیں جواں ہو کر اُٹھوں[3]

چِل سال رنج و غصہ کشیدیم و عاقبت
تدبیرِ ما بدستِ شرابِ دوسالہ بُود

چالیس سال غصہ و غم میں ہوئے خراب
دو سال کی شرابِ کہن کام آ گئی[4]

فقیہِ مدرسہ دی مست بُود و فتوے داد
کہ مے حرام ولے بہ زمالِ اوقاف است

فقیہِ مدرسہ کل مست تھا جو کہتا تھا
ہے مے حرام مگر مالِ وقف سے بہتر[5]

شیخم بہ طنز گفت حرام است مے مخور
گفتم بگو کہ گوش بہ ہر خر نمی کنم

شیخ نے طنز سے کہا مے نہ پیو حرام ہے
مَیں نے کہا کہ مَیں سنوں ایک گدھے کی بات کیا[6]

---

[1] تا [6] الہاماتِ ایرانی (غیر مطبوعہ قلمی نسخہ۔ منوّر لکھنوی) صفحات بالترتیب ۳۴، ۲۱، ۲۸، ۶۹، ۷۸، ۷۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

من ارچہ عاشقم و رندو مست و نامہ سیاہ
ہزار شکر کہ یاران شہر بے گنہ اند
(حافظ)

عاشق ہوں، رند مست، مَیں نامہ سیاہ ہوں
صد شکر اہل شہر گناہوں سے پاک ہیں[1]

گر گنُد میل بخوباں دلِ من، خوردہ مگیر
کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند
(حافظ)

جو مَیں ہوں مائل خوباں تو معترض کیوں ہو
تمہارے شہر میں بھی یہ گناہ ہوتا ہے[2]

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذت شرب دوام ما
(حافظ)

اے مرے شغل دوامی کے مزے سے محروم
مَیں نے دیکھا ہے پیالے میں رخ یار کا عکس[3]

ناخن تمام گشت معطر چو برگ گل
بند قبائے کیست کہ وامی کنیم ما
(حافظ)

معطر برگ گل کی طرح ناخن ہو گئے یکسر
یہ ہیں کس کی قبا کے بند جن کو کھولتا ہوں مَیں[4]

اُوپر کے حوالوں سے یہ حقیقت اُجاگر ہو جاتی ہے کہ منوّر لکھنوی کے منظوم تراجم اصل اشعار کی ایک بے روح نقالی نہیں بلکہ ان تراجم میں اصل اشعار کے سارے امکانات اور مفاہیم جذب ہو کر اُردو کے قاری کے سامنے آئے ہیں۔ ترجمے کا لطف اسی بات میں ہے کہ اصل شعر کی روح مجروح نہ ہو جیسے کہ مذکورہ بالا تراجم میں اصل مفہوم شعر کے لگ بھگ سبھی گوشے اُبھر کر قاری کو سیر کام کرتے ہیں۔

"الہامات ایرانی" کے تراجم کی چند اور دلآویز مثالیں ملاحظہ کیجیے:۔

فارسی اشعار

- حدیث عشق چہ داند کسے کہ در ہمہ عمر
  بہ سر نہ کوفتہ باشد در سرائے را
- تا فصلے از حقیقت اشیا نوشتہ ایم
  آفاق را مرادف عنقا نوشتہ ایم

حدیث عشق کی اُس کو خبر کیا عمر بھر جس نے
کسی کے آستاں پر جا کے اپنا سر نہ پھوڑا ہو[5]

کہیں تھوڑا سا بھی جو راز اشیا لکھ دیا ہم نے
جسے کہتے ہیں دنیا اُس کو عنقا لکھ دیا ہم نے[6]

---

[1] تا [6] غیر مطبوعہ مسودہ الہامات ایرانی (منوّر لکھنوی)، صفحات:۔ ۴۴، ۸۴، ۳، ۲۸، ۳، ۴

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

- ایں آں غزل کہ فیضیؔ شیریں کلام گفت
  در دیدہ ام خلیدہ و در دل نشستہ است

  یہ وہ غزل ہے فیضیؔ شیریں کلام کی
  آنکھوں میں چبھ گئی ہے جو دل میں اُتر گئی[۱]

- شعر گفتن گرچہ دُر سفتن بُوَد
  شعر فہمیدن بہ از گفتن بُوَد

  شعر کہنا گرچہ ہے موتی پرونے کا عمل
  شعر کہنے سے بھی بہتر ہے سمجھنا شعر کا[۲]

- آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
  قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

  کیا ہر خار کو آلودہ ہم نے خون سے اپنے
  بتایا ہے کہ یوں گلزار صحرا کو بناتے ہیں[۳]

"الہاماتِ ایرانی" میں مشمولہ فارسی اشعار اور اُن کے تراجم مترجم کے حُسنِ انتخاب ذوقِ سلیم اور حُسنِ ترجمہ کی غمازی کرتے ہیں۔ تمام ترجمے آزاد اور رواں دواں ہیں۔ ترجمے اور بالخصوص شعری ترجمے کا کام "کارگہہِ شیشہ گری" سے کم نہیں ہوتا۔ زیرِ نظر مجموعہ میں بعض اشعار کے تراجم اصل شعر کے لطف کو فزوں تر کر رہے ہیں۔ مثلاً "قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم" کا آزاد ترجمہ یوں کر کے کہ "بتایا ہے کہ یوں گلزار صحرا کو بناتے ہیں" منورؔ نے ترجمے میں ایک انوکھا کیف و تلذذ پیدا کر دیا ہے۔ منورؔ لکھنوی کی اس ادبی کاوش نے ثابت کر دیا ہے کہ "ہندوستان کی قدیم ترین زبانوں کی جدید ترین ارتقائی شکل" اُردو زبان وسعتِ اظہار اور سرمایۂ الفاظ سے مالامال ہے اور یہ دنیا بھر کی دوسری اہم زبانوں کے افکار، احساسات، ادبی اصطلاحات، علائم و استعارات کا صحیح صحیح عکس خود میں اُتارنے کی وافر صلاحیت رکھتی ہے۔ بشرطیکہ دوسری زبان سے ان افکار و احساسات کو اُردو میں منتقل کرنے والا کوئی منورؔ جیسا سلیقہ مند ذہن ہو۔

سوزِ اقبال

منورؔ لکھنوی کی یہ تخلیقی کاوش ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ کی شعری تصنیف "ارمغانِ حجاز" کے فارسی اشعار کے منظوم اردو تراجم پر مشتمل ایک بصیرت افروز صحیفہ ہے۔ "ارمغانِ حجاز" جس میں ڈاکٹر اقبالؔ کا اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کا کلام شامل ہے۔ دراصل موصوف کا ذہنی سفرنامۂ حجاز

---

۱ تا ۳ الہاماتِ ایرانی (قلمی نسخہ) منورؔ لکھنوی، صفحات ۸۳، ۷۸، ۴۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہے۔ ان کے دل میں ایک حسرت برسوں سے پل رہی تھی کہ وہ حضورِ اکرم رسولِ الٰہی حضرت محمدؐ کے روضۂ مبارک پر سجدۂ عقیدت گزار سکیں مگر عمر کی ڈھلان پر ان کی خرابیٔ صحت اس آرزو کے بر آنے میں مانع رہی۔ چنانچہ انھوں نے روضۂ مبارک کی سمت یہ سفر" ارمغانِ حجاز" کی صورت میں ذہنی طور پر طے کیا۔ وہ اپنی چشمِ تخیّل سے اُس ریگ زار کا نظارہ کرتے ہیں جس میں سے منزل منزل گزر کر انھیں اپنے مرکزِ عقیدت و آرزو تک پہنچنا ہے۔ وہ اس صحرائے مقدّس کی دہکتی ریت پر سجدہ گزاری کو بھی ایک متبرک فرض تصوّر کرتے ہیں تاکہ اس سجدے کا ثمر اِک داغ سوزاں اُن کی جبینِ نیاز پر ثبت ہو جائے۔ انتہائے شوق میں اقبالؔ یہ تصوّر کرتے ہیں کہ جس اونٹنی پر سوار ہو کر وہ جانبِ منزل رواں ہیں، وہ بھی انھیں کی طرح جذبۂ عقیدت سے سرشار اور بیتابیٔ شوق سے وارفتہ ہے۔ اس عالم میں وہ اپنے ساربان سے بھی یہ گزارش کرتے ہیں کہ وہ اُن کے ناقہ کو ایسے طویل راستے پر ڈالے جو زیادہ دنوں میں اپنے مرکزِ ارادت اور جلوہ گاہِ یار تک پہنچائے۔ مدّعا یہ ہے کہ اس صبر آزما سفر کی طوالت سے اُن کا شوقِ دید شدید تر ہوگا۔

اسی سلسلۂ کلام میں اقبالؔ نے" ارمغانِ حجاز" کو عالمِ انسانیت اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے ایک پیغامِ اصلاح و عمل کا پیکر عطا کیا ہے۔ منوّر لکھنوی نے اِس تصنیف کے فارسی قطعات کے ترجمے کو سوزِ اقبالؔ کا نام دیا ہے۔ یہ کتاب ۱۱۲ صفحات کی ضخامت رکھتی ہے اور اسے کتب خانۂ انجمنِ ترقیٔ اُردو دہلی ۶ نے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کا انتساب منوّر لکھنوی نے اِس مصرعہ کے وسیلے سے کیا ہے:۔

ع به آں مردِ یزداں که اقبال بُود

کتاب کے شروع میں ناشر کے مفصّل تعارفی نوٹ کے علاوہ کرنل بشیر حسین زیدی صاحب کا ایک مختصر دیباچہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ابتدائی صفحات میں منوّر کی دو تین منظومات بھی درج ہیں جن میں اقبالؔ کو ہدیۂ عقیدت پیش کیا گیا ہے اور کلامِ اقبالؔ کے محاسن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی منوّر کی فارسی نظم "بیادِ اقبالؔ" بھی ان صفحات میں شامل ہے۔ یہ نظم منوّر لکھنوی نے پاکستانی سفارت خانے میں یومِ اقبالؔ کے موقعے پر پڑھی تھی۔ (منوّر کی فارسی شاعری کے باب میں مذکورہ نظم کا تنقیدی جائزہ الگ سے شامل کیا گیا ہے)۔

انھی صفحات میں مترجم حضرت منوّر نے "شکوۂ خلوص" کے زیرِ عنوان ایک قطعے میں اقبالؔ سے اس بات کا گلہ بھی کیا ہے کہ انھوں نے اپنے بلند پایہ کلام کے پیغام کو صرف مسلمانوں کے لیے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کیوں محدود کیا۔ یہ پیام تمام عالمِ انسانیت کے نام ہونا چاہیے تھا۔ منوّر فرماتے ہیں :۔

خطاب کردہ بہ مُسلم بہ جذبۂ محدود
نکو نہ کرد کہ ایں شیوۂ بلند نبُود

تمام نوعِ بشر را چرا خطاب نہ کرد
کہ از تراوشِ اقبال مستمند نبُود [۱]

اپنی اس پیش کش کے بارے میں منوّر نے ایک مزید قطعہ درج کیا ہے، جو حسبِ ذیل ہے :

بہ لوحِ فلسفہ ارژنگ وار نقاشم
امینِ ربطِ مسلماں بہ ہندوواں باشم

نوائے برہمن کعبہ را باز آرم
ز ترجمانیٔ اقبال "پاک" بشاشم [۲]

(منوّر اس سعادت پر مسرور ہیں کہ وہ چین کے نامی مصوّر ارژنگ کی طرح فلسفے کی تختی پر نقوش بنا رہے ہیں اور وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی ربط و ارتباط کے امانت دار ہیں۔ کعبہ کے برہمن یعنی اقبال کی آواز کی وہ اُردو میں ترجمانی کر کے شاد و مطمئن ہیں)

منوّر لکھنوی اپنی اس کاوش کے متعلق اپنے نثری مضمون میں اعتراف کرتے ہیں کہ وہ اقبال کی شاعرانہ عظمت اور مفکرانہ اہمیت سے متاثر ہیں۔ اگرچہ انھیں اقبال کے بعض نظریات سے دیانت داری کے ساتھ اختلاف ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"ڈاکٹر اقبال نے "ارمغانِ حجاز" میں جو خطاب مسلمانوں سے کیا ہے اس کی نوعیت میرے خیال میں علامتی ہے۔ ان کے ارشادات میں عالمگیریت کے عناصر نہایت لطیف طور پر چھپے ہوئے ہیں۔ کم از کم میں نے اقبال کا مطالعہ محض اِسی نظریے کے تحت کیا ہے لیکن ان کے کلام میں جو خلوص اور سوز ہے جو اضطراب اور جوش ہے اُس سے ہندو مذہب کا ایک مخلص فرد ہوتے ہوئے بھی بے حد متاثر ہوں" [۳]

منوّر کے مطابق غیر منقسم ہندوستان میں بلا امتیازِ مذہب و ملت سبھی اہلِ وطن میں خود شناسی اور خود ارادیت کا مادّہ پیدا کرنے کے لیے جو پیغام راجہ رام موہن رائے، سوامی رام کرشن پرم ہنس، سوامی وویکانند، رام تیرتھ، ٹیگور، تلک، گوکھلے، آربندو، مدن موہن مالویہ اور گاندھی نے ہندوستانی قوم کو دیا۔ وہی پیغام بیداری مسلمانوں کو سرسیّد، حالی اور اقبال نے دیا تاکہ وہ ہندوؤں کے دوش بدوش ایک زندہ قوم کی حیثیت سے ترقی

---

[۱] [۲] سوزِ اقبال (منوّر لکھنوی) مطبوعہ ۱۹۷۰ء صفحہ ۱۹ - ۴ بالترتیب
[۳] سوزِ اقبال (منوّر لکھنوی) طبعِ اوّل ۱۹۷۰ء صفحہ ۲۰ - ۲۱ کچھ مترجم کی طرف سے۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کی دوڑ میں شامل ہوں اور یہ اُن کا ملی فرض تھا۔

اگرچہ اقبال صرف اسلام کو عالمگیریت کا علمبردار سمجھتے ہیں، منوّر کا دعویٰ ہے کہ ہندو مذہب بھی اسلام کے طلوع سے بیشتر کے زمانے سے عالمگیریت اور انسان دوستی کا مبلغ رہا ہے۔ ویدوں اور اپنشدوں کی عالمگیریت کی تعلیم سے کوئی منکر نہیں ہوسکتا۔ البتہ ان گرنتھوں میں عالمگیریت کی تعلیم کو کسی خاص دائرۂ خیال کی زنجیروں میں پابند نہیں کیا گیا۔ ان کا اعتقاد ہے کہ دنیا کے تمام غیر مسلم دینی طبقے بھی اقبال کی اس تلقین و تعلیم سے خود شناسی اور خود ارادی کے جوہروں کی بازیابی اور اکتساب کر سکتے ہیں۔

اقبال کی شاعری درحقیقت ایک آفاقی پیغام ہے۔ منوّر لکھنوی کی اس رائے کی تائید دیگر محققین نے بھی کی ہے۔ اپنے مقالہ "اقبال اور اس کا عہد" میں پرنسپل امیر چند بہار رقمطراز ہیں:-

"اس کی (اقبال کی) شاعری میں وہ لفظی تصنع نہیں جو اُردو شاعری میں جذام کی مانند پھیل چکا تھا۔ اس میں زندگی کی تنقید اور اس کی شرح ہے۔ اس کے ہاتھوں میں شاعری سماجی، اصلاحی اور رُوحانی امتزاج کا ایک ذریعہ بن گئی۔ ٹیگور کے مانند وہ ایک رِشی تھا جس نے زندگی کی نئی قدریں پیش کیں ......

...... بیشتر اُردو شعرا کے برعکس اور براؤننگ کے مانند وہ ایک کٹّر رجائیت پسند ہے۔ اس نے کبھی بھی مایوسی کا دامن نہیں تھاما بلکہ ہمیشہ اُمید، جرأت اور خوشی کا ترانہ گایا جو ہمارے ذہنوں کو بلند کرکے ہمیں اپنی پستی سے نکالتا ہے اور اسی میں اقبال کی آفاقیت پنہاں ہے۔"[۱]

اپنے متعدد سابقہ منظوم و منثور تراجم کی بدولت منوّر لکھنوی ایک مشّاق اور ذہین مترجم کی حیثیت سے اُردو کے ادبی حلقوں میں ایک معتبر مقام اور شہرت حاصل کر چکے تھے۔ علّامہ اقبال کی فارسی شاعری کے ترجمے میں منوّر لکھنوی کی فنی اور علمی صلاحیتیں کس حد تک بروئے کار آئی ہیں۔ ذیل کی کچھ منتخب رباعیات و قطعات کے تراجم کا تنقیدی اور تقابلی جائزہ اس کا تعین کرنے میں معاون ہوسکے گا۔

اقبال کا درج ذیل قطعہ اور اُس کے مقابل میں منوّر لکھنوی کا ترجمہ صنفِ رُباعی میں ملاحظہ ہو:-

خوش آں راہی کہ سامانے نگیرد	ہے خوب وہ راہ رَو جو ہو بے ساماں
دلِ او پندِ یاراں کم پذیرد	کرتا ہے قبول کم صلاحِ یاراں
بہ آہِ سوزناکش سینہ بکشائے	شق اُس کی آہِ گرم سے ہو سینہ
زِ یک آہش غمِ صد سالہ میرد (اقبال)	اِک آہ ہو سو سال کے غم کا درماں (ترجمہ منوّر)[۲]

[۱] جگن ناتھ آزاد- ایک مطالعہ (مرتب: محمد ایوب واقف) طبع ثانی ۱۹۸۸ء صفحہ ۲۹۳ ([۲] حاشیہ اگلے صفحہ پر)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ترجمہ مکھی پر مکھی بٹھانے کا کام نہیں بلکہ کلام کے اصل خالق کی سپرٹ کو عام فہم اور موزوں ترین الفاظ میں قاری تک پہنچانے کا عمل ہے جس سے مزید کسی وضاحت کے بغیر اصل تخلیق کا مفہوم قاری کے ذہن نشین ہو جائے۔ تقابلی مطالعہ اور موازنہ سے یہ واضح ہو جائے گا کہ منوّر لکھنوی کی کوشش کس قدر مخلصانہ اور ترجمہ اصل مفہوم کے کس قدر قریب ہے۔

اب اسی قطعے کا ترجمہ ایک اور شاعر مضطر مجاز کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔ مضطر مجاز فرماتے ہیں :-

خوشا راہی کہ ہے بے ساز و ساماں | اثر جس پر کرے کم پند یاراں
کرے سینہ کشائی آہ جس کی | ہو صد غم سوز اک اُس کی آہ سوزاں[۱]

دونوں ترجموں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر موازنہ کیا جائے تو جہاں مضطر نے اقبال ہی کے الفاظ کو دوہرا کر مصرعوں کو لگ بھگ جوں کا توں رہنے دیا ہے۔ وہاں منوّر نے مفہوم کی رُوح تک پہنچنے اور اسے پوری وضاحت کے ساتھ قاری کے ذہن تک منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ "پذیرد" کا ترجمہ کرتا ہے قبول" کس قدر صحیح اور اصل کے قریب ہے بمقابلہ" اثر اُس پر کرے کم پند یاراں" کے۔ اسی طرح اقبال کی ترکیب" پند یاراں" کو مضطر مجاز نے جوں کا توں رہنے دیا ہے۔ اور اپنی طرف سے اسے ترجمے میں لانے کی کوشش نہیں کی۔ وہاں منوّر نے اس کا ترجمہ" صلاحِ یاراں" کہہ کر اور" سینہ کشائی" کا ترجمہ" سینہ شق ہونا" کر کے قاری کو اصل مفہوم کے سمجھنے میں مزید کسی جد و جہد اور کوشش کے کرب سے آزاد کر دیا ہے۔ مضطر نے" سینہ کُشائی" کہہ کر ہی ترجمہ میں اقبال کے الفاظ کو محض دوہرا دیا ہے اور اس ترکیب کے اصل مفہوم کو معمّہ ہی رہنے دیا ہے۔

قطعۂ اقبال	ترجمہ منوّر
سخن ہا رفت از بُود و نبودم	میرے ہونے یا نہ ہونے کی کہاں اب گفتگو
من از خجلت لب خود کم کشودم	کھولتا ہوں کم ندامت سے دہانِ آرزو
سجودِ زندہ مرداں می شناسی	تجھ پہ تو مردانِ زندہ کے ہیں سجدے آئینہ
عیارِ کارِ من گیر از سجودم	جائزہ لے میرے کاموں کا مرے سجدے سے تُو[۲]

(حاشیہ صفحہ گزشتہ ۲) سوز اقبال (منوّر لکھنوی) باب" حق تعالیٰ کے حضور میں" ایڈیشن ۱۹۷۰ء صفحہ ۲۳

۱۔ ترجمہ ارمغانِ حجاز (مضطر مجاز) ایڈیشن دسمبر ۱۹۷۷ء۔ صفحہ ۳ (ناشر: مکتبۂ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ۔ حیدر آباد)

۲۔ سوزِ اقبال (منوّر لکھنوی) ایڈیشن دسمبر ۱۹۷۵ء۔ صفحہ ۲۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منوّر لکھنوی کے ترجمے میں مفہوم بالکل واضح ہے۔ اب مضطر مجاز کے ترجمے کے ساتھ رکھ کر ہم اس ترجمے کا تقابلی جائزہ لیتے ہیں مضطر مجاز کا ترجمہ حسب ذیل ہے :-

زبانِ خلق بھی کیا چل رہی تھی — مگر مَیں نے زباں کھولی نہ اپنی
مرا اخلاص، میرے دل کی گرمی — کہ میرے زندہ سجدوں سے ہے ظاہر[1]

موازنہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ مضطر مجاز کا ترجمہ بہت اعتبار سے تشنہ ہے۔ "بود و نبود دم" کے بارے میں بزم میں سخن آرائی ہے لیکن مضطر نے اس ٹکڑے کا ترجمہ ہی نہیں کیا۔ "زبانِ خلق چل رہی تھی" لیکن موضوعِ سخن کیا تھا، ترجمہ کرنے میں مترجم مجاز نے اس اہم حصّے کو نظر انداز ہی کر دیا ہے۔ جہاں منوّر نے "خجلت" کا ترجمہ "ندامت" کر کے اصل مفہوم کو کو اردو شعر کا پیکر عطا کیا ہے، وہاں مضطر نے اس لفظ "خجلت" کو ترجمہ کے دائرے میں لیا ہی نہیں۔ مضطر نے "سجودِ زندہ مرداں" کا ترجمہ "زندہ مردوں" یا "زندہ افراد کا سجدہ" کرنے کی بجائے زندہ سجدوں کہہ کر اصل مفہوم شعر ہی کو بدل دیا ہے۔

چند مزید تراجم بھی اسی ضمن میں تقابلی جائزہ اور موازنہ کے لیے ذیل میں دیے جا رہے ہیں :-

قطعۂ اقبال	ترجمہ از منوّر لکھنوی
دلِ بے قیدِ من در پیچ و تابے ست	میرے دلِ غنی میں بڑا پیچ و تاب ہے
نصیب من عتابے یا خطابے ست	میرے لیے عتاب ہے یا پھر خطاب ہے
دلِ ابلیس ہم نتوانم آزرد	شیطان کے بھی دل کو دُکھانا نہیں پسند
گناہ گاہ گاہِ من ثوابے ست	میرا کبھی کبھی کا گُنہ اِک ثواب ہے[2]

اب اسی نفسِ مضمون کو مضطر مجاز اپنے قطعہ میں یوں ادا کرتے ہیں :-

مرے دل کو ملی ہے ناصبوری — مری قسمت میں قُربت ہے کہ دُوری
مجھے شیطاں کا بھی ہے پاسِ خاطر — گناہ گاہ گہ بھی ہے ضروری[3]

تقابلی معائنہ کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ مضطر مجاز یا کسی بھی مترجم کی ادبی کاوش کی اہمیت کو کم کر کے دکھایا جائے بلکہ مدعا اس صداقت کی جانچ پرکھ کرنا ہے کہ کیا فنِ ترجمہ

---

[1] ترجمہ ارمغانِ حجاز، (مضطر مجاز) ایڈیشن دسمبر ۱۹۷۷ء، صفحہ ۳ [2] سوزِ اقبال (منوّر لکھنوی) ۱۹۷۰ء، ایڈیشن، صفحہ ۲۴ [3] ترجمہ ارمغانِ حجاز (مضطر مجاز)۔ ایڈیشن ۱۹۷۷ء، صفحہ ۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

پر منوّر لکھنوی کی گرفت واقعی زیادہ مضبوط و مؤثر ہے اور مفہوم تخلیق تک ان کی رسائی قریب تر اور مقابلتاً واضح تر ہے۔ اس قطعے کا مضطر مجاز کا ترجمہ اگر سلیس اور رواں ہے پھر بھی اس میں قدرے تشنگی اور ادھورے پن کا احساس رہ جاتا ہے۔ "دلِ بے قید" کے مفہوم کو نظم کرنے سے مضطر مجاز دامن کشاں رہے ہیں۔ اگرچہ "عتاب و خطاب" کا ترجمہ انھوں نے "قربت اور دُوری" کر کے مفہوم کے کچھ نزدیک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح اقبال کی اصل رباعی کے "پیچ و تاب" کی بھی وہ اپنے ترجمے میں وضاحت نہیں کر پائے۔

"رسالت کے حضور" میں عنوان کے تحت مشمولہ باب میں سے ایک قطعہ پر نگاہ ڈالیے ذرا:۔

بایں پیری رہِ یثرب گرفتم	اِس بڑھاپے میں چلا یثرب کی سمت
نوا خواں از سرورِ عاشقانہ	مَیں نوا زن مست زورِ عشق سے
چو آں مُرغے کہ در صحرا سرِ شام	شام کو صحرا میں اُس طائر کی طرح
گُشاید پر بفکرِ آشیانہ	پر جو فکرِ آشیاں میں کھول دے[1]
(اقبالؔ)	(منوّرؔ)

اس قطعہ کا ترجمہ مضطر مجاز کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:۔

بایں پیری رواں ہوں سوئے یثرب	نوا گر ہے سرورِ عاشقانہ
بوقتِ شام جیسے کوئی طائر	کرے صحرا میں فکرِ آشیانہ[2]

اگرچہ سلاست اور رُوانی کے اعتبار سے مضطر مجاز کا ترجمہ بہتر اور زیادہ دلنشیں معلوم معلوم ہوتا ہے۔ لیکن "بایں پیری" کا ترجمہ بھی انھوں نے "بایں پیری" کہہ کر کیا ہے۔ اگر اس مصرعے کو وہ یوں کہتے "بڑھاپے میں رواں ہوں سوئے یثرب" تو مصرع کے نہ تو وزن میں فرق پڑتا اور نہ اس میں کوئی عروضی عیب در آتا مگر اس کے ساتھ ترجمہ اور سلیس اور واضح ہو جاتا۔ فارسی سے اُردو زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے تو اصل شعر کی فارسیت کو برقرار رکھنا کہاں تک جائز اور برحق ہے؟۔ دوسرے شعر میں "پر کشاید" کا ترجمہ "پر افشانی"، "یا" پر کھولنا" "یا" اُڑان بھرنا" کرنے کی بجائے انھوں نے اقبال کی اصل عبارت "فکرِ آشیانہ" کرنے ہی سے کام چلانا چاہا ہے۔

---

[1] سوزِ اقبال (منوّر لکھنوی) صفحہ ۳۴   [2] ترجمہ ارمغانِ حجاز (مضطر مجاز) صفحہ ۲۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اسی طرح اقبال کے افکارِ عالیہ کی ترجمانی منوّر لکھنوی نے اس تمام ادب پارے میں بکمال خلوص و دیانت کر کے قارئینِ اردو کو موصوف کے پیغام سے روشناس کیا ہے۔ آل احمد سرور صاحب کے الفاظ ہیں :-

"اکبر اقبال سے ناحق خفا تھے کہ وہ بزرگوں کی شان میں گستاخی کرتے ہیں۔ حالاں کہ اقبال کی مذہبیت اکبر سے زیادہ گہری ہے۔ اکبر کی مذہبیت میں رندی و جنّت دونوں حاصل کرنے کا جذبہ شامل نظر آتا ہے۔ اقبال کو یہ فکر بار بار ستاتی ہے کہ زندگی کے نئے مسائل میں یہ مذہبیت باقی بھی رہے گی یا نہیں۔"[1]

اقبال کے انہی تعمیری اور اصلاحی نظریات کی منوّر نے موزوں ترین الفاظ میں پورے خلوص کے ساتھ ترجمانی کی ہے۔ در اصل "ارمغانِ حجاز" کو "تبرّکاتِ اقبال" کہہ کر آنکھوں سے لگایا جائے تو برحق ہے۔ یہ فکری صحیفہ اقبال کی زندگی کے آخری دَور کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا آئینہ دار ہے جب وہ گرم و سردِ زمانہ چشیدہ ہو چکے تھے۔ مصلح الدین سعدی رقم طراز ہیں :-

"ارمغانِ حجاز" اقبال کی آخری کتاب ہے۔ اس کے موضوعات بھی اس کو اہم بناتے ہیں۔ اقبال کا وہ ذہنی سفر جو مشرق و مغرب کی علمی اور فکری وادیوں سے ہی نہیں گزرتا بلکہ جو آفاق کے مشاہدات کا شاہد بھی ہے...... "ارمغانِ حجاز" اسی معراجِ فکر کی وہ تجلّی ہے جہاں اقبال عشقِ رسالت مآب کی تکمیلِ آرزو سے سرشار ہیں۔"[2]

"ارمغانِ حجاز" میں عشقِ محمدیؐ اور پیغمبرِ اسلام کے تئیں اظہارِ عقیدت کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس "بہت کچھ" میں سب سے اہم ہے مسلمانوں کی زبوں حالی پر فکر و تشویش اور اس ملّت کی اصلاح و بہبودی کا جذبہ۔ قرآن ایک دستورِ حیات ہے، اقبال نے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اعلیٰ و ارفع مقاصدِ حیات کو سمجھنے اور سمجھانے کا مجدّدانہ عمل شروع کیا اور اس ضابطۂ حیات کے ایک ایک شق کو اشعار میں پرو کر مسلمانوں کی اخلاقی، ذہنی اور معاشرتی اصلاح کے لیے اپنے تخلیقی اُدب سے کام لینے کی سعیِ جمیل میں اپنی زندگی وقف کر دی۔ عالم خوندمیری اقبال کے اس فکری اور ذہنی رُویے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اگر اطمینان کی وہ کیفیت ہے جو صرف ایک نفسِ مطمئنہ" کے نصیب میں آتی ہے تو اضطراب کا وہ

---

[1] تنقیدی اشارے (آل احمد سرور) ۔ ایڈیشن ۱۹۴۷ء۔ ناشر کتابی دنیا لمیٹڈ نئی دہلی۔ صفحہ ۷۶

[2] ترجمۂ ارمغانِ حجاز (مضطر مجاز) صفحہ ص (دیباچہ)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

عالم ہے جو صرف ایک بلند نظر کو اپنے ہم جنسوں کی زبوں حالی کو دیکھ کر ہو سکتا ہے۔ ۲؎

اقبالؔ بالخصوص مسلمانوں کی زبوں حالی سے فکرمند اور نالاں ہیں۔ وہ اس صورتِ حال میں اصلاح کے متمنی ہیں اور "ارمغانِ حجاز" کے قطعات میں تلقین کرتے ہیں۔ اس تلقین کو منورؔ لکھنوی نے عام فہم اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ ذیل کے تراجم ملاحظہ فرمائیے:۔

قطعۂ اقبال	ترجمہ از منورؔ لکھنوی
در صد فتنہ را بر خود کشادی	در سینکڑوں بلاؤں کا اپنے پہ وا کیا
دو گامے رفتی و از پا فتادی	دو گام چل کے راستہ لغزش کا لے لیا
برہمن از بتاں طاقِ خود آراست	طاق اپنا برہمن نے سجایا بتوں سے خوب
تو قرآں را سرِ طاقِ نہادی	قرآں اُٹھا کے تو نے سرِ طاق رکھ دیا ۱؎
ادب پیرایۂ نادان و داناست	ہے وہ دانا اور ناداں کا ادب میں رہنما
خوش آں کو از ادب خود را بیاراست	خوب ہے جو خود ادب سے ہو گیا آراستہ
ندارم آں مسلماں زادہ را دوست	دوستی ایسے مسلماں سے روا مجھ کو نہیں
کہ در دانش فزود و در ادب کاست	عقل میں جو بڑھ گیا لیکن ادب میں گھٹ گیا ۳؎
دلِ تو داغِ پنہانے ندارد	ترے دل میں کہاں ہے داغِ پنہاں
تب و تابِ مسلمانے ندارد	نہیں تجھ میں تب و تابِ مسلماں
خیابانِ خودی را دادہ ای آب	کیا باغِ خودی کو اس سے سیراب
ازاں دریا کہ طوفانے ندارد	جو دریا ہے بغیرِ زورِ طوفاں ۴؎
مسلماناں بخویشاں در ستیز اند	آپس میں مسلمان لڑے جاتے ہیں
بجز نقشِ دوئی بر دل نہ ریزند	کندہ دل پہ دوئی کیے جاتے ہیں
بنالند ار کسے خشتے بگیرد	روتے ہیں جو مسجد سے اُٹھا لے کوئی اینٹ
ازاں مسجد کہ خود از وے گریزند	کترا کے اُسی سے خود چلے جاتے ہیں ۵؎

۱؎ ترجمہ ارمغانِ حجاز (منظر مجاز)، صفحہ ز (دیباچہ) (۲؎ تا ۵؎ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اوپر کے قطعات میں اصلاح و بہبود کا جو پیغام اقبالؔ نے دیا ہے اُس میں مسلمانوں کے فکری رویّوں پر طنز بھی ہے اور قدرے تلخ نوائی سے معمور صاف گوئی بھی۔ یہ پیغامِ اصلاح اقبالؔ کے آخری دَور کی شاعری میں بالکل صاف اور بلند آواز پیغام ہے۔ اسی لیے ان کی نظم، غزل اور دیگر اصنافِ شعری میں جو علائم واستعارات استعمال میں لائے گئے ہیں۔ وہ بالکل منفرد اور جداگانہ ہیں اور بڑی حد تک خالص اسلامیت کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔ اسی ضمن میں مردِ مومن اقبالؔ کا اہم ترین اشارہ ہے۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید ڈاکٹر اقبالؔ کی شاعری کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :-

" پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور آنحضرت کے بعد آج تک خلفائے راشدین، صحابہ کرامؓ اولیائے اللہ اور رہبرانِ ملّت نے اپنے اپنے طور پر فرمانِ الٰہی اور تعلیماتِ محمدیؐ کو پیش کیا۔ اقبال کا پیغام بھی وہی ہے لیکن اقبالؔ نے اپنی بات اپنے دَور کے تقاضوں کی روشنی میں کہی۔ وہ اپنی ملّت کی نفسیات سے واقف تھے۔ ان کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ وہ بات جس کو تا حال بارہا کہا جا چکا ہے، اگر اسی طرح کہی جائے تو لوگ کم متوجّہ ہوں گے اور متاثر شاید کوئی نہیں۔ چنانچہ انھوں نے غور و فکر سے کام لیتے ہوئے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے اشارات کو وسیلہ بنایا۔"[۱]

اور اس اشاریت کے کلیدی آلات یا علائم تھے۔ مردِ مومن، کوہکن، پرویز، شاہین، قلندر، جبرئیل، فقیہہ، ابلیس، غزنوی، ایاز، شمشیر و سناں، حجازی، عجمی، کلیمی، شبّیری، تیمور، حکیم زاہد، ـــــ وغیرہ۔ اقبالؔ کے تخلیقی سفر میں تعلیماتِ محمدیؐ کی نشر و تبلیغ کا ایک کلیدی مقصد تھا جو مسلمانوں کی عام بیداری کا وسیلہ بن سکے۔

" ارمغانِ حجاز میں اس پیغامِ بیداری کو اقبالؔ نے ملّت کے مَردوں اور جوانوں تک ہی محدود نہیں رکھا۔ ملّت کی بیٹیوں کو بھی اقبالؔ تلقین کرتے ہیں :-

ـــ حواشی صفحہ گزشتہ

۵۲ سوزِ اقبالؔ (منوّر لکھنوی) صفحہ ۹۷۔ باب : برہمن
۵۳ ایضاً ۸۱ ایضاً
۵۴ ایضاً ۹۱ ایضاً : خودی کی فضیلت
۵۵ ایضاً ۴۲ ″ : پیغمبرؐ کے حضور میں (قطعہ نمبر ۴۸)

۱ اردو شاعری میں اشاریت (ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید) ایڈیشن نومبر ۱۹۸۳ء صفحہ نمبر ۱۵۸-۱۵۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

جہاں را محکمی از امہات است　　نہادِ شاں امینِ ممکنات است
اگر ایں نکتہ را قومے نداند　　نظامِ کار و بارش بے ثبات است

اب حضرتِ منوّر کا اِس قطعے کا ترجمہ دیکھیے :۔

محکم ہے جس سے دہر وہ عورت کی ذات ہے　　بنیاد اس کی ضامنِ صد ممکنات ہے
اِس نکتۂ گراں سے ہے جو قوم بے خبر　　جتنا بھی یہ نظام ہے سب بے ثبات ہے[1]

مِلت کی بیٹیوں کو اقبال مزید ہدایت کرتے ہیں :۔

نگاہِ تست شمشیرِ خدا داد　　بزخمش جانِ ما را حق ہما داد
دلِ کامل عیار آں پاک جاں بُرد　　کہ تیغِ خویش را آب از حیا داد

منوّر نے اسے یوں اُردو کے سانچے میں ڈھالا ہے :۔

خدا کی دی ہوئی شمشیر ہے نظر تیری　　لگا کے زخم مجھے نورِ حق کی دولت دی
عیار جس کا تھا کامل ہوا وہ پاک نہاد　　کہ اپنی تیغ پہ صیقل حیا کی آنکھ سے کی[2]

تراجم کے مذکورہ بالا نمونوں سے اس کتاب کے ناشر کی توقعات کی بھی توثیق ہوتی ہے جنھوں نے اپنے تعارفی نوٹ میں لکھا ہے :۔

"منوّر صاحب نے ڈاکٹر اقبال کے خیالات کی اصل سپرٹ کو بخوبی جزوِ خاطر بنا کر اور انھیں رُوانی اور سلاست کے ساتھ اردو شعر کے قالب میں ڈھال کر اپنی مہارتِ فن کا مزید ثبوت پیش کیا ہے جس کے لیے وہ تمام اُردو دنیا کی طرف سے مبارکباد کے بھی قابل ہیں اور شکریے کے مستحق بھی۔ ہماری تو یہی دعا ہے :۔

ہو اقبال کے ساتھ ہمیشہ　　نام منوّر اور بھی روشن"[3]

منوّر لکھنوی خود اپنے دیباچے میں اقبال اور اُن کے کام کی عظمت کے بارے میں یوں اظہارِ خیال فرماتے ہیں :۔

"اقبال کے متعلق میرا یہ بھی خیال ہے کہ پیغمبرِ اسلام حضرت محمدؐ کے بعد انیسویں اور بیسویں صدی میں صرف انھیں کی وہ اہم ترین ہستی ہے جس نے تمام دنیا کے مسلمانوں میں خود شناسی اور خود ارادیت

---

[1] سوزِ اقبال (منوّر لکھنوی)۔ صفحہ ۷۶۔ باب : مِلّت کی بیٹیوں سے
[2] ایضاً　　۷۷　　ایضاً
[3] ایضاً　　۹　　مضمون : کچھ ناشر کی طرف سے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کا جذبہ اُبھار کر انھیں ایک عالمِ ملی رشتے میں پرونے کا عظیم فرض انجام دیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ اقبال نے پان اسلام ازم کی تحریک کو بڑی تقویت پہنچائی اور یہ ان کا ملی فرض تھا اس لیے اگر میں یہ عرض کروں تو شاید کچھ بے جا نہ ہوگا کہ اقبال کو بھی اپنے نظریات کے اظہار و اشاعت کو بروئے کار لانے کا حق فطری طور سے حاصل تھا اور اس حق کو انھوں نے اپنے ضمیر کے مطابق استعمال کیا۔"[1]

اقبال کا یہ پیغام جو"ارمغانِ حجاز" کے پیکر میں آج ہمارے ہاتھوں میں ہے، خواہ صرف مسلمانوں کے لیے ہے یا بیسویں صدی کے حالات و واقعات کے سیاق و سباق میں تمام بنی نوع انسان کے لیے ایک بات مسلّم ہے کہ دنیا کا اور خصوصاً برصغیر ہند و پاک کا ہر بشر فارسی داں نہیں۔ فارسی زبان کے ان قطعات اور ادب پاروں کو اُردو کے پیکر میں ڈھال کر "سوزِ اقبال" کے رُوپ میں اردو دنیا کو پیش کر کے منور نے عالمِ انسانیت پر اور اس برصغیر کے اُردو داں طبقہ پر ایک احسان کیا اور شاعرِ مشرق اقبال کے دل کی آواز کو عوام تک پہنچانے کا کارِ خیر سر انجام دیا۔

میری یاد داشتیں

میری یاد داشتیں نثری ترجمہ ہے جو افغانستان کے ایک اہم محبِ وطن اور جانباز فوجی سربراہ مارشل ولی خان کی جنگی یاد داشتوں پر مشتمل ایک اہم کتاب ہے جو ہندی میں"میرے سنسمرن" کے نام سے شائع ہوئی اور اُردو میں"میری یاد داشتیں" کے نام سے۔ مارشل شاہ ولی خان کی اصل تصنیف فارسی میں"یاد داشت ہائے من" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ جسے انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز آزاد بھون، نئی دلی کی فرمائش پر منور لکھنوی نے اُردو کے قالب میں منتقل کیا۔ یہ اردو ترجمہ مارچ ۱۹۶۶ء میں لکشمی بک سٹور، جن پتھ، نئی دلی نے برائے انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز نئی دلی سے شائع کیا۔ یہ ترجمہ ۱۸۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے پیش لفظ میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم نے (جو اُن دنوں نائب صدر جمہوریۂ ہند تھے) اس کتاب کی اشاعت پر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے لکھا:-

"مجھے یقین ہے کہ خود ہماری آزادی کی جدوجہد کی یاد کے ساتھ جو کہ ہنوز تازہ ہے، مارشل ولی خان کی سرگزشت دونوں ملکوں کے عوام کے دلوں میں ایک طرح کی یک جہتی اور قربت کے احساس کو پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔ مارشل ولی خان افغانستان کے موجودہ فرمانروا شہنشاہ طاہر شاہ کے حقیقی چچا ہیں۔ آپ کی یہ گراں قدر کتاب اس حقیقت کا انکشاف کرتی ہے

---

[1] سوزِ اقبال (منور لکھنوی)۔ صفحہ ۲۱۔ "کچھ مترجم کی طرف سے"۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کہ کس طرح ان تینوں بھائیوں یعنی سردار محمد خان جو کہ موجودہ بادشاہ کے والدِ محترم تھے، سردار شاہ ولی خان اور شاہ محمود خان نے بچّے سقّے کی بغاوت کو کچلا اور ملک کو اندرونی و بیرونی کش مکش سے نجات دِلائی۔"[۱]

اصل مصنّف نے تصنیف کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ اپنے حالات زندگی کو بالشرح بیان کرنے کے لیے مذکورہ یادداشتیں شائع نہیں کی گئیں بلکہ ان میں محض ان دو معاملوں کو قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جو انھیں اپنی زندگی میں پیش آئے۔ مارشل ولی خان فرماتے ہیں :-

"ان دو بڑے مسئلوں میں ایک مسئلہ آزادیِ وطن کا تھا اور دوسرا اس کی نجات حاصل کرنے کا۔ وطن کی نجات کے سلسلے میں جو کہ معرکہ جنگ میں پیش آیا۔ اس کا تعلق اندرونی شورش سے ہے اور میرے عقیدے کے مطابق ہمارے ملک کی آزادی کو اس سے بہت بڑا سہارا مِلا ہے۔ اور بڑی مدد حاصل ہوئی ہے۔ اِس لیے مجھے اور میرے ساتھ تمام خیر خواہانِ وطن کو یقین ہے کہ اگر یہ شورش ہمیشہ جاری رہتی تو ملک کی وحدت کا شیرازہ بکھر جاتا۔"[۲]

مارشل ولی خان نے اِس تصنیف کے کچھ ابتدائی صفحات ہی میں مذکورہ بالا جنگِ نجات و آزادی کے پس منظر اور اہم واقعات کا خلاصہ درج کیا ہے جس کا ترجمہ منوّر لکھنوی کے الفاظ میں درج ذیل ہے۔

"یہ خاندان جلاوطنی کے ایام دہرہ دون میں گزار رہا تھا" جب اعلیٰحضرت ضیاالملت والدین کا پیغام افغانستان کے سفیر سردار محمد اسمٰعیل خان کے ذریعے دہرہ دون پہنچا اور ہمارے گھر بار کو وطن واپس جانے کی اجازت مل گئی تو بے انتہا خوشی ہوئی تھی۔ دربار کی طرف سے ایک دستہ کی سرداری ولی خان کے سپرد ہوئی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اس کام کے سوا ہم کسی اور مقصد کے لیے پیدا ہی نہیں ہوئے۔"[۳]

اِس تاریخی معرکے کے متعلق مزید فرماتے ہیں :-

---

۱ میری یادداشتیں (ترجمہ منوّر لکھنوی) ایڈیشن ۱۹۶۶ء صفحات ۵-۶

۲ ایضاً ایضاً صفحہ ۱۸-۱۹ مضمون: مصنّف کا مقصد

۳ ایضاً ایضاً طبع اوّل ۱۹۶۶ - صفحہ ۲۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

"جانداد خاں احمد زائی نے اطرافِ جنوبی میں جو فتنہ برپا کیا تھا وہ اس سلسلۂ واقعات کی ایک کڑی تھی۔ یہ پہلا معرکہ تھا جس میں میرے بھائی محمد نادر خاں کو کامیابی حاصل ہوئی اگرچہ یہ فتنہ بہت زور پکڑ چکا تھا، جانداد خاں پسپا ہوا اور گرفتار ہو گیا اور اپنے کیے کی سزا پائی۔ سبھی باغیوں نے اطاعت قبول کرلی۔ عام معافی کا حکم بھی ہوا۔ کیوں کہ میرے بھائی کا خیال تھا کہ "بغاوت کے گناہ میں عوام الناس بذاتِ خود حصّہ نہیں لیتے بلکہ وہ تو چند مفسدوں کی اغراض کے کھلونے بن جاتے ہیں۔"[۱]

اس کے بعد کے واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بادشاہ سراج الملت شہید کر دیے گئے۔ ادھر پہلی جنگِ عظیم ختم ہوئی تو اس جنگ میں جرمنی کی طرف سے رسائی کی کوششوں کے باوجود افغانستان نے اپنی غیر جانب داری برقرار رکھی۔ لیکن برطانوی حکومت آخری وقت تک افغانستان کی نیم آزاد حکومت کو حریفانہ نظر سے دیکھتی رہی۔ جنگِ عظیم میں فتح یابی کے غرور میں برطانیہ نے افغانستان کو آزاد نہ کرنے کا ارادہ اور بھی مضبوط کر لیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۲۹۸ شمسی کے موسمِ بہار میں اعلیحضرت امان اللہ خان نے حکومتِ برطانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا —— انگلستان کے سفیر کو کابل سے نکال دیا گیا۔ ہر طرف عام جلسے ہونے لگے۔ امان اللہ خان نے میرے بھائی سردار محمد نادر خان اور مجھے جنوبی علاقے میں سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ جہاں کی کامیابی کی داستان اس کتاب میں قلم بند کی گئی ہے۔

کتاب کے اصل متن کو فارسی سے اُردو زبان میں منتقل کرنے کا فریضہ منوّر لکھنوی نے اس سلیقے اور احتیاط سے ادا کیا ہے کہ یہ تمام داستان اردو کے قالب میں بالکل اوریجنل اور قدرتی معلوم ہوتی ہے۔ منوّر لکھنوی کو چوں کہ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں پر یکساں دسترس حاصل تھی اور انھیں فارسی کے قادر الکلام شاعر ہونے کا شرف بھی حاصل تھا، اس لیے "میری یادداشتیں" کے اس ترجمے پر اصل تصنیف کا گمان ہوتا ہے۔ نمونے کے طور پر کتاب کے پہلے باب "جنوب کی طرف روانگی" میں سے ایک پیراگراف کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

"ہماری ماں نے جب اپنے تین بیٹوں کو محاذ پر جاتے ہوئے دیکھا تو ان پر رقّت طاری ہو گئی۔ اپنے تاثراتِ قلبی کو چھپانا چاہتی تھیں۔ انھوں نے آنسو ضبط کر کے اور آبدیدہ ہو کر ہمارے سروں اور چہروں کا بوسہ لیا۔ بڑی مشکل سے وہ یہ چند جملے اپنی زبان سے ادا کر پائیں۔

---

[۱] میری یادداشتیں (ترجمہ منوّر لکھنوی)۔ طبع اوّل ۱۹۶۶ء۔ صفحہ ۲۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

"میں تمھیں خدا کو سونپتی ہوں اور مجھے امید ہے کہ تم کامیابی کے ساتھ واپس آؤ گے۔ میں تمھیں ناکامیابی کی حالت میں زندہ نہ دیکھوں۔"

اُن کی وہ پرسوز نگاہیں اور ادھورے الفاظ اور رقت آمیز کلمات مجھے اب تک یاد ہیں۔[۱]

مندرجہ بالا عبارت کو پڑھ کر قطعاً یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ کسی دوسری زبان سے ترجمہ کیا ہوا بیانیہ ہے۔ ترجمے کے پیکر میں ڈھلی ہوئی عبارت کا برجستہ اور بے تکلف انداز دیکھ کر اس ترجمے کو اعلیٰ درجہ اور افضل نوعیت کا ترجمہ قرار دیا جائے گا۔ ترجمے کے محاسن کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر ظ انصاری اپنے مضمون "ترجمے کے بنیادی مسائل" میں لکھتے ہیں:۔

"ترجمے کی ذمے داری کے سلسلے میں سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ ترجمہ کرنے والا اپنے وجود، خیال، جذبے اور اپنے قلم کو اصل مصنف کے سپرد کر دے، اور یہ سوچ لے کہ اگر فلاں بات، فلاں جملہ، تصنیف یا عبارت یا محاورہ مصنف کو خود ہماری اسی زبان میں لکھنا ہوتا تو وہ کس طرح لکھتا۔ اپنی بساط بھر جو بھی تصور قائم ہو کہ وہ یوں لکھتا، بس ویسے ہی لکھ دینا چاہیئے۔"[۲]

اور یہی ترجمے کا وہ حسن اور نفاست ہے جو منوّر کے زیرِ نظر ترجمے کا طرّۂ امتیاز ہے۔ اس کتاب کے مختلف ابواب میں سے ترجمے کی چند اور مثالیں بھی درج ذیل ہیں۔ ان میں اُردو زبان کی اپنی آن بان بھی ہے اور محاورہ کی چاشنی بھی اور وہ سلاست اور رُوانی بھی جو ترجمے اور اصل متن کے اصل مضمون کو اس حد تک قریب کر دیتی ہے کہ دونوں کے مابین امتیاز کرنا ہی مشکل ہو جائے۔

اسی باب سے ایک اور عبارت دیکھیے:۔

"جب سپہ سالار جماعت سے رخصت ہونے لگے تو انھوں نے بلند آواز سے اذان دینی شروع کی۔ ہمیشہ جنگ کے لیے روانگی کے موقعے پر یہ رسم ادا ہوتی آئی ہے اور اب تک اسے ہر مسافر کے رخصت ہونے پر برکت کے خیال سے ادا کیا جاتا ہے۔ بعض مقامات پر دُور دُور تک تکبیر کی آوازیں ہمارے کانوں میں دیر تک گونجتی رہیں۔ کبھی کبھی لوگ حیرت سے پوچھتے کہ اتنی تھوڑی سی فوج کے ساتھ انگریزوں کی حکومت کے مقابلہ میں کیوں جا رہے ہو؟"[۳]

۱۔ میری یاد داشتیں (ترجمہ منوّر) صفحہ ۲۷

۲۔ ترجمے کا فن اور روایت (ڈاکٹر قمر رئیس) ایڈیشن جون ۱۹۷۶، صفحہ ۱۱۷ ناشر: تاج پبلشنگ ہاؤس۔ جامع مسجد دہلی ۶

۳۔ میری یاد داشتیں (فارسی سے ترجمہ۔ منوّر لکھنوی) صفحہ ۲۸

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ایک اور باب ـــ" بات چیت کا آغاز" میں سے چند سطور ملاحظہ ہوں :-

" انگریزی حکومت ان تمام حالات کا مطالعہ کر رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر یہ جنگ یونہی جاری رہی تو اس کا خاتمہ خود ان کی شکست سے ہو کر رہے گا۔ اس لیے اس وقت اس نے ہماری حکومت سے بات چیت کرنے کی صورت نکالی۔ ہندوستان کے وائسرائے نے ہمارے سفیر عبدالرحمٰن خاں کے ذریعے اعلیحضرت امان اللہ خان کو پیغام بھیج کر یہ خواہش ظاہر کی کہ جنگ بندی کر دی جائے اور دوستانہ گفتگو کا سلسلہ جاری ہو۔

وائسرائے ہند کی طرف سے صلح جوئی کے لیے تاکید و اصرار سے اعلیٰ حضرت امان اللہ خان کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ تمام ہندوستان میں خیالاتِ آزادی کی اشاعت سے برطانوی حکومت کو طرح طرح کے اندیشے لاحق ہو گئے ہیں اور ہمارے قومی لشکروں کی پیش قدمی کرنے سے، اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ اس سے ہندوستان اور ہندوستان کے عام باشندوں میں ایک عام انقلاب رونما ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے حکومت برطانیہ افغانستان کی آزادی تسلیم کرنے کے لیے راضی ہو رہی تھی۔"[1]

شہباز حسین صاحب اپنے مضمون "ترجمہ کی اہمیت" میں رقم طراز ہیں :-

"ترجمہ محض ایک زبان کے خیالات کو دوسری زبان میں پلٹ دینے کا نام نہیں ہے بلکہ خیالات اور احساسات کو اس ترتیب کے ساتھ منتقل کرنے کا نام ہے کہ مصنف نے کس جگہ پر زور دیا ہے۔ کہاں پر طنز ہے، کہاں پر محاورہ یا روزمرہ ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ صحیح ہے کہ ترجمے میں اصل کی ساری خوبیاں نہیں پیدا کی جا سکتیں۔ لیکن بہت سی خوبیاں ضرور سموئی جا سکتی ہیں۔"[2]

اس لحاظ سے بھی اگر مذکورہ بالا عبارات کو جانچا جائے تو منوّر کے تراجم اس کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں۔ آخری باب میں سے چند سطور کی روشنی میں اس دعوے کو پرکھا جا سکتا ہے ـــ آخری باب کی ایک عبارت ملاحظہ ہو :-

"لوگ بیعت کے خیال سے جمع ہونے لگے تھے، ترکی کے سفیر کبیر حکمت بیور نے بھی سپہ سالار ظاہر شاہ کو سمجھایا، "چونکہ افغانستان میں اب کوئی ایسا شخص باقی نہیں رہ

---

[1] میری یادداشتیں (فارسی سے ترجمہ منوّر لکھنوی۔ صفحہ ۵۲

[2] ترجمہ کا فن اور روایت (مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس) جون ۱۹۷۶ء۔ ایڈیشن صفحہ ۱۹۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

گیا جو افغانستان کے سیاسی وجود کو بحال کر سکے، ابھی تک خطرات لاحق ہیں۔ حبیب اللہ (بچۂ سقہ) اپنی فوجوں کے ساتھ ابھی تک کوہستان میں موجود ہے۔ اور آپ کی سلطنت میں اجتماعی نظام درہم برہم ہو چکا ہے۔ صرف آپ ہی کی وہ ذات ہے جس نے پایۂ تخت کو شورش کنندوں سے خالی کرالیا ہے۔ اگر ایسی حالت میں آپ صمیمِ قلب سے کی ہوئی ملت کی اس درخواست کو قبول نہیں کریں گے تو اس کی خبر جگہ جگہ پھیل جائے گی جس سے حبیب اللہ اور بھی گستاخ ہو جائے گا اور پھر پلٹ کر آجائے گا........ آپ تو خود ہی صورتِ حالات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ کئی ہزار اشخاص کلہاڑیاں اور رسیاں لیے ہوئے سلام خانے کے باہر موجود ہیں۔ جونہی ان کو معلوم ہوگا کہ آپ نے سلطنت قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے تو شہر میں انتشار برپا ہو جائے گا...... سفارت خانے لٹ جائیں گے اور ہزاروں انسانوں کا خون ہو جائے گا......"

ابھی حکمت بیور کی تقریر ختم نہ ہو پائی تھی کہ لوگوں نے آکر سپہ سالار کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور سب آکر ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے۔ تب سپہ سالار کا کچھ بس نہ چلا۔"[1]

اوپر کی سطور میں محاورہ بندی، زبان کی پاکیزگی وصحت اور نثر کا رواں دواں انداز۔ تقریر کے جس حصّے کو زیادہ نمایاں مقام دینا ہے اور جس گفت گو یا مکالمے کو زیادہ اہمیت دینی ہے، اُسے نمایاں تر کرنے کا سلیقہ، اور موزوں الفاظ کا چست جامہ پہنانے کی پرکاری، منوّر لکھنوی کی ترجمے کی مشق ومہارت کا ناقدانِ فن سے اعتراف کروانے کے لیے کارگر ثبوت ہیں۔ اُوپر کی عبارت میں خط کشیدہ حصّوں اور محاورات کی برمحل نشست، چستی اور معنوی معقولیت تحسین طلب ہے۔

اُردو جیسی ارتقا پذیر اور زندہ زبان کے فروغ وتموّل کے لیے ایسے مشّاق مترجموں کی واقعی ضرورت تھی جو ترجمے کی باریکیوں، نفاستوں اور تہہ داریوں سے گہری آشنائی و آگاہی رکھتے ہوں۔ ڈاکٹر قمر رئیس کے الفاظ ہیں :۔

" مترجموں کو دو زبانوں اور دو قوموں کے درمیان لسانی اور ثقافتی سفیر

---

[1] میری یادداشتیں (مترجم منوّر لکھنوی) صفحہ ۱۷۶

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کا نام دیا گیا ہے۔[1]
منوّر لکھنوی بلاشبہ ہر لحاظ سے ایک کامیاب اور پختہ کار لسانی اور ثقافتی سفیر تھے۔

وجدانِ حافظ

اُردو اور فارسی دونوں متموّل زبانوں پر منوّر لکھنوی کی یکساں اور کامل گرفت کا ثبوت ان کا ایک اور علمی و ادبی کارنامہ "وجدانِ حافظ" ہے جو خواجہ حافظ شیرازی کے سینکڑوں منتخب اور پسندیدہ اشعار کے سلیس اور رُواں ترجموں پر مشتمل ہے۔ اسے ۱۹۵۶ء میں کتب خانہ انجمنِ ترقیٔ اُردو، اُردو بازار، دہلی نے شائع کیا تھا۔ اگرچہ منوّر نے یہ ترجمے ۱۹۵۱ء میں شروع کیے تھے اور وقفے وقفے سے انھیں ۱۹۵۳ء میں مکمّل کیا لیکن ان کی اشاعت تین برس بعد کتب خانہ انجمنِ ترقیٔ اُردو ہند نے قبول کی اور ۱۲۸ صفحات پر مشتمل یہ گرانقدر اور بصیرت افروز فن پارہ ۱۹۵۶ء میں چھپ کر قارئین کے ہاتھوں تک پہنچا۔

"وجدانِ حافظ"، کیا ہے۔ اِس عنوان کے تحت اپنے مختصر مضمون میں جو کتاب کے ابتدائی صفحات میں شامل ہے، منوّر لکھنوی فرماتے ہیں :۔

> "خدا رسیدہ بزرگ شیاما چرن داس نے جو انگریزی زبان کے فاضل ہیں اور فلسفہ و الٰہیات پر عبور رکھتے ہیں، خواجہ حافظ کے دیوان سے کثیر التعداد اشعار کا ایک انتخاب ترجمے کے ساتھ "عرفانِ حافظ" کے نام سے شائع کیا ہے۔ جس کا دیباچہ مرحوم ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے سپردِ قلم کیا تھا۔ یہ ترجمہ نثر میں ہے۔ مَیں نے انھیں کے انتخاب کیے ہوئے اشعار کو اردو نظم کے سانچے میں ڈھال دیا۔ اب اس مجموعے کو "وجدانِ حافظ"، کے نام سے آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔"[2]

بادی النظر میں یہ کتاب "کنارِ آبِ رُکناباد"، اور "گلگشتِ مصلّٰی" کی سَیر کا رُوحانی وسیلہ ہے۔ جنابِ باقی مالک و مدیر روزنامہ "پیامِ وطن"، دہلی "وجدانِ حافظ"، میں "تاثراتِ باقی"

---

[1] ترجمہ کا فن اور روایت (مرتّب ڈاکٹر قمر رئیس) مقدمہ صفحہ ۱۱

[2] "وجدانِ حافظ"، (منوّر لکھنوی) طبع اوّل ۱۹۵۶ء۔ صفحہ ۹-۱۰

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کے زیرِ عنوان فرماتے ہیں :-

" ایک مترجم کے لیے اس سے دشوار کام ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ حافظ کی فارسی شاعری کو خسرو اور میر کی گنگ وجمن میں ڈھلی ہوئی اردو کا لباس پہنائے ...... ادب انگریزی کے مشہور نثار ای۔ این۔ بیکن نے جب حافظ کے کلام کا انگریزی نثر میں ترجمہ کیا تو اپنے عجز کا اعتراف کیا کہ حافظ کے کلام کی فطری سادگی اور صناعانہ پُرکاری ادبِ انگریزی میں نہیں سما سکتی لیکن منوّر صاحب نے ثابت کر دیا کہ کہ ہندوستان میں جو زبان پلی اور پروان چڑھی۔ وہ اپنی ایرانی بہن کے مقابلے میں مسکین ہو تو ہو' عاجز و ناتواں نہیں ہے۔ اور یہ "غرورِ بجا" منوّر نے اُردو کو عطا فرمایا ہے۔"[۱]

پروفیسر تلوک چند محروم نے بھی اپنے دیباچے میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اور مترجم کے شرمیدبھگوت گیتا اور "کمار سمبھو" کے تراجم کے حوالے سے منوّر لکھنوی کے کمالِ فن کی داد دی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ کلاسیکل نظم یا نثر کے ترجمے کے لیے دونوں زبانوں پر قدرت اور اُن کی مزاج شناسی کے علاوہ ذوقِ سلیم کی بے حد ضرورت ہے۔ نثر کی نسبت نظم کا ترجمہ زیادہ احتیاط کا متقاضی ہوتا ہے۔ مترجم جب تک ان اشعار کی رُوح کو جن کا ترجمہ اسے مطلوب ہے' جذب نہ کر لے' کامیاب ترجمہ ناممکن ہے۔ محروم نے منوّر لکھنوی کے ساتھ مذکورہ دیباچے میں ان کے والدِ نامور کی صلاحیتوں کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

خواجہ حافظ شیرازی کو فارسی ادب میں ایک قابلِ رشک' ارفع اور اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ میر تقی میر کی طرح حافظ کے کلام کی آفاقیت اور عالمگیریت مسلّم ہے۔ دنیا بھر کے کلاسیکی ادب میں دیوانِ حافظ شیرازی ایک منفرد عظمت اور شہرت کا حامل ہے۔ منوّر نے حافظ کے پسندیدہ اشعار کو اُردو کا لبادہ پہنا کر اس کی معنوی خوبیوں کو اُردو دان قارئین پر اس طرح اُجاگر کیا ہے کہ قاری اصل شعر کے کیف و وجدان کی لذّت حسّی کر سکے۔ سینکڑوں اشعار کے ترجمے پڑھنے والے کے دل و ذہن کو اپنی جذب و کشش کے گھیرے میں لے لیتے ہیں۔" وجدانِ حافظ" میں پہلے ہی شعر کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے جو" ضرورتِ عشقِ حقیقی" کے زیرِ عنوان رقم کیا گیا ہے۔

---

[۱] وجدانِ حافظ (منوّر لکھنوی) طبع اوّل ۱۹۵۶ء۔ صفحہ ۴-۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اشعارِ حافظ	ترجمہ منوّر لکھنوی
بیا دل درخمِ گیسوئے او بند اگر خواہی خلاص ورستگاری	رہائی کی جو تجھ کو آرزو ہے اسیرِ گیسوئے پُرپیچ ہو جائے

یعنی روحِ بشر اگر دنیاوی آفات و آلام یا تناسخ کے چکّر سے آزاد ہو جانا چاہتی ہے تو اُسے خواجہ یہ تلقین فرماتے ہیں کہ محبوبِ حقیقی کے گیسوؤں کا اسیر ہو جائے عشقِ الٰہی کے طوق وسلاسل میں خود کو گرفتار کر لے۔ ابدی رہائی اور آزادی کی یہی ایک سبیل ہے۔ ترجمے میں سلاست کے ساتھ ہی شعر کے حُسنِ صنعت کو بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ صنعتِ تضاد و تقابل اسیری اور رہائی کے الفاظ لاکر اُسی طور محفوظ و سلامت رکھی گئی ہے، جیسے بند، خلاص، رستگاری کے متضاد الفاظ کی یکجائی سے اصل فارسی مصرع میں موجود تھی۔

اسی عنوان "ضرورتِ عشقِ حقیقی" کے تحت ہی چند مزید اشعار کے دلکش اور جاذبِ ذہن ورُوح ترجمے دیکھیے:۔

فردا کہ پیش گاہِ حقیقت شُود پدید شرمندہ رُہروے کہ نظر بر مجاز کرد (حافظ)	حقیقتِ باطنی کا جلوہ کہیں بھی جب آشکار ہوگا مجاز پر ہے نگاہ جس کی وہ راہرو شرمسار ہوگا[۲] (ترجمہ از منوّر)
بہائے وصلِ تو گر جاں بُوَد، خریدارم کہ جنسِ خوب مبصّر بہ ہرچہ دید، خرید (حافظ)	مَیں اپنی جان دے کر بھی تری قربت کا طالب ہوں نظر والے تو لے لیتے ہیں ہر قیمت پہ چیز اچھی[۳] (منوّر)
نظیرِ دوست ندیدم اگرچہ از مہ و مہر نہادم آئینہ ہا در مقابلِ رُخِ دوست (حافظ)	چاند سُورج کے آئینوں میں بھی دوست کا ساحسیں نہیں دیکھا[۴] (منوّر)
از آں زماں کہ فتنۂ چشمت بمارسید ایمن زسرِ فتنۂ آخر زماں شدم (حافظ)	تیری آنکھوں نے بپا کی ہے قیامت جب سے کچھ قیامت کے بھی فتنے کا نہیں ڈر مجھ کو[۵] (منوّر)

[۱ تا ۵] "وجدانِ حافظ" (ترجمہ منوّر لکھنوی) ایڈیشن ۱۹۵۶ء۔ صفحات بالترتیب ۱۲، ۱۳، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

مذکورہ بالا اشعار میں کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ ترجمے میں اصل متن سے گریز یا معنوی طور پر انحراف کیا گیا۔ شعر کی اصل رُوح اور مفہوم جوں کا توں برقرار ہے۔ کہیں یہ گمان نہیں ہوتا کہ حافظ کے شعر کے کسی لفظ یا حصّے کا ترجمہ نہیں کیا گیا بلکہ کہیں کہیں حسنِ ترجمہ سے شعر کا لطف اردو قاری کے لیے۔ جو فارسی سے ناآشنا ہو، فزوں تر ہو گیا ہے اور جو قاری فارسی جانتا ہے اُسے اردو ترجمے میں قندِ مکرر سی لذّت و شیرینی حاصل ہوتی ہے۔

اسی طرح " بندگی " کے زیرِ عنوان کچھ اشعار دیکھیے۔ حافظ کے کلام کی پاکیزگی وطہارت کو کس نفاست کے ساتھ اُردو کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے :

تو بندگی چو گدایاں بشرطِ مُزد مکُن	بھکاری کی طرح شرطِ جزا پر بندگی کیسی
کہ دوست خود روشِ بندہ پروری داند	طریقہ جانتا ہے دوست خود بندہ نوازی کا
(حافظ)	(منوّر[۱])
جمالِ یار ندارد نقاب و پردہ ولے	جمالِ یار کو پردے سے مطلب ہی نہیں کوئی
غبارِ رہ بنشاں تا نظر توانی کرد	غبارِ راہ ہٹ جائے تو کچھ صورت نظر آئے
(حافظ)	ترجمہ[۲]
گدائی درِ جاناں بہ سلطنت مفروش	سلطنت کیا درِ جاناں کی گدائی کے عوض
کسے ز سایہ ایں در بہ آفتاب رَود؟	چھوڑ کر چھاؤں کہیں دھوپ میں جاتا ہے کوئی؟
حافظ)	ترجمہ[۳]

منوّر لکھنوی نے " وجدانِ حافظ " کے شعری تراجم میں کہیں بھی مرکزی خیال اور مجموعی نفسِ مضمون کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ یہ تسلیم کہ جس زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس کا دامن اور سرمایۂ الفاظ بھی کسی اعتبار سے تنگ و کوتاہ نہیں لیکن سرمایۂ الفاظ کو چابک دستی سے برتنا اور اسے اُدائیگی مفہوم کے لیے سلیقے اور ذہانت سے استعمال کرنا، اعلیٰ درجے کے شعور تمیز اور حُسنِ انتخاب کا متقاضی ہوتا ہے جو منوّر جیسے ماہرِ فن ہی کا حصّہ ہے۔

حافظ کے چند اور دلچسپ اور حسین اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو :-

زیرِ شمشیرِ غمش رقص کناں باید رفت	چلو رقصاں غمِ محبوب کی تلوار کے نیچے
کانکہ شُد کشتۂ او نیک سرانجام افتاد (حافظ)	جو کٹ جاتا ہے سر اس سے تو نیک انجام ہوتا ہے[۴]
	(ترجمہ منوّر لکھنوی)

[۱ تا ۴] وجدانِ حافظ (منوّر لکھنوی)۔ صفحات بالترتیب ۱۴، ۲۶، ۲۷، ۳۰، ۳۱۰

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ملول از ہمرہاں بودن طریقِ کاروانے نیست
بکش دشواریِ منزل بیادِ عہدِ آسانی
(حافظ)

سفر میں ساتھیوں سے رُوٹھنا یہ کیا طریقہ ہے
اُٹھا منزل کی دُشواری کہ آسانی کا دُور آئے[1]
(ترجمہ منوّر لکھنوی)

گرچہ از آتشِ دل چوں خُمِ مے در جوشم
مہر بر لب زدہ خوں می خورم و خاموشم
حافظ)

لگی ہے آگ سی اِک دل میں اس صورت میں جیتا ہوں
خُمِ مے کی طرح اپنا لہو چپ چاپ پیتا ہوں[2]
(ترجمہ)

زیرِ عنوان تسلیم و رضا

رضا بدادہ بدہ وز جبیں گرہ بکشا
کہ بر من و تو درِ اختیار نکشادہ است
(حافظ)

جو بلا ہو لے خوشی سے، یہ جبیں کے بَل مٹاوے
نہ کچھ اختیار میرا، نہ کچھ اختیار تیرا[3]
(ترجمہ)

مکُن حافظ از دورِ گردوں شکایت
چہ دانی تو اے بندہ کارِ خدائی
(حافظ)

گِلہ یہ کیا ستمِ چرخِ پیر کا حافظ
خدا کی مصلحتوں کا تجھے پتہ ہی نہیں[4]
(ترجمہ)

صبر و ظفر کے بارے میں حافظ کا زاویہ نگاہ ملاحظہ ہو :-

ساقی بیا کہ ہاتفِ غیبم بہ مژدہ گفت
با درد صبر کُن کہ دوامی فرستمت
(حافظ)

دیا ہے ہاتفِ غیبی نے یہ مژدہ مجھے ساقی
گوارا درد کر لے میں دوا ارسال کرتا ہوں[5]
(ترجمہ)

"شاد باید زیستن" کے حوالے سے حافظ کا عقیدہ ہے :-

وفا کنیم و ملامت کشیم و خوش باشیم
کہ در طریقتِ ما کافری ست رنجیدن
(حافظ)

وفا کرتا ہوں کہتے ہیں بُرا سب پھر بھی میں خوش ہوں
مرے مذہب میں افسردہ دلی کو کفر کہتے ہیں[6]
(ترجمہ)

منظوم ترجموں کے حوالے سے ڈاکٹر عنوان چشتی فرماتے ہیں :-

"چوں کہ خیال کو الفاظ کا جامہ پہنانے کا عمل فنی، ادبی اور تخلیقی نوعیت کا ہے اس لیے دوسری زبانوں سے اُردو میں منظوم ترجمہ کرتے وقت علم بدیع و بیان پر نظر رکھنا ضروری ہے اور

---

[1] تا [6] دیوانِ حافظ (ترجمہ منوّر) صفحات بالترتیب ۳۴، ۳۵ (۴۵، ۴۱) (۵۸، ۵۹) (۶۲، ۶۳) (۶۲، ۶۳، ۷۸، ۷۹)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

عروض وقوافی، معائب ومحاسنِ سخن اور شعری اسالیب کا عرفان بھی ضروری ہے۔[۱]

اور مذکورہ جملہ لوازمات منوّر لکھنوی کے یہاں موجود ہیں۔ وجدانِ حافظ کے اشعار کے تراجم ڈاکٹر عنوان چشتی کے وضع کردہ اس معیار پر بھی کھرے اُترتے ہیں۔ یہ تراجم فنّی اسقام و معائب سے پاک ہیں۔ یہ ترجمے بذاتِ خود اعلےٰ درجہ کی شعری تخلیقات نظر آتے ہیں جو جُملہ اوصاف ومحاسنِ شعری سے مملو ہیں۔ ان شعری تراجم میں بندش کی چستی بھی ہے اور زبان کی صحت وشستگی بھی۔ اس کے علاوہ ان اشعار کے اصل خالق کے استعمال کردہ علائم واستعارات کے بقا وتحفّظ کی شعوری کوشش بھی۔ اور یہ کوشش ہر لحاظ سے کامیاب ہے۔ اس لیے نہ تو ان تراجم کے قاری کی قوّتِ تفہیم ہی پر کوئی بوجھ پڑتا ہے اور نہ ہی شعر کے اصل تخلیق کار کے مفہوم اور مرکزی خیال کی ترسیل مضروب ہوتی ہے۔

بلاشبہ " وجدانِ حافظ " منوّر کا ایک معرکۃ الآرا اَدبی صحیفہ ہے اور فارسی ادب و فلسفہ کے چمن زار کا ایک نادر، رنگین اور نکہت بیز پھول جسے منوّر نے نگارِ اُردو کے جُوڑے میں بصد شوق لا سجایا ہے۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

باب پنجم (الف)

مُنوّر کے تراجم۔ مذہبی تصانیف کے ترجمے

(۱) قرآنِ مجید کی سورتوں کے تراجم
(۲) انجیلِ مقدّس کے باب (الہاماتِ مغرب)
(۳) دھمپد یا سچی راہ (گوتم بُدھ کی تعلیمات)
(۴) نغمۂ قلندری یا اودھوت کا ترانہ (جگت گرو شنکر اچاریہ کی چرپٹ پنجریک کا ترجمہ)
(۵) نسیم عرفاں (شری مد بھگوت گیتا)
(۶) دُرگا سپت شتی
(۷) رامائن بالمیکی
(۸) گیت گووند (سرمدی نغمے)
(۹) وِدُر نیتی پترکا
(۱۰) رُوحانی مکالمہ
(۱۱) آریہ ابھی وِنے
(۱۲) گجیندر موکش
(۱۳) رمبھا شُک سمواد

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

(الف) مذہبی کُتب کے تراجم

خالق ومخلوق کے باہمی رشتوں، وجود وعدم، ذات وکائنات، دنیا کے مزاج وارتقا، جسم وروح کے تقاضات ومطالبات، ادب واخلاقیات سے متعلق غور وفکر، آفرینش دوعالم کے وقت ہی سے ذہنِ انساں کا مقدّر بن گئے تھے۔ فطرت نے جن ذہین وطبّاع انسانوں کو تفکّر و تخیّل کی دولت سے فیض یاب کیا تھا، انھوں نے خدمتِ خلق اور رفاہِ انسانیت کی غرض سے اپنے نتائجِ فکر کو بنی نوعِ انسان کے سامنے رکھنا شروع کیا، اور اس کے لیے ارتقائے بشر کے ساتھ ساتھ تقریر وتحریر، نشر واشاعت، پند وعظ اور دیگر مختلف ذرائع ابلاغ اختیار کیے جاتے رہے۔ یوں حکمت وفلسفے کی بنیاد پڑی اور یوں ان اکابر کے افکار کے ذہنِ انسان پر اثر انداز ہونے کا عمل فروغ پاتا رہا۔ زندگی کے ان عمومی حقائق اور اخلاق وآداب کو انسان کے لیے مشعلِ راہ بنانے کے عمل میں ترجمہ بھی ایک طاقت ور ذریعۂ ابلاغ ثابت ہوا۔ ایک زبان کے حکیموں اور دانش وروں کے افکار ونکاتِ حکمت کو دوسری زبان میں منتقل کرنے سے ان کے ابلاغ و اشاعت کا دائرہ وسیع ہوا اور لاکھوں کروڑوں انسان مختلف اقوام وممالک کے دانش وروں، رُوحانی پیشواؤں، سنتوں اور فقیروں کے افکار واقوال سے روشنی پا سکے۔ منوّر لکھنوی نے اسی نیک مشن کو اپنا نصب العین بنا کر شنکر آچاریہ، گوتم بُدھ، حضرت محمد صاحب، سوامی رام کرشن پرم ہنس، بھگوان سری کرشن، یسوع مسیح، سوامی دیانند وغیرہ عظیم رُوحانی پیشواؤں کے زرّیں اقوال اور اُپدیشوں کو کمال محنت وعرق ریزی سے اُردو نظم کا جامہ پہنا کر قارئینِ اردو تک پہنچایا۔

آج جبکہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے دنیا کے فاصلوں کو بے حد کم کر دیا ہے، اس طرح کی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

شعوری مساعی روحِ انسان کے معراج و ارتقا میں خصوصی اہمیت رکھتی ہیں جن کے طفیل ساری انسانی برادری تہذیبی و اخلاقی اقدار، میلانات و رجحانات میں یگانگت محسوس کر سکے اور کُل عالمِ انساں کی آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کے وسائل تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ مشترکہ مادّی اور رُوحانی دُکھوں کا مداوا پیش کر سکے۔

اُردو کے سرمایۂ ادب کو مالا مال کرنے میں ترجموں کا ایک خاص رول رہا ہے۔ ترجمے کی افادیت و مقصدیت ہر زبان میں مسلّم ہے۔ اُردو نے اپنی کم عمری میں ہی دیگر زبانوں بالخصوص سنسکرت، انگریزی، فارسی، عربی اور فرانسیسی زبان کے ادب پاروں کو نیز مذہبی اور رُوحانی کتب کو ترجمے کے وسیلے سے خود میں سمو لیا۔ منوّر لکھنوی نے دوسری بھاشاؤں کے منظوم اور نثری شاہکاروں کے منظوم و منثور ترجمے پیش کر کے اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دینے کے ساتھ قارئینِ اُردو کو دیگر زبانوں کے اُدبِ عالیہ سے روشناس کرایا اور مذکورہ زبانوں کے علما، شعرا، تمثیل نگاروں اور رُوحانی پیشواؤں کے بلند و بیش بہا افکار سے مستفیض کر کے اُردو کی عظیم اور قابلِ ستائش خدمت سر انجام دی۔

ترجمہ خواہ سائنسی اور تکنیکی کتب کا مقصود ہو یا اُدبی اور رُوحانی مضامینِ نظم و نثر کا، مترجم سے دونوں زبانوں کے مزاج و تہذیب سے مکمل شناسائی کا متقاضی ہوتا ہے۔ دوسری زبانوں کے اُدب کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے اردو زبان و لغات پر مترجم کی کامل گرفت ہونا لازمی ہے۔ دوسری زبانوں کے شعر و ادب کو اُردو زبان کے شعری قالب میں ڈھالنا اور بھی دشوار تر کام ہے۔ کیوں کہ شاعری میں بحروں اور قافیوں پر تعمیر شدہ ایک الگ خود مختار اور منفرد صوتی نظام ہوتا ہے اور اس کے استعارات و علامات ایک خاص مفہوم کا جامہ اوڑھے ہوتے ہیں۔ ترجمے کے عمل میں متعلقہ دونوں زبانوں کے مابین صوتیاتی ڈھانچہ اور تانے بانے کا فرق ہی اصل فرق ہوتا ہے۔ اصوات و افکار باہم مربوط اور شیر و شکر ہوتے ہیں۔ دوسری بھاشا میں انھیں اُن کے صحیح مفہوم کے ساتھ نظم کرنا نثری ترجمے کے بمقابلہ زیادہ دُشوار، دقیق اور محنت طلب کام ہوتا ہے، کیوں کہ منظوم ترجمہ کو بحر، موزونیت اور اصوات کے استعمال سے بندھا رہنا پڑتا ہے۔ شاعری کی ترسیلِ اثر کے لیے اس پہلو کو ملحوظ رکھنا منظوم ترجمے میں ناگزیر ہوتا ہے۔

اِس اعتبار سے مذہبی کتب اور مقدّس صحیفوں کا ترجمہ اور بھی زیادہ محنت طلب اور کڑی آزمائش کا کام ہے۔ مترجم کو ہر قدم پر محتاط رہنا پڑتا ہے اور مفہوم کی صحت میں ذرا سا اشتباہ

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اور ترجمے کی ذرا سی لغزش مترجم کو ہدفِ ملامت بنا سکتی ہے اور اگر ترجمہ منظوم صورت میں کرنا مقصود ہو تو یہ کام آئینہ سازی کی طرح نازک اور تلوار کی دھار پر رقص کے مترادف ہو جاتا ہے۔ افادیت کے اعتبار سے بھی ایسے ترجمے کی حیثیت مستقل اور پائیدار تصنیف جیسی اہم ہوتی ہے اور یہ صرف موجودہ نسل کے لیے ہی نہیں بلکہ آئندہ نسلوں کے لیے بھی ایک سرمایہ بن جاتی ہے لیکن منوّر کا حوصلہ ہے کہ وہ اس دشوار اور پیچیدہ عمل سے بار بار پورے اعتماد کے ساتھ گزرا ہے اور اُس نے مختلف مذاہب کے محترم و متبرک صحیفوں کو اُردو نظم و نثر کا جامہ پہنایا ہے۔

سب سے پہلے ہم منوّر لکھنوی کے ترجمۂ قرآنِ پاک کا جائزہ لیں گے۔ قرآنِ مقدس کی کئی سورتوں کا ترجمہ منوّر نے کمال، صحت، فصاحت اور بلاغت کے ساتھ اُردو میں نظم کیا ہے۔ اگرچہ وہ اس بات سے متفکر بھی تھے کہ علمائے اسلام و مشائخ ان کی اس کوشش کو کہیں گستاخی پر نہ محمول کریں۔ قرآن پاک کی سورتوں کے ترجمے جو منوّر نے کیے ان کے شائع نہ ہونے کی ایک ممکنہ وجہ یہ خدشہ بھی ہو سکتی ہے۔ اگرچہ انھوں نے اپنے یہ تراجم مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور کچھ دیگر علما کو سنائے۔ انھوں نے انھیں بہت پسند کیا لیکن اس طرح کے واقعات کئی مرتبہ پہلے دیگر شعرا اور مصنفین کو پیش آچکے تھے جبکہ قرآنِ پاک کے تفسیر و ترجمے کی بعض کٹر دینی قائدین کی جانب سے حوصلہ شکنی کی گئی۔ اپنے مضمون "مذہبی تصانیف کے تراجم" میں ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں کہ قرآن مجید کے منظوم تراجم اور تفسیروں کو علما نے مستحسن نظروں سے نہیں دیکھا۔ بالخصوص اس واقعہ کا ذکر ڈاکٹر صاحب موصوف نے کیا ہے:۔

> "اُردو کے مشہور ادیب سیماب اکبرآبادی نے جب ترجمے کو نظم کی صورت میں پیش کرنا چاہا تو علما نے اِسے تحریف قرار دے کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ یہی صورتِ حال دسویں صدی ہجری میں پیش آئی۔ جب شیخ بدرالدین محمد بن رضی الغزی دمشقی نے عربی منظوم قرآن کی سب سے پہلی تفسیر لکھی۔[1]"

منوّر لکھنوی کے تراجم محض اپنی علمی قابلیت اور ادبی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کی آرزو کا ماحصل نہیں۔ بلکہ اُن کے اِس ریاض کے پیچھے کچھ خاص مقدس مقاصد و عوامل کارفرما ہیں۔ قومی یک جہتی اور انسانی بھائی چارے کی تبلیغ، نیز رُوحانی اقدار کے فروغ و بالیدگی کا جذبہ

---

[1] ترجمہ کا فن اور روایت (مرتب ڈاکٹر قمر رئیس)۔ ایڈیشن جون ۱۹۷۶ء۔ صفحہ ۲۵۰

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

دراصل ان مسائی کے محرک رہے ہیں۔ مختلف مذاہب کے معتقد لوگ ان ترجموں کے توسط سے نہ صرف دوسرے مذاہب کی تعلیمات سے آشنا ہوئے ہیں بلکہ مشترکہ انسانی اقدار وافکار جذبات واحساسات اور انسانی رویّوں کے ردِّ عمل کی ہم آہنگی و یک رنگی سے بھی آگاہ ہوئے ہیں :۔

تعبیرِ منظوم

حضرتِ منوّر قرآنِ حکیم کے ترجمے کو "تعبیرِ منظوم" کے نام سے شائع کرنا چاہتے تھے۔ قرآنِ پاک کی سورۃ فاتحہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔ اس سے قبل منوّر لکھنوی "عذرِ تالیف" میں رقم طراز ہیں :۔

بیدار ہوا نصیب میرا — ہے ختمِ رسل حبیب میرا
مسجد مرے گھر کے سامنے ہے — قرآن نظر کے سامنے ہے
تکمیلِ مُراد کر رہا ہوں — اللہ کو یاد کر رہا ہوں

گو نام ہے پاک ترجمے کا — دعوےٰ نہیں خاک ترجمے کا
اکرام کی جستجو نہیں کچھ — انعام کی آرزو نہیں کچھ
مَیں ہوں ہندو تو حرج کیا ہے — یہ بھی تو رضائے کبریا ہے
مجھ پہ لطفِ رسولؐ ہوگا — ہدیہ میرا قبول ہوگا

"اسلام منوّر کی نظر میں" کے زیرِ عنوان اپنے مقالے میں سید محمود نقوی ایک واقعہ کا ذکر یوں کرتے ہیں :۔

"قرآن مجید کے مطالعہ نے ان کے ذہن و دل کو متاثر کیا۔ ایک رات سورۂ حمد اور اس کا ترجمہ پڑھتے پڑھتے سو گئے۔ صبح بیدار ہوئے تو اپنے کو سورۂ حمد کی تعبیرِ منظوم کے لیے بالکل آمادہ پایا اور بے ساختہ سورۂ حمد کے معانی و مطالب اردو نظم کے پیکر میں مرتّب ہو گئے۔ یہ ۱۹۴۱ء کی بات ہے۔ جب سے منوّر لکھنوی برابر جناب محمود الحسن اور جناب اشرف علی تھانوی صاحب کے تراجم کو پیشِ نظر رکھ کر کلام مجید کے معانی و مفاہیم کو شعری پیکر میں ڈھالتے رہتے ہیں۔"[۱]

---

[۱] منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (مرتّب راج نرائن راز)۔ صفحہ ۱۸۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ترجمہ سُورۃِ فاتحہ : (یعنی قرآنِ کریم کی پہلی سورت کے مطالب اردو نظم میں)

ہے وردِ زباں کلام تیرا — پہلے لیتا ہوں نام تیرا
تو ہر صورت سے مہرباں ہے — تیرا لطف و کرم عیاں ہے
ہر اک حمد و ثنا کے لائق — ہے تو ہی مربیِ خلائق
لیتا ہے مدام رحم سے کام — بے شک تیرا رحیم ہے نام
تجھ میں موجود ہر صفت ہے — تو مالکِ روزِ آخرت ہے
اک رہرو راہِ بندگی ہوں — میں تجھ سے مدد کا ملتجی ہوں
سیدھا رستہ مجھے دکھاوے — اُن لوگوں کا چلن سکھاوے
انعام کی بخششیں ہوں جن پر — حد درجہ نوازشیں ہوں جن پر

جن پر چشمِ غضب ہو تیری — معتوب جنھیں طلب ہو تیری
اس راہ سے جو بھٹک گئے ہوں — چلتے چلتے بہک گئے ہوں
دے میرے خدا شعور مجھ کو
رکھ ان کی روش سے دُور مجھ کو[1]

ہر سُورہ کے آغاز میں منوّر نے بسم اللہ کا بیان الگ الگ پیرایہ میں رقم کیا ہے جیسا کہ سورۂ فاتحہ کے مندرجہ بالا شعری ترجمے کے پہلے دو اشعار اسی کے لیے وقف ہوتے ہیں۔ سورۃ لہب کے شروع میں بسم اللہ کے مفہوم کو یوں نظم کیا ہے :۔

آغاز خدا کے نام سے ہے
تمہید اسی کلام سے ہے
رحمان ہے وہ رحیم ہے وہ
بے حد ہم پہ کریم ہے وہ

سورۃ الناس کا آغاز منوّر حسبِ ذیل اشعار سے کرتے ہیں :۔

---

[1] قلمی نسخہ سورۂ فاتحہ (منوّر لکھنوی کا ترجمہ) بمطابق عکسی تصویر (تعبیرِ منظوم میں سے)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اللہ کے نام سے ہے آغاز　　ہے حسنِ کلام کا یہ پرداز
وہ رحم و کرم کی ابتدا ہے　　وہ رحم و کرم کی انتہا ہے
الطاف اُسی کے ہیں جاودانی　　ہے یہ سب اُسی کی مہربانی

"سورۂ آلِ عمران کی ایک آیت قل ان تخفوا ما فی صدورکم او تبدوہ یعلم ما فی السمٰوات و ما فی الارض واللہ علیٰ کلِ شیٔ قدیرہ کے مفہوم کو شاعر نے جس طرح پیش کیا ہے وہ اس تعبیرِ منظوم کے اندازِ بیان اور طرزِ ادا کی غمازی کرتا ہے۔"

کردیجیے آپ ان سے ارشاد　　رکھیں وہ ہمیشہ بات یہ یاد
جو کچھ بھی ہو مدّعا تمھارا　　پنہاں رکھو کہ آشکارا
اللہ کو اُس کا سب پتہ ہے　　اس پر ہر بات آئینہ ہے
ہے اس عرشِ بریں پہ جو کچھ　　ہے اس فرشِ زمیں پہ جو کچھ
سب سے واقف ہے ذات اُس کی　　بالا سب پر ہے بات اُس کی

کچھ شک نہیں اس کی منزلت میں
ہر چیز ہے اس کی مقدرت میں[1]

منوّر لکھنوی قرآنِ کریم کی عظمت کو نہایت خشوع و خضوع اور عقیدت و ارادت کے ساتھ اپنے اشعار میں بیان کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

قرآن ہے جو نام خدا کی کتاب کا　　چہرہ ہے انبیائے فضیلت مآب کا
قرآں کی سطر سطر پہ قربان جائیے　　کیا جائزہ لیا ہے گناہ و ثواب کا
اس کی حقیقتیں ہیں دوامی حقیقتیں　　اس بارگہ میں دخل نہیں انقلاب کا
منشا یہ ہے کہ باز رہیں ہم گناہ سے　　ہے بار بار ذکر جو روزِ حساب کا

بیٹھیں جو چین سے بھی تو یادِ خدا کریں
پہلو سکون میں بھی ہو اک اضطراب کا[2]

منوّر نے اسلامیات کا سنجیدگی سے غائر مطالعہ کیا ہے اور حد درجہ خلوص اور

---

[1] منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (مرتب راج نرائن رازؔ) صفحہ ۱۹۰
[2] شگفتہ عقیدے (منوّر لکھنوی) غیر مطبوعہ قلمی مسودہ۔ صفحات پر نمبر درج نہیں۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

صداقتِ احساس کے ساتھ قرآن پاک کی سورتوں کے علاوہ امیر المومنین حضرت علی کے "کلام حقیقت نظام" یعنی ثنائے پروردگار کو بھی اردو نظم کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ اس کے دو اشعار درج ذیل ہیں:۔

اونچی بھی ہو کے ہمت اس کو نہیں پہنچتی — ہو لاکھ دل میں جرأت اس کو نہیں پہنچتی
انساں کی عقل چاہے جتنے لگائے غوطے — ممکن نہیں کہ اس کی تہہ تک ذرا بھی پہنچے

الہاماتِ مغرب

عالمگیر مذاہب میں اسلام کے ساتھ ساتھ مسیحیت کے مقلدین کی تعداد بھی کروڑوں میں موجود ہے اور برِ صغیرِ ہند میں بھی عیسائیوں کی ایک خاصی بڑی تعداد صدیوں سے آباد ہے۔ منوّر کی مذہبی رواداری اور ہر دھرم کے تئیں وسیع القلبی نے اُسے "انجیلِ مقدس" کے مطالعہ اور اس کے کچھ حصوں کے ترجمے کی جانب راغب کیا۔ ذیل میں انجیلِ مقدس کے پہلے باب کے ترجمے سے کچھ اقتباس بطورِ نمونہ پیش کیے جا رہے ہیں۔ انجیلِ مقدس کے ترجمے کا نام منوّر لکھنوی نے "الہاماتِ مغرب" رکھا تھا۔

کتابِ آفرینش کا پہلا باب

(انجیلِ مقدس کے پہلے باب کا آزاد منظوم ترجمہ)

(۱)

ہوئی قدرتِ حق عیاں سب سے پہلے — بنائے زمیں آسماں سب سے پہلے

(۲)

ہویدا تھی صنعت جہاں آفریں کی — مقرر نہ تھی کوئی صورت زمیں کی
عجب ڈھنگ سے تھی نمودار ہستی — نہ تھا اس میں جنگل نہ تھی اس میں بستی
یہاں تھا وہاں تھا، اِدھر تھا، اُدھر تھا — اندھیرے کا گہرائیوں میں گزر تھا
تھی اِک تیرگی سطحِ دریا پہ طاری — یہی سلسلہ تھا بہر شکل جاری
رُواں تھے سمندر رُواں تھے سمندر — نظر کے لیے بیکراں تھے سمندر

اسی رنگ میں غرق ساری فضا تھی
بس آمادۂ کار روحِ خدا تھی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

(۳)

خدا نے سخن یہ زباں پہ اُتارا — کہ ہو جائے تابندگی آشکارا
ہوا حکم اِدھر اور اُدھر روشنی تھی — ہر اک سمت پیشِ نظر روشنی تھی

(۴)

حضورِ خدا آ گئی یہ تجلّی — اِک اعجاز فرما گئی یہ تجلّی
بیاں وصف کیا ہو بہت خوب تھی یہ — پسند آ گئی چیز مرغوب تھی یہ
لیا کام پھر اُس نے کاریگری سے — جُدا روشنی کو کیا تیرگی سے

(۵)

اسی کام سے کام رکھّا خدا نے — اُجالے کا دن نام رکھّا خدا نے
جو کر دی یہ تقسیمِ اوقات اس نے — اندھیرے کو ٹھہرا دیا رات اُس نے
تھا اس سحر کاری کا انجام ظاہر — ہوئی صبح پیدا ہوئی شام ظاہر
یہ منظر تھا دل کش یہ نقشہ دل آرا
دن اس طرح پہلا ہوا آشکارا [1]

"مذہبی کتب کے تراجم" کے متعلق ڈاکٹر عبدالحق صاحب کا یہ کہنا ہے کہ :-

"ان تراجم کی حیثیت مذہبی ہے ادبی نہیں۔ یعنی عقائد و افکار سے ہے اسلوب و انشا سے نہیں لیکن ادب کے لیے موضوع کی تخصیص نہیں۔ ادب کا رشتہ اسلوب سے متعین ہوتا ہے۔ آج بھی ادبی میراث کا بہترین حصہ مذہبی شہ پاروں پر ہی مشتمل ہے۔ یہ ذخیرۂ تراجم ادبی اسلوب کی دل کشی کا ایک توانا احساس دلاتا ہے۔ ہم انھیں کامیاب تراجم کے ذیل میں پیش کر سکتے ہیں۔" [2]

انجیلِ مقدس کے محرّرہ بالا حوالوں سے روشن ہے کہ منوّر کے ان منظوم تراجم پر ڈاکٹر عبدالحق صاحب کا قول بالکل صادق آتا ہے۔ اُوپر کے حوالوں کے اور آگے پیش کیے جانے والے اقتباسات کے ادبی معیار کو بغور دیکھا جائے تو یہ تراجم عمدہ شاعری کی قابلِ رشک مثالیں ہیں۔ ان میں فنی سلیقہ اور ادبی چاشنی بھی ہے اور صحتِ مفہوم بھی۔

---

[1] قلمی مسوّدہ۔ کتاب آفرینش کا پہلا باب (منوّر لکھنوی)۔ "الہاماتِ مغرب" میں سے۔

[2] ترجمہ کا فن اور روایت (مرتّبہ ڈاکٹر قمر رئیس) صفحہ ۲۷۱ - ۲۷۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اوپر کے پانچ بندوں کے بعد آسمان، سمندروں، دریاؤں اور خشکی کی آفرینش کے لیے خداوند تعالیٰ کے احکامات کا ذکر کیا گیا ہے جسے منوّر لکھنوی نے اعلیٰ اور معیاری شاعری کے لباس میں پیش کیا ہے۔ بعد کے مراحلِ آفرینش کا بیان نویں اور دسویں بندوں میں ملاحظہ ہو۔

(۹)

خدا نے کہا پھر بصد مہربانی ۔۔۔ کہ ہو جائے یکجا تہِ چرخ پانی
ہو نظمِ جہاں منقسم خشک و تر میں ۔۔۔ کچھ امکانِ تمیز ہو بحر و بر میں
سمندر اکٹھا ہوئے ایک جانب ۔۔۔ بہم سارے دریا ہوئے ایک جانب
یہ قدرت ہوئی دوسری سمت ظاہر ۔۔۔ زمیں خشک تھی دوسری سمت ظاہر
یہی رنگ تھا دہر کی ابتدا کا
کہیں ٹل بھی سکتا تھا کہنا خدا کا

(۱۰)

بحکم خدا نام خشکی زمیں تھا ۔۔۔ یہی مقتضائے جہاں آفریں تھا
جو پانی کا حصّہ ہوا تھا مقرر ۔۔۔ وہ تھا نام کی شکل میں اب سمندر
تھا منظور اظہارِ صنعت خدا کو
پسند آئی بے حد یہ صورت خدا کو
ہوا حکم پھر یہ جہاں آفریں کا ۔۔۔ کہ جنبش میں ہو کارخانہ زمیں کا
اسی سے ہوں پیدا نباتات ساری ۔۔۔ ہو تخلیق کا شغل ہر سمت جاری
جڑی بوٹیاں ہوں انوکھی نرالی ۔۔۔ اثر خاص رکھیں بنیں بیج والی
لدے ہوں پھلوں سے جو پیدا شجر ہوں ۔۔۔ ہمیشہ اسی طرح سے بارور ہوں
خود اپنے میں ہو بیج ان کا مہیا ۔۔۔ پھل ان کے کریں پھل ہمیشہ مہیا
ملا حکم اِدھر اور اُدھر یہ عمل تھا
مقرر پئے خشک و تر یہ عمل تھا[1]

منوّر لکھنوی نے حضرت یسوع مسیح کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے اور ان کی شہادت کے ماتم میں کئی نظمیں کہی ہیں جو گاہے بگاہے ملک کے اہم اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

---

[1] مسودہ کتاب آفرینش کا پہلا باب (منوّر لکھنوی) صفحہ نمبر درج نہیں۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تعبیرِ منظوم (ترجمۂ قرآن پاک) کے قلمی نسخہ کے ایک صفحہ کی عکسی تصویر

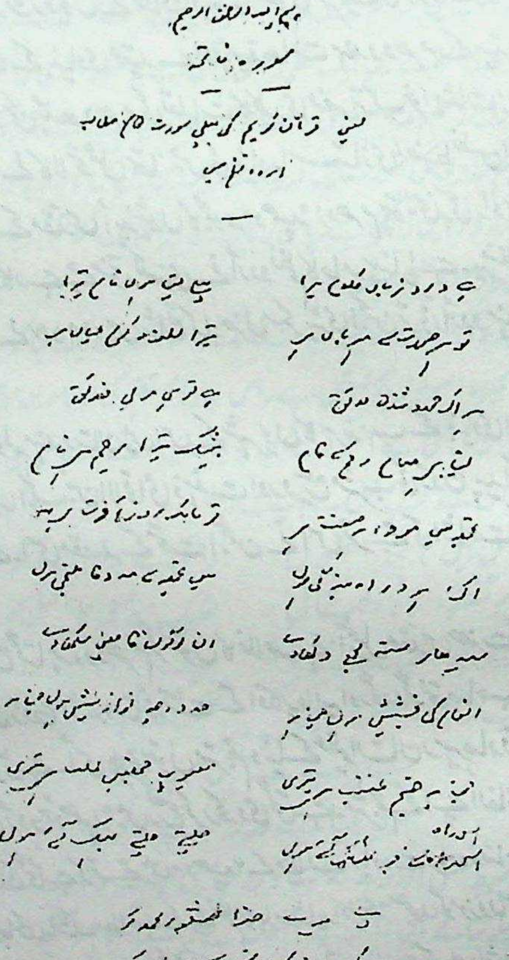
بسم اللہ الرحمن الرحیم
سورۂ فاتحہ
یعنی قرآن کریم کی پہلی سورت کا مطلب
اردو نظم میں

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سچّی راہ (دھمپد)

برِ صغیر ہند سے طلوع ہونے والے مذاہب میں "بُدھ مت" کو ایک ممتاز مقام حاصل رہا ہے۔ یہ مت دراصل ہندو دھرم میں صدیوں سے دخول پائے ہوئے رجعت پسندانہ اور کٹّر رویّوں کے خلاف ایک اصلاحی تحریک کی صورت میں معرضِ وجود میں آیا۔ اگرچہ اس مذہب کے بنیادی عقیدے اور سِدّھانت ہندو دھرم کے سِدّھانتوں سے مختلف نہیں تھے، لیکن بُدھ دھرم کی تعلیمات کا کلیدی عنصر ترکِ خواہشات، میانہ روی اور متوازن زندگی گزارنے کا لائحہ عمل تھا، جس کی بنیاد راستبازی، ضبطِ نفس اور پاکبازی پر رکھی گئی۔ گوتم بُدھ کے مقدّس اُپدیشوں کا مجموعہ "دھمپد" (دھرم پتھ یعنی سچی راہ) پالی زبان کا ایک عظیم مذہبی شاہکار ہے جسے منوّر لکھنوی نے اُردو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ یہ منظوم ترجمہ انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ نے ۱۹۵۴ء میں شائع کیا۔ جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند کے ادارتی نوٹ کے مطابق :-

"سیکولر ہندوستان میں اس کے شہریوں کا ہر مذہب کے بنیادی اصولوں سے واقف ہونا ان میں ایک بین الاقوامی ذہنیت اور وسیع مشرب کی رُوح پیدا کرنے کے لیے بہت ضروری ہے۔ اسی مقصد کے تحت انجمن نے اس ترجمے کی اشاعت کی ذمّہ داری قبول کی تھی۔"

جس طرح گیتا ہندو دھرم گرنتھوں کا خلاصہ ہے، انجیلِ مقدّس حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کا، قرآن کریم اسلام کی رُوح "ژند وستا" زرتشت کے افکارِ عالیہ اور گورو گرنتھ صاحب سِکھ گروؤں کی تلقینات کا نچوڑ ہے۔ اُسی طرح بقولِ مترجم دنیا کے عظیم الشان رہبرِ صادق ساکی مُنی گوتم کے دھرم اُپدیشوں کی رُوح "دھمپد" میں کھینچ کر رکھ دی گئی ہے۔ مترجم کے اپنے الفاظ میں :

"کوشش کی گئی ہے کہ ترجمے میں "دھمپد" کے مطالب زیادہ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ ادا ہو جائیں۔ خشک مطالب کے لیے نظم کا جامہ شاید اکثر نکتہ سنجوں کو موزوں معلوم نہ ہو لیکن نظم کے ترنّم میں مطالب کی خشکی بھی دلپذیر بن جاتی ہے اور اس کو یادداشت میں محفوظ رکھنے کے لیے نظم جس قدر ممدو معاون ثابت ہوتی ہے اتنی نثر نہیں۔" [۱]

---

[۱] دھمپد (سچی راہ) صفحہ ۴-۵ (شروع کی بات) از منوّر لکھنوی۔ ۱۹۵۴ء ایڈیشن ۱۹۵۴ء

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منوّر لکھنوی نے فی الواقعی "دھمپد کے چار سو اکیس" بندوں میں اپنے مذکورہ بالا دعوے کو سچ ثابت کر دیا ہے۔ علامہ برج موہن دتاتریہ کیفیؔ جیسے مؤقر ادیب نے اس ترجمے پر اظہار رائے کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ترجمہ کی زبان فصیح اور سلیس ہے۔ اصل موضوع کو اس اسلوب میں منتقل کیا ہے کہ مشکل اور دقیق مسائل آسانی سے سمجھ میں آ جاتے ہیں۔

زیر نظر کتاب میں تراجم سے پہلے "تصویر حقیقت" کے عنوان سے دنیا کے عظیم ترین انسان مہاتما بدھ کی منقبت میں ایک نظم شامل کی گئی ہے جو منوّر لکھنوی کی نظموں کے اولین مجموعہ "کائنات دل" (مطبوعہ ۱۹۳۹ء) سے ماخوذ ہے۔ اس سے آگے چھبیس گفتگوؤں پر مشتمل چھبیس باب منظوم ترجموں کی صورت میں دیے گئے ہیں جن میں کل ۴۲۱ پالی اشلوکوں کی وضاحت اردو کے ۴۲۱ بندوں میں کی گئی ہے۔ پالی زبان کے ہر اشلوک کا ترجمہ پانچ اشعار میں کیا گیا ہے تاکہ مفہوم اچھی طرح واضح ہو جائے۔

مہاتما بدھ کی تعلیمات کا نچوڑ "اشٹانگکا" مارگ میں یک جا کر دیا گیا ہے جو زندگی بسر کرنے کے آٹھ پاکیزہ اصولوں پر مشتمل ہے۔ اس جادۂ مستقیم کی وضاحت "دھمپد" میں بیسویں گفتگو کے زیر عنوان کی گئی ہے۔ منوّر نے کس چابکدستی سے اسے نظم کیا ہے، ملاحظہ کیجیے۔ بیسویں گفتگو کا عنوان ہے "طریق عمل کے باب میں۔"

شاہراہ عمل ہیں آٹھ اصول — واقعی بے بدل ہیں آٹھ اصول
ٹھیک ہو گفتگو، نگاہ، خیال — ٹھیک ہو سعی کا، عمل کا مآل
ٹھیک ورزش ہو، ٹھیک روزی ہو — ٹھیک اسمرتی ہو، سمادھی ہو
چار سچائیاں ہی افضل ہیں — نقص سے پاک ہیں، مکمل ہیں

سب پہ ہے بے تعلقی فائق
مرد بینا ہے قدر کے لائق [۱]

گوتم بدھ ضبط نفس اور ترک لذات کو نروان یعنی حیات و موت کے چکر (تناسخ۔ آواگون) سے نجات کا وسیلہ بتاتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے "اشٹانگکا" (آٹھ اصولوں پر مبنی جادۂ مستقیم پر چلنے کی تلقین کی جو پاکیزہ بول چال، پاکیزہ نگاہی (مشاہدہ)، پاکیزہ طرز فکر (سوچ)،

---

[۱] سچی راہ (دھمپد۔ منوّر لکھنوی) مطبوعہ ۱۹۵۴ء صفحہ ۱۰۹ بند نمبر ۲۷۳

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

پاکیزہ عمل ۶۔ پاکیزہ روزی ۷۔ پاکیزہ کسرت، پاکیزہ حافظہ اور — پاکیزہ مراقبہ پر مبنی ہے۔ منوّر کا منظوم ترجمہ بڑی سلاست سے ان اصولوں کی وضاحت کرتا ہے۔

اِس راستا کی مزید وضاحت بیسویں گفتگو کے بند نمبر ۲۸۱ میں یوں کی گئی ہے:۔

لب پہ لائے نہ جو فضول کلام — اس میں لے خاص احتیاط سے کام
دِل کو بے حد سنبھال کر رکھّے — نظم پر، ضبط پر نظر رکھّے
جسم سے جو کوئی گنہ نہ کرے — معصیت کی طرف نگہ نہ کرے
دل، زباں، جسم صاف جو رکھّے — جو ہر اعتکاف جو رکھّے

پیروِ عقلمند بُدّھ کا ہے
اُس کو مسلک پسند بدّھ کا ہے [1]

گوتم بدّھ دنیا کو دُکھوں اور مصائب کا ایک لامتناہی سلسلہ مانتے ہیں اور ان کے مطابق اس سے محفوظ ہونے اور اس کے بندھن سے مستقل طور پر نجات پانے کا ذریعہ ہے ترکِ خواہشات لیکن یہ بہت دُشوار کام ہے۔ چوبیسویں گفتگو "جو ترِشنا" یعنی حرص کے باب میں ہے، کا ترجمہ منوّر نے کس دل کش انداز میں کیا ہے:۔

خواہشوں کو جیتنا دشوار ہے — کام یہ بے انتہا دُشوار ہے
ان کی پیدائش کبھی رُکتی نہیں — جیتے جی تا زندگی رُکتی نہیں
زیر کر لیتا ہے جو ان کو بشر — پست کر دیتا ہے جو اِن کو بشر
دُور اس کے رنج ہو جاتے ہیں سب — داغ اس کے دل کے دھو جاتے ہیں سب

خواہشیں ہوتی ہیں رُخصت اس طرح
گر پڑے پتّوں سے شبنم جس طرح [2]

اس کی مزید وضاحت بند نمبر ۲۵۴ میں کی گئی ہے۔ ترجمہ بالکل سلیس اور رواں ہے۔ شُستہ زبان، حُسنِ بیان اور محاورہ بندی سے آراستہ:۔

لذّتوں پر جان دینا ہے گُناہ — اپنی کشتی ان میں کھینا ہے گناہ
آدمی کو خاک کر دیتی ہیں یہ — اِس کا قصہ پاک کر دیتی ہیں یہ

---

[1] سچی راہ (دھمپد) از منوّر لکھنوی۔ صفحہ ۱۱۲۔ بند نمبر ۲۸۱

[2] " " " ۱۳۳ " ۳۳۰

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

لازمی ہے اس سمندر پہ عبور　　پار جانے کی کرے کوشش ضرور
روئے گا، چلّائے گا، پچھتائے گا　　پھیر میں ان کے اگر پڑ جائے گا
نقدِ ہستی ہاتھ سے خود کھوئے گا
اپنے حق میں آپ کانٹے بوئے گا ۱ے

ترجمے کی شعریت ایک الگ لطف دے رہی ہے اور بامحاورہ شستہ اردو کا چٹخارہ الگ ہے۔ محاورات ترجمے میں بالکل قدرتی اور عام بول چال کے انداز میں برتے گئے ہیں۔ لہٰذا ترجمے پر ترجمے کا گمان ہی نہیں ہوتا۔ جان دینا، کشتی کھینا، خاک کر دینا۔ قصہ پاک کرنا، پھیر میں پڑنا، نقدِ ہستی کھونا، کانٹے بونا وغیرہ محاورات بالکل فطری انداز میں استعمال ہوئے ہیں۔

فقیری کے باب میں دھمپد کی پچیسویں گفتگو میں جو وضاحتیں کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں "بھکشو" یعنی راہب (سچّے فقیر) سے کیا تقاضا کیا گیا ہے اور اسے منوّر نے کیسے نظم کیا ہے، ملاحظہ ہو۔

تمام جسم کو اک قاعدے میں رکھنا ہے　　تمام جسم کو اک ضابطے میں رکھنا ہے
جو گفتگو ہو مہذب ہو اور کام کی ہو　　برنگِ اسپ ضرورت اسے لگام کی ہو
یہ دل، یہ نفس رہِ راست سے بھٹک نہ سکے　　ہو خواہ کتنی ہی مشکل مگر بہک نہ سکے
حواس تجھ پہ نہ حاوی ہوں یہ خیال رہے　　نظر میں جب بھی رہے صورتِ مآل رہے
ہو کچھ نہ فکرِ کم و بیش غم سے دور رہے
یہ خوبیاں ہوں تو درویش غم سے دور رہے ۲ے

بُدھ مت ایک اصلاحی تحریک تھی جو برہمنوں کے احساسِ برتری اور ان کے پھیلائے ہوئے کرم کانڈ کے بھرم جال یا طلسمِ توہمات کے خلاف بھرپور احتجاج اور جذبۂ اصلاح کی نمائندہ تھی۔ برہمن کی ذات و صفات کے متعلق گوتم بُدھ کے افکارِ گرامی کو منوّر کی زبان میں سُنیے :-

جٹائیں رکھ کے برہمن کوئی نہیں ہوتا　　بزرگ اس سے کبھی آدمی نہیں ہوتا

۱ے سچّی راہ (دھمپد)۔ منوّر لکھنوی ۱۹۵۴ء۔ ایڈیشن۔ صفحہ ۱۳۹۔ بند نمبر ۳۵۴
۲ے 〃 〃 〃 〃 〃 ۔ 〃 ۱۴۱ 〃 ۳۶۰

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

نہ گوتر سے، نہ برہمن جنم سے ہے کوئی — فضول کیوں پھر اسے برہمن کہے کوئی
جو راستی کا، صداقت کا ہے علم بردار — نثار دھرم پہ ہے جس پر جو دھرم پر ہے نثار
شعار نیک ہو، محمود ہو چلن جس کا — برنگِ شعلۂ بے دُود ہو چلن جس کا
اسی کے وصف گنانے میں تر زباں رہیے
برہمن اصل میں ہے برہمن اسے کہیے [1]

بُدھ برہمن کے لیے اعلیٰ ذات میں جنم لینا ہی کافی اور ضروری نہیں سمجھتے۔ وہ ذات کی تمیز جنم سے نہیں بلکہ عمل سے مانتے ہیں۔

اکیسویں گفتگو بہترین مفاد کے باب میں ہے۔ جس میں بُدھ مت کے اعلیٰ ترین اصول یعنی اہنسا (عدم تشدّد) پر زور دیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت چودھویں گفتگو (عقلمندوں کے باب میں) کے تحت منوّر کے الفاظ میں دیکھیے :۔

(۱۴)

خواب میں بھی جو کسی پر حرف زن ہوتا نہیں — عیب جُو کی گفتگو جس کا سخن ہوتا نہیں
دل میں بے رحمی کے جذبے کو جگہ دیتا نہیں — جو کسی کی جان بھی بے فائدہ لیتا نہیں
جو فقیری کے اصولوں پر عمل پیرا رہے — ساکنِ دنیا بھی ہو کر تارکِ دُنیا رہے
جو غذا کھاتا ہو مقدارِ مناسب میں مُدام — جاگنے سونے میں جو لیتا ہو تنہائی سے کام
دل کی یکسوئی میں جس کا شغل ہو ابھیاس ہے
ہے یہی تعلیم داناؤں کی، اس کا پاس ہو [2]

شریمد بھگوت گیتا جہاں سنیاس (ترکِ علائق) اور تیاگ (اعمال کے ثمر سے دست کشی) کی تلقین کرتی ہے، وہاں عظمتِ عمل کی مبلّغ بھی ہے۔ گیتا کی طرح دھمپد بھی عظمتِ عمل پر زور دیتی ہے۔ بیکار اور بے عمل انسان دنیا اور عقبے دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ دوسری گفتگو (عمل کی فضیلت) اور آٹھویں گفتگو (ہزار کا بیان) میں عظمتِ عمل پر زور دیا گیا۔ آٹھویں گفتگو ملاحظہ ہو :۔

تحصیلِ علم میں جو بسر ایک دن بھی ہو — جس کی مراقبہ میں گزر ایک دن بھی ہو

---

[1] سچی راہ (دھمپد) منوّر لکھنوی۔ صفحہ ۱۵۲ ۔ بند نمبر ۳۹۱

[2] " " " " ۸۰ " ۱۸۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بہتر ہے سو برس کی حیاتِ فضول سے   کیا فائدہ ہے عمر کے بے کار طول سے

سُست الوجود دین کے جو انساں بسر کرے

آوارگیِ نفسِ دنی میں گزر کرے [۱]

اِس سے اگلے بند میں اس نکتے پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے منوّر مہاتما بدھ کے فرمودات کی یوں وضاحت کرتے ہیں :۔

سُستی میں کاہلی میں جو سو سال کاٹ دے   عمرِ عزیز یوں جو بد اعمال کاٹ دے

اس پر ہے ایک دن کی بھی فائق وہ زندگی   ہوتی ہے خاص قدر کے لائق وہ زندگی

آغاز جس میں ہو کسی کارِ عظیم کا

اظہار جس سے ہو کسی عزمِ صمیم کا [۲]

"دھمپد" کے اس ترجمے کے اختتامیہ صفحات میں "خاتمہ" کے زیرِ عنوان منوّر لکھنوی کا ایک نوٹ شامل ہے جو اس ترجمے کی تاریخ تکمیل ۳ر دسمبر ۱۹۵۰ء کا محررہ ہے۔ اس میں فرماتے ہیں :۔

"آج ایک دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ مبارک دن تھا جب میں نے دنیا کے عظیم ترین انسان یعنی مہاتما بدھ کے مقدس تلقینات کا ترجمہ اردو زبان میں شروع کیا اور مبارک دن ہے آج کہ جب یہ دشوار گزار مہم حیات و قوت کے مخزنِ عظیم کی مدد سے طے ہوئی۔۔۔۔۔"

اِس ترجمے کی خصوصیات کی نشان دہی کسی حد تک خود منوّر لکھنوی کے یہ اختتامیہ جملے کرتے ہیں :۔

"گیتا، کمار سمبھو، اور قرآن شریف کے ترجمے سے یہ ترجمہ اس لحاظ سے مختلف بھی ہے کہ اس کے تمام ابواب میں بحر کی یکسانیت اختیار نہیں کی گئی اور ایسا دیدہ دانستہ کیا گیا ہے تاکہ اِس یکسانیت سے طبیعت گھبرا نہ جائے۔ اس ترجمے سے مجھے ذاتی طور پر اور عامۃ الناس کو کہاں تک فائدہ پہنچے گا، اس کا اندازہ کرنا میرا کام نہیں۔

---

[۱] سچی راہ (دھمپد) منوّر لکھنوی، صفحہ ۵۰ - بند نمبر ۱۱۱

[۲] " " " " ۵۱ - " ۱۱۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

مَیں تو اُس حلوائی کے مانند ہوں جو مٹھائیاں تو خوب تیار کرتا ہے مگر خود نہیں کھاتا۔ مگر ہر کام کا اس کی نوعیت کے مطابق کچھ نہ کچھ نتیجہ ضرور نکلتا ہے...... اگر دنیا میرے اس ترجمے سے کسی قسم کا فائدہ اُٹھا سکتی ہے تو اُٹھالے۔"

نغمۂ قلندری

مذہبی کتابوں کے تراجم میں منوّر لکھنوی کا ایک اور قابلِ ذکر کارنامہ "نغمۂ قلندری" — (اُودھوت کا ترانہ) ہے۔ یہ کتابچہ جگت گورو شری شنکر آچاریہ کی سنسکرت تصنیف "چرپٹ پنجریک" کا منظوم ترجمہ ہے جو صرف ۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے اس ترجمے کی وجہ تصنیف یہ بیان کی ہے کہ انھوں نے یہ ترجمہ اپنے چچازاد بھائی ڈاکٹر گوری سہائے سکسینہ ایم ڈی ایچ کی تحریک و ترغیب پر شروع کیا تھا۔ یہ ترجمہ ۲۳ر جون ۱۹۴۴ء کو مکمل ہوا اور جون ۱۹۵۸ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آیا۔ یہ ۱۸ بندوں پر مشتمل ہے۔ ہر بند میں پانچ پانچ اشعار ہیں جبکہ ہر بند کا چھٹا شعر ٹیپ کا شعر ہے جسے ہر بند کے آخر میں دوہرایا گیا ہے۔ ۱۸ بندوں کے اس پند نامہ کے بعد ایک الگ نظم "رام کی باتیں" شامل کی گئی ہے۔ جس میں بھگوان رام کو ہدیۂ نیاز پیش کیا گیا ہے اور اُن کے کارناموں کی عظمت بیان کی گئی ہے۔

اُودھوت کا ترانہ یا نغمۂ قلندری ایک پند نامہ ہے جو اس دنیا اور سفرِ حیات کو "مایا جال" قرار دیتا ہے۔ کیوں کہ مایا (دنیائے ظاہر) کے تمام سُکھ اور راحتیں عارضی اور ناپائدار ہیں، ان کا مآل دُکھ اور پشیمانی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ دنیاوی قدرت بے پناہ دلکشی رکھتی ہے لیکن انسان کو قدرتِ افضل (یعنی اُس لازوال آتما) کی پناہ میں آکر خود سپردگی سے عبادت کی طرف راغب ہونا چاہیے اور یک سوئی سے اُس قادرِ مطلق کا دھیان اور سمرن کرنا چاہیے۔

پند نامہ کے ابتدائی بند میں اسی خیال کی تبلیغ کی گئی ہے۔ یہ بند اِس طرح ہے:۔

شامِ الم کا منظر، صبحِ طرب کا منظر — دلچسپ کس قدر ہے یہ روز و شب کا منظر
اِک رنگِ عارضی ہے جو رنگ ہے جہاں کا — عالم بہار کا ہے نقشہ کبھی خزاں کا
برباد جنسِ ہستی فسق و فجور میں ہے — کتنی سیاہ مستی تجھ بے شعور میں ہے
دنیا کی تیرے سر میں پھر بھی ہوا بھری ہے — دنیا سے پھر بھی تجھ کو اُمیدِ بہتری ہے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

گوبند کا بھجن کر گوبند کا بھجن کر

ناداں! عقیل بن کر، گوبند کا بھجن کر[1]

دُنیا اور علائقِ دنیا افراد اور اداروں کی خود غرضیوں پر اساس پذیر ہیں۔ ان کا ربط و اُنس دائمی نہیں۔ انسان کی محبت کا حقیقی مرجع و مرکز خدائے رحیم و کریم کی ذاتِ لافانی ہونا چاہیے۔ شنکر آچاریہ کی اس تلقین کو "نغمۂ قلندری" کے تیسرے بند میں واضح کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

جب تک کما کما کر لاتا ہے گھر میں دولت
کیا دوست کیا اعزّا کرتے ہیں سب محبت
لاتی ہے جب تباہی قسمت بگڑ بگڑ کر
ڈھاتی ہے اِک مصیبت صحت بگڑ بگڑ کر
اُس وقت کوئی آکر لیتا نہیں خبر بھی
آنسو نہیں بہاتی، پھر ایک چشمِ تر بھی
کرتا نہیں محبت الفت نہیں جتاتا
اپنا بھی کوئی آکر اپنا نہیں بناتا

گوبند کا بھجن کر، گوبند کا بھجن کر

ناداں عقیل بن کر، گوبند کا بھجن کر[2]

بند نمبر ۱۵ میں اسی دلیل کو آگے بڑھاتے ہوئے وقتِ آخر کی کیفیت اور اہلِ دنیا کے فی الوقت طرزِ عمل پر روشنی ڈالی گئی ہے:۔

چلتی ہے سانس جب تک، رہتی ہے رُوح تن میں
جلتی ہے شمع تیری دنیا کی انجمن میں
سب جانتے ہیں تجھ کو پہچانتے ہیں تجھ کو
آتا ہے کام جن کے وہ مانتے ہیں تجھ کو
لیکن طلسمِ ہستی جس وقت ٹوٹتا ہے
ہوتا ہے سب سے رخصت گھر بار چھوٹتا ہے
کھاتے ہیں خوف ایسا تجھ سے حبیب تیرے
بی بی بھی کانپتی ہے آکر قریب تیرے

گوبند کا بھجن کر، گوبند کا بھجن کر

ناداں عقیل بن کر گوبند کا بھجن کر[3]

لیکن دنیا کے دُکھوں سے نجات کا ذریعہ ترکِ دنیا کر کے اور فرائض سے مُنہ موڑ کر گیروا دھارن کرنا یعنی سادھو سنتوں کا لباس پہن کر بستی بستی بھٹکنا، مانگ کر کھانا اور لوگوں سے اپنی سیوا پوجا کروانا نہیں۔

---

[1] تا [2] نغمۂ قلندری اُودھوت کا ترانہ۔ منوّر لکھنوی۔ مطبوعہ جون ۱۹۵۸۔ صفحہ ۴-۵

[3] " (منوّر لکھنوی) صفحہ ۶ بند نمبر ۱۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

خمدار ہوں جٹائیں یا سر مُنڈا ہوا ہو
سنیاسیوں کا جامہ یا تن پہ گیروا ہو

سَو سَو انگ روز رچنا سو بھیس روز بھرنا
دُنیا کو لُوٹنے کے ڈھنگ اختیار کرنا

معصوم بن کے سب کو احمق بنا رہا ہے
سادہ طبیعتوں پر قبضہ جما رہا ہے

آنکھیں کُھلی ہیں پھر بھی اندھا بنا ہوا ہے
کتنا شکم پری کا چسکا پڑا ہوا ہے

گوبند کا بھجن کر، گوبند کا بھجن کر
ناداں عقیل بن کر گوبند کا بھجن کر[1]

شنکر آچاریہ ان پاکھنڈوں اور ظاہری فریبوں کو گندم نمائی جو فروشی ٹھہراتے ہوئے ان کرم کانڈوں سے دنیا کو ٹھگنے کی بجائے سچی عقیدت سے عبادتِ ذات باری کو راہِ نجات بتاتے ہیں۔ منوّر نے بہت ہی صاف اور بلیغ پیرائے میں ان کے اس اُپدیش کو اُردو شاعری کا جامہ پہنایا ہے۔ ملاحظہ ہو :

آنکھیں کھلی نہ تیری گنگا میں کیا نہایا
باقی ہے مَیل مَن میں کچھ بھی دھلی نہ کایا

انجام بَرت کا یا خیرات کا نتیجہ
ہے تیرے سامنے اب ہر بات کا نتیجہ

ظلمت دماغ و دل کی کافور اگر نہ ہوگی
عرفان و آگہی کی پیدا نظر نہ ہوگی

جینے کا لطف تجھ کو کیا خاک آسکے گا
سَو جنم لے کے بھی تو مکتی نہ پا سکے گا

گوبند کا بھجن کر، گوبند کا بھجن کر
ناداں! عقیل بن کر گوبند کا بھجن کر

ہندو دھرم تناسخ کے چکّر کو ایک دائرے کا سفر مانتا ہے جس کا لامتناہی سلسلہ تب تک ختم نہیں ہوتا جب تک انسان کذب و ریا، اور کام (شہوانی خواہشات) کرودھ (طیش) لوبھ (حرص و ہَوس) موہ (انسِ علائق) اور اہنکار (غرور) کو ترک کر کے ذاتِ باری کی پناہ میں نہیں آتا۔ ذاتِ باری کی یکسوئی سے عبادت اور ترکِ خواہشات کے ذریعہ ہی انسان تناسخ کے چکّر سے چھٹکارا حاصل کر کے نورِ الٰہی میں مدغم ہو سکتا ہے۔ جیسے قطرہ سمندر میں سما جاتا ہے۔ جیسے فارسی رُباعی میں کہا گیا ہے۔

چوں ذرہ بخورشید درخشاں پیوست
چوں قطرۂ سر گزشتہ بہ عماں پیوست

جاں بود میانِ وے و جاناں حائل
فی الحال کہ جاں داد بجاناں پیوست

---

[1] نغمۂ قلندری (منوّر لکھنوی)۔ صفحہ ۷، بند نمبر ۱۸

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سولہ صفحات کے اس کتابچے میں آخری دو صفحات میں 'رام کی باتیں' کے زیرِ عنوان ایک طویل نظم درج ہے۔ اِس مخمّس کے مختلف بندوں میں رامائن کے خاص خاص واقعات اور ذاتِ الٰہی کے شہود اور ان معجزوں کی طرف اشارے کیے گئے ہیں جو ذاتِ یزداں نے رام کی حیثیت سے اوتار لے کر (انسانی جامہ میں نمودار ہوکر) کائنات کو باطل کے ظلم و ستم سے محفوظ کرنے کے لیے کر دکھائے اور ایک مثالی انسان اور مثالی حکمران کا آدرش دنیا کے سامنے رکھا۔ اس نظم کے کچھ بند بطور نمونہ درج ذیل ہیں:۔

اہلیا کے لیے اعجاز تھی خاکِ قدم کس کی
اُٹھی شبری کے بگڑے حال پر چشمِ کرم کس کی؟
سُنی سُگریو نے بجرنگ سے رودادِ غم کس کی؟
جٹایو نے بلائیں لیں تڑپ کر بیش و کم کس کی؟
رہی بالی کے ہر الزام پر گردن یہ خم کس کی؟

خوشی پر رنج کے احساس کو ترجیح دی کس نے؟
مسرت پر ہجومِ یاس کو ترجیح دی کس نے؟
حکومت پر سخن کے پاس کو ترجیح دی کس نے؟
اودھ کے راج پر بن باس کو ترجیح دی کس نے؟
ہمیشہ سب پہ اپنے داس کو ترجیح دی کس نے؟

فطرتِ الٰہی کی شانِ کریمی کو واضح کرتے ہوئے منوّر بند نمبر ۱۱ میں کیا فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو۔ وہ ذاتِ ابدی جو جبّار و قہار بھی ہے اور رحیم و شفیق بھی ہے۔ انسانی قالب میں نمودار ہوکر کیا کیا مثالی کارنامے کرتی ہے:۔

یہ کس نے اپنے دشمن کو بھی عمرِ جاوداں بخشی؟
یہ کس نے جانکی کے غاصبوں کو بھی اماں بخشی؟
عدوئے دوجہاں کی کس نے فرمائی یہ جاں بخشی؟
جو تھا درجے میں اسفل اُس کو توقیرِ گراں بخشی؟
یہ کس نے ذرّے ذرّے کو ضیائے کہکشاں بخشی؟

مجموعی طور پر منوّر لکھنوی کا مذکورہ بالا کتابچہ "نغمۂ قلندری" "شنکر آچاریہ کے اُپدیشوں کے مجموعہ "چرپٹ پنجریک" کا بہت کامیاب اور مؤثر ترجمہ ہے جو روحانیت میں دل چسپی رکھنے والے اُردو دانوں کے لیے ایک نادر سوغات ہے۔

نسیم عرفاں

بھگوان سری کرشن کے کلامِ ربانی شریمد بھگوت گیتا کا وہ منظوم ترجمہ ہے جسے ہندوستان بھر

۱؎ نغمۂ قلندری (مترجم منوّر لکھنوی) صفحہ ۱۵ بند نمبر ۶

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

میں قابلِ رشک شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ اہلِ نظر نے منوّر لکھنوی کے اس ترجمے کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اُردو زبان میں اسے بھگوت گیتا کا بہترین ترجمہ تسلیم کیا۔ اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۳۶ء میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ دوسرا ایڈیشن کچھ ترامیم کے ساتھ ۱۹۵۵ء میں آدرش کتاب گھر، بلبلی خانہ، بازار سیتا رام دہلی۶ سے شائع ہوا جو ۲۵۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ منوّر لکھنوی نے نسیمِ عرفاں کا انتساب اپنے والدِ مرحوم ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد صاحب اُفق لکھنوی کے نام کیا ہے جو "اپنے زمانے کے ایک زبردست انشا پرداز، شاعر، ناظم، تمثیل نگار اور صحافی ہوئے ہیں اور جن کے گراں قدر جحیم و ضخیم ادبی سرمائے سے زبانِ اُردو مالا مال ہے۔"[1]

شریمد بھگوت گیتا کا شمار دنیا کی ان چند کتابوں میں ہوتا ہے جن کے ترجمے دنیا کی ہر زبان میں ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ہندوستان کی واحد کتاب ہے جو عالمی مقبولیت حاصل کر چکی ہے اور دنیا کی ہر زبان میں منتقل ہوئی ہے۔ ہندوستان میں بھی اتنے ترجمے کسی اور کتاب کے نہیں ہوئے۔ درحقیقت یہ بھارتی فلسفے کا وہ عظیم اور متبرک صحیفہ ہے جس میں مہرشی ویدویاس نے بنی نوعِ انساں کی رہنمائی کے لیے ویدانت کا پورا نچوڑ رکھ دیا ہے۔ بھارتی فلسفے اور کلچر کے اس بے نظیر رتن کی تب و تاب کو فکر و آگہی کے بدلتے ہوئے موسموں کے اثرات اور سائنس کی حد درجہ تیز پیش رفت کی روشنی بھی ماند نہیں کر سکی۔ بقول پروفیسر نرمل چندر:-

> "نوعِ انساں کی غیر محدود ترقی کے ساتھ ساتھ اس رتن کی اہمیت اور قدر و قیمت بھی بڑھتی چلی جائے گی۔ دنیا بھر کی کتبِ مقدسہ میں سے یہی ایک ایسی کتاب ہے جو کسی خاص قوم یا نسل کی کتاب نہیں ہے۔ یہ سب کی ہے اور سب کے لیے ہے۔ چونکہ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ فقط انسانی، عالمگیر اور ابدی نقطۂ نگاہ سے کہا گیا ہے اس کا مضمون زندگی ہے، رسوم نہیں۔ اس کا مقصد سب کی حقیقی اور مشترکہ بہتری ہے۔...... اس کی حرکت مقرون سے مجرّد کی بجائے مجرّد سے مقرون کی طرف ہے اور اس کی تعلیم ظہور سے حقیقت کی طرف لے جانے کی بجائے ظہور ہی میں حقیقت کا براہِ راست دیدار کراتی ہے۔

---

[1] نسیمِ عرفاں (منوّر لکھنوی) ۱۹۵۵ء ایڈیشن۔ مترجم کی جانب سے انتساب کی عبارت کا ایک حصہ

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

رشی وید ویاس کے اپنے الفاظ میں : سرو و پنشد گاوو دو گدھا گوپال نندن بارتھوو تسہ سدھیر بھوگتا دُگدھ گیتا مرت مہت" یعنی سارے اپنشد گئو ہیں، دُوہنے والا گوپال نندن یعنی سری کرشن ہے۔ ارجن بچھڑا ہے اور سلیم العقل انسان اس گیتا امرت روپی دودھ کو پینے والا ہے۔[1]"

ممتاز افسانہ نگار عصمت چغتائی (مرحومہ) کا کہنا ہے :-

" مَیں نے گیتا پڑھی ہے اور مَیں سمجھتی ہوں کہ دنیا کی WISDOM کا نچوڑ اسی میں ہے۔[2]"

گیتا کا ہمہ گیر نظریہ کسی بھی مذہب یا نظامِ فلسفہ کو رد نہ کرتا ہوا، سبھی مذاہب اور طرائقِ عبادت کا احترام کرتا ہوا، اختلاف میں وحدت، حرکت میں سکون، قید میں آزادی، فنا میں بقا اور وحدت میں کثرت کے جلوے دکھاتا ہوا انسان کو ایسی نگاہ بخشتا ہے جو آتما میں ہی پرماتما (روح میں ذاتِ خدا) جگت میں برہم (کائنات میں روحِ ابدی و ایزدی) محدود میں غیر محدود اور عارضی میں ابدی کا نظارہ کر سکتی ہے۔

گیتا میں سانکھیہ، یوگ اور بھگتی مارگ، ذاتِ یزداں سے وصال کے راستے بتائے گئے ہیں اور تفصیل سے ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ کرم (اجر و عمل) کے نتیجے میں سلسلۂ تناسخ (بار بار جنم لینے کا چکّر) اور فطرتِ انسانی کی تین صفات، ستوگُن (فطرتِ علوی)، رجوگُن فطرتِ جذباتی) اور تموگُن (فطرتِ سفلی)، علم و عمل و عامل کے موضوعات پر تفصیلاً بحث کی گئی ہے۔ گیتا کی تعلیم یہ ہے کہ برہم (حقیقت۔ ذاتِ ذوالجلال) کو پانے کے لیے انسان کو جنگلوں کی طرف کوچ کرنے اور دنیا سے کنارہ کش ہو کر ریاضت کرنے اور اس بدن کو (جس میں خدا خود جلوہ گر ہے) سُکھانے اور ایذا پہنچانے کی ضرورت نہیں۔ اسے دُنیا میں رہ کر اپنے فرائض ادا کرنے اور انسانی تعلّقات برقرار رکھتے ہوئے بھی پایا جا سکتا ہے۔ نیز سب کی ایکتا اور مشترکہ بھلائی پر اعمال کی بُنیاد رکھ کر نشکام کرم (بے لوث تکمیلِ فرض) اور خدائے واحد و مطلق کی عبادت کرنا ہی نجات کا صحیح راستا ہے۔

ا رسالہ "اوم" شمارہ اپریل ۱۹۹۲ء صفحہ ۴۳

۲ مضمون "عصمت چغتائی سے ایک ملاقات" (مضمون نگار فیروزہ فیاض) ماہنامہ "گلکدہ" سہسوان شمارہ ۱-۲-۳ ۱۹۹۲ء صفحہ ۲۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اُردو زبان میں گیتا کے بے شمار تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ نثری ترجموں میں منشی کنہیا لال عرف الکھ دھاری کا ترجمہ سب سے قدیم ترجمہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ منشی شیام سندر لال، منشی دیبی پرشاد، رائے بہادر جانکی ناتھ مدن، لوک مانیہ تلک (اُردو ترجمہ از شانتی نرائن) چوہدری روشن لال آئی اے ایس۔ محمد اجمل خاں، منشی دوارکا پرشاد اُفق لکھنوی اور من موہن لال چھابڑہ وغیرہ کے تراجم قابلِ ذکر ہیں۔ منظوم تراجم میں سورج نرائن مہر دہلوی، منشی لچھمن پرشاد صدر لکھنوی، منشی رام سہائے تمنا، خلیفہ عبدالحکیم، ستیہ پرکاش مہتاب پسرُوری، نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی، اَلم مظفر نگری، یوگ راج نظر سوہانوی، رائے بہادر شنکر دیال جج لکھنؤ، رائے برج موہن دیال آحقر لکھنوی کے علاوہ خواجہ دل محمد کا گیتا کا ترجمہ موسومہ "دل کی گیتا" اہلِ نظر سے داد پا چکے ہیں۔ دل کی گیتا اپنی سلیس اور عام فہم زبان اور رواں دواں لہجے کے باعث بہت مقبول ہوئی ہے۔ لیکن منور لکھنوی کے زیرِ نظر ترجمہ "نسیم عرفاں" کو اپنے شعری اوصاف اور اسلوبِ بیاں کے باعث ان سب تراجم میں افضل ترین ترجمہ قرار دیا جاتا ہے۔ منور نے نسیمِ عرفاں کے پیش لفظ میں یہ دعوے کیا ہے کہ انھوں نے یہ ترجمہ براہِ راست سنسکرت متن سے کیا ہے۔ اگرچہ کسی حد تک ہندی اُردو اور انگریزی میں موجود دیگر تراجم سے بھی انھوں نے میلان اور استفادہ کیا ہے۔

علامہ برج موہن دتاتریہ کیفیؔ "نسیمِ عرفاں" کے متعلق اظہارِ رائے کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :-

"نفسِ معنیٰ میں اصل سے مطابق اور خوبیِ بیان میں حسنِ ادا کی جان پایا۔ ان اوصاف اور اصل موضوع کی وقیع اہمیت کے باوجود "نسیمِ عرفاں" باغِ فصاحت کے دلدادوں کے لیے شمیمِ مشام پرور بھی ہے۔ بیان کی سلاست، بندشس کی چستی، اسلوب کی تازگی و دلآویزی اور مشکل پسندی سے اجتناب میں یہ کتاب ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔"[1]

ہندوستان کے کچھ دیگر مایۂ ناز دانشوروں اور اہم شخصیات نے بھی "نسیمِ عرفاں" کے متعلق اسی طرح کے احسن خیالات اور آرا کا اظہار کیا ہے۔ ان میں سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر آصف علی مرحوم، مسز سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر بھگوان داس، منشی مہاراج بہادر برق دہلوی، منشی دیانرائن نگم

---

[1] نسیمِ عرفاں (منور لکھنوی) طبع اوّل۔ صفحہ ۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ایڈیٹر ” زمانہ “ علامہ تاجور نجیب آبادی، ڈاکٹر گوکل چند نارنگ، جسٹس سرسلیمان، ڈاکٹر امرناتھ جھا جناب کیلاش ناتھ ہکسر، ڈاکٹر سیدا نند سنہا کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

” نسیم عرفاں “ کے بارے میں علامہ کیفی کے مذکورہ بالا تاثرات اور دیگر عظیم دانشوروں کی توصیفی آرا کہاں تک مبنی برحقائق ہیں، اس کی پرکھ کے لیے ہمیں اس ترجمے کا تنقیدی جائزہ لینا ہوگا اور کسی حد تک تقابلی مطالعہ بھی کرنا ہوگا۔

مہابھارت کی جنگ میں جب غنیم (کوروؤں) کی صفوں میں مہابھارت کا شہرۂ آفاق ہیرو پانڈو یودھا ارجن اپنے مقابل اپنے گُرو (استاد درونا چاریہ) اپنے دادا بھیشم پتامہا اور قریبی رشتے داروں کو آمادۂ پیکار دیکھتا ہے تو وہ دل شکستہ ہو کر تیر و کماں پھینک دیتا ہے اور لڑنے کا ارادہ ترک کر دیتا ہے۔ یہ کسی بُزدلی کی علامت نہیں بلکہ اپنے اُقربا کا خون بہانے سے گریز کرنے کا عقلی مشورہ ہے، لیکن اُس کے رتھ بان اور مشفق دوست بھگوان کرشن اُسے اُس وقت گیتا کا اُپدیش سنا کر تکمیلِ فرض (نبرد آزمائی) کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔ گیتا کا مقصد ترغیبِ عمل اور انسان کو صحیح راستہ پر ڈالنا ہے۔ حق و انصاف کی خاطر اگر اپنوں کا خون بھی بہانا پڑے تو اس عمل سے بھی پہلوتہی نہیں کرنی چاہیے۔ یہی گیتا کی اخلاقی تعلیم اور صحیح و صالح فلسفۂ زندگی ہے۔ یہ واضح کرتا ہے کہ رُوحِ انساں ابدی اور لافانی ہے۔ موت صرف جسم کا خاتمہ کرتی ہے رُوح کا نہیں۔ تعمیلِ فرض اور ظلم کے خلاف ہتھیار اُٹھانے کی تلقین و تاکید میں کرشن جی گیتا کے دُوسرے اَدھیائے میں کیا فرماتے ہیں۔ گیتا کے شلوک ۳۲ تا ۳۵ میں ملاحظہ ہو، جو درج ذیل ہیں :-

دوسرا ادھیائے — شلوک نمبر ۳۲ :

یدرِچھیا چوپ پنّم سوَرگ دُوارم اپاورِتم
سُکھِناہ کھشتریاہ پارتھ لبھنتے یُدھ می درِشم

شلوک نمبر ۳۳ :

اتھ چیج وامم دھرمیم سنگرامم نہ کرشیسی
تتہ سو دھرمم کیرتم چ ہتوا پاپ موا پسیسی

شلوک نمبر ۳۴ : اکیرتم چاپی بھوتانی کتھی شنتی تے اوِیا یام
سمبھاوِتیسہ چاکیرتر مرنڑ اردتی رِچیئتے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

شلوک نمبر ۳۵ : بھیا درنڑا دُپرتم مس سینتے توام مہارتھاۃ
لیے شانح توم بہومتو بھُوتوا یاسیسی لاگھ دم

منوّر لکھنوی نے اِن شلوکوں کا حسب ذیل ترجمہ کیا ہے :-

(۳۲)

ہے پارتھ یہ کیا شعارِ مذموم | کیا تم کو نہیں یہ بات معلوم
بے شک ہے وہ چھتری مبارک | بے شک ہے وہ آدمی مبارک
جس کی اِس جنگ میں ہو شرکت | بے مانگے ملے جسے یہ نعمت
ہے عرصۂ جنگ بابِ فردوس | کرتا ہے یہ کامیابِ فردوس

(۳۳)

اِس جنگ کا مدعا ہے نیکی | اِس جنگ کا مقتضا ہے نیکی
اِس سے کرتے ہو تم کنارا | اِس میں شرکت نہیں گوارا
تم کو نہیں فرض کا کچھ احساس | ہے ننگ و وقار کا نہ کچھ پاس
عزت کو تباہ کر رہے ہو | تم اِک یہ گناہ کر رہے ہو ؎

(۳۴)

تہمت تم پہ دھرے گی دُنیا | نفرت تم سے کرے گی دُنیا
ہر وقت بنائے گا زمانہ | بے وقری کا تمھیں نشانہ
غیرت والا جو آدمی ہے | حرمت والا جو آدمی ہے
اِس کے لیے خوب ہے کہ مر جائے | موتی سی جو آبرو اُتر جائے

(۳۵)

سالارِ سپہ جری ہیں جتنے | جانباز مہارتھی ہیں جتنے
کیا داد بہادری کی دیں گے | سب دل میں یہ اپنے سوچ لیں گے
میدانِ وغا سے خوف کھا کر | ارجن بھاگا ہے جی چُرا کر
اب تک جو تھی آبرو تمھاری | ہو جائے گی وہ سپردِ خواری ؎۲

؎۱-۲ نسیم عرفاں (منوّر لکھنوی) ۱۹۵۵ء ایڈیشن۔ صفحات بالترتیب: ۲۸ — ۲۸- ۲۹ (طبع دوم)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اب انہی اشلوکوں کا ترجمہ خواجہ دِل محمد کی "دِل کی گیتا" میں ملاحظہ فرمائیے :

(۳۲)

ہیں ارجن! وہی چھتری خوش نصیب — ملے معرکہ جن کو ایسا عجیب
یہ بن مانگے نعمت خود آئی ہے گھر — کھلے خود بخود آکے جنّت کے در

(۳۳)

اگر دھرم کی تُو لڑے گا نہ جنگ — اور اس جنگ میں کچھ کرے گا درنگ
تو پت تیری باقی رہے گی نہ دھرم — تجھے پاپ گھیریں گے آئے گی شرم

(۳۴)

تجھے لوگ دیکھیں گے تحقیر سے — نہ لیں گے ترا نام توقیر سے
جو باآبرو اس جہاں میں رہے — وہ مرنے کو ذلّت پہ ترجیح دے

(۳۵)

کہیں گے بہادر مہارتھ سوار — تو میداں سے ڈر کر ہوا ہے فرار
تجھے سب بلاتے ہیں عزت سے اب — یہ لیں گے ترا نام ذلّت سے تب[1]

دوسرے اُدھیائے کا ایک بہت ہی مشہور اشلوک اس طرح ہے :۔

کرمنڑیے وادھیکارستے ما پھلیشو کدا چنا
ما کرم پھل ہیتُر بھور ماتے سنگوستوا کرمنڑی

خواجہ دِل محمدؔ کا اس اشلوک کا ترجمہ حسب ذیل ہے :۔

تجھے کام کرنا ہے اومردِ کار — نہیں اس کے پھل پر تجھے اختیار
کیے جا عمل اور نہ ڈھونڈ اُس کا پھل — عمل کر عمل کر نہ ہو بے عمل[2]

منوّر لکھنوی کا مذکورہ بالا اشلوک کا ترجمہ ملاحظہ ہو :۔

تم کو تو فقط ہے کام سے کام — لازم نہیں ذکر وفکرِ انجام
پھر کام کے پھل سے لوٹ کیوں ہو — پھر اجرِ عمل سے لوٹ کیوں ہو

---

[1] دل کی گیتا (خواجہ دل محمد) ۱۹۵۴ء ایڈیشن۔ صفحات ۸۷-۸۸-۸۹

[2] " " " " ۹۲-۹۳

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

جب کام کے واسطے ہو تیار　　پھل سے ہرگز نہ ہو سروکار
بے کار مگر کبھی نہ رہنا　　دریا کی طرح مدام بہنا[1]

شریمد بھگوت گیتا کے چوتھے اُدھیائے میں گیان کرم اور سنیاس کی تعلیم ہے اور "اوتار واد" یعنی ذاتِ اَبدی کے اِس دنیا میں انسانی قالب میں نمودار ہونے کا مقصد و پس منظر بھی بیان کیا گیا ہے۔ جو ان اہم شلوکوں میں بھگوان اپنی زبانِ مبارک سے کہتے ہیں۔

اُدھیائے چہارم :-

شلوک ۶

اجوپی سن ویاتما بھوتانا میشروپی سن　　پرکرتم سوا مدِھشٹھائے سمبھوامیاتم مایا

شلوک ۷

یدا یداہی دھرمسیہ گلانر بھوتی بھارت　　ابھیوتھانم دھرمسیہ تدات مانم سرجامیم

شلوک ۸

پری ترانڑائے سادھونام وناشائے دُش کرتام　　دھرم سنستھاپنارتھائے سمبھوامی یُگے یُگے

شلوک ۹

جنم کرم چہ مے دویہ میوم یووےتی تتو ستہ　　تیکتوا دیہم پُنر جنم ما میتی یو ارجن

مذکورہ بالا شلوکوں میں ساتواں اور آٹھواں شلوک گیتا میں مرکزی اور کلیدی اہمیت رکھتے ہیں کیوں کہ اس میں گیتا کا درسِ مقدس دینے والے بھگوان کرشن انسانی قالب میں جنم لینے والی ذاتِ ذوالجلال تسلیم کیے جاتے ہیں اور وہ انسان کے لباس میں یُگ یُگ میں نمودار ہونے کا باعث اور مقصد خود واضح کرتے ہیں۔ ان اشلوکوں کا حوالہ اکثر و بیشتر رُوحانی وعظوں میں دیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا اشلوکوں کا ترجمہ حضرت منوّر نے کن الفاظ میں نظم کیا ہے۔ خواجہ دِل محمد صاحب نے انھیں کس انداز سے اُردو نظم کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ ملاحظہ کیجیے :-

ترجمہ از منوّر لکھنوی :

(۶)

رکھتا ہوں وجودِ سرمدی میں　　پیدا ہوتا نہیں کبھی میں

---

[1] نسیم عرفاں (منوّر لکھنوی) ۱۹۵۵ء ایڈیشن صفحہ ۳۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

۱ بانیِ بزمِ حیات کا ہوں — مالکِ کُل کائنات کا ہوں
پھر بھی فطرت پہ آ کے غالب — کرتا ہوں مَیں اختیارِ قالب
جب پیش آتی ہے کچھ ضرورت — کر لیتا ہوں قبول صورت

(۷)

رہتی نہیں جب ثواب کی قدر — بن جاتا ہے ہلال یہ بدر
بڑھ جاتا ہے بدی کا امکاں — سرکش ہوتا ہے جب یہ طوفاں
رہتا نہیں کوئی آگہہِ فرض — دنیا ہوتی ہے گمرہِ فرض
جب بڑھ جاتی ہے خود پرستی — کرتا ہوں قبول قیدِ ہستی

(۸)

قائم رہے جس سے فرض کی شان — منہ موڑ سکے نہ اس سے انسان
حفظِ مردانِ بے ریا کو — آئینہ طرازیِ صفا کو
زشت اعمالوں کی نیستی کو — بربادیِ مسکنِ بدی کو
ہوتا ہوں زمانے میں نمودار — کرتا ہوں مَیں قدرتوں کا اظہار

(۹)

یوں ذائقۂ حیات چکھنا — پھر راہِ عمل میں پاؤں رکھنا
دونوں باتیں مری ہیں اعجاز — ان کا بیشک عجیب ہے راز
ہو کر اِس راز سے شناسا — کرتے ہیں جو ترک جسم اپنا
رہتے نہیں دامِ زیست میں قید — مل جاتے ہیں مجھ میں ہو کے ناپید

خواجہ دل محمدؒ صاحب "دل کی گیتا" میں انہی بندوں کا ترجمہ نہایت سلیس الفاظ میں حسبِ ذیل کرتے ہیں:-

(۶)

مری ذات ہے مالکِ کائنات — نہ اس کو ولادت نہ اس کو ممات
جو کام اپنی فطرت کو لاتا ہوں مَیں — ظہور اپنی مایا سے پاتا ہوں مَیں

ا؎ نسیم عرفاں (منوّر لکھنوی)۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۵ء۔ صفحہ ۶۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

(۷)

ننزّل پہ جب وقت آتا ہے دھرم | ادھرم آ کے کرتا ہے بازار گرم
یہ اندھیر جب دیکھ پاتا ہوں مَیں | تو انساں کی صورت میں آتا ہوں مَیں

(۸)

بھلوں کو بُروں سے بچاتا ہوں مَیں | بُروں کو جہاں سے مٹاتا ہوں مَیں
جُڑیں دھرم کی پھر جماتا ہوں مَیں | عیاں ہو کے یُگ یُگ میں آتا ہوں مَیں

(۹)

جو ارجن سمجھ لے اِن اسرار کو | خدائی جنم اور کردار کو
وہ مَر کر مرے وصل سے شاد ہے | تناسخ کے چکر سے آزاد ہے [1]

اب ایک مثال آٹھویں اُدھیائے میں سے لے کر ہم دونوں تراجم کا موازنہ کریں گے۔

اشلوک ۸/۵

انت کالے چ مامیو سمرن مکتوا کلیورم
یپریاتی سامد بھاوم گیاتی ناستی اتر سنشیاہ

ترجمہ شلوک ۸/۵ از منوّر لکھنوی :-

جب زیست جواب دے رہی ہو | جب جائزہ موت لے رہی ہو
رکھ کر اُس وقت اگر مرا دھیان | چولا جب چھوڑتا ہے انسان
ہوتا ہے مرے وجود میں غرق | رہتا نہیں مجھ میں اُس میں کچھ فرق
ہر صورت سے نجات پا کر | مل جاتا ہے وہ مجھ سے آکر [2]

ترجمہ شلوک ۸/۵ از خواجہ دل محمد :-

جب انساں جہاں سے گزرتا ہوا | مری ہی کرے یاد مرتا ہوا
تو پھر اس میں شک کا نہیں احتمال | اُسے مر کے حاصل ہو میرا وصال [3]

---

[1] دِل کی گیتا (خواجہ دل محمد) مطبوعہ ۱۹۴۵ء صفحات ۱۲۰-۱۲۱
[2] نسیم عرفاں (منوّر لکھنوی) ۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۵ء ۔ آٹھواں اُدھیائے شلوک ۵
[3] دِل کی گیتا (خواجہ دل محمد) تیسرا ایڈیشن ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۷۶

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

موازنہ سے ثابت ہوتا ہے کہ خواجہ دِل محمد صاحب کی گیتا موسومہ بہ "دل کی گیتا" اپنی رُوانی اور سلاست کے باعث عوام میں زیادہ مقبول ہے اور اس مقبولیت کی مستحق بھی ہے۔ اس ترجمے میں حُسنِ اختصار بھی ہے۔ اس کے مقابلے میں منوّر لکھنوی کا ترجمہ مقابلتاً زیادہ مفصّل ہے اور فنّی خوبیوں اور صحتِ زبان سے آراستہ ہے۔ خواجہ صاحب نے جو بات دو شعروں میں کہی ہے اُس کی ترسیل منوّر لکھنوی نے چار اشعار میں کی ہے۔ دونوں ترجمے آزاد تراجم ہیں لیکن فنّی التزام اور صحتِ زبان کے اعتبار سے منوّر کا ترجمہ زیادہ پسندیدہ اور معیاری ہے۔ ترجمے کو عام فہم بنانے کے چکّر میں خواجہ صاحب نے زبان کی لغزشیں نظر انداز کر دی ہیں۔ مثلاً شلوک ۵ کے ترجمے میں دوسرا مصرعہ زبان کی خامی کا شکار ہوا ہے۔ (تو پھر اس میں شک کا نہیں احتمال) شک اور احتمال در اصل ہم معنی الفاظ ہیں لہٰذا شک کا احتمال گرامر اور زبان کے لحاظ سے غیر صحیح ہے۔ اسی طرح کی مزید مثالیں بھی 'دل کی گیتا' میں سے بطورِ حوالہ دستیاب ہیں۔ لیکن "دل کی گیتا" مقبولِ عام اور اس درسِ مقدس کے نشر و ابلاغ کے مقصد کی تکمیل میں زیادہ کامیاب ہے۔ آسان اور عام فہم سٹائل، اختصار، جامعیت اور رُوانی کے محاسن کی بدولت "دل کی گیتا" کو زیادہ ریڈرشپ ملی ہے۔

شری مد بھگوت گیتا کا گیارھواں اُدھیائے جلوۂ ذاتِ خدا سے متعلق ہے۔ اس میں مالکِ کائنات بھگوان کرشن اپنا جمالی اور جلالی رُوپ ارجن کو دِکھلاتے ہیں۔ یہ جلوہ برہنہ آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اِس لیے اس سے قبل وہ ارجن کو وہ ایک مخصوص قسم کی خدائی بصارت عطا کرتے ہیں جس سے وہ دیدارِ حق سے فیض یاب ہو سکے۔ اس جلالی رُوپ کو دیکھ کر ارجن سراسیمہ و خائف بھی ہوتا ہے اور احساسِ فخر و شرف سے خوش بھی۔ سراپا نیاز ہو کر وہ ذاتِ ابدی سے رحم و کرم کا خواہاں ہوتا ہے۔ "ارجن کی مناجات" میں سے کچھ شلوک دیکھیے :-

گیارھواں اُدھیائے شلوک ۲۵

دانشٹرا کرالانی چتے مُکھانی — درِشٹوئی وکالان لسنّی بھانی
دِشو نجانے نہ لبھے چ شرم — پرسید دیوے ش جگن نواس

ترجمہ از منوّر لکھنوی :-

خونخوار یہ دانت ہیبت آگیں — ہیں سنگ رہ قرار و تسکیں

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

جو شعلہ روئے آتشیں ہے   کم حشر کی آگ سے نہیں ہے
دل اس سے لرز اُٹھا ہے میرا   ہے یاس نے ہر طرف سے گھیرا
راحت نہیں رُوح کو میسّر   اے حاضر ناظر! کرم ہو مجھ پر[1]

ترجمہ از خواجہ دل محمدؒ :-

تمھاری ڈاڑھیں اُبھر رہی ہیں   کہ آگ محشر کی جل رہی ہے
فنا کے شعلے نکل رہے ہیں   جو اک جہاں کو جلا رہے ہیں
مرا سہارا نہ ہے ٹھکانہ   کرم ہو مجھ پر کرم ہو مجھ پر
تمھارا سائے میں سارے عالم   سروں کو اپنے چھپا رہے ہیں[2]

گیارھواں ادھیائے (شلوک ۳۲)

کالوسمی لوک کھشئے کرت پر وردھو   لوکان سماہرتو میہہ پرورتاہ
رِتے پی توام نہ بھوشینتی سروے   یے او ستھتا پرتیئ نے کیشو یودھاہ

ترجمہ از منوّر لکھنوی :-

ارجن کا سوال یہ سُنا جب   یوں کرشن ہوئے کلام بر لب
اس وقت میں درپئے فنا ہوں   موجود بصورتِ قضا ہوں
لڑنے سے ہو خواہ تم کو انکار   پھر بھی ہر سمت کے یہ سردار
جانباز یہ مرد یہ سپاہی   ہونے کو ہیں سب عدم کو راہی[3]

ترجمہ از خواجہ دل محمدؒ (شری بھگوان کا ارشاد)

قضا ہوں میں قضا ہوں میں   کہ درپئے فنا ہوں میں
جہاں کی ہست و بود کو   مٹانے آ رہا ہوں میں
یہ سُور بیر لشکری   جو تُل رہے ہیں جنگ پر
تو ہو نہ ہو یہ سب کے سب   ہلاک کر چکا ہوں میں[4]

۱؎ نسیم عرفاں (منوّر لکھنوی) صفحات ۱۴۹-۱۵۰   ۲؎ دل کی گیتا (خواجہ دل محمد) . صفحہ ۲۲۳

۳؎ نسیم عرفاں (منوّر لکھنوی) طبع ثانی ۱۹۵۵ء- صفحہ ۱۶۰

۴؎ دل کی گیتا (خواجہ دل محمد) طبع سوم ۱۹۴۵ء- صفحہ ۲۲۶

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

گیارھویں ادھیائے (وشوروپ درشن یوگ) کے دونوں منظوم تراجم کے مقابلے و موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مفہوم میں باہم کوئی خاص تفاوت نہیں۔ لیکن جیسا کہ پچھلے صفحات میں بھی تسلیم کیا جا چکا ہے خواجہ دل محمد کے ترجمے کو سلیس رواں اور عام فہم ہونے کے باعث قبولِ عام کا شرف حاصل ہے۔ بالخصوص شمالی ہند کے قارئین اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ اکثر روحانی مضامین اور مذہبی رسائل میں چھپنے والے معرفت و فلسفہ کے مضامین میں "دل کی گیتا" سے حوالے دیے جاتے ہیں۔ لیکن شعری صنائع و بدائع، فصاحت و بلاغت اور فنی التزام کے اعتبار سے منوّر لکھنوی کی "نسیم عرفاں" کے اشعار افضل تر قرار دیے جاتے ہیں۔ مثلاً گیارھویں ادھیائے کے مذکورہ بالا شلوک نمبر ۲ اور نمبر ۳۲ کے ترجموں ہی کو لیجیے۔ ڈاکٹر شارب ردولوی نے شلوک نمبر ۲۵ کے ترجمے کا ذکر بطورِ خاص اپنے فاضلانہ مضمون میں ان الفاظ میں کیا ہے :-

"پرسید دیویش جگن نواس" کے ساتھ اس مصرع کو پڑھیے — 'اے حاضرِ کل کرم ہو مجھ پر'۔ مجھے شاید کسی دعوے کا حق نہیں لیکن میں یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اس سے بہتر اور پُر اثر ترجمہ اس کا میری نظر سے نہیں گزرا۔ 'اے حاضرِ کل کرم ہو مجھ پر' میں جو دعائیہ انداز، جو لجاجت اور منت ہے وہ صرف یہی نہیں کہ پُر اثر اور فصیح ترین ہے بلکہ اشلوک کی اصل رُوح عبد و معبود کے رشتہ کا جو تعلق ہے، رحیم و کریم کی بارگاہ میں طالبِ رحم بندے کی جو کیفیت ہوتی ہے، وہ سب اس مصرع میں آگئی ہے۔"[1]

حضرتِ منوّر نے "جگن نواس" کا ترجمہ "اے حاضرِ کل" کی ترکیب میں کر کے مفہوم کو دو لفظوں میں سمو دیا ہے جبکہ یہاں شاید ضرورتِ شعری سے خواجہ دل محمد صاحب کو پورے مصرع کا سہارا لے کر اس مفہوم کو یوں ادا کرنا پڑا ہے :

ع — تمہارے سائے میں سارے عالم سروں کو اپنے چھپا رہے ہیں

ہر چند کہ اُردو کی کم ہوتی ہوئی ریڈر شپ اور فارسی الفاظ و تراکیب سے اُردو کے قاری کی کم آمیزی و عدم آشنائی کے پیشِ نظر خواجہ دل محمد کی آسان گیتا کو عوام میں زیادہ ہر دلعزیزی ملی ہے مگر اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ منوّر لکھنوی کی "نسیم عرفاں" کی اشاعت کے بہت سال بعد خواجہ دل محمد کی گیتا زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ جبکہ "نسیم عرفاں"

۱۔ منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (راج نرائن رازؔ) صفحہ ۲۱ (مضمون : نسیم عرفاں۔ صاحب مضمون ڈاکٹر شارب ردولوی)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۶ء میں مارکیٹ میں آگیا تھا۔ ظاہر ہے کہ خواجہ صاحب نے بھی "نسیم عرفاں" اور دیگر مطبوعہ تراجم بھگوت گیتا سے بھی استفادہ کیا ہوگا اور اس طرح وہ مقابلتاً زیادہ سلیس اور رُواں دواں ترجمہ قارئینِ اُردو تک پہنچا سکے۔

بھگوت گیتا میں سب سے آخر میں ایک بات "بڑے راز کی" کہی گئی ہے جو بھگوان کرشن کی جانب سے قولِ آخر ہے۔ اور اس ساری بحث و گفتگو کا نچوڑ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ صرف ایک پرمیشور (ذاتِ مطلق) میں دل لگاؤ۔ اس کی عبادت کرو۔ اسی کے لیے سب کام کرو۔ اُسی کے سامنے سر جھکاؤ، سب رسمی رواجوں اور الگ الگ فرقوں کے امتیاز سے بالاتر ہو کر پرمیشور (خدائے واحد) کا سہارا لو۔ زندگی کے بندھنوں اور تناسخ کے چکر سے مستقل نجات حاصل کرنے کا یہی ایک راستہ ہے۔

اس سے ثابت ہے کہ گیتا کی تعلیم اور اسلام کے نظریۂ توحید یا وحدت الوجود میں باہم یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس سرخفی کے بارے میں گیتا کا اُپدیش کرنے والے کرشن کیا فرماتے ہیں۔ منوّر نے اُردو اشعار میں اسے یوں بیان کیا ہے:-

اٹھارھواں اُدھیائے شلوک ۶۴

منظور ہے پاسِ دوستداری — مقصود فلاح ہے تمھاری
تم سے ہے مجھے بڑی محبت — کرتا ہوں تمھیں میں پھر نصیحت
کرتا ہوں وہ راز پھر ہویدا — جس کا نہیں کوئی مثل پیدا
امرِ برحق ہے عظمت اُس کی — لازم ہے کرو سماعت اُس کی

شلوک نمبر ۶۵ :-

کھنچ کر مری طرف دل آجائے — میرے ہی خیال میں سما جائے
تم میری طلب میں ایسے کھو جاؤ — میری ہستی میں وصل ہو جاؤ[1]
ہو میری ہی بندگی مقدّم — سر میرے ہی آستاں پہ ہو خم
آئے گا نہ میرے قول میں فرق — ہو جاؤ گے مجھ میں دوست اتم غرق

شلوک نمبر ۶۶

ہر دھرم کو اَلوداع کہہ کر — ہر کرم کو اَلوِداع کہہ کر

---

[1] نسیم عرفاں (منوّر لکھنوی)۔ طبع دوم ۱۹۵۵ء، صفحہ ۲۳۶

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

رکھو نہ کسی سے کوئی مطلب | آجاؤ مری پناہ میں اب
ہو دل نہ شکستہ رنج و غم سے | میری رحمت مرے کرم سے
ہو جائیں گے پاپ دور سارے | باقی نہ رہیں گے دکھ تمہارے[1]

اسی مفہوم کو اب خواجہ دل محمد کی گیتا کے اشعار میں دیکھیے :۔

شلوک ۶۴ :

سُن اب سرِ پنہاں کی اِک اور بات | بڑے راز کی قابلِ غور بات
کہ ارجن! تو پیارا ہے محبوب ہے | ترا فائدہ مجھ کو مطلوب ہے

شلوک ۶۵ :۔

لگا مجھ میں دل بھگت ہو جا مرا | تو کر یگ مرے سامنے سر جھکا
مجھے تجھ سے مجھ سے تجھے پیار ہے | مرا وصل کا تجھ سے اقرار ہے

شلوک ۶۶ :

تو سب دھرم چھوڑ اور لے میری راہ | تو مانگ آ کے دامن میں میرے پناہ
ترے پاپ سب دور کر دوں گا میں | نہ غمگیں ہو مسرور کر دوں گا میں[2]

گیتا کا پیغام دراصل وشو شانتی کا پیغام ہے۔ امنِ عالم کے اس پیغام کی اُجلی روشنی میں تمام ملی، نسلی اور ملکی امتیازات و عناداتِ نابود ہو جاتے ہیں۔ یہ ہر سوال کو تحمل کے نظریے سے دیکھتی ہے اور اس کی تعلیم میں یک طرفہ پن اور تعصب کی ذرا بھر بھی گنجائش نہیں ہے۔ اس کی تاکید بنی نوعِ انساں کی مساوات اور مجموعی خیر و عافیت پر ہے اور "سب کا بھلا" کے اصول پر ہے۔ گیتا کا مکالمہ کائنات و حیات کو نئی نظر سے دیکھنا سکھاتا ہے اور موہ، بھئے، شوک، دانشِ علائق، خوف و رنج) کی یکسر بیخ کنی کرتا ہے۔ بقول پروفیسر نرمل چند :۔

"گیتا کا ویدانت جنگلوں اور غاروں کا ویدانت نہیں بلکہ گھروں اور بازاروں کا عملی ویدانت ہے۔ یہ ویدانت باہمی میل ملاپ اور مل جل کر جینا سکھاتا ہے۔ اس کی تعلیم سوشلزم کی تعلیم ہے اور اگر کوئی شخص ہندوستانی کلچر کی روح کا پورا عرفان چاہتا ہے تو اسے صرف بھگوت گیتا میں ہی پایا جا سکتا ہے۔"[3]

---

[1] نسیم عرفاں (منوّر لکھنوی) صفحہ ۲۴۶

[2] دل کی گیتا (خواجہ دل محمد) صفحہ ۳۱۴۔۳۱۵ [3] ماہنامہ "اوم" نئی دہلی شمارہ اپریل ۱۹۹۲ء صفحہ ۴۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منوّر لکھنوی نے انسانیت کے لیے گیتا کی اِسی افادیت سے متاثر ہو کر اس مقدّس گرنتھ کا منظوم اُردو ترجمہ شائع کر کے نہ صرف اردو ادب اور ہندوستانی عوام کی بلکہ تمام انسانیت کی زبردست خدمت انجام دی ہے۔ ان کا یہ ترجمہ "نسیم عرفاں" فی الواقع زبان و اَدب کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ اِس ادب پارے کے متعلق ڈاکٹر شارب ردولوی نے کیا صحیح فرمایا ہے کہ:۔

"یہ ترجمہ اِس لیے اور بھی زیادہ اہم ہے کہ مترجم نے ترجمہ کرتے وقت فصاحت و بلاغت کی ان اعلیٰ قدروں کو نگاہ میں رکھا ہے جو کسی فنّی و شعری تخلیق کو تاریخِ اَدب میں بلند مقام دیتی ہے۔" [۱]

دُرگا سپت شتی (موسومہ دُرگا پاٹھ)

سنسکرت شلوکوں پر مشتمل ایک طویل منظوم منقبت ہے جو ماں بھگوتی دیوی دُرگا کی استتی (حمد و توصیف) اور اُن کے حضور دعائے خیر و برکت کی غرض سے گائی جاتی ہے۔ منوّر لکھنوی نے اس کا ترجمہ اُردو نظم میں اپنے قریبی دوست جناب گن بیر کشور ماتھر کے اصرار و فرمائش پر کیا تھا۔ چنانچہ اس ترجمہ کا انتساب ماتھر صاحب موصوف کے نام کرتے ہوئے منوّر لکھتے ہیں:۔

"حبیبِ خوش نصیب گن بیر کشور صاحب ماتھر کے نام جن کی والہانہ عقیدت کے تقاضے سے دُرگا سپت شتی کو میں مکمل طور پر جامۂ شاعری میں ڈھال سکا اور جن کی سیر چشمی اس مقدّس صحیفہ کی اشاعت کا رازِ سربستہ ہے۔"

یہ ترجمہ ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ایک مقدّس صحیفہ ہے اور اس کے پبلشر بھی منوّر کے حبیب موصوف جناب گن بیر کشور ماتھر پروپرائٹر دہلی سائنٹیفک ورکس اجمیری گیٹ دہلی ہیں جنھوں نے اِسے اپنے مصارف سے شائع کیا۔ کتاب پر سنِ اشاعت درج نہیں۔ قیمت کے خانہ کے مقابل لکھا ہے:۔

سُرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے

ظاہر ہے کہ یہ کتاب اہلِ اعتقاد کو مُفت فراہم کرنے اور ماں دُرگا بھوانی کے اُردو شناس بھگتوں میں تقسیم کرنے کی غرض سے شائع کرائی گئی۔

---

[۱] منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (مرتب راج نرائن رازؔ) صفحہ ۲۱۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کتاب کے شروع میں تعارفی مضمون میں منوّر لکھنوی اِس دعائیہ نظم کے حوالے سے فرماتے ہیں :۔

"درگا سپت شتی ہندو مذہب کا ایک نہایت مقدّس اور پُراسرار طور پر اہم اور پُر تاثیر صحیفہ ہے جو نہ صرف شکتی مذہب کے ماننے والوں میں بکمال عقیدت پڑھا جاتا ہے بلکہ ہندو مذہب کے دوسرے اسکولوں میں بھی نہایت ادب و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ صحیفہ زبانِ سنسکرت میں ہے اور اس کے تراجم ہندی نثر اور نظم دونوں میں ہو چکے ہیں۔ بعض ہندو شعرا نے اس کے کچھ حصص وقتاً فوقتاً اُردو میں بھی نظم فرمائے ہیں۔ میرے والد بزرگوار مرحوم ملک الشعرا منشی دوار کا پرشاد اُفقؔ لکھنوی نے بھی دُرگا درشن کے نام سے ایک طویل مسدّس قلم بند فرمایا تھا......

میرا یہ آزاد ترجمہ ۱۹۴۶ء میں شروع ہوا تھا اور صرف چند اَدھیائے ۱۹۵۳ء تک مکمل ہوئے تھے۔ جب اس کا ذکر میرے دوست مسٹر گن بیر کشور ماتھر سے آیا تو انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں اِسے مکمّل کر دوں۔ مسٹر گن بیر کشور ماتھر شکتی مت کے ایک پُرخلوص علمبردار اور دیوی جی کے بڑے بھگت ہیں۔ غالباً جب تک دِلّی میں رہتے ہیں، بیشتر ہر اتوار کو سات میل کا پا پیادہ سفر کرکے کالکاجی جاتے ہیں اور ان کے درشنوں سے رُوحانی مسرّت حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ماتھر صاحب کی خواہش پوری کی۔"

اصل پاٹھ کے ترجمے سے پہلے منوّر نے اپنی جانب سے ایک بندنا (دعائیہ نظم) شامل کی ہے جس میں ماں بھگوتی کے اصل سروپ پر اجمالاً روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہ کائنات کے خالقِ ازلی کی مستقل رفیقہ ہیں اور اُس کی قوتِ جلالی وجمالی کا مجسّمہ بھی۔ بندنا کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

مہادرگے کے گُن گانے لگا ہوں — مہادیوی سے بَر پانے لگا ہوں
اسے سمجھیں گے امرت دیوتا بھی — قلم سے رَس وہ بَرسانے لگا ہوں
انھیں کے دَم سے یارائے بیاں ہے — دہن میں مارکنڈے کی زباں ہے
رہوں اِس فخر سے کس طرح محروم — رقم کرتا ہوں دُرگا پاٹھ منظوم
نہیں باتیں مری زنہار فرضی — مہا مایا کی ہے ایسی ہی مرضی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

انھیں کی مُورتی پیشِ نظر ہے
انھیں کا رُوپ دل میں جلوہ گر ہے
جُلالی دُبدُبہ بھی دیکھتا ہوں
جمالی طنطنہ بھی دیکھتا ہوں
مہا مایا کی مایا ہے نرالی
کبھی دُرگا کبھی ہیں آپ کالی
کبھی ہیں سرسوتی کے رُوپ میں آپ
کبھی ہیں لکشمی کے رُوپ میں آپ
کبھی رکھتی ہیں برمھانی کا قالب
اُدا کرتی ہیں قدرت کے مطالب
کبھی بن کر ہمالہ کی کُماری
سدا شیو سے جپتی کی ہو کے پیاری
شوا کے نام سے ہوتی ہیں مشہور
کیا کرتی ہیں سب پر بارشِ نور
وہی سیتا دُلاری رام کی ہیں
وہی شیاما سلونے شیام کی ہیں
بغیر ان کے نہیں ممکن کوئی کام
انھیں میرا ہزاروں بار پرنام [1]

یہ ترجمہ چونکہ دلی ارادت وعقیدت اور ایمان کی حرارت سے مملو ہے اس لیے بے حد مؤثر ہے۔ پڑھنے والے کو دیوی دُرگا کی بھگتی کے والہانہ جذبے سے سرشار کر دیتا ہے۔ تخلیقِ کائنات کے لمحے سے لے کر آج تک کروڑوں قرنوں اور صدیوں میں معرکۂ حق و باطل ہمیشہ جاری رہا ہے جب جب بھی دُھرتی کا بھار بڑھا ہے اور ظلم و تشدّد، معصیت و استحصال کی قوتوں نے نیک و معصوم مخلوق کو پریشان و ہراساں کرنے کی مہم شروع کی، خالقِ ازل نے اپنی جُلالی قوت کے ذریعے باطل کو شکست دی۔ دھرم یا نیکی کی برتری کو از سرِ نو قائم کیا۔ دُرگا دیوی، جن کے کالی برمھانی، شوا، بھیما، چومنڈا وغیرہ کئی مختلف نام اور رُوپ ہیں۔ خالقِ کائنات کی وہ جُلالی قوت ہے جس نے ماضی میں نبردِ حق و باطل میں آگے بڑھ کر دیوتاؤں (نیکی و ایمان کی قوتوں) کا تحفظ کیا اور اسروں (ظلم و باطل کی طاقتوں) کو پسپا و برباد کر کے رکھ دیا۔ ان معرکوں کی کئی داستانیں ہندوستان کے سرمایۂ اساطیر میں محفوظ ہیں۔ زیرِ نظر ترجمہ کے تیرہ باب (ادھیائے) اسی طرح کے مختلف معرکوں کی کتھائیں (داستانیں) ہیں۔ پہلے باب میں درویشِ کامل مہرشی مارکنڈے اپنے عقیدت مند مُرید کروشٹک کو اسی طرح کی ایک کتھا سناتے ہیں۔

پہلی کتھا میں مہرشی مارکنڈے بتاتے ہیں کہ ایک بار سُورج دیوتا کی اولاد میں پانچویں

---

[1] درگا سپت شتی (منوّر لکھنوی)، صفحہ ا

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

حکمران پیڑھی پر افتاد پڑی، جب اس خاندان کے راجہ سُرتھ پر غنیم نے حملہ کر کے اُس کا راج پاٹ ہتھیا لیا۔ اس واقعہ کا بیان منوّر لکھنوی کے رواں دواں اشعار میں ملاحظہ ہو:۔

ہوئے راجہ سُرتھ جس وقت محصور
یگانوں نے سمجھ کر پست و مجبور
کیا محروم تخت و تاج اُن کو
بنایا گلشنِ تاراج اُن کو
وزیروں نے بھی ان کا ساتھ چھوڑا
مشیروں نے بھی سر اُن سے نہ جوڑا
زمانہ اب نہ تھا ان کا زمانہ
گیا غیروں کے قبضے میں خزانہ

راجہ سُرتھ مایوس و حزیں جنگل میں پناہ گزیں ہوئے۔ وہیں ان کی ملاقات سمادھی نام کے ایک شخص سے ہوئی جو جاتی کا ویش تھا۔ اس سوداگر کا مال و زر بیوی بچّوں نے چھین کر اُسے گھر سے نکال دیا تھا۔ راجہ کو اپنے جاہ و حشم کے اور ویش سمادھی کو اپنے بیوی بچّوں کے انس و تشویش نے گھیرا ہوا تھا۔ دونوں نے اپنی دُکھ بھری داستان جا کر میدھا رِشی کو سُنائی۔ رشی میدھا نے ان دونوں کو بھگوتی درگا کی پرستش کرنے کا مشورہ دیا اور بھگوتی کے اُن ابدی اور یادگار کارناموں کی کتھائیں سُنائیں کہ کس طرح بھگوتی نے مختلف ادوار میں مصیبت زدہ بھگتوں اور عقیدت مندوں اور نیکی کی طاقتوں کی امداد و حفاظت کی۔ ان حق و باطل کی لڑائیوں میں انھوں نے کس کس رُوپ اور شکل میں نمودار ہو کر اپنے بھگتوں کی دستگیری کی۔ ان کے مذکورہ مخصوص کارناموں اور کرداروں کے باعث ان کے تخصیصی نام پڑے۔ ایک بار ایک کلپ (جو ہندو شاستروں کے مطابق چار ارب بیس کروڑ سالوں یعنی ایک ہزار مہا یُگوں کے برابر ہوتا ہے) کے خاتمے پر دو عظیم اور جابر راکھشسوں مدھو اور کیٹبھ کا ظہور ہوا۔ جو برھما جی (خالق ازلی کی تخلیقی قوّت کے پیکر) کی جان کے درپے ہو گئے۔ برھما جی نے اپنی مدد کے لیے ہنیا بھگوتی کو پُکارا۔ منوّر لکھنوی کے اشعار میں درگا سپت شتی کی ایک داستان کے مذکورہ واقعہ کا بیان دیکھیے:۔

اُسی شکتی کو گھبرا کر پُکارا
جو ہے روزِ ازل سے عالم آرا
بقا کا سلسلہ جاری ہے جس سے
فنا کی شعبدہ کاری ہے جس سے
مجسّم جو رضا بھگوان کی ہے
جو دیوی اِک نرالی شان کی ہے
ہوئے برھما مخاطب بھگوتی سے
گُل افشاں تھے دہانِ ملتجی سے
مہامایا مہامایا تمھیں ہو
بہر صورت گراں پایہ تمھیں ہو

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہویدا عالمِ اعجاز میں ہو | نمایاں پردۂ آواز میں ہو
سُدھا کے نام سے جانی گئی ہو | ہر اک صورت سے پہچانی گئی ہو
تمھیں تقریر میں ندرت نما ہو | تمھیں تحریر میں حیرت فزا ہو
جہاں گستر ہو تم جان آفریں ہو | جگت ماتا پرم جننی تمھیں ہو
تمھیں سے ابتدائے بحر و بر ہے | تمھیں پر انتہائے خشک و تر ہے
بنائے بزمِ امکاں ڈالتی ہو | تمھیں چھوٹے بڑے کو پالتی ہو
تمھیں کرتی ہو دنیا کو فنا بھی | دکھاتی ہو اجل کا راستا بھی
مہا مایا تمھیں ہو کال کی رات | سراسر ہیبت و اجلال کی رات
اسی مایا کے بَل سے وشنو بھگوان | دکھلاتے ہیں ہمیشہ ایزدی شان
مگر وہ بھی ہیں محوِ خواب راحت | ہوا ہے بند ہم پر بابِ رحمت
دکھا دو شعبدے اپنے دکھا دو | جگا دو اُن کو اے دیوی جگا دو

برہما جی نے طویل استتی کی جس میں سے صرف منتخب اشعار ہی اوپر درج کیے گئے ہیں۔ ان اشعار کی روانی، موسیقیت اور مجموعی تاثر دل میں عقیدت و ارادت کے جذبات کو بیدار کرتے ہیں اور مترجم کی غیر معمولی صلاحیتوں کی گواہی دیتے ہیں۔

بھگوان کی تحریک پر بھگوان وشنو (پروردگارِ عالم) بیدار ہوتے اور انھوں نے اپنے سدرشن چکر سے مدھو اور کیٹبھ دونوں راکشسوں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا۔

اسی طرح تیسرے ادھیائے میں دیوی کے ہاتھوں مہشاسُر (دیو۔ راکشس) کی ہلاکت کی کتھا بیان کی گئی ہے۔ پانچویں ادھیائے میں باطل کی طاقتوں کے نمائندہ دو اور جابر دیتیوں شُمبھ اور نشُمبھ کا ذکر آتا ہے۔ ان دونوں طاقتور شیطانوں نے دیوتاؤں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں اور ہر طرف آفت برپا کر رکھی تھی۔ منوّر لکھنوی نے اپنے ترجمے میں دیوتاؤں (نیکی کی قوتوں) کی واماندگی اور بے بسی کی کیا مؤثر اور بامحاورہ زبان میں تصویر کشی کی ہے، ملاحظہ کیجیے۔ ان الفاظ میں خط کشیدہ محاورات کی بندشیں اور نشست دیکھیے:-

کیا ہر دیوتا کو رام اپنا | بچھایا مکر و فن کا دام اپنا
کیے برباد گھر اُن کے اُجاڑے | فضیلت کے عَلَم ہر سمت گاڑے
نہ رکھا یگیہ پر حق اُن کا باقی | یہی اس میکدے کے اب تھے ساقی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تھا اب اِک کُرۂ بے نور خورشید
تھا اب اِک پیکرِ مستور خورشید
قمر کو تھا نہ تابانی کا یارا
کُبیر ایسا غنی تھا بے سہارا
بُرن کی آب رُخصت ہو چکی تھی
بہت کچھ یم کی دُرگت ہو چکی تھی
پُون کی تندی و تیزی ہوا تھی
یہ بیماری تھی وہ جو لادوا تھی
جو تیج اگنی کا تھا وہ ڈھل رہا تھا
کلیجا سوزِ غم سے جل رہا تھا
یہ سوچا دیوتاؤں نے اُسی آن
دیا تھا ہم کو دیوی نے یہ بردان
کروگے یاد جب بھی وقتِ مشکل
کروں گی دُور فوراً کُلفتِ دل

دیوتا یہ سوچ کر ہمالہ پربت پر یکجا ہو کر مہامایا کا سمرن کرنے لگے۔ دیوی شِوا کے رُوپ میں نمودار ہوئیں۔ شُمبھ نے اپنے ایک قاصد سُگریو کے ذریعہ دیوی کو شادی کا پیغام بھیجا۔ دیوی نے جواب بھجوایا کہ :۔

لڑائی میں جو مجھ کو جیت لے گا
ظفر پاکر شکستِ فاش دے گا
سپرد اس کو کروں گی زندگی میں
بنالوں گی اُسے اپنا پتی میں

قاصد نے شُمبھ اور نشُمبھ کی طاقت کا بکھان کر کے دیوی کو مرعوب کرنے کی کوشش کی لیکن دیوی نے اپنا عزمِ مصمم دہرا دیا۔ دیوی کو مغلوب کرنے کے لیے ہمالہ پر فوجیں بھیجی گئیں۔ انھیں دیوی نے شکست دے دی۔ ان کا سالار دھومر لوچن مارا گیا۔ تب شیطانی قوتوں کے دو سپہ سالار چنڈ اور مُنڈ بھگوتی کو گرفتار کرنے کے لیے ایک لشکرِ جرار کو لے کر ہمالہ پر پہنچے۔ بھگوتی مہا کالی کے رُوپ میں غنیم کے مقابل آئیں۔ ان کا سراپا منوّرؔ نے اپنے ترجمے میں یوں بیان کیا ہے[1] :۔

بھویں ٹیڑھی جبیں تھی قہر آثار
ہوئیں اس وقت کالی جی نمودار
نگاہِ قہر تھی پھانسی کا چکر
لیے تھیں ہاتھ میں مُردے کا پنجر
سَروں کا ہار گردن میں پڑا تھا
عدو بر دُند یہ اُن کا بڑا تھا
دوشالے کی جگہ تھی شیر کی کھال
تھی رفتار قیامت آپ کی چال
بدن پر گوشت شمّہ بھر نہیں تھا
یہ سُوکھا جسم بے حد خشمگیں تھا
دھنسی اندر کی جانب گہری گہری
وہ آنکھیں تھیں کہ انگاروں کی بھٹی[1]

---

[1] درگا سپت شتی (منظوم ترجمہ۔ منوّر لکھنوی) صفحہ ۶۸

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

یہ مہا کالی کے رُوپ کا ورنن ہے جس کی پرستش بنگال میں صدیوں سے ہوتی آئی ہے۔ بھگوتی کالی نے چنڈ اور مُنڈ کو مار گرایا اور ان کے سروں کو لے کر ماں چنڈکا کے پاس پہنچیں۔ ماں چنڈکا نے بشارت کی :-

تمہارا نام اب زندہ رہے گا — زمانہ تم کو چامُنڈا کہے گا[1]

چنڈ اور مُنڈ کے مارے جانے کی خبر سُن کر شُمبھ آگ بگولہ ہو گیا۔ وہ اپنی فوجیں لے کر مہا کالی کے مقابلہ میں آیا۔ مہا کالی شیر پر سوار ہو کر میدان میں آئیں۔ ہر طرف جے جے کار کا شور ہوا۔ لشکرِ اعدا کے درمیان دیوی کو گھرا دیکھ کر دیگر شکتیاں بھی ان کی مدد کو آئیں۔ برہما کی شکتی برہمانی، مہیشور کی شکتی مہیشوری۔ وشنو کی شکتی ویشنوی، نارسنگھی، اندرانی وغیرہ شکتیاں اپنے اپنے واہنوں پر سوار آ پہنچیں۔ سبھی شکتیاں پے در پے حملے کر رہی تھیں۔ اپنی فوج کو میدان سے بھاگتے دیکھ کر رکت بیج نامی اسُر اپنا لشکر لے کر آگے آیا۔ اس کا اگر ایک قطرہ خون گرتا تو اس سے ایک اور اسُر پیدا ہو جاتا۔

جو دیکھی دیوتاؤں نے یہ حالت — ہوئے ان کے حواس و ہوش رُخصت
ہوا جب چنڈکا کو علم اس کا — ہوئیں فی الفور کالی جی سے گویا
تمہارا نام چامنڈا ہے کالی! — ہے بانا خوب، بیج دھج ہے نرالی
تم اپنا مُنہ ذرا پھیلاؤ — گرے جو خونِ دشمن، اُس کو پی جاؤ[2]

بالآخر نشمبھ اور شُمبھ دونوں مارے گئے۔ دیوتا دیوی ماں کے شکر گزار ہوئے۔ گیارھویں ادھیائے میں دیوتاؤں کی جانب سے مہا کالی کی حمد و ثنا اور شکرانہ نظم کیے گئے ہیں۔

ہوئے سب دیوتا بشاش و مسرور — شرابِ عیش و عشرت سے ہوئے چُور
ادائے شکر میں تھے سر خمیدہ — تھے فرطِ خرمی سے آبدیدہ
یہ استتِ حمدیہ وردِ زباں تھی — یہ استت حاصلِ حسنِ بیاں تھی
جگت ماتا بھوانی پاک کالی — شرن شرناگتوں کو دینے والی
ہیں فرزند آپ کے سب آپ ماں ہیں — بساطِ آرائے ہر کون و مکاں ہیں[3]
وسیلہ بہتری کا آپ ہی ہیں — ہر اک غم کا مداوا آپ ہی ہیں[4]

[1-4] درگا سپت شتی (منظوم ترجمہ۔ منوّر لکھنوی) صفحات بالترتیب ۷۱۔ ۷۹۔ ۸۹۔ ۹۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بارھویں ادھیائے میں بھگوتی تفصیلاً بتاتی ہیں کہ آنے والے زمانوں میں وہ کس کس نام سے اور کس کس صورتِ حالات میں نمودار ہوں گی۔ نیز کن کن زبردست مسائل کو حل کرنے کے بعد ان مسائل و واقعات کی تخصیص سے وہ کن کن ناموں سے موسوم ہوں گی۔

دُرگا سپت شتی کی تلاوت (پاٹھ) کی عظمت و اہمیت بھگوتی ماں خود اپنے الفاظ میں بیان کرتی ہیں۔ ان کے مطابق اس صحیفے کا باقاعدہ پاٹھ دافعِ آفات اور مشکل کُشا ہے۔

مسلّط دِل پہ جو مردِ نکو خو — نہایت شانتی سے ہو کے یکسو
پڑھے گا استتی یہ روز میری — مَیں اُس کی مشکلیں آساں کروں گی
جو انساں اشٹمی کو چودھوِیں کو — ہمیشہ ہر مہینے کی نویں کو
سُنے گا ذکر میرا ہو کے یکسو — رکھے گا دل کو اپنے زیرِ قابو
نہ ہو گا آشنا حرفِ خطا سے — بچے گا ہر مصیبت سے بَلا سے
ہمیشہ رنج و غم سے یاس سے دُور — رہے گا نکبت و افلاس دُور[۱]
دل اُس کا ہو گا خوف و بیم سے پاک — رہے گا چور سے ڈاکو سے بے باک[۲]
بپا ہو گا نہ اُس پر قہرِ شاہی — نہ ہو گی آگ پانی سے تباہی
نہ ہتھیاروں کا ڈر اس کو رہے گا — نہ پھر کوئی خطر اُس کو رہے گا
سُنے بھگتی سے یہ ساری کتھائیں — نہ اس کے پاس پھٹکیں پھر بلائیں
وہ ہو جاتا ہے آزادِ مصائب — نحوست اُس کی ہو جاتی ہے غائب[۳]
نہیں ڈرتا کسی سے صورتِ شیر — مخالف اُس کے ہو جاتے ہیں سب زیر
مرض بچوں کا ہو جائے گا عنقا — نہیں باقی رہے گا کوئی جھگڑا

بھگوتی مزید فرماتی ہیں کہ میرا ذکر و فکر بہت ہی سُود مند اور سکون بخش اور مایۂ امن و تحفظ ہے۔

یہ ہے نا اتفاقی کا مداوا — ہِلا دیتی ہے دل دو دشمنوں کا
پشاچوں کی نہیں چلتی ذرا بھی — نشاں رہتا نہیں بھوتوں کا باقی[۴]
کتھا میری جو کرتا ہے سماعت — کیا کرتی ہوں میں اُس کی حفاظت

---

۱ تا ۴ درگا سپت شتی (منظوم اردو ترجمہ منوّر لکھنوی) صفحات بالترتیب:- ۱۰۰-۱۰۰-۱۰۱-۱۰۱-۱۰۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

نکھرتی ہے اسے پڑھنے سے دانش — سنورتی ہے اسے پڑھنے سے دانش
جسے خوفِ زیانِ زندگی ہو — حکومت نے سزا پھانسی کی دی ہو
ہوں جس پر آفتیں ہر وقت نازل — جسے درپیش ہو مشکل سی مشکل
یہ دل سے اگر مجھ کو کرے یاد — جو رکھے دھیان میں میری یہ روداد
نجات اُس کو میسّر ہو الم سے — رہا ہو جائے فوراً دامِ غم سے[۱]

اس کتھا کے سلسلے کو اختتام کی طرف لاتے تھے میدھا رشی مذکورہ دونوں پریشان حال اشخاص راجا سُرتھ اور سمادھی بنیے کو بتاتے ہیں کہ اپنی استتی کے فوائد دیوتاؤں کو سُنا کر مہامایا بھگوتی انتر دھیان (نگاہوں سے غائب) ہو گئیں۔ راجہ سُرتھ کو مخاطب کر کے رشی میدھا فرماتے ہیں۔

اسی صورت سے اے راجن! وہ دیوی — کیا کرتی ہیں رکھشا دو جہاں کی
ضرورت کے مطابق سینکڑوں بار — لیا کرتی ہیں اس دنیا میں اوتار
بپا ہوتا ہے جب شورِ قیامت — جب آجاتی ہے بدکاروں کی شامت
مہاکالی کا رکھ لیتی ہیں قالب — گنہ گاروں پہ آجاتی ہے غالب
مہاماری بھی بن جاتی ہیں سرکار — یہ اس صورت میں ہوتی ہیں نمودار
جب آجاتا ہے وقتِ آفرینش — کرم کی، مہر کی ہوتی ہے بارش
ہویدا ہو کے کہلاتی ہیں سرشٹی — بنا کرتی ہیں راہیں پرورش کی[۲]

میدھا رشی کی زبانی بھگوتی کی کتھائیں سُن کر راجا سُرتھ اور سوداگر سمادھی نے مہامایا بھگوتی کی پرستش شروع کر دی۔ تین برسوں کی مسلسل عبادت و ریاضت کے بعد انھیں دیوی نے درشن دیے اور اُن کے مَن کی مُرادوں کی تکمیل کا وردان دیا۔

دُرگا سپت شتی کا زیرِ نگاہ ترجمہ صحتِ مفہوم، صداقتِ بیان اور طہارتِ موضوع کے اعتبار سے کھرا اور پاکیزہ ترجمہ ہے۔ نفسِ مضمون کی وضاحت و ترسیل میں کوئی خامی اور لغزش کہیں دکھائی نہیں دیتی اور نہ ہی سیاق و سباق کا ربط کہیں ٹوٹتا ہے۔ ترجمے کی سلاست، بندش کی چستی، حمد و ثنا کے ساتھ موافقت رکھنے والا طہارت فزا سرمایۂ الفاظ، موزوں اور مترنم بحر کا انتخاب، محاورے کی چاشنی اور مؤثر لب و لہجہ مترجم کی مہارت اور مشاقیِ فن کے غماز ہیں۔ ترجمہ اپنے پاکیزہ

---

۱ ۔ ۲ ۔ درگا سپت شتی (منظوم ترجمہ منوّر لکھنوی) صفحات ۱۰۳ – ۱۰۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

مقصد کی تکمیل اور اُس پیغام کی ترسیل میں کامیاب ہے جس کے نشر و ابلاغ کے لیے یہ ترجمہ خاص طور پر کروایا گیا ہے۔ اُردو زبان کے رُوحانی سرمایۂ ادب میں یہ قابلِ تحسین اضافہ ہے۔

رامائن بالمیکی

آدی کوی مہرشی بالمیک کی لافانی سنسکرت تخلیق ہے جس کا ۶۷۶ صفحات پر مشتمل نثری ترجمہ منوّر لکھنوی نے لاہور کے ایک پبلشر کی فرمائش پر کیا تھا۔ یہ نثری ترجمہ اردو زبان میں ۱۹۳۱ء میں سردار سنت سنگھ سجد یو اینڈ سنز لاہور ناشرانِ کتب نے شائع کیا تھا۔ کتاب کے مختصر دیباچے بعنوان "نذرانۂ رُوح" میں منوّر لکھتے ہیں:-

"سردار سنت سنگھ کی فرمائش ہے کہ میں بالمیکی رامائن کو آسان، سلیس، بامحاورہ اور روزمرہ کی زبان میں اردو نثر کا جامہ پہناؤں۔ یہ کیوں؟ ـــــ والمیکی رامائن کے اُردو میں متعدد ترجمے موجود ہیں اور وہ بھی ایک سے ایک قابل اور لائق اہلِ قلم کے قلم سے۔

پھر اس مزید ترجمے کی کیا ضرورت ہے

اس کا جواب مختصر یہ ہے۔ سردار صاحب کی رام بھگتی۔ رام کے چرتروں کو رائج الوقت زبان اور موجودہ لب و لہجہ میں بیان کرنے کا شوق، نیز ادبی خدمت بالمیکی رامائن کا مکمّل و جامع ترجمہ والدِ مرحوم ملک الشعراء منشی دوارکا پرشاد اُفقؔ نے ایک تاجرِ کتب کی فرمائش سے ۱۹۰۵ء/۱۹۰۶ء کے زمانے میں کیا تھا۔ ان کے ترجمے کو جیسی مقبولیت حاصل ہوئی وہ عالم آشکارا ہے اور امرِ واقعہ ہے کہ اُن کا ایسا زورِ قلم مجھے سو مرتبہ جنم لینے پر بھی میسّر نہیں ہو سکتا۔"[۱]

دیباچے میں اپنے والد کی قادر الکلامی کے اعتراف اور اپنے عجزِ طبع اور کسرِ نفسی کے اس اظہار کے ساتھ منوّر لکھنوی نے رامائن اور اس کے مصنّف مہارشی بالمیک کی عظمت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ دیباچے سے پہلے ترجمے کے ناشر سردار سنت سنگھ کی تصویر شاملِ کتاب ہے اور مہرشی

۱۔ رامائن بالمیکی باتصویر (ترجمہ منثور از منوّر لکھنوی) مطبوعہ ۱۹۳۱ء۔ صفحہ ۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بالمیک کو نظم کی شکل میں ہدیۂ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم کے دو بند درج ذیل ہیں۔

ہوئی وجود سے تیرے ہی ابتدائے سخن | پڑی ترے ہی یدِ پاک سے بنائے سخن
تری ہی ذاتِ مقدس تھی رہنمائے سخن | کہاں ہے اور کوئی جز ترے خدائے سخن

ہے بہرہ جن کو سخن گوئی کے سلیقے سے
وہ پھول لاتے ہیں چن کر ترے حدیقے سے

جو لفظ منہ سے ترے وجد میں نکلتا تھا | معاً وہ کالبدِ شاعری میں ڈھلتا تھا
ہر ایک رکن اشاروں پہ تیرے چلتا تھا | قلم ترا تھا جو لعل و گہر اگلتا تھا

خدا کی شان تھا کیا پاک و صاف سینہ ترا
کھلا وہ سب پہ جو مستور تھا خزینہ ترا

منوّر کی رامائن بالمیکی کا دیباچہ "نذرانۂ روح" ان دعائیہ اشعار سے شروع ہوتا ہے:۔

اے جادہ نمائے عشق و فنا | اے عقدہ کشائے سرِّ بقا
اے عارفِ کامل صاحبِ دل

دانندۂ رازِ کیفِ نہاں | بینندۂ روشنیِ عرفاں
اے عالم و عامل صاحبِ دل

مقبول ہو روح کا نذرانہ | آباد ہو دل کا کاشانہ
برآئے مُرادِ منوّر کی

ہوں ابلقِ دنیا پر غالب | دل پرم آنند کا ہے طالب
بھگتی مل جائے سیابر کی[1]

رامائن اور اس کے مصنف کے متعلق اس دیباچے میں اہم اور مفید اطلاعات فراہم کی گئی ہیں جن کا ذکر یہاں بے محل نہیں ہوگا۔ لہٰذا کچھ ضروری اقتباس اس دیباچے میں سے درج ذیل ہیں:۔

"زمانۂ قدیم کے باکمال رشیوں نے رامائن کو ایک درخت سے تشبیہہ دی ہے۔ اور اسی رعایت سے ان کا ارشاد ہے کہ برہم یعنی ذاتِ مطلق سے اس درخت کا ظہور ہوا ہے۔ ہستی بمنزلہ تخم ہے

---

[1] رامائن بالمیکی (منوّر لکھنوی ۱۹۳۱ء ایڈیشن صفحہ ۳۔ پہلا سرگ

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اور رامائن اِس تخم سے معرضِ وجود میں آئی ہے۔ اس درخت کی کونپل گیان (یعنی معرفت) ہے۔ اس کی شاخیں اس کے سات کانڈ ہیں۔ چوبیس ہزار شلوک اس کے پتے اور پانچ سو سرگ اِس کی چھوٹی چھوٹی شاخیں ہیں۔ اس درخت کی نشو ونما رشیوں کے دستِ مقدس سے ہوئی ہے۔ انسان کے جُملہ مقاصد رامائن کے وسیلے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ دنیا و عقبیٰ میں اس کی کامیابی کے جتنے ذرائع ہیں ان میں رامائن کو تفوق حاصل ہے۔ ارتھ یعنی دولت، دھرم یعنی فرائضِ دارین کے ادا کرنے کی صلاحیت۔ کام یعنی خواہشات (مدعا براری) اور موکھش یعنی نجات یا کامل رستگاری۔ اس شجرِ مقدس کے شیریں ثمر ہیں...... لہ"

منوّر اِس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"والمیک جی کی عظمت عالم آشکارا ہے۔ آپ آدی کوی یعنی دنیا کے شاعرِ اوّل ہیں۔ بھگوان رام کے ذکرِ مقدس کا قلم بند کرنا آپ ہی کا کام تھا۔ رامائن ایسی متبرک اور مقدس کتاب تصنیف فرما کر مہرشی والمیک نے اہلِ دنیا پر وہ احسان فرمایا ہے جو کبھی ادا نہیں ہو سکتا۔ کمال تو یہ ہے کہ جہاں معنوی حیثیت سے مہرشی نے رامائن کو ویدوں کا ہم پلہ بنا دیا ہے وہاں ظاہری خوبیوں سے بھی اِس صحیفے کو مزین کرنے میں آپ نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ نادر تشبیہات، اچھوتے استعارے، عجیب و غریب صنائع و بدائع، محاکات، مناظرِ قدرت کی عکاسی، واقعات کی ترتیب، ان کا اسلوب، زبان کی حلاوت، خیالات کا تسلسل، غرض ایسی بے شمار خوبیاں رامائن میں ہویدا کر کے مہرشی والمیک نے واقعی معجزہ نمائی کی ہے۔ بھگوان رام کے چرتروں کو لکھتے لکھتے ان میں اس قدر محو ہو گئے ہیں کہ ان کی ہستی بھگوان رام کی ہستی میں وصل ہو گئی ہے۔ لہ"

رامائن والمیکی کے زیرِ نظر نثری ترجمے کا اسٹائل منوّر لکھنوی کے مابعد کے نثری تراجم سے خاصا مختلف ہے۔ یہ ترجمہ منوّر کے مطبوعہ تراجم میں سب سے پہلا نثری ترجمہ ہے۔ اگرچہ اُس زمانے میں مقفّیٰ اور مسجّع عبارت لکھنے کا رواج ترک ہو چکا تھا۔ تاہم نثری عبارتوں میں فارسیت کا دخل شاید معیاری نثر کے لوازمات میں سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ اس ضخیم ترجمے کے

لہ لہ رامائن والمیکی (نثری ترجمہ از منوّر لکھنوی) ۱۹۲۱ء ایڈیشن صفحہ ۱۱، ۱۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

آغاز میں دیباچے میں یہ دعوے کیا گیا ہے کہ منوّر لکھنوی نے رامائن والمیکی کا ترجمہ اپنے ناشر سرودار سنت سنگھ کی اس فرمائش کی تعمیل میں کیا ہے کہ رامائن کو آسان، سلیس اور روزمرہ کی زبان میں اُردو کا جامہ پہنایا جائے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ کیوں کہ زیرِ بحث ترجمے میں وہ سادہ اور سلیس نثر کہیں دکھائی نہیں دیتی جو منوّر کے حصولِ آزادیِ وطن کے بعد کے نثری تراجم اور تالیفات میں نظر آتی ہے۔ نہ اس میں وہ قدرتی بے تصنع اور روزمرہ بول چال کی زبان ملتی ہے جو منوّر کی نثری تخلیقات و تراجم کا زمانۂ مابعد میں طرۂ امتیاز بنی۔ نیچے دی گئی چند مثالوں سے اس سچائی کی تصدیق ہو جاتی ہے:۔

چوں کہ رامائن کی کہانی ایک مقبولِ عام تاریخی کہانی ہے جس سے کوئی بھی تعلیم یافتہ ہندوستانی ناآشنا نہیں ہوگا۔ لہٰذا یہاں اس کہانی کا خلاصہ تحریر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس لیے نثری ترجمے کے معیار کا جائزہ لینے کے لیے مختلف سرگوں سے براہِ راست کچھ اقتباسات اخذ کر کے درج ذیل کیے جا رہے ہیں۔ آٹھویں سرگ کی ایک عبارت دیکھیے:۔

"دھرم شاستروں کی ہدایت ہے کہ جب کوئی کارِ خیر سر انجام کرنے کے لیے انسان تیار ہو تو اُسے لازم ہے کہ پہلے ہی سے پاکیزگی اور طہارت اختیار کرے۔ نیز جب تک جگیہ ختم نہ ہو جائے کسی کو کسی کی ذات سے کوئی تکلیف اور ایذا نہ پہنچنے پائے۔ ورنہ جگیہ میں خلل واقع ہوتا ہے اور دل کی مُراد بر نہیں آتی۔ جگیہ میں برہم راکھشسوں کی طرف سے بڑی مزاحمت ہوتی ہے۔ برہم راکھشسوں سے مُراد اُن برہمنوں سے ہے جو بید اور شاستر سے بہرہ ور ہونے پر بھی اُن کی ہدایات پر عمل نہ کریں اور بھگوت بھگتی سے محروم ہوں۔ ایسے برہمن دھرم کرم کے معاملوں میں ہمیشہ دست اندازی کرتے ہیں۔ اس لیے کسی نیک کام کے آغاز سے پہلے اُن کی شرارتوں کا انسداد کر دینا مناسب ہے۔"[1]

سرگ نمبر اڑتالیس ۴۸ میں سے ایک عبارت پر نظر ڈالیے:۔

"بھگوان رام چندر جی نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر نہایت ادب کے ساتھ وشوامتر اجی سے دریافت کیا کہ یہ کون سا شہر سامنے نظر آ رہا ہے۔ فرمایئے اور اس جنگل کا کچھ حال بتایئے جس سے ہم لوگ گزر رہے ہیں۔ وشوامتر اجی نے کہا ــــ یہ جنگل نہایت مقدس ہے۔

---

[1] رامائن بالمیکی (نثری ترجمہ۔ منوّر لکھنوی) صفحہ ۳۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

گوتم رشی کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ بڑے مہاتما پُرش تھے۔ دیوتا تک اُن کا احترام کرتے تھے۔ اس جنگل کو انھوں نے ریاضت و عبادت کے لیے منتخب کیا تھا۔ وہ اپنی استری اہلیا کے ساتھ بھگوت بھجن میں شب و روز گزارتے تھے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ گوتم رشی تھوڑی دیر کے لیے اپنے آشرم سے کہیں چلے گئے۔ اسی وقت راجہ اندر کے سر پر جنون سوار ہوا اور وہ گوتم رشی کے بھیس میں اہلیا کے پاس جا پہنچے۔ اہلیا حُسن و جمال میں لاثانی تھی اور راجہ اندر اُس کے گرویدہ تھے۔ راجہ کو خیال تھا کہ دن کے وقت ازدواجی فرائض ادا کرنا رشیوں کے اصول کے خلاف ہے۔ اس لیے اگر اس قسم کا کوئی مطالبہ اہلیا سے کیا جائے گا تو سارا بھانڈا پھُوٹ جائے گا اور اس کی چال نہ چلے گی لیکن نفسِ شہوانی جس وقت کسی ذی رُوح پر بھوت بن کر سوار ہوتا ہے تو پھر اسے پاگل بنا کر چھوڑتا ہے۔ عام طور پر تو کسی میں اس کے مقابلے کی طاقت باقی نہیں رہتی۔ راجہ اندر بھی اس وقت جذباتِ شہوانی کے زیرِ اثر تھے، انھیں نیک و بد کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ جوش میں آکر اہلیا سے مطالبہ کر بیٹھے۔

اہلیا کو پہلے تامّل ہوا اور اُس نے کہا۔ رشیوں کو زیبا نہیں کہ دن کے وقت ایسا کام کریں۔[1]

نثر کا ایک اور اقتباس سرگ ۶۲ میں سے :-

"مہارانی کیکئی کو دیکھ دیکھ کر راجہ دسرتھ کی رُوح کانپ رہی تھی۔ تمام بدن بید کی طرح لرزاں تھا۔ وہ ایک ایسے سانپ کی مانند تھے جس کو منتر پڑھ پڑھ کر بے تاب و تواں کر دیا گیا ہو۔ ان پر موہ طاری تھا۔ وہ خود کو لعن طعن کر رہے تھے۔ ان کی عقل کا چراغ گُل ہوگیا تھا۔ اسی وجہ سے غصّہ نے آدبایا اور وہ دل ہی دل میں سوچنے لگے کہ کیکئی شاید خاندان کی تباہی پر آمادہ ہے۔

وہ غصّہ نہ ضبط کر سکے اور آخر کار اُن کی زبان سے یہ فقرہ نکل گیا۔

"کیکئی! کیکئی۔ تم کون ہو۔ تمہارے سر پر کون پاپ سوار ہے۔ کیا کوئی ہتیا مول لے رہی ہو۔ آخر رام چندر کی کوئی خطا؟ کوئی قصور؟ کس گناہ کی پاداش میں ان کی جلاوطنی کی سزا تجویز کی جا رہی ہے؟ میں نے آخر تمہارا کیا بگاڑا ہے جو اس قدر بدلگامی کے ساتھ مجھ سے باتیں کر رہی ہو.....؟

---

[1] رامائن بالمیکی (منوّر لکھنوی) صفحہ ۲۱۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

لیکن پھر سنبھلے اور سوچنے لگے کہ غصہ کرنا جائز نہیں۔ اس لیے خوشامد سے کام لینے لگے۔ وہ کیکیئ جی کے پاؤں پر گر پڑے اور منت ساجت کرنے لگے۔ یہ اُن کی انتہائی ذلت تھی، مگر وہ اس قدر بے کس و مجبور تھے کیکیئ جی سے رحم و کرم کی درخواست کی۔ لیکن اِدھر قطب از جائی جُنبد کا معاملہ تھا۔[1]

اوپر کے حوالوں میں دی گئی عبارتیں دقیق الفاظ اور فارسیت سے معمور ہیں۔ بالمیکی رامائن ایک داستان ہے' ادبی تنقید کی کتاب نہیں۔ پھر ابتدائی صفحات میں تو بامحاورہ، سلیس اور روزمرّہ کی زبان میں بالمیکی رامائن کو اُردو نثر کا جامہ پہنانے کا اعلان بھی کیا گیا ہے۔ جہاں تک ترجمے کے بامحاورہ ہونے کا تعلق ہے۔ یہ دعوے بالکل صحیح ہے لیکن ترجمے کی زبان کو سلیس اور روزمرّہ کی زبان قرار دینا برحق نہیں۔ مذکورہ عبارتوں میں "کارِ خیر" "طہارت" "ایذا" "خلل" "مزاحمت" "انسداد" "دست اندازی" "تجاہلِ عارفانہ" "بہرہ ور" "شب و روز" "ازدواجی فرائض" "جذباتِ شہوانی" "لرزاں" "بے تاب و تواں" "آمادہ" "پاداش" "جلاوطنی" "بدلگامی" "قطب از جائی جُنبد" جیسے الفاظ کا شعوری طور پر استعمال ثابت کرتا ہے کہ ترجمے کی زبان سلیس نہیں بلکہ فارسیت سے مغلوب ہے۔ مذکورہ دقیق فارسی الفاظ کے بہت آسان متبادل اُردو الفاظ سے کام لیا جا سکتا تھا۔ کارِ خیر کی جگہ نیک کام، ایذا کی جگہ دُکھ یا تکلیف۔ خلل کی جگہ رکاوٹ۔ انسداد کی جگہ روک تھام۔ پاداش کی جگہ سزا۔ جلاوطنی کی جگہ بن باس جیسے الفاظ استعمال کر کے نثر کو سلیس بنایا جا سکتا تھا۔ اور اس سے ترجمے کے معیار میں بھی کوئی خامی آنے کا امکان نہیں تھا۔

شاید بیسویں صدی کے دوسرے تیسرے دہے تک اُردو نثر کا معیار، عصری تقاضوں اور ادبی ماحول کے تحت یہی ہوگا کہ نثر و نظم میں زیادہ سے زیادہ فارسی الفاظ استعمال کیے جائیں۔ نصف صدی قبل کی نثر کے ہیئتی اور لسانی رجحانات و رواج کو آج کے پیمانوں سے ناپنا اُس دور کے فنکاروں کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ اغلب ہے کہ اُن دنوں میں اسی اسٹائل کی نثر مقبولِ عوام رہی ہوگی۔ تاہم ترجمے کی سلاست کا دعویٰ ایک نیم صداقت ثابت ہوتا ہے۔ البتہ ترجمہ کی نثر آراستہ و پیراستہ ہے۔ اس میں شوکتِ الفاظ کا زیادہ اہتمام و التزام ہے اور محاورے کا چٹخارہ بھی۔

منوّر لکھنوی کی رامائن بالمیکی کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ ترجمے میں جا بجا اشعار بھی

---

[1] رامائن بالمیکی (منوّر لکھنوی) صفحہ ۳۵۸-۳۵۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

زیرِ استعمال لائے گئے ہیں بلکہ بالعموم ہر نئے سرگ کے آغاز میں منوّر لکھنوی نے اپنے یا دیگر شعرا کے اشعار درج کیے ہیں جن اشعار سے سرگ کا آغاز ہوتا ہے، وہ بھی بالعموم دقیق اور قاری سے ذہنی ورزش کے متقاضی ہیں۔ شاید بیسویں صدی کے رُبعِ اوّل میں یہ طرزِ تحریر مقبول و مستحسن سمجھا جاتا ہوگا اور اس سے کتاب کے مصنّف کی علمیت کے متعلق بہتر تاثر ہوتا ہوگا۔ ذیل میں کچھ ایسی مثالیں درج کی جا رہی ہیں۔

سرگ نمبر ۵۶ کے شروع میں غالبؔ کا یہ شعر درج ہے:-

خانہ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجیے　　صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست[1]

سرگ نمبر ۵۷ کے آغاز میں غالبؔ کے اشعار ہیں:-

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا　　دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز　　پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا[2]

مذکورہ باب رام چندر جی کو بن میں چھوڑ آنے کے بعد وزیر سومنت کی واپسی، راجہ دسرتھ کو اس کی خبر سنانے اور ایودھیا نگری میں صفِ ماتم بچھ جانے کے بارے میں ہے۔

سرگ نمبر ۲۹ کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے:-

(یہ سرگ رانی کیکئی کو گمراہ کیے جانے اور منتھرا باندی کے بہکاوے میں آجانے کے بارے میں ہے)

رفتہ رفتہ غیر نے پیدا اثر کر ہی لیا　　باتوں باتوں میں کسی کے دل میں گھر کر ہی لیا

اضطرابِ شوق میں تھی اس قدر وارفتگی　　عالمِ صبر و سکوں زیر و زبر کر ہی لیا[3] (منوّر)

سرگ نمبر ۳۷ کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:-

(اس باب میں کیکئی سیتا جی کو بن باس میں جانے کے لیے فقیرانہ لباس پیش کرتی ہے)

سُرخیِ خونِ محبت ہے نظر کو مرغوب　　رنگ چڑھتا ہی نہیں اورِ ستم گاروں پر[4] (منوّر)

یہ اشعار دقیق ہونے کے علاوہ بعض مقامات پر کتابت کی غلطیوں کے باعث مجروح بھی ہیں مثلاً سرگ نمبر ۵۵ کا ابتدائی شعر:-

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا　　حباب موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا[5]

---

۱ تا ۵ رامائن بالمیکی (منوّر لکھنوی) صفحات بالترتیب: ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳ - ۴۵۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

جنابِ کاتب نے اِس شعر کے مصرعہ اُولیٰ میں "بیاباں ماند گی" کی جگہ "بیاباں زندگی" لکھ دیا ہے۔ علیٰ ہذالقیاس اِسی طرح کئی مزید اشعار بھی کاتب کی ستم ظریفیوں کا تختۂ مشق بنے ہیں۔ لیکن ان خامیوں کی ذمّہ داری ناشر پر آتی ہے۔ مصنّف یا مترجم پر نہیں۔

منوّر لکھنوی کا ترجمۂ رامائن بالمیکی اپنے عہد کے قارئین کے ذوقِ نظر اور ذہنی معیار کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور یہ ایک کامیاب ترجمہ ہے۔

گیت گووِند

ایک مقدّس رُوحانی گرنتھ ہے جسے وِشنو بھگت اتنی ہی عقیدت سے پڑھتے ہیں جتنی شردھا اور عقیدت سے ویدوں، شاستروں اور اپنشدوں وغیرہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ بھگوان کرشن کی راس لیلاؤں سے منسوب گیتوں کا مجموعہ ہے جسے منوّر لکھنوی نے اُردو شاعری کے لباس میں پیش کیا ہے اور جو اُردو زبان میں گیت گووند (عرف سرمدی نغمے) کے نام سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ اس کی ضخامت ۲۴۸ صفحات ہے اور یہ خوبصورت ادبی اور رُوحانی صحیفہ منوّر کے نجی اشاعتی ادارہ آدرش کتاب گھر، فیض گنج، دریا گنج دہلی نے شائع کیا تھا۔ منوّر لکھنوی نے "گیت گووند" کا یہ ترجمہ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے دو برس بعد ۱۴ مارچ ۱۹۵۹ء کو شروع کیا اور ۲۳ جولائی ۱۹۶۱ء کو اِسے مکمّل کر دیا لیکن مالی مشکلات کے باعث اس کی اشاعت تین برس تک التوا میں رہی۔ اِس ترجمے کے شروع کے ۵۶ صفحات دیباچوں کے لیے وقف ہوئے ہیں۔ ترجمے کے ۱۹۲ صفحات الگ شمار کیے گئے ہیں۔

گیت گووند کے اصل مصنّف جے دیو نے سنسکرت بھاشا میں لکھے اپنے ان گیتوں میں رادھا اور کرشن کے باہمی پریم، ان کے ہجر و وصل کی کیفیات اور راز و نیاز کو شرنگار رس میں مرد اور عورت کے جسمانی رِشتوں کے خطوط پر بیان کیا ہے۔ عام قاری یا بھگوان کرشن کے تئیں جذبۂ عقیدت و نیاز سے عاری دِلوں کو "گیت گووند" کا مرکزی جذبۂ عشقِ الٰہی اور اس میں درس و پیام سمجھ میں نہیں آسکتا۔ وہ اسے مرد اور عورت کے باہمی اختلاط و راز و نیاز اور تلذّذِ بدن کی داستان ہی تصوّر کرے گا۔ ہر چند کہ ایران اور ہندوستان میں صوفیائے کرام کا مسلک بھی ذاتِ الٰہی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کو دنیوی اور مجازی معشوق و محبوب جیسا تصوّر کر کے عبادت کے بلند مقامات تک رسائی پانے میں اعتقاد رکھتا ہے۔ مسلمان فقیروں کی وہ جماعت جو "سدا سُہاگن" کہلاتی ہے، اسی مکتبۂ فکر کی نمائندگی کرتی ہے۔

چونکہ "گیت گووند" میں وصل و فراق کی کیفیتیں جسمانی قربت و مواصلت، اور دو جسموں کی کچھ مدت کی دوری اور جدائی سے جنم لینے والی تڑپ اور جلن کی سطح پر بیان کی گئی ہیں، اس سے کئی طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ بالکل فطری بات ہے۔ اس مقدس صحیفے کا اردو میں ترجمہ کرتے وقت اس طرح کا اندیشہ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے منورؔ لکھنوی جیسے مشاق، پختہ کار اور قادر الکلام مترجم کو بھی اس ترجمے میں بے حد احتیاط سے کام لینا پڑا، تاکہ اس فن پارے کی نغماتی اور صوتیاتی خوبصورتی اور شعری محاسن کے ہم دوش اس کا مرکزی جذبۂ عقیدت و عبودیت اور "پرماتما" کے آگے "آتما" کی خود سپردگی کا بنیادی تاثر برقرار رہے کیوں کہ اس شعری تصنیف کا ظاہری لباس عاشقانہ ہے۔ لیکن تانا بانا عقیدت مندانہ ہے اور ہر "سرگ" کے آخر میں اصل مصنف جے دیو نے اس جذبۂ عقیدت کو بار بار دہرایا ہے جو اُس کے دل میں رادھا اور کرشن کے تئیں موجزن ہے اور ایک طرح سے اُس پاک مقصد کی رہ رہ کر یاد دہانی کرائی ہے جس کے لیے یہ گیت تخلیق کیے گئے۔ وہ مقصد ہے رادھا اور کرشن کی بھگتی، بندگی اور اُن کی لیلاؤں کی یاد اور چرچا۔

"گیت گووند"، سنسکرت ادب کا ایک نادر فن پارہ ہے۔ اس کے مصنف جے دیو کا جنم بنگال میں ضلع ویر بھوم کے ایک گاؤں کیندو بِلو میں بارھویں صدی عیسوی میں ہوا تھا۔ ان کے والد کا نام بھوج دیو تھا۔ جے دیو بنگال کے راجہ لکشمن سین کے دربار کے پانچ رتنوں میں سے ایک تھے۔ نابھاداس جی کی "بھگت مال" میں جے دیو کا ذکر ایک باکمال کرشن بھگت کی حیثیت سے آیا ہے۔ اپنی عمر کے آخری حصّے میں جے دیو جی کا قیام جگن ناتھ پوری میں تھا۔ ان کی کچھ دیگر تصانیف بھی رہی ہوں گی لیکن مؤرخینِ ادب کے علم میں ہنوز جے دیو کی یہی ایک تصنیف "گیت گووند" ہی آئی ہے جس نے جے دیو کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ یہ تصنیف وشنو بھگتوں میں حد درجہ مقبول ہے۔ مہاپربھو چیتنیہ جی نے ایک ست سنگ (محفلِ وعظ) میں "گیت گووند" کو بھی گیتا اور بھاگوت وغیرہ کی طرح بھگتی شاستر کی مستند کتاب تسلیم کیا تھا۔ اڑیسہ کے راجہ رُدر پرتاپ دیو نے ۱۴۹۸ء میں یہ شاہی فرمان جاری کیا تھا کہ وشنو بھگت اور نرتک (رقاص لوگ) صرف جے دیو کی دو گیت گووند کے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

نغمے ہی یاد کریں اور مجالس میں گائیں۔

ہندی اور سنسکرت ادب کے نقّاد اور عالم ڈاکٹر ہزاری پرشاد دویدی نے منوّر کے اس ترجمے "گیت گووند" یا "سرمدی نغمے" کے ابتدائی صفحات میں "گیت گووند کا پس منظر" کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس میں انھوں نے گیت گووند کو پیرایہ (روایتی شاعری) کا کارنامہ قرار دیا ہے کیونکہ اس کا تار و پود سنسکرت کی مروّجہ شاعری سے کچھ الگ قسم کا ہے۔ غیر ملکی علماء نے اسے دیہاتی زندگی کا ناٹک PASTORAL DRAMA یا غنائی تمثیل LYRICAL DRAMA اور MELO DRAMA یا جذباتی ناٹک وغیرہ گردانا جاتا ہے۔

اُردو میں "گیت گووند" کا ترجمہ پہلی بار ہوا ہے اور یہ ترجمہ کرنے کا شرف علامہ منوّر لکھنوی کو حاصل ہوا ہے۔ اگرچہ ہندی اور دنیا کی کئی دیگر متمدن زبانوں میں اس کے ترجمے پہلے ہی شائع ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلے ولیم جونز نے جو ماہرِ شرقیات تھے، اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا۔ اِروِن آرنلڈ نے سانگ آف سانگز SONG OF SONGS کے نام سے "گیت گووند" کا ترجمہ شائع کیا۔ نظمِ معرّیٰ میں اس کا ترجمہ جارج کیتھ نے انگریزی میں کیا۔ جرمن، فرانسیسی اور لاطینی بھاشاؤں میں بھی اس صحیفے کے تراجم شائع ہو چکے ہیں اور بنگالی، گجراتی، مراٹھی وغیرہ بھارتی بھاشاؤں میں بھی۔

علامہ منوّر کے اس ادبی کارنامے پر اپنے مضمون میں علی جواد زیدی فرماتے ہیں:-

"اس (گیت گووند) کی بنیاد برِندابن میں کرشن جی کی بہاریہ تفریحوں کے ایک عشقیہ پہلو پر رکھی گئی ہے۔ کرشن جی گوپیوں سے خوش اختلاطیاں کر رہے ہیں اور رادھا جی روٹھ گئی ہیں۔ رادھا کے یہاں آرزو اور رشک کی کشمکش ہے۔ رادھا جی کی ایک سکھی بیچ میں پڑ کر اس کشمکش کو دور کرتی ہے۔ کرشن جی رادھا جی کے پاس واپس آتے ہیں اور اظہارِ افسوس کر کے روٹھی رادھا کو مناتے ہیں اور پھر رادھا کو مسرّتِ وصل سے شادکام کرتے ہیں۔ جس طرح رادھا جی کی آرزوئے قربت بے حد عقیدت مندانہ ہے، اسی طرح کرشن جی کی عنایت میں بھی سرمدی انداز ہیں۔"[1]

اس تصنیف کے ۱۲ سرگ ہیں اور ہر سرگ میں کئی سلسلے ہیں۔ انھیں گیتوں کی لڑیاں بھی کہا جا سکتا ہے۔ ابتدائی سرگ میں راس لیلا کا بیان ہے۔ اس سے قبل بھگوان کرشن کی چند مناجاتیں ہیں جو جے دیو نے بڑی مترنم بحروں میں لکھی ہیں۔ راس لیلا کے بیانیہ میں سے چند

---

[1] گیت گووند یا سرمدی نغمے (منوّر لکھنوی) طبع اول ۱۹۶۴ء صفحہ ۲۸ (حصہ دیباچہ جات)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اقتباس دیکھیے :-

گوپیوں سے دو چار ہونے کو ہم بغل ہم کنار ہونے کو
جا رہے تھے لپک لپک کر کرشن دلبری کر رہے تھے دلبر کرشن

اونچا اونچا سینہ تلنے جب آتی ہے موج میں کوئی
بے تابو سی بے قابو کچھ ہو جاتی ہے موج میں کوئی
کرشن کے پاس آتے ہی ان سے ہو کر مست لپٹ جاتی ہے
پنچم سُر میں تان لگا کر گیت بڑے میٹھے گاتی ہے

کرشن کنھیا کے رُخساروں کی نرمی دل کشی اور ملاحت کا ذکر کرتے ہوئے جے دیو کیا فرماتے ہیں۔ منوّر کے ترجمے میں دیکھیے :-

کرشن کے گال حسیں ہیں کتنے دنیا ان کی دلدادہ ہے
ان پر بھی ہیجان ہے طاری رویاں رویاں استادہ ہے
اونچے کولوں والی کوئی ان پھولوں کا رس لیتی ہے
کان میں کچھ کہنے کے بہانے گالوں پر مُنہ رکھ دیتی ہے
کوئی گوپی چالاکی سے کرشن کا دامن کھینچ رہی ہے
طرّاری سے بے باکی سے کرشن کا دامن کھینچ رہی ہے
کرشن گُل افشانی کرتے تھے دم دم پر تعریف میں اس کی
کرشن کے ساتھ ہی گوپی کوئی راس میں چھم چھم ناچ رہی تھی
سینے سے چمٹا کے کسی کو سرو کی صورت جھوم رہے تھے
کرشن کسی کے گورے گورے رُخساروں کو چوم رہے تھے

اس بیانیہ کے بعد سرگ کے اختتام پر جے دیو مقصد کی جانب مراجعت کرتے ہوئے قاری کو یاد دلاتے ہیں :-

سری جے دیو نے برندابن کی اس کریڑا کا ذکر کیا ہے
کیشو جس سے جس دیتے ہیں اُس لیلا کا ذکر کیا ہے

ے گیت گووند (اردو ترجمہ۔ منوّر لکھنوی) مطبوعہ ۱۹۶۴ء حصۂ ترجمہ۔ صفحہ ۲۸۔ ۲۹   ے کریڑا یعنی کھیل، شغل

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اک مخزن اسرار کا ہے یہ راس سے بھلائی ہو بھگتوں کی
کرشن کے باب لطف و کرم تک کاش رسائی ہو بھگتوں کی

اِدھر یہ راس لیلا ہو رہی ہے۔ اُدھر رادھا جی کرشن جی کے ان تفریحی مشاغل اور گوپیوں کے ساتھ اختلاط و ارتباط کی خبروں سے آزردہ ہیں۔ روٹھی ہوئی رادھا ہجرِ محبوب کے کرب اور نفسیاتی تناؤ سے گزر رہی ہیں۔ ان گیتوں میں دو چاہنے والے دلوں کی کیفیتوں کے لمحہ لمحہ بدلتے رنگ سموئے ہوئے ہیں۔ امید و بیم، ہجر و وصل، سکون و اضطراب، نشاط و الم، ایذا و سرور، رشک و رقابت کی تلخی اور قربتِ جاناں کی مٹھاس، طنز و تشنیع، برہمی و بیزاری، شکوے شکایتیں، روٹھی ہوئی محبوبہ کو منانے کے لیے منت، سماجت، خوشامد و معذرت، کے آئینہ در آئینہ کئی پرتو اِن جذباتی گیتوں میں قاری کی نگاہوں سے گزرتے ہیں۔

روٹھی ہوئی رادھا رشک و رقابت کی جوالا میں جل رہی ہیں۔ ایک طرف محبوب سے ملنے کی اُمنگ اور اشتیاق دل میں ہوک اُٹھاتی ہے۔ دوسری جانب دل میں کشیدگی و رنجیدگی ہے۔ ان کی ایک رازدار سکھی انھیں کرشن جی سے کدمب کُنج میں جا کر ملنے کی ترغیب دیتی ہے جہاں بھگوان کرشن رادھا جی کے منتظر ہیں۔ سکھی کہتی ہے :-

نرم پتّوں کے بچھونوں میں وہ محوِ آرام
جن کی آنکھیں ہیں کنول کی سی وہ نٹور گھنشیام

بے لباسی صفتِ شمعِ فروزاں جن میں
کر دھنی اپنے عدم سے ہے نمایاں جن میں

ایک آنند کا بھنڈار ہے اُن کی ہستی
بادۂ عیش سے سرشار ہے اُن کی ہستی

اُن کی ساقوں پہ مزین ہوں تمھاری ساقیں
وہ بلوریں وہ حجابات سے عاری ساقیں

کرشن کے دل میں بھی احساس ہے خودداری کا
دل نہ بن جائے مرقع کہیں بیزاری کا

رات کا وقت گزرتا ہی چلا جاتا ہے
رُخِ اُمید اُترتا ہی چلا جاتا ہے

ہیں جہاں کرشن اِسی وقت جو ہو آؤ تو خوب
کرشن کے پاس بہت جلد چلی جاؤ تو خوب ہے[۱۰۵]

گیتوں کی اِس لڑی کے اختتام پر جے دیو حسبِ معمول یاددہانی کرواتے ہیں کہ :-

اپنے اِس گیت کے خالق ہیں سخنداں جے دیو
اپنے اِس گیت سے ہیں نازشِ دوراں جے دیو

ان پہ جو لطف و عنایت کی نظر رکھتے ہیں
فکر رکھتے ہیں جو ہر وقت خبر رکھتے ہیں

جن سے تکمیل ارادوں کی ہو وہ کام کرو
ایسے بھگوان سری کرشن کو پرنام کرو[۱۰۶]

۱۰۵-۱۰۶ گیت گووند یا سرمدی نغمے (منور لکھنوی)۔ حصہ ترجمہ۔ صفحہ ۸۵-۸۶ — ۸۶-۸۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اسی پانچویں سرگ کے ایک اور گیت میں سکھی رادھا کو لتا کنج میں جاکر کرشن جی سے ملنے کے لیے ترغیب دیتی ہے اور اُن کی آتشِ شوق کو بھڑکاتی ہے۔ ان جذبات کی ترجمانی منوّر لکھنوی نے کن الفاظ میں کی ہے، ملاحظہ ہو:

شبِ تار میں جاننا ہے یہ مشکل — بہر نوع پہچاننا ہے یہ مشکل
زن و مرد ہیں کون مصروف باہم — کسے لطفِ خلوت ہوا ہے فراہم
انھیں عشرتِ وصل کی دُھن لگی ہے — یہی لمحہ تو حاصلِ زندگی ہے
مئے عاشقی کی قدح نوشیاں وہ — بغل گیریاں وہ ہم آغوشیاں وہ
وہ پردے میں دستِ جنوں کی رسائی — وہ محرم کے رازوں کی عقدہ کشائی
ہُمک کر وہ سینے سے سینہ ملانا — لب و رُخ پہ بوسوں کی مُہریں لگانا
وہ زیر و زبر دل کے عالم کا ہونا — تصادم وہ شعلے سے شبنم کا ہونا
وہ آسودگی میل کی راحتوں سے — وہ سرشاریاں وصل کی لذتوں سے
مقدّر میں وہ عشرتِ کامرانی — دہانِ صدف میں وہ گوہر فشانی
مزا کون ہوتا نہیں ان کو حاصل
جو ہوتے ہیں دو دل محبت میں واصل ۱؎

رادھا جی کی آتشِ شوق کو اس منظر کشی کے ذریعہ بھڑکا کر سکھی پھر انھیں تلقین کرتی ہے:

ذرا کنجِ خلوت کی جانب بڑھو — حریمِ محبت کی جانب بڑھو
کرو جا کے تم اُن کی پوری مُراد — تمھیں دیکھ کر کرشن ہو جائیں شاد ۲؎

سرگ کے آخر میں جے دیو پھر حسبِ معمول منقبت کا انداز اختیار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

جو ہیں برج کی نازنیں گوالنیں — وہ گُل رُو وہ بے حد حسیں گوالنیں
دل ان کا انھیں کرشن کے بس میں ہے — مزا کس قدر پریم کے رس میں ہے
انھیں سے ہوا کنس کا خاتمہ — یہ تھا پاپ کے بنس کا خاتمہ
وہ رکھیں ہمیشہ کرم کی نگاہ — وہی اپنے دامن میں بخشیں پناہ ۳؎

کرشن جی روٹھی ہوئی رادھا کو منانے کے لیے منت سماجت سے کام لیتے ہیں اور رادھا جواباً طعن و تشنیع اور ناز و ادا کے تیر چلاتی ہیں۔

۱؎ تا ۳؎ گیت گووند (منوّر لکھنوی) صفحات بالترتیب ۹۰-۹۱-۹۲-۹۳

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

یہ آپ کے لبوں پہ جو دانتوں کے ہیں نشاں   ہیں اور گوپیوں کی محبت کے ترجماں
بڑھتا ہے اضطراب مرا ان کو دیکھ کر   ہوتا ہے دل کباب مرا ان کو دیکھ کر
جن گوپیوں نے دانت لبوں پر لگائے تھے   خلوت میں ساتھ آپ کے جلسے منائے تھے
آتا ہے اُن پہ رشک مجھے غیر حال ہے   میرے لیے عذاب یہ سہنا محال ہے

ہاں ہاں انھیں کے پاس بصد شوق جائیے
ہاں ہاں اُنھیں کو اپنی چہیتی بنائیے [1]

اگرچہ کرشن اور رادھا کی ملاقاتوں اور راز و نیاز کے بیان میں جے دیو نے مرد اور عورت کے اختلاط کو اُس حد تک پہنچا دیا ہے کہ بے لوث پریم اور تعیّش پسندی کے مابین کوئی خطِ فاصل دکھائی نہیں دیتا۔ گوپیوں کی راس لیلا کی چھیڑ چھاڑ ہو یا رادھا اور کرشن کے وصل و نشاط کے تذکرے وشنو سمپردائے والوں کی نگاہ میں یہ سب منبعٔ عقیدت ہیں۔ یہ طبقہ اپنی "مدھرا بھگتی" کے عقیدے میں اس پریم لیلا کو جائز و محترم سمجھتا ہے اور عین عبودیت مانتا ہے۔ تاہم منوّر لکھنوی نے اپنے ترجمے میں کھل کھیلنے کے ان مناظر و واردات کو بھی بڑی شائستگی اور تہذیب، سلیقے اور احتیاط کے ساتھ نظم کیا ہے جس کی کچھ مثالیں درج ذیل ہیں۔ رادھا اور کرشن کی باہمی جُدائی کے بعد ملن کے اس گیت کو ترجمے کی صورت میں دیکھیے :۔

کرشن رادھا تھے ہم کنار اس وقت   دونوں تھے اپنے پردہ دار اُس وقت
اِک طرف ناز اِک طرف تھا نیاز   ہو گیا چھیڑ چھاڑ کا آغاز
خوب تھیں حُسن و عشق کی گھاتیں   تھیں محبت کی پیار کی باتیں
وا تھا دونوں کا حلقۂ آغوش   تھا نہ باقی کسی بھی بات کا ہوش [2]
بند وش بادہ کش تھیں دو رُوحیں   لب بہ لب بوسہ چش تھیں دو رُوحیں
ہار کا تھا نہ ذِکر جیت کا تھا   سلسلہ بند بات چیت کا تھا
ستمِ ناز کوئی کیا جانے   باندھ رکھے تھے ہاتھ رادھا نے
بوجھ تھا یہ عجب قرینے کا   کرشن اُٹھائے تھے بار سینے کا
چٹکیوں میں تھے ناخنوں کے نشاں   لب تھے دانتوں کی کاٹ سے لرزاں
اِک گرہ سی دل و نظر میں تھی   ایک زنجیر سی کمر میں تھی

---

[1] [2] گیت گووند (منوّر لکھنوی) صفحہ ۱۲۹۔ ۱۳۰ — ۱۷۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کیف گستر گھڑی وصال کی تھی — خاطر آسودگی کمال کی تھی
کرشن کا زور آزمانا تھا — کام کی جنگ میں ہرانا تھا
تھا جو اُن کی شکست کا ارماں — رادھیکا نے بدل دیا عنواں
اپنے رنگیں حسین پیکر سے — کر دیا سرنشانہ اوپر سے
اب تھا نقشا ہی اور تخت پر — زیر جو تھا وہ بن گیا تھا زبر
دل کا ارماں مگر نکل نہ سکا — وار رادھا کا یہ بھی چل نہ سکا
رہ گئیں جم کے اک جگہ رانیں — اب تھکیں پتھر یہ حسن کی کانیں
ہو گئی سلب قوتِ بازو — نہ رہا اک بھی عضو پر قابو
کپکپی رو نما تھی سینے پر — بے کسی آئینہ تھی سینے پر
ان پہ طاری غضب کا سکتہ تھا — بند آنکھیں تھیں دل دھڑکتا تھا [۱]

جسمانی اختلاط کے ایسے لذت انگیز مناظر دکھا کر جے دیو اس سرگ کے آخر میں پھر شنگار رس سے بھگتی رس کی جانب مراجعت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں :-

اے کرشن کا نام لینے والو! — اے کرشن پر جان دینے والو!
تم دھیان میں اُن کے ڈوب جاؤ — جے دیو کے پاک گیت گاؤ
ہو اس امرت سے تشنگی دور — کلجگ کے گناہ سب ہوں کافور [۲]

یہ تسلیم کہ اس طرح کے جمالیاتی اور شنگار رس کے (رومانی) گیتوں کی تخلیق اور نغمہ سرائی وشنوؤں کی "مدھرا بھگتی" میں مستحسن سمجھی جاتی ہے، اور وہ اس میں سے کرشن بھگتی اور عقیدت کا کوئی پہلو نکال لیتے ہوں گے۔ لیکن اس طرح کی "وِلاس کریڑا کے ورنن" (تعیش کے کھیل کے تفصیلی بیان) کو عام نقاد یا قاری اس کے ظاہری روپ ہی میں دیکھ کر رائے زنی کرتا ہے۔ عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ رادھا کرشن تو بھگتوں کی عقیدت و ارادت کے مرکز ہیں، ان کے باہمی پیار کو ایک عام عورت اور مرد کے جسمانی پریم اور شہوانی تعلقات کی سطح پر بیان کر کے جے دیو جی نے بھگوان کرشن اور ماں رادھا کے خدائی روپ کو ان کے عقیدت مندوں کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا ہے۔ لیکن اس طرح کی حرف زنی کرنے والے قاری اور دانش ور "مدھرا بھگتی" کے روپ سے آشنا نہیں۔ وشنوؤں کو اس کی شاعری میں مدھرا بھگتی کا گہرا جذبہ اور کرشن اور رادھا کی خدائی ہستی کے

---

[۱] [۲] گیت گووند (منور لکھنوی) ۱۷۵ تا ۱۷۷ —— ۱۸۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تئیں گہری محبت اور ایک پُر اثر جمالیاتی تأثر ملتا ہے اور رادھا، کرشن کی باہمی محبت کی رومان انگیز اور جمالیاتی عکاسی ہری سُمرن (یادِ خدا) کا وسیلہ اور سادھن بن جاتی ہے۔ صوفی مت والے بھی اکثر بھگوان کو اپنی محبوبہ مان کر اس سے اپنی محبت جتاتے ہیں۔ وشنو طبقہ کرشن اور رادھا کے وصل کے مناظر کو آتما اور پرماتما کے ملاپ کے رُوپ میں قبول کرتا ہے اور ہجر میں دونوں کی بے قراری کو پرماتما کی ذات میں وصال وادغام کے لیے گہری تڑپ اور طلب کا رنگ دیتا ہے۔

دراصل اس تصنیف کے پوشیدہ معانی اور مرکزی نکتہ پر غور کیا جائے تو رُوحِ بشر (آتما) ہندو عقیدے کے مطابق ذاتِ الٰہی پر(ماتما) ہی کا ایک اَنش (جزو) ہے۔ یہ اپنے مرکز و منبع سے بچھڑی ہوئی رادھا ہے اور اپنے اس مرجع، معبودِ حقیقی (کرشن۔ ذاتِ یزداں) سے پُنر ملن (تجدیدِ وصال) کے لیے تڑپ رہی ہے۔ جب یہ رادھا اپنے بچھڑے ہوئے کرشن سے دوبارہ ہم آغوش ہو کر لطفِ وصال پاتی ہے تو اس انوکھی سرور انگیز کیفیت کو جے دیو کے سرمدی نغمے (گیت گووند) ہی الفاظ کے رُوپ میں بیان کر سکتے ہیں۔

نریش کمار شادؔ اپنے مضمون "نظرے خوش گزرے" میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:۔

"عرفان کی اس شان اور پُر تر تزندی میں جنسی ہیجان کے جو جھونے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بالعموم ہمارے قدیم ادبِ عالیہ کا جزو لاینفک رہے ہیں۔ کالی داس، شیکسپیر اور جامی اور بہت سے دوسرے تاریخ ساز اہلِ قلم کی نگارشات اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اگر بصیرت اور بصارت کو ذرا سی تکلیف دی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہوس کی آلودگی اور کثافت کے نہیں بلکہ عشقِ صادق کی پاکیزگی اور لطافت کے جاندار مظاہر ہیں۔ رومانیت اور روحانیت کے متلاطم اور طوفان خیز دریاؤں کا یہ اتصال ایک عجیب و غریب وجدانی کیفیت پیدا کرتا ہے اور خاص طور پر اس لیے کہ اس میں سنگیت کے زیر و بم کا لطف بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔"[۵]

نفسیات نگاری کے ساتھ ساتھ حسنِ فطرت کی منظر نگاری کے بھی بہترین نمونے جے دیو جی نے "گیت گووند" میں دیے ہیں۔ جنھیں منوّر نے حسین ترجمے کی شکل دی ہیں۔ منظریہ شاعری کے کچھ تراجم دیکھیے:۔

---

[۵] گیت گووند (یا سرمدی نغمے) منوّر لکھنوی۔ صفحہ ۵۶ (حصۂ دیباچہ جات)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

لَونگ کی بیل کو چُھوتی چُھوتی ملیاگر کی مُست پَون ہے
کتنی اس میں چترائی ہے کتنا اس میں اُلھڑپن ہے
دل کے دل متوالے بھنورے کاٹ رہے ہیں چکر کیا کیا
لیتی ہیں ان کی جھنکاریں دل سے ہر دم ٹکر کیا کیا
دُور لتا کنجوں کے اندر کوئل کیا کیا کوک اُٹھتی ہے
ٹیس سی پیدا ہو جاتی ہے دل میں ہوک سی ہوک اُٹھتی ہے
مولسری کے پھول کھلے ہیں ان پر بھنورے منڈلاتے ہیں
پھولوں کے رس کی خوشبو میں کھو کر مست ہوئے جاتے ہیں ؎۱
ایسی رُت میں ناچ رہے ہیں بالاؤں میں کرشن کنھیّا
دل بہلاتے ہیں جا جا کر للناؤں میں کرشن کنھیّا ؎۲

آخری گیت میں جے دیو نغمہ طراز ہیں :-

یہ نغمۂ سرمدی ہے ممتاز — جے دیو کو اس پہ خود بھی ہے ناز
سرمست ہیں اس کے حال سے وہ — کہتے ہیں زبانِ قال سے وہ
جب تک شعر نگار رس ہے قایم — یہ گیت رواں رہے گا دایم
اس گیت میں لطفِ بیکراں ہے — نغمہ یہ نوائے جاوداں ہے

تصویر یہ جمالِ ایزدی ہے
نغمہ یہ تمام سرمدی ہے ؎۳

منوّر لکھنوی نے اس نازک سے صحیفے کا ترجمہ بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے کیا ہے اور اس راہ میں پھونک پھونک کر قدم رکھا ہے۔ زیرِ ترجمہ گیتوں میں جسمانی مواصلت اور تلذّذ کی کیفیت کی ہو بہو ترجمانی میں خلوص و عقیدت کے مجروح ہونے کے امکانات و خدشات سے دو چار ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اس صحیفے کے بنیادی تقدس اور بھگتی کے تاثر کو محفوظ رکھا ہے۔ سنسکرت کی تراکیب میں کثیر پہلو معانی و مفاہیم کو تھوڑے الفاظ میں سمونے کی بے انتہا گنجائش ہوتی ہے۔

؎۱ گیت گووند (یا سرمدی نغمے) منوّر لکھنوی۔ صفحہ ۲۲-۲۳
؎۲ 〃 〃 〃 〃 مطبوعہ ۱۹۶۴ء-۲۲-۲۳-۲۴ صفحات
؎۳ 〃 〃 〃 〃 صفحہ ۱۸۸

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

لیکن آزاد اردو ترجمے میں منوّر کو کہیں کہیں مفہوم کو واضح کرنے کے لیے تفصیل و اضافہ سے کام لینا پڑا ہے۔ ضرورتِ شعری اس طرح کسی حد تک ترجمے کے صفحات میں اضافے کا باعث بنی ہے۔ منوّر نے تشبیہات و استعارات کو محفوظ و سلامت رکھتے ہوئے مفاہیم کی کامیاب ترسیل کی کوشش کی ہے جس میں وہ حد درجہ کامیاب رہے ہیں۔ یوں انھوں نے سنسکرت اُدب کی رُوح کے انکشاف کی کوشش کے ساتھ اُردو شاعری کی عظمت میں بھی اضافہ کیا ہے۔ ڈاکٹر ہزاری پرشاد دویدی اِس ترجمے کے متعلّق فرماتے ہیں:۔

"مگر یہ کام نہایت درجہ مشکل ہے۔ معانی کا خیال رکھیے تو موسیقیت ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔ موسیقیت کا خیال رکھو تو معنویت دُور جا پڑتی ہے۔ ان دونوں کا امتزاج ایک باکمال شاعر ہی کے بس کی بات ہے۔ میں نے منوّر صاحب کا ترجمہ ان کی زبان سے سُنا ہے۔ وہ جھوم اُٹھتے ہیں...... انھوں نے محض سنسکرت الفاظ کی نقّالی نہیں کی ہے اور معانی کو زبان کے صوتی حسن میں ڈھالا ہے۔"[1]

نریش کمار شادؔ اِس ترجمے پر تبصرہ آرائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"لفظی ترجمہ اگر بسا اوقات شعریت کا، تو آزاد ترجمہ معنویت کا خون کر دیتا ہے۔ دونوں میں توازن برقرار رکھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مذاقِ سلیم میں بیک وقت شعر گوئی اور شعر فہمی کا یکساں توازن موجود نہ ہو۔ عام طور پر ایسا ہوتا نہیں...... منوّر لکھنوی اس اعتبار سے حیرت انگیز اور قابلِ رشک ذہانت اور کلام پر قدرت کے مالک ہیں...... ان کے منظوم تراجم کو پڑھتے ہوئے اکثر مجھے سعادت حسن منٹو کے اُس جملے کا خیال آتا ہے جو انھوں نے اپنے ایک مضمون میں نواب کاشمیری کے متعلّق لکھا ہے کہ وہ اپنے رول میں ایسے دھنس جاتا ہے جیسے ہاتھ میں دستانہ۔ واقعہ یہ ہے کہ منوّر صاحب کا کمال بھی یہی ہے کہ وہ جب کسی دوسری زبان کی ترجمانی کرتے ہیں تو اُس ماحول کی رُوح میں اس طرح اُتر جاتے ہیں جیسے دستانے میں ہاتھ۔"[2]

"گیت گووند" کے زیرِ بحث ترجمے میں اصل تصنیف کی زبان کے مزاج، صوتی آہنگ اور صحتِ مفاہیم کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ تشبیہات و استعارات کا بالکل موزوں اور چست

---

[1] گیت گووند عرف سرمدی نغمے (منوّر لکھنوی) طبع اوّل ۱۹۶۴ء۔ صفحہ ۵۲

[2] ایضاً ایضاً 〃 ۵۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ترجمہ کیا گیا ہے اور سیاق وسباق کے مطابق موزوں الفاظ و تراکیب استعمال میں لائے گئے ہیں منوّر لکھنوی کی ذہانت اور سلیقے کی داد دینی پڑتی ہے۔

وِنے پتر کا

مہا کوی گوسوامی تلسی داس کا تخلیقی کارنامہ ہے، جو ۲۷۹ منقبتی بھجنوں پر مشتمل گزارش نامہ ہے۔ وِنے پتر کا کے لغوی معنی بھی گزارش نامہ ہیں۔ منوّر لکھنوی کے غیر مطبوعہ قلمی مسودات میں اس عظیم تصنیف کے صرف ۴۴ بھجنوں کا ترجمہ دستیاب ہوا ہے۔ یہ ترجمے منظوم نہیں بلکہ نثری ترجمے ہیں جو ۱۶۸ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ تلسی داس کی اوّلین تصنیف "شری رام چرت مانس" کے بعد جس اور تصنیف کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ "وِنے پتر کا" ہے۔ ہر چند کہ تلسی داس کی متعدد دیگر تصانیف بھی موجود ہیں۔

تلسی داس کو اُن کے "شری رام چرت مانس" کے طفیل لازوال شہرت حاصل ہے۔ اصل رامائن کے مصنف مہرشی والمیک تھے لیکن ان کی تصنیف والمیکی رامائن سنسکرت میں تھی۔ شمالی ہند کی عام بول چال کی بھاشا اودھی ہندی میں اس گرنتھ کی تخلیق کا شرف تلسی داس کو حاصل ہوا۔ جنھوں نے اپنی اودھی رامائن کا نام "شری رام چرت مانس" رکھا۔ یہ اس قدر مقبول ہوئی کہ یوروپی مستشرقین نے بھی اس کی عظمت کو تسلیم کیا۔ ہندوستان میں تو کوئی گھڑی ایسی نہیں ہوتی جب کہیں نہ کہیں اس گرنتھ کی تلاوت نہ ہو رہی ہو۔ یہ گیان اور بھگتی کے جذبات کا لازوال خزانہ ہونے کے علاوہ شاعرانہ محاسن میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی۔

تلسی داس کی دیگر تصانیف میں سب سے اہم اور ہر دلعزیز تصنیف وِنے پتر کا ہے۔ منوّر کے مطابق حق یہ ہے کہ رام چرت مانس تلسی داس نے دنیا کے لیے لکھا اور "وِنے پتر کا" اپنے دل کے جواہر پاروں کے ذریعہ محض ذاتی تسکین کے لیے قلم بندکی۔ اس کے ایک ایک بھجن میں انھوں نے رام بھگتی کے صدقے مختلف دیوی دیوتاؤں اور رام پریوار کے اراکین سے الگ الگ گزارشات کی ہیں اور خود بھگوان رام سے بھی بیشتر بھجنوں میں گڑگڑا کر التماس کی ہے کہ اُسے آواگون (تناسخ) کے تکلیف دہ چکّر سے نجات دی جائے۔ خالقِ کائنات رام سے اُن کی عاجزانہ

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

التجائیں ایسے رقت انگیز لب و لہجے میں کی گئی ہیں جیسے بقولِ منوّر :-

"کوئی بچہ اپنی بھوک مٹانے کے لیے اپنی ماں کے سامنے روتا چلاّتا ہے۔ ان کے جذبات کی پاکیزگی اور اُن کے مطالبات کے انداز کی معصومیت اتنی دل کش ہے کہ ایک مرتبہ تو پڑھنے والا بھی ان کے درد و کرب میں شریک ہونے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔"[۱]

"رام چرت مانس کی طرح "وِنے پتر کا" کوئی مسلسل نظم نہیں ہے۔ اس کے ۲۷۹ گیت اور بھجن مختلف راگ راگنیوں میں منضبط ہیں۔ یہ بھجن اگرچہ اودھی زبان میں رچے گئے ہیں لیکن ان کی بھاشا خاصی دقیق ہے کیوں کہ اس میں سنسکرت کے الفاظ و تراکیب کی آمیزش بہت زیادہ ہے۔ بعض بھجن سنسکرت بھاشا میں بھی ہیں۔

"وِنے پتر کا" کے ہندی میں بے شمار ترجمے شائع ہوئے ہیں لیکن اُردو میں سب سے پہلے اس کا ترجمہ منوّر لکھنوی نے کیا۔ اس کے قلمی مسودے میں اصل گرنتھ کے ۲۷۹ بھجنوں میں سے صرف چوالیس بھجنوں کا نثری ترجمہ منقول ملا ہے۔ منوّر نے ۱۹۲۳ء میں اس نثری ترجمے کا آغاز کیا تھا اور لگ بھگ تین برس میں اسے مکمل بھی کر لیا تھا، لیکن ایسا لگتا ہے کہ غیر صاف شدہ مسوّدات کو وہ یکجا کر کے اپنے عرصۂ حیات میں ترتیب دینے کے لیے وقت نہیں نکال پائے۔ لہٰذا منوّر کے اپنے خوشخط تحریر کردہ مسوّدے میں صرف ۴۴ بھجنوں کا ترجمہ موجود ہے۔ ان نثری تراجم سے پہلے ہر بھجن کے مشکل الفاظ کے معانی اُردو میں تحریر کیے گئے ہیں۔

منوّر نے "وِنے پتر کا" کا ترجمہ اپنے فطری شوق کی تکمیل کے لیے کیا۔ اس کے پیش لفظ میں جو موصوف نے ۱۸ مارچ ۱۹۵۰ء کو تحریر کیا، ان کا یہ اعتراف بھی شامل ہے کہ شعری ترجمے کے فن میں ان کی کامل اور مسلّمہ مہارت کے باوجود "وِنے پتر کا" کا نظم میں ترجمہ کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی کیوں کہ بقول اُن کے :-

"اُن کے بھجنوں کا پس منظر کچھ ایسا ہے جس کا اثر مختلف طبائع پر مختلف انداز سے پڑ سکتا ہے اور ہر پڑھنے والا ان جذبات میں شریک نہیں ہو سکتا جو تلسی داس کے دل سے نکل کر ان بھجنوں میں بجلیوں کی طرح اپنی تڑپ دکھا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو اس کے اسلوب بیان کی متحمل بھی نہیں ہو سکتی۔"[۲]

۱۔ وِنے پتر کا (نثری اردو ترجمہ۔ منوّر لکھنوی)، غیر مطبوعہ مسوّدہ۔ پیش لفظ، صفحہ ۲

۲۔ " " " " "اپنی بات"، صفحہ ۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تلسی خدا رسیدہ سنت تھے اور باکمال شاعر تھے۔ عبودیت و عرفانیت کے اسرار سے اُن کی مکمل آگاہی کے باوجود اُن کے بھجنوں سے عام آدمی کو شاید یہ تاثر بھی مل سکتا ہے کہ وہ ایک سے زیادہ خداؤں کے معتقد تھے اور اس طرح انھیں مشرک قرار دیا جا سکتا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ "شری رام چرت مانس" کے اوّلین باب "بال کانڈ" میں اُن کی یہ مشہورِ زمانہ چوپائی اُن کے وحدتِ لاشریک میں اعتقاد کی تصدیق و توثیق کرتی ہے:-

سیا رام مے سب جگ جانی　　　کرہوں پرنام جوری جگ پانی

یعنی میں کائنات کے ذرّے ذرّے میں سیتا رام (پُرش اور پرکرتی۔ خدائے ذوالجلال اور اُس کی فطرتِ عالی) کو جلوہ افروز دیکھتا ہوں اور اس لیے میں ان سب کو دونوں ہاتھ جوڑ کر تعظیم کرتا ہوں۔ اُس کی نظر میں رام ہی رُوحِ کائنات ہے۔ لہٰذا جن دیوی دیوتاؤں کی مناجات انھوں نے بھجنوں میں کی ہے ان میں بھی تلسی کو اُس واحد و لاشریک رام کا جلوہ نظر آتا ہے۔ "شری رام چرت مانس" میں انھوں نے بار بار اپنے اس مقدّس عقیدے کو دوہرایا ہے۔ "مانس" کے ساتویں اور آخری باب "اُتر کانڈ" میں فرماتے ہیں:-

ساردکوٹی امت چترائی　　　بدھی شت کوٹی سرشٹی نپنائی
وشنو کوٹی شت پالن کرتا　　　رُدر کوٹی شت سم سنہرتا

یعنی رام (خدائے لاشریک) کروڑوں شاردا (علم و ادب کی دیوی سرسوتی) کے سمان چتر (دانا) ہیں۔ کروڑوں برہما کے برابر کائنات کی تخلیق کرنے والے ہیں۔ کروڑوں وشنو کے برابر پالن کرتا (پرورش کرنے والے) ہیں اور کروڑوں رُدر (شوجی) کے برابر سنگھار (تخریبِ کائنات) کرنے والے ہیں۔

ہندو شاستر ذاتِ الٰہی کی وحدت کا قائل ہوتے ہوئے، اس کے افعال و فرائض کے مطابق اس کی تخلیقی قوت، قوتِ پرورش اور قوتِ جلالی یا قوتِ انہدام، تینوں کی حمد و مناجات کرتا ہے۔ برہما روپ میں وہی ذاتِ وحدت الوجود کائنات کی تخلیق کرتی ہے۔ وشنو رُوپ میں وہ تمام جانداروں کی پرورش کرتی ہے اور رُدر یا شوجی کے رُوپ میں کائنات کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا کام بھی کرتی ہے۔ یہ اُس کا قہار و جبار یا جلالی رُوپ ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تلسی ملحد و مشرک نہیں تھے۔ وہ فنا فی الرام تھے اور رام بھگتی کے نشے میں مستغرق رہتے تھے جس کی انتہا ایک طرح کی دیوانگی کی صورت میں ہمیں "ونے پترکا"

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ منوّر لکھنوی کے الفاظ میں :-

" رام چرت مانس لکھ کر بھی تلسی داس کے دل کو حقیقی شانتی نہیں حاصل ہوئی ۔ ان کو ابدی اطمینان اسی وقت ہوا جب اُن کی "بنے پتر کا" ان کے محبوب کُل کے دربار میں پیش ہو کر مقبول ہوئی ۔"[1]

تلسی کی "رام چرت مانس" خواص و عوام دونوں کے لیے تخلیق کی گئی تھی لیکن اُس کی "ونے پتر کا" ایک خصوصی رُوحانیت آشنا طبقے کے مذاق کی تسکین کرتی ہے ۔ جو بلا تعصب ہر مذہب اور پنتھ کو ذاتِ باری کی طرف لے جانے والا ایک راستہ سمجھ کر اس صحیفے سے بھی رُوحانی فیض اور دِلی سرور حاصل کر سکتا ہے ۔

ترجمے کے کچھ نمونے درجِ ذیل ہیں اور دقیق سنسکرت الفاظ کے معانی بھی ، جیسے کہ وہ اصل مسودہ میں دیے گئے ہیں :-

بھجن نمبر ۲ ۔ سُورج دیوتا کی استتی

دین دیال دِواکر دیوا   کر مُنی منج سُرا سُر سیوا
ہِم تم کر کیہر کر مالی   دہن دوش دُکھ ورت رُجالی
کوک کوک نہ لوک پرکاسی   تیج پرتاپ رُوپ رس راسی
سارتھ پنگ دِویہ رتھ گامی   ہری شنکر ودھ مُورت سوامی

ویدپُران پرگٹ جس جاکے
تلسی رام بھگتی بر مانگے[2]

لفظ	معنی	لفظ	معنی
دین	عاجز	اسُر	جو دیوتا نہ ہو یعنی جس سے بدی کی قوتوں کا اظہار ہو
دیالو	رحیم	سیوا	خدمت ، عبادت
دواکر	دن بنانے والا یعنی سُورج	ہِم	لفظی معنی برف ۔ مراد ٹھنڈک سردی
دیوا	دیوتا معبود	تم	اندھیرا
مُنی	عابد	کر	کر معنی ہاتھی
منج	انسان	کر مالی	کرنوں کی مالا
		دہن	فنا فی النار کرنے والا

---

[1] ونے پتر کا ترجمہ منور لکھنوی ۔ قلمی نسخہ ، صفحہ ۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

مطلب

اے دین دیال یعنی عاجزوں پر رحم و کرم فرمانے والے سورج دیوتا! عابد، انسان، دیوتا اور دیتیہ سب آپ کی خدمت بجالاتے ہیں۔ آپ سردی اور تاریکی نما ہاتھی کے لیے شیرِ غرّاں کا کام کرتے ہیں۔ یعنی آپ کے طفیل سردی دور ہو جاتی ہے اور اندھیرا کافور۔ کرنوں کی مالا زیبِ گلو ہے اور پاپ دُکھ، بیماری نیز بداعمالی کے لیے آپ آگ کا کام کرتے ہیں۔ جب دنیا میں آپ کا نور پھیلتا ہے تو چکوا اور چکوی دونوں کو بیحد خوشی ہوتی ہے۔ کنول کھلنے لگتے ہیں۔ آپ روشنی جلال اور رس کی کان ہیں۔ یعنی اگر آپ کی روشنی نہ ہوتی تو دنیا میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا۔ آپ کے جلال کے سامنے ظلمت ٹھہر نہیں سکتی۔ آپ کی تنویرِ حسن کے بغیر کوئی چیز نظر ہی نہیں آسکتی، اور تمام موجوداتِ عالم کا ظہور اس رس کے طفیل ہے جو ذاتِ مقدس میں ہر وقت موجود ہے۔ آپ کا سارتھی لنگڑا (پنگو) ہے اور آپ مرکبِ ایزدی پر سوار ہیں۔ آپ کی ہستی برھما وشنو اور مہیش کا جلوہ ہے۔ آپ کی عظمت کے گیت ویدوں میں گائے گئے ہیں۔ تلسی داس آپ سے رام بھگتی کے علاوہ اور کسی چیز کا خواستگار نہیں ہے۔

منوّر لکھنوی کے ترجمے کے مسوّدے میں ہر بھجن کے ترجمے کا یہی اسٹائل رکھا گیا ہے، یعنی مشکل الفاظ کے معنی الگ اور اُن کے نیچے پورے گیت یا بھجن کی مفصّل تشریح الگ۔ ایک اور نمونہ۔

بھجن نمبر ۱۳۔ شیوجی کی استتی

سیو ہُو سو چرن سروج ریُو ۔ کلیان اکھِل پرد کام دھینُو ۔ ۱
کرپور گور کرونا اُدار ۔ سنسار سار بُھجگند رِھار ۔ ۲
سکھ جنم بھوم مہما اپار ۔ بنرگُن گُن نائک نرا کار ۔ ۳
ترِے نین میَن مردن مہیس ۔ اہنکار نہار اُدِت دِنیس ۔ ۴
بربال نشاکر مُولی بھراج ۔ ترے لوک سوک ہر پر متھ راج ۔ ۵
جن کنہہ بدھی سُگتی نہ لکھی بھال ۔ تنہ کی گت کاسی پت کرپال ۔ ۶
اُپکاری کو اپر ہر سمان ۔ سُرا سُر جرت کرت گرل پان ۔ ۷
بہو کلپ اُپائن کرانیک ۔ بنو سمبھو کرپا نہیں بھو ویک ۔ ۸

لے بنے پتر کا (ترجمہ منوّر لکھنوی) غیر مطبوعہ قلمی مسوّدہ صفحہ ۴۸

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

وگیان بھون گری سُتارُون   کہہ تلسی داس مَم تراس سمن ۔ ۹ ؎

تشریح: شوجی کے چرن کملوں کی خاکِ مقدّس کو سُرَ آنکھوں سے لگاؤ جس سے کام دھینُو گائے کی مانند ہر قسم کی برکتیں حاصل ہوتی ہیں ۔ شوجی کا جسم مبارک کافور کی طرح سفید رنگ کا ہے ۔ اُن کی ہستی خلاصۂ کونین ہے ۔ گلے میں سانپوں کا ہار پڑا ہوا ہے ۔ تمام قسم کی راحتوں کا وجود انھیں کی ذاتِ بابرکات سے ہے ۔ ان کی عظمت حدِ قیاس سے باہر ہے اور وہم و گمان سے بالاتر ۔ وہ صفاتِ گوناگوں سے مبرّا بھی نہیں مگر تمام صفات ذاتِ اقدس میں موجود بھی ہیں ۔ ان کی کوئی شکل وصورت نہیں ۔ تین آنکھوں سے دیکھتے ہیں ۔ انھوں نے کام دیو کو فنا کیا ہے ۔ وہ تمام دنیا کے مالک ہیں ۔ انانیت کے کُہرے کو فنا کرنے کے لیے وہ آفتابِ عالم تاب کی مانند ہیں جس نے خودی کے زعم میں سر اُٹھایا اُس کو شوجی نے نیچا دکھایا ۔ اُن کی جبینِ نور آگیں پر چاند روشن ہے ۔ وہ ہر سہ عالم کے آلام و مصائب رُفع کر سکتے ہیں ۔ وہ شوگنوں کے مالک ہیں ۔ برہما جی نے جن لوگوں کے نوشتۂ تقدیر میں نجات نہیں لکھی، شوجی اُن کو بھی آواگون سے چھٹکارا دِلاتے ہیں ۔ رفاہ و بہبود کے معاملے میں شوجی کی ہمسری کون کر سکتا ہے ۔ کیوں کہ جب مندراچل پہاڑ سے ساگر کا منتھن کیا جارہا تھا اُس وقت دیوتاؤں اور دَیتیوں کو زہر کی سوزش سے بچا کر انھوں نے اسے نوشِ جاں فرما لیا تھا ۔ انسان خواہ لاکھوں تدبیریں کرے لیکن شوجی کی عنایت کے بغیر اُس کو یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ فنا کس چیز کا نام ہے اور بقا کسے کہتے ہیں ۔ شوجی علم و اِدراک کا خزانہ اور پاربتی جی کو راحت و آرام کی دولت سے مالا مال کرنے والے ہیں ۔ تلسی داس جی کہتے ہیں کہ وہ شوجی میرے تمام مصائب و آلام دُور کریں گے ۔

بھجنوں کے تراجم کے مندرجہ بالا نمونوں سے ظاہر ہے کہ منوّر لکھنوی نے تلسی داس کے ان طہارت و عقیدت سے معمور گیتوں اور بھجنوں کے تراجم اعلیٰ پایہ کی نثر میں پیش کر کے انھیں اُردو کے عام قاری تک پہنچانے کی کوشش کی لیکن اس ترجمے کی اشاعت کا ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا ۔ تاہم منوّر نے انکسار، خود سپردگی اور خشوع و خضوع کی اُس سپرٹ کو جو تلسی داس کے ان بھجنوں میں میں ساری وطاری ہے، اپنے ترجمے میں تمام و کمال برقرار رکھا ہے ۔ عقائیت اور رُوحانی سرور بھرے یہ منقبتی گیت نہ صرف بھگوان رام کے لیے لکھے گئے ہیں ۔ بلکہ یہ منظوم گزارشات سوریہ دیوتا، گنیش جی، شوجی، شری نرنارائن شری وندو مادھو، شری رنگ، لکشمی جی، سرسوتی جی، ماتا سیتا اور دیگر دیوی دیوتاؤں ہنومان جی، لکشمن جی، بھرت، شترو گھن وغیرہ جلیسانِ رام اور مقدّس تیرتھوں اور ندیوں مثلاً

؎ بے پتر کا (ترجمہ منوّر لکھنوی) غیر مطبوعہ قلمی مسودہ صفحہ ۴۸

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

چترکوٹ، گنگاجی، کاشی تیرتھ، یمناجی وغیرہ کو مخاطب کر کے بھی نظم کی گئی ہیں۔ ترجمے سے ثابت ہوتا ہے کہ منوّر کا ذخیرۂ الفاظ نہایت وسیع ہے اور ان کا تراجم میں صحیح لفظ کا صحیح جگہ استعمال نگینہ کاری کی طرح ہوتا ہے۔ زیرِ نظر نثری ترجمے سلیس، رواں، پختہ و شگفتہ زبان میں کیے گئے ہیں۔ انھوں نے تلسی داس کے اس مقدس صحیفے کا بڑے عمق اور بصیرت کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور اس کے لیے جو پیش لفظ اس مسودے میں شامل کیا ہے وہ بہت دل چسپ، مدلل اور متوازن ہے۔ ان کے دلائل منطقی اور صادق ہیں اور ان کی حق شناسی و بالغ نظری کے آئینہ دار ہیں۔

رُوحانی مکالمہ

صرف ۳۲ صفحات پر مشتمل مختصر سا کتابچہ ہے۔ اس میں مرشدِ اعظم شری سوامی شنکر آچاریہ کی تصنیف "پرشنوتّری" کو اردو شاعری کے لباس میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتابچہ آدرش کتاب گھر فیض گنج دریا گنج دہلی سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا۔

پرشنوتّری کے معنی ہیں سوال و جواب۔ اِن اشعار میں چیلا (مُرید۔ شاگرد) اپنے گورو یا مرشد سے کچھ رُوحانی سوالات پوچھتا ہے۔ ان منظوم سوالات کے منظوم جواب گورو یا مرشد کی جانب سے دیے گئے ہیں۔ کچھ منتخب سوالات اور ان کے جوابات بطورِ نمونہ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ منوّر اس ترجمے کے صفحۂ قرطاس پر لائے جانے کا مقصد اپنے مختصر دیباچے میں بتاتے ہوئے رقم طراز ہیں :-

> "ترجمانی کا جنون مجھے ہندِ مقدس کے مرشدِ اعظم شری ۱۰۰۸ سوامی شنکر آچاریہ کے آستانۂ پاک تک بھی کھینچ لایا اور میں نے ان کی شہرۂ آفاق تصنیف "پرشنوتّری" کو بھی جو معرفت و حقیقت کی تعلیم کا ایک مختصر وسیلہ ہے، اردو شاعری کے لباس میں پیش کرنے کی جرأت کی ہے۔ موضوع خشک ہے اور اندازِ بیاں بھی ترش۔ وجہ یہ ہے کہ حقیقت ہمیشہ تکلف و تصنع سے بری ہوتی ہے۔ اس لیے اصل تصنیف کی خشک بیانی اور سادہ طرزِ نگارش اردو شعر میں بھی منعکس ہو رہی ہے ...."

منوّر اس سے پہلے شنکر آچاریہ جی کی "چرپٹ پنجریک" کا بھی شعری ترجمہ "نغمۂ قلندری"

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کے نام سے شائع کر چکے تھے۔

مُرید کا سوال :

مرشدِ مہرباں! کرم کی نگاہ — خضرِ منزل نشاں کرم کی نگاہ
مبتلا تیرگی کی راہ میں ہوں — غرق ہیں قلزمِ گناہ میں ہوں
روِش اس درجہ بد نہیں کوئی — اس سمندر کی حد نہیں کوئی
رُخِ تسکیں دکھائیے مجھ کو — ڈوبتا ہوں بچائیے مجھ کو

کیا ہے میری رفاہ کی صورت
کچھ تو آخر پناہ کی صورت

جوابِ مرشد :

ہے خیالِ خدا رفاہ کی شکل — بس یہی ایک ہے پناہ کی شکل
سوال : آدمی بے خرد ہے ایسا کون؟ — ہے گرفتارِ دامِ دنیا کون؟
جواب : جس پہ خیلِ حواس غالب ہو — ان سے جو لذتوں کا طالب ہو
سوال : دُور کیونکر عذابِ دنیا ہو؟ — غمِ ہستی کا کیا مداوا ہو؟
جواب : آدمی ربِ پاک کو جانے — خالقِ دو جہاں کو پہچانے
سوال : کیا بنائے عذابِ دوزخ ہے؟ — کس سے وا، ہم پہ بابِ دوزخ ہے؟
جواب : اس کا باعث ہے ذات عورت کی — قہر ہے بات بات عورت کی
سوال : کیسے شکلِ سکونِ کامل ہو؟ — ہمیں کیونکر بہشت حاصل ہو؟
جواب : بھول کر بھی نہ دیں کسی کو عذاب — نہ کسی سے کریں سلوک خراب
سوال : ہے غنی کون، مالدار ہے کون؟ — صاحبِ گنجِ بے شمار ہے کون؟
جواب : مال ہے اُس کے پاس دولت ہے — صرف حاصل جسے قناعت ہے
سوال : بے بصر کون؟ کون اندھا ہے؟ — دیدۂ شوق کور کس کا ہے؟
جواب : وہ جو شہوت پرست ہوتا ہے — چشمِ بینا میں پست ہوتا ہے
سوال : کون اُستاد کون رہبر ہے؟ — کس سے علم و ہنر میسّر ہے؟
جواب : جس سے دنیا کی بھی ملے تعلیم — جس سے عقبیٰ کی بھی ملے تعلیم
سوال : کون انساں ہے لائقِ توصیف؟ — کون ہوتا ہے قابلِ تعریف؟

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

جواب : دُوسروں کے جو کام آتا ہے — دُکھ کے ماروں کا دُکھ مٹاتا ہے

سوال : کون ہوتا ہے لائقِ تعظیم؟ — کون ہوتا ہے واجب تکریم؟

جواب : جس کو عرفاں کا نور حاصل ہے — نیک و بد کا شعور حاصل ہے

سوال : کون محرومِ نطق ہوتا ہے؟ — بے زبان کون، کون گونگا ہے؟

جواب : نہ رہِ راست میں جو لب کھولے — خواب میں بھی کبھی نہ سچ بولے

سوال : چیز مشکل سے کون ملتی ہے؟ — کس سے بنیادِ جہل ہلتی ہے؟

جواب : مرشدِ پاک، رہبرِ کامل — مردِ روشن ضمیر، صاحبِ دل

اور اصحابِ نیک کی صحبت — تیاگ، ایشور کا گیان، ست سنگت

دل کو لذّات سے ہٹا لینا — ایک مالک کا آسرا لینا

اُس کی بھگتی ہے باعثِ راحت — اُس کی بھگتی کی ہے بڑی عظمت

اُوپر کی سطور میں "پرشنوتری" کے محض چیدہ چیدہ منظوم سوالات اور مرشد کی جانب سے ان کے منظوم جوابات بطورِ حوالہ درج کیے گئے ہیں۔ یہ ترجمہ تبلیغی نقطۂ نظر سے رفاہِ عام کے لیے اور بلند اخلاقی اقدار کو مقبولِ خلق کرنے کے مقصد سے کتابچے کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اس میں اچھی شاعری کے تمام لوازمات بھی ہیں اور اخلاقیات کے اصائلِ محسنہ بھی۔ یہ کتابچہ مقصدی شاعری کی ایک عمدہ مثال ہے اور کامیاب ترجمے کی بھی۔

آریہ ابھی وِنے (بِنَا) پرماتما کے دربار میں آریہ سماج کے بانی مہرشی دیانند سرسوتی کی کی تالیف ہے۔ منوّر لکھنوی نے اِس تالیف کا شعری ترجمہ اُردو زبان میں آریہ سماج کرنال (ہریانہ) کے چند مقتدر اور ممتاز اراکین کی فرمائش پر ۱۹۶۸ء میں مکمل کیا۔ اس کے ناشر رائے صاحب چوہدری پرتاپ سنگھ تعارفی نوٹ میں لکھتے ہیں:۔

"۱۹۶۷ء کے ماہِ نومبر میں آریہ سماج کرنال کے کچھ بلند خیال عالموں اور شاعروں نے منوّر صاحب کو ایک خاص موقعہ پر ضیافت دی اور اس موقعہ پر یہ خیال ظاہر کیا کہ بھارت کے تیز جنم داتا مہارشی دیانند سرسوتی کی تالیف آریہ ابھی وِنے کے مطالب و مفاہیم کو اردو شاعری کے قالب میں پیش

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کر کے اُردو والوں کو اس عظیم و قدیم رُوحانی دولت سے مالامال فرمائیں۔ اگرچہ منوّر صاحب کی تندرستی میں پہلے کے مقابلے عمر کے زیرِ اثر کافی فرق آگیا ہے۔ پھر بھی انھوں نے اس خدمت کی تکمیل کے لیے بھی کمرِ ہمت باندھ دی اور مارچ ۱۹۶۸ء کے آخر تک یہ منظوم ترجمہ مکمل کر دیا۔"[1]

آریہ ابھی وِنے کا یہ ترجمہ ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ سنِ اشاعت ۱۹۶۸ء ہے۔ آغازِ ترجمہ کی تاریخ اس کے کوائف میں نومبر ۱۹۶۷ء اور تکمیلِ ترجمہ کی تاریخ ۲۷ اپریل ۱۹۶۸ء درج ہے۔ اور اس کے ناشر رائے صاحب چوہدری پرتاپ سنگھ ٹرسٹ ۱۷۵ ماڈل ٹاؤن کرنال ہیں۔

مشہور ریفارمر اور آریہ سماج کے پیشوا دیانند جی کی تمام تصانیف و تالیفات بنیادی طور پر ویدوں کے گیان کی روشنی میں قلم بند کی گئی ہیں۔ زیرِ نظر شعری ترجمہ میں زیادہ تر پرارتھنائیں (دعائیں) اور حمدیہ گیت ہیں جن میں وید کے منتروں سے اخذ کیے گئے خیالات کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ ان حمدیہ سطور کے تراجم کی چند مثالیں ذیل میں تحریر کی جارہی ہیں۔ یہ تراجم سوامی دیانند کے افکارِ عالیہ کی پوری اور صحیح عکاسی کرتے ہیں:۔

جس کا پرماتما لقب ہے — جو نیست کا ہست کا سبب ہے
سب کے اندر بسا ہوا ہے — جو پاک پوتر آتما ہے
آزاد ہے جو نہیں ہے پابند — جس کو کہتے ہیں ست چت آنند
ہے اُس کا وجود ابتدا سے — شرمندہ نہیں وہ انتہا سے
کرتا ہے وہ مدام انصاف — ہے صورتِ آئینہ وہ شفاف[2]

اگنی یعنی پرکاش کے سروپ میں پرماتما کی استتی (حمد)

اے اگنی کی شکل میں نمایاں — میں آپ کا دل سے ہوں ثناخواں
کرتا ہوں باصفت مناجات — عرفاں ہے تمام آپ کی ذات
دنیا بھر میں بشر ہیں جتنے — کہتا ہے وہ کردگار اُن سے

---

[1] "آریہ ابھی وِنے (ترجمہ منظوم۔ منوّر لکھنوی) صفحہ vii
[2] " " " " ۱ ایڈیشن ۱۹۶۸ء

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اے انسانو! سُنو مری بات   معبودِ زمانہ ہے مری ذات
میری استتت میں لب کشا ہو   ہر وقت میری پرارتھنا ہو [۱]

پرارتھنا (منقبت)

اُگنی کے پاک رُوپ میں پرماتما ہیں آپ   پرماتما ہیں مالکِ ارض و سما ہیں آپ
موجودِ کُل ہیں آپ ہُویدا کہاں نہیں   ہر شکل ہر لباس میں پیدا کہاں نہیں
رُخ آپ کا ہے چار طرف آئینہ طراز   ہیں آپ ہی نشیب تو ہیں آپ ہی فراز
اے اگنی دیو عالمِ امکاں ہے آپ سے   ہر چیز میں جلال نمایاں ہے آپ سے [۲]

آریہ قوم کے ویدک دھرم میں ہون یگیہ کا رواج از منۂ قدیم سے چلا آرہا تھا۔ ہَوَن کرنے کے لیے اگنی (آگ) لازمی شے تھی۔ عموماً دو لکڑیوں کو باہم رگڑ کر ہون کے لیے اگنی پرکٹ (نمودار) کی جاتی تھی۔ انرجی کا منبع ہونے کے باعث بھی آگ کی اہمیت مسلّم ہے۔ اِس کرۂ ارض پر آگ کے بغیر زندگی کا تصوّر ہی ناممکن ہے۔ اس لیے آریہ لوگ قدرت کی اِس قوّت کی پرستش کرتے تھے۔ ویدوں میں اگنی بہت اہم دیوتا (قوّت) مانا گیا ہے۔

ایک اور حمد اس کتاب میں دیکھیے :۔

(استتی)

ہم اُسے پرماتما کہتے ہیں اے صاحبِ نظر!   ہر جگہ آکاش کی مانند ہے وہ جلوہ گر
عالمِ امکاں کا پیدا کرنے والا ہے وہی   بے نیازِ جسم ہے برتر ہے بالا ہے وہی
اُس کے ٹکڑے ہو نہیں سکتے، ہے وہ لاانتہا   شکل اُس کی کچھ نہیں وہ جسم میں ظاہر ہو کیا
اُس سے بڑھ کر کوئی بھی شے بزمِ امکاں میں نہیں   دشت و گلشن میں نہیں کوہ و بیاباں میں نہیں
اُس کے رُخ سے کوئی بھی پردہ ہٹا سکتا نہیں   بے حجابی سے اُسے عُریاں بنا سکتا نہیں
ہے لطیف اتنا کہ وہ محسوس ہو سکتا نہیں   قیدِ نبض و پوست میں محبوس ہو سکتا نہیں [۳]

اوپر کے تراجم میں جہاں حمدیہ اور رُوحانیت اثر زبان استعمال کی گئی ہے وہاں اُردو اور ہندی نیز سنسکرت الفاظ کی آمیزش بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ صفاتِ ایزدی کو بیان کرنے کے

۱، ۲، ۳ آریہ ابھی ونے (ترجمہ منوّر لکھنوی) صفحہ ۱۰۰ — ۱۶۴ — ۱۶۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

لیے ترجمے میں اصل متن کے مزاج سے میل کھاتے ہوئے الفاظ ہی استعمال کیے جانے ضروری ہیں۔ منوّر نے خود بھی اپنے مختصر دیباچے میں فرمایا ہے کہ :-

"یہ ترجمہ بہر حال ترجمہ ہے اور اس میں موقع کے مطابق اردو اور ہندی دونوں قسم کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس لیے اچھی شاعری کی تمام ممکن خوبیاں حتی الامکان اس میں سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض ہندی الفاظ اردو تلفّظ میں اصل مخرج سے قدرے مختلف محسوس ہوں گے۔ ان مخرجوں کے استعمال پر اردو کے ماحول میں زور دینا زیادہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ حتی الامکان ہندی تلفّظ کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر بھی فنی مجبوریوں اور علمی مصلحتوں کے تحت بعض مقامات پر اصل تلفّظ سے گریز کیا گیا ہے۔ اور ایسا کرنے کا حق ایک مترجم کو حاصل ہے۔[1]"

ظاہر ہے کہ ضرورتِ شعری سے پُورتر ست چت آنند، اج، اننت، استت، پراتھنا جیسے الفاظ ترجمے میں سموئے گئے ہیں، تاکہ اشعار عروض کی پابندی میں رہیں اور مفہوم بھی ترجمے میں صحیح ادا ہو۔ ان کے بجائے اگر ان کے فارسی یا اُردو متبادل الفاظ کو لایا جاتا تو یا تو عروضی پابندیوں کی تعمیل کے لیے منظوم ترجمہ طویل ہو جاتا بصورتِ دیگر مفہوم مجروح ہو جاتا۔ آریا ابھی وِنے کے متن کے مزاج کے مطابق ہندی اور اردو الفاظ کی نشست اپنی اپنی جگہ بہت موزوں اور برموقع ہے۔ اِس آمیزش سے ترجمہ زیادہ مُؤثر اور دل کش ہو گیا ہے۔ جس مزاج اور معیار کے قارئین کے لیے یہ ترجمہ فرمائش کے مطابق کیا ہے، اِس مخصوص ریڈرشپ کے لیے یہ ترجمہ بہت کامیاب اور معیاری ترجمہ ہے۔

گجیندر موکش

۳۲ صفحات کا ایک کتابچہ ہے جو دراصل مہرشی وید ویاس کی نادر الزمانہ تصنیف شریمد بھاگوت کا ایک چھوٹا سا اقتباس ہے۔ اس کہانی کے ذریعے یہ رُوحانی درس دیا گیا ہے کہ اِس دنیا کا خالق بہت رحیم و کریم ہے اور جب کوئی جاندار دُکھی ہو کر سچے دل سے

---

[1] آریہ ابھی وِنے۔ دصفحہ دیباچے)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اُس ذاتِ الٰہی سے امداد کا خواہاں ہو اور خلوصِ قلب سے اُسے پکارے تو وہ خدائے کارساز اُس فریاد سے پسیج جاتا ہے اور سائل کی مدد اور دستگیری کے لیے دوڑا دوڑا آتا ہے۔ "پنج تنتر" نامی تصنیف میں جانوروں کی کہانیوں کے ذریعے اخلاق اور حکمتِ عملی کے اسباق ذہن نشین کرائے گئے ہیں۔ عین اسی طرح "گجیندر موکش" میں ایک ہاتھی کی کہانی کے ذریعے قارئین کو یہ نکتہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ خلوصِ دل سے کیے ہوئے سجدے، فریادیں اور دعائیں رائیگاں نہیں جاتیں۔ رحمتِ ایزدی دُکھی دل کی فریاد سن کر یقیناً جوش میں آتی ہے۔ اور مصیبت زدوں کی دستگیری اور مشکل کشائی کرتی ہے۔

گجیندر، ترکوٹ پربت پر رہنے والا شکیل اور مست ایک بڑا ہاتھی ہے اور ہاتھیوں کے گروہ کا سربراہ۔ موسمِ گرما کی حدت میں اپنی عادت کے مطابق وہ نہانے کے لیے اپنے گروہ کے ہمراہ جھیل میں اُترتا ہے۔ وہ ہتھنیوں کے ساتھ پانی میں کلیلیں کرتا ہے اور بچوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ اسی عالم میں ایک مگرمچھ اُس کی ٹانگ اپنے جبڑوں میں جکڑ لیتا ہے۔ مگرمچھ سے ٹانگ چھڑانے کی ہر ممکن کوشش ناکام ہوتی ہے اور گجیندر (گج = ہاتھی اندر = راجہ) یعنی ہاتھیوں کے راجہ کو اپنی موت یقینی نظر آتی ہے تو وہ تائب ہو کر سچے اور پاک دل سے بھگوان وشنو کو مدد کے لیے پکارتا ہے۔ بھگوان وشنو اس کی فریاد سے پسیج کر جنتُ الفردوس سے اپنی معمول کی سواری گرڑ پکشی پر سوار ہو کر گج راج کی مدد کو پہنچتے ہیں۔ وہ اپنے سُدرشن چکر سے مگرمچھ کا کام تمام کر دیتے ہیں۔

کہانی کے نصف دوسرے حصے میں پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ مگرمچھ دراصل ایک گندھرب تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ وہ بھی فی الواقعی کسی بددعا کے زیرِ اثر مگرمچھ کی جون میں پڑا تھا اور اب اُسے بددعا سے گجیندر نے نجات دلا دی ہے۔

منوّر لکھنوی نے مذکورہ کہانی کا آزاد ترجمہ کیا ہے بلکہ اسے ترجمے کی بجائے اُردو نظم میں آزادانہ از سرِ نو لکھی ہوئی منظوم داستان قرار دینا چاہیے۔ یہ کتابچہ آدرش کتاب گھر، دریا گنج دہلی سے ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔

میلوں تک پھیلا ہوا ترکوٹ پربت گندھربوں اور دیوتاؤں کا مسکن تھا۔ اس کی عظمت اور عشرت فضا ماحول کا ذکر منوّر کس اہتمام کے ساتھ کرتے، ملاحظہ ہو:۔

ہم کیا بتائیں کیا کیا جوہر نہاں تھے اس میں
آئینہ پاش گویا ہفت آسماں تھے اس میں

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تھا تین چوٹیوں سے رُتبہ بلند اس کا — تھا ایک ایک منظر یزداں پسند اس کا
تینوں سے روشنی کی اک تہر سی رواں تھی — ترتیب ان کی گویا ترتیبِ کہکشاں تھی
باسی ازل سے اس کے نے گندھرب دیوتا تھے — اس کی ادا ادا پر سو جان سے فدا تھے
ہر وقت رنگ رلیاں رہتی تھیں ان میں جاری — دنیائے عاشقی میں تھے محوِ جاں سپاری
ہونٹوں میں چاشنی تھی آنکھوں میں انکی رس تھا — زہرہ وشوں سے پہلو آباد ہر نفس تھا [1]

ترکوٹ پہاڑ پر واقع جھیل کا یوں ذکر کرتے ہیں:-

اک جھیل خوبصورت اس کوہ پر رواں تھی — عمرِ طویل پر بھی یہ نازنیں جواں تھی
اس جھیل میں کنول تھے ہر گام پر شگفتہ — تھے ان کے دیکھنے سے قلب و نظر شگفتہ

ہاتھیوں کا سربراہ گجیندر گرمی کے مارے پیاس سے بے تاب ہو کر جھیل پر پہنچتا ہے آگے کے واقعات کو منوّر یوں نظم کرتے ہیں:-

کی اُس کے پاک جل سے کافور پیاس اپنی — خود جھیل میں اُتر کر کی دُور پیاس اپنی
پھر کھیلنے لگا وہ بچوں کو ساتھ لے کر — کرتا تھا پیار ان کو سونڈوں میں سونڈ دے کر
محبوب ہتھنیوں پر پانی اُچھالتا تھا — موجوں کو دے کے جنبش چکّر میں ڈالتا تھا
حد سے گزر گیا تھا کچھ اتنی بے خودی تھی — مستی شباب کی یہ مستی شراب کی تھی
آسودگی میں گم تھی اب پیاس کی اذیّت — وہ زعم تھا خودی کا بے راہ تھی طبیعت
مستی میں اپنی آ کے سب کو بھلا دیا تھا — سر پر خودی کا پربت گویا اُٹھا لیا تھا
قدرت کو توڑنا تھا لیکن غرور اُس کا — تھا سرزنش کے قابل فسق و فجور اُس کا [2]

عیش و مستی کے اس عالم میں مشیتِ ایزدی کو اُس کی اصلاح کیسے منظور تھی۔ ملاحظہ ہو:-

گم گشتۂ خودی کی تعزیر لازمی تھی — اصلاحِ زندگی کی تدبیر لازمی تھی
قدرت بھی ڈھونڈتی ہے اصلاح کا بہانہ — ہاتھوں میں سرزنش کا رکھتی ہے تازیانہ
جب اس طرح کلیلیں بدمست کر رہا تھا — جس وقت شیطنت کا جذبہ اُبھر رہا تھا
پیچھے سے آ کے پکڑی ٹانگ اُس کی اِک مگر نے — جبڑوں میں اپنے جکڑی ٹانگ اُس کی اِک مگر نے
تھا گراہ کی جکڑ سے اتنا گجیندر خستہ — مایوس ہو گیا تھا بچنے سے دل شکستہ
یہ دیکھ کر کہ بچنا مشکل گجیندر کا ہے — اِس وقت پانی پانی پیتہ گجیندر کا ہے

---

[1] [2] [3] گجیندر موکش (منوّر لکھنوی) مطبوعہ ۱۹۵۸ء صفحات ۸-۹-۱۱ بالترتیب

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سب لے کے جان بھاگ گئے سہمے ہوئے مگر سے / نامردمی دِکھا کر ٹالی بَلا یہ سر سے [1]

گجیندر کو احساس ہوتا ہے کہ اب اس کی موت یقینی ہے۔ وہ صدق دل سے بھگوان کو مدد کے لیے پکارتا ہے۔ ملاحظہ ہو کیا رقّت خیز حمدیہ اشعار ہیں:

شاید سزا ملی ہے مجھ کو کسی خطا کی / نزدیک آگئی ہے ساعت مری فنا کی
گجراج کے لبوں پر فریاد تھی فغاں تھی / جو اِلتجا تھی اُس کی بیکسی کی داستاں تھی
سر اُس کا جھک گیا تھا اظہارِ بندگی میں / بھگوان کی مدد کا طالب تھا بے بسی میں
بھگوان کون جن سے ہے یہ ظہور سارا / جن کے یمِ کرم کا پیدا نہیں کنارا
ہر جسمِ عنصری میں جو روح ہیں رواں ہیں / جن سے قیامِ تن ہے جو جلوہ پاشِ جاں ہیں
آثارِ بزمِ ہستی ہیں آئینہ انھیں سے / ہیں جس قدر بھی شکلیں ہیں رونما انھیں سے [2]
وہ برمھا ہیں وہی ہیں تینوں بھون کے مالک / سرو و سمن کے مالک دشت و دمن کے مالک
ہیں روپ اُن کے لاکھوں ہیں نام اُن کے لاکھوں / ہیں فرش اُن کے لاکھوں ہیں بام اُن کے لاکھوں
بے حد ہیں دُور پھر بھی ہر حلقۂ نظر سے / ظاہر ہیں وہ اِدھر سے غائب ہیں وہ اُدھر سے
ذاتِ جلیل اُن کی ہر قید سے بَری ہے / جو اُن کی برتری ہے وہ اُن کی برتری ہے [3]

مندرجہ بالا اشعار میں بندش کی چستی، زبان کی فصاحت و بلاغت اور لکھنویت کی چاشنی ایک عجیب تاثر پیدا کر رہی ہے۔ ان حمدیہ اور توصیفی اشعار کو پڑھ کر لطف آتا ہے۔

گجراج تائب ہو کر فریاد کرتا ہے:-

چشمِ کرم ہو ایسی ہو رنج دُور میرا / کر دیں معاف سوامی جو ہے قصور میرا
اِس کشمکش سے مالک میں تنگ آگیا ہوں / کیوں قید اس بَلا میں آخر کیا گیا ہوں [4]

بھگوان گجیندر کی دردناک پکار اور دلِ گداز فریاد سے تڑپ اُٹھتے ہیں۔ وہ سُدرشن چکر ہاتھوں میں لیے گرڑ (شاہین) پکشی پر سوار موقع پر پہنچ گئے۔ ہاتھی نے انھیں دیکھ کر ان کی استتی کی۔

بھگونت شیام سندر جیوتی سروپ تم ہو / تم اندر اندروں کے بھوپوں کے بھوپ تم ہو
بن کر مرے محافظ آئے ہو پاس میرے / مونس تمھیں بنے ہو ہنگامِ یاس میرے [5]
بھگوان نے چلایا اس طرح کچھ سُدرشن / اُس دین اُس دکھی کو دے کر خوشی سے درشن
در پیش خاتمہ تھا اُس جاں سِتاں مگر کا / منہ چیر کے رہ گیا تھا ناپاک جانور کا [6]

یہاں اب کہانی کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ مگر مچھ کے قالب سے رہائی پا کر اُس کی روح ایک

[1] ماتا گجیندر موکش از کوثر (لکھنوی) [illegible]

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh. Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

حسین وجمیل گندھرب کے قالب میں نمودار ہوئی۔ وہ ہاتھی کی شکر گزار ہوئی کہ اُس نے مگرمچھ کے قالب سے اُسے نجات دلادی۔ وہ بتاتا ہے کہ وہ دراصل ایک گندھرب تھا لیکن ایک رِشی کی بد دعا کے زیرِاثر وہ مگرمچھ بن گیا۔ منوّر نے اس کی کہانی یوں نظم کی ہے۔ اس میں سے چند منتخب اشعار دیکھیے :-

اِک روز کا ہے قصہ میں سیر کر رہا تھا ہر نقشِ آرزو میں سو رنگ بھر رہا تھا
موجِ رواں کا عالم میری اُڑان میں تھا اُس وقت مسند آرا شاہی وِمان میں تھا
بے فکر دو جہاں سے تھا محوِ عیش و عشرت مصروفِ دلبری تھی میری انیسِ خلوت
رُخسار و لب کی قسمت دونوں جگا رہے تھے اک دوسرے پہ دونوں قربان جا رہے تھے
اُس محفلِ طرب میں کچھ اور بھی حسیں تھے پہ چنچل تھے، ماہ رُو تھے، اَلھڑ تھے، نازنیں تھے
اُس دشت پُر فضا میں تالاب اِک حسیں تھا حد درجہ دِل رُبا تھا، حد درجہ دِل نشیں تھا
سب عورتوں کو لے کر اُس کے قریں میں اُترا مسحور اُس سے ہو کر خندہ جبیں میں اُترا ١

یہ تمام گروہ پانی میں اُتر کر دادِ عشرت دینے لگا۔ اس تالاب میں پاکباز دیول رِشی بھی آرام فرما رہے تھے۔ اپنی جلیسوں کے اشارے پر گندھرب نے رِشی سے شرارت کی۔

مستی کی ان حدوں سے جب ہم گزر رہے تھے دیول مہا مُنی بھی "جل سین" کر رہے تھے
سوجھی یہ مہوشوں کو کچھ چھیڑ ہو رِشی سے صبر ان کا آزمائیں شوخی سے دل لگی سے
خرمستیوں میں سوجھی مجھ کو بھی دل لگی سی ڈبکی لگا کے پکڑی اِک ٹانگ مہرشی کی
پھر ٹانگ کھینچ کر میں کچھ دور ان کو لایا گُم کر کے ہوش ان کے تالاب میں گرایا
سب نے لگائے ٹھٹھے گرنے پہ مہرشی کے پورے ہوئے تھے ارماں اس وقت انچھرا جی کے ٢

دیول رِشی نے غیظ میں آکر بد دعا دی۔ وہ یوں گویا ہوئے :-

جو کچھ کیا ہے تو نے اس کی سزا ملے گی جیسا مرض ہے تیرا ویسی دوا ملے گی
کھینچی ہے ٹانگ تو نے پری مگر کی صورت تکلیف سخت دی ہے مجھ کو یہ بے ضرورت
پانی میں تا بمدّت رہنا پڑے گا تجھ کو بے حرمتی کا صدمہ سہنا پڑے گا تجھ کو ٣

گندھرب کے معافیاں مانگنے اور گڑگڑانے پر دیول رِشی کو ترس آگیا۔

---

١ تا ٣ گجیندر موکش (منوّر لکھنوی) ایڈیشن ١٩٥٨ء صفحات بالترتیب ٢١-٢٢-٢٣-٢٤

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بولے ابھی تو یہ دُکھ سہنا پڑے گا تجھ کو — محبوس اس بَلا میں رہنا پڑے گا تجھ کو
لیکن پھر ایک دن تو پا جائے گا رہائی — پھوٹے گی ساتھ تیرا تقدیر کی رسائی
ہوگا گجیندر ہاتھی آکر اسیر تیرا — شامِ اَلم سمٹ کر بن جائے گی سویرا
ہاتھی کے غم کا درماں بھگوان خود کریں گے — تسکین و عافیت کا سامان خود کریں گے
تیرا لباسِ ہستی اُس وقت چاک ہوگا — قصہ ترا انھیں کے ہاتھوں سے پاک ہوگا ؎۱

گجیندر بھی دراصل ایک راجہ تھا اور رشی اگیستہ کی بددعا سے معتوب ہو کر ہاتھی کے جنم میں آیا تھا۔ اب وہ بھی اپنے اصلی روپ میں آگیا اور بھگوان نے ان دونوں کو دعائے برکت دی۔

اس منظوم قصے کے اختتام پر منوّر لکھنوی اپنی طرف سے تلقین و ہدایت کرتے ہیں:۔

بالکل اسی طرح سے معذور ہو جو انساں — دنیا کے فکر و غم سے محصور ہو جو انساں
امداد کے لیے بس بھگوان کو پکارے — کشتی جو ہو بھنور میں لگ جائے وہ کنارے
کہتا ہوں سچ منوّر یہ تجربہ ہے میرا — ہوتا ہے اس سے غائب مایوسیوں کا گھیرا
پاتے ہیں وہ مُرادیں جو ہیں مُراد والے — ہوتا نہیں کبھی دل افکار کے حوالے ؎۲
ہے اس کتھا کا رتبہ بھگتوں پہ آشکارا — چھوٹا سا یہ صحیفہ دُکھیوں کا ہے سہارا
گائے ہیں گیت اس کے گاندھی مہاتما نے — تعریف کی ہے اس کی اُس مردِ بے ریا نے
تم بھی گجیندر بن کر بھگوان کو پکارو — کیسی بھی ہو مصیبت ہمت کبھی نہ ہارو ؎۳

مہرشی وید ویاس کی شریمد بھاگوت کی یہ کتھا شکدیو منی نے راجہ پریکشت کو سنائی ہے۔ اس کا اصل ماخذ شریمد بھاگوت ہے۔ منوّر لکھنوی اس کتھا (داستانِ عقیدت) کی اہمیت و افادیت کے متعلق اپنے اس کتابچے میں رقم طراز ہیں:۔

" اس نسخے کی عظمت کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب مہاتما گاندھی نے غیر ملکی حکمرانوں اور محکوم ہندوستان کے درمیان آزادی کی کشمکش کو گجیندر اور گراہ کی لڑائی سے تشبیہ دے کر مایوسی کے عالم میں بھگوان کو پکارا۔ کوئٹ انڈیا (ہندوستان چھوڑو) کے مہامنتر میں اس مہان یوگی نے نہ جانے کیا درد، کیا تڑپ بھر دی تھی کہ ہمارے حکمرانوں کے دل۔ اندر سے خود بخود لرزنے لگے اور انھیں یہ بخوبی معلوم ہوگیا

۱، ۲، ۳ گجیندر موکش (منوّر لکھنوی) ایڈیشن صفحات ۲۴-۲۵-۲۹-۳۰-۳۰ —

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کہ اس مہامنتر کے پسِ پشت کوئی ایسی زبردست اور ما فوق الطبع طاقت کام کر رہی ہے جو انھیں ہندوستان چھوڑ دینے پر مجبور کر دے گی۔ گاندھی جی کی تپسیا کیا تھی، گجیندر کی فریاد تھی، بھگوان نے ان کی مایوسیوں کو امید میں تبدیل کر دیا اور انگریز ہندوستان کو اپنی غلامی کے شکنجے سے آزاد کرنے پر مجبور ہو گیا......... مہاتما گاندھی نے جو سند بلا واسطہ گجیندر موکش کو دی ہے وہ غلط نہیں۔ میں نے بھی بعض اوقات مجبوری کی حالت میں بھگوان کو پکارا ہے اور بھگوان نے میری سُنی ہے۔ وہ سب کی سنتے ہیں۔ البتہ ہمیں ذرا صبر و تحمل سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ گجیندر موکش کے پاٹھ کی تاثیر کا میں بھی قائل ہوں۔[1]

اس روحانی اور عرفانی داستان کو منوّر لکھنوی نے انتہائی عقیدت، انکسار اور خشوع و خضوع کے ساتھ قلم بند کیا ہے اور اس کے نظم کرنے میں جملہ شعری محاسن، صنائع و بدائع کا التزام بھی رکھا ہے۔ اسے نظم کرنے کے لیے جس بحر کا انتخاب کیا گیا ہے، وہ رواں دواں بحر بھی اس جذبۂ عقیدت کے ساتھ میل کھاتی ہے۔

اگرچہ اس تقدّس بھری رُوحانی داستان کو منوّر لکھنوی سے پہلے بھی کئی بزرگ نظم کر چکے ہیں لیکن ہر شخص کی زبان اور طرزِ اَدا جداگانہ ہوتی ہے۔ اور یقیناً اس کہانی کے تلنے بلنے اور منفرد طرزِ بیان میں منوّر نے اپنی شناخت برقرار رکھی ہے۔

"رمبھا شُک سمواد"

ایک مشہور سنسکرت نظم کا حرف بحرف منظوم ترجمہ ہے جس میں رمبھا نام کی اپسرا اور رشی شُک دیو کے درمیان ہوئی گفتگو کو نظم کیا گیا ہے اور اس میں دُنیا پر دِین کی فضیلت ثابت کی گئی ہے۔ بیشتر بندوں کے آخر میں اس ایک مصرعہ کو دوہرایا گیا ہے۔

بے کار شے ہے ایک حیاتِ بشر نہیں

یہ نظم کتابچہ کی صورت میں بھی ہے اور منوّر لکھنوی کی مطبوعہ تصنیف نظمیات "کائناتِ دل" کی بھی زینت بنی ہے۔ گلبدن حسینہ رمبھا اپنے اندازِ فکر کے مطابق عشق و مستی کی تعیش کوشی سے

---

[1] گجیندر موکش (لکھنوی) ۱۹۵۸ء ایڈیشن۔ صفحات ۳-۴ (تعارف)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بے نیاز زندگی کو بے مصرف و رائیگاں ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے جبکہ رشی شُک دیو اپنے زاویۂ نگاہ کے مطابق عبادت، ریاضت اور پاکبازی سے لاتعلق اور خالی زندگی کو بے مقصد اور بیکار سی چیز قرار دیتے ہیں۔ یہ مکالمات بہت دلچسپ اور پُرکشش زبان میں نظم کیے گئے ہیں۔ ترجمہ رواں دواں ہے اور اصل متن کو اردو اشعار کے رُوپ میں دیکھ کر کہیں بھی ترجمے کے بوجھل پن یا زبان کی غیر مانوسیت اور اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ نمونہ کے طور پر چند منظوم مکالمے درجِ ذیل ہیں:۔

رمبھا:۔

ہو جس نگارِ ناز کی مستی اُبھار پر
جس کا ریاضِ حُسن و ادا ہو بہار پر
چندن مَلا ہو جس کے تنِ نور بار پر
حاوی نہ ہو جو دیدۂ بے اختیار پر
ایسی حسین زینتِ پہلو اگر نہیں
بے کار شے ہے ایک حیاتِ بشر نہیں

شُک دیو جی:۔

جس کا وجود حدِ تصوّر سے دُور ہے
پروردگارِ کُل ہے جو بالذات نور ہے
ہر ذرّہ ہر شرار میں جس کا ظہور ہے
جو عینِ معرفت ہے جو عینِ سرور ہے
اُس کا خیال اُس کا تصوّر اگر نہیں
بے کار شے ہے ایک حیاتِ بشر نہیں

رمبھا:۔

چندن سے جس کے پیکرِ گلبار کو ہو زیب
کافور و زعفراں سے بنا ہو جو دلفریب
ملبوسِ عنبریں پہ ہو جس کے فدا شکیب
جس کا فرازِ حُسن نہیں واقفِ نشیب
پہلو میں اپنے اُس کو بٹھایا اگر نہیں
بے کار شے ہے ایک حیاتِ بشر نہیں

شُک دیو جی:۔

خلّاقِ دہر، منبعِ انوار، کردگار
جس کی ہزار صورتیں ہیں، نام بے شمار
عینِ سرور، بانیٔ گلزارِ روزگار
موجود، گُم، عیاں و نہاں، غائب آشکار
محو اُس کے دھیان میں دلِ یکسو اگر نہیں
بے کار شے ہے ایک حیاتِ بشر نہیں

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

رمبھا شُک سمواد کے آخری دو مکالمات جو طرفین کی زبان سے ادا ہوئے ہیں، بالخصوص قابلِ غور ہیں :-

رمبھا :-

پتلی کمر پہ جس کی ہو دھوکا کہ ہے ہلال — قدرت نے جس کو ہنس کی مانند دی ہو چال
ہر دم ہو مستِ نازِ جو سرمایۂ جمال — باغِ جہاں میں جس کی ادا کا بچھا ہے جال
لذت سے اُس کے وصل کی واقف اگر نہیں
آگاہ زندگی کے مزے سے بشر نہیں

شُک دیو جی :-

ہوتا ہے جس سے مائلِ دنیائے دوں بشر — بھگتی کے نخلِ تر کو جو ہے صورتِ تبر
بے درد، راہ زن، ستم ایجاد، فتنہ گر — ایسی حسین پر جو کبھی اُٹھ گئی نظر
زاہد کے دل میں خوف کچھ انجام کا نہیں
انساں وہ دو جہاں میں کسی کام کا نہیں

رمبھا :-

گلہائے عطر بار بچھے ہوں پلنگ پر — ہو شاہدِ حسیں کی طبیعت اُمنگ پر
موسم بسنت کا ہو اِدھر اپنے رنگ پر — دریا اُدھر ہو نورِ سحر کا ترنگ پر
سب ہیچ ہیں بشر میں جو شانِ بشر نہیں
قدرِ گہر ہو خاک جو آبِ گہر نہیں

شُک دیو جی :-

غرقابِ حسن قالبِ خاکی ہوا تو کیا — عورت جوان ہو جو کوئی دل رُبا تو کیا
انبار مال و زر کا اگر ہو لگا تو کیا — گُلریز ہو اگر کوئی شیریں نوا تو کیا
ہے مرگِ نامُراد حیاتِ بشر نہیں
دل مائلِ تصورِ خالق اگر نہیں

منوّر لکھنوی کے دوسرے تراجم کی طرح " رمبھا شُک سمواد " بھی نفسِ مضمون پر اُن کی کامل گرفت اور ترجمے میں محاسنِ شعری کے التزام و تحفظ کا آئینہ دار ہے۔ یہ ترجمہ پہلی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

جنگِ عظیم سے قبل کے دنوں کا نظم کیا ہوا فن پارہ ہے لہٰذا اس میں فارسیت کی پرچھائیاں صاف نظر آتی ہیں لیکن اصل سنسکرت متن کے نفسِ مضمون کے مطالبات ہی کچھ ایسے ہیں کہ فارسی تراکیب سے مترجم دامن نہیں بچا سکتا، ورنہ اصل موضوع کی ترسیل کے لیے ترجمے کو طوالت کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ اس ترجمے میں کہیں کوئی پیچیدگی یا ابہام نہیں اور مطالب صبحِ صادق کی طرح واضح اور روشن ہیں۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

باب پنجم (ب)

سنسکرت تصانیف کے تراجم

(۱) ابھگیان شکنتلا (کالی داس)

(۲) کمار سمبھو (")

(۳) مالویکا گن مِتر (")

(۴) وکرم اُروشئم (")

(۵) رگھوونش (")

(۶) مُدرا راکھشس (وِشاکھادت)

(۷) مالتی مادھو (بھوبھوتی)

(۸) کندمالا یا سیتا بن باس (دِنگ ناگ)

(۹) مفلس کا عشق یا چارودت (بھاس)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سنسکرت تصانیف کے تراجم

اگرچہ سنسکرت ادب ایک بحرِ ذخار ہے۔ تاہم زبان وادب کی عظمت ومقبولیت کے لحاظ سے سنسکرت نے تین "ممتاز شاعر دنیا کو دیے ہیں، جو عصری شہرت کے حامل ہیں اور یہ ہیں والمیک[1]، وید ویاس اور کالی داس اور ان کی شہرۂ آفاق تصانیف ہیں۔ بالترتیب رامائن، مہابھارت اور شکنتلا۔ جنھیں ادبِ عالیہ کا مقام حاصل ہے۔ پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر کے الفاظ ہیں:۔

"اجمالاً اگر رامائن اخلاقی قدروں کی آئینہ داری کرتی ہے تو مہابھارت عقلی دلائل کی ترجمانی اور شکنتلا قومی بیداری کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ تینوں سنسکرت ادب کے شہ پارے انسان دوستی، باہمی رواداری اور قومی یکجہتی کے نیک جذبات سے مملو ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ دراصل دنیائے ادب کے بالعموم اور سنسکرت ادب کے بالخصوص ایسے شہکار ہیں جن کا کوئی جواب نہیں ہے۔"

کالی داس سے پیشتر بھاس، سمسکا اور بعض دوسرے تمثیل نگاروں کے فن پارے تہذیب وتمدن کے ایک خاص دور کے نمائندے تھے جن کا ظہور بودھوں کے زمانۂ عروج میں ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کالی داس کے ڈراموں میں بودھ مذہب اور بودھی تہذیب کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ "مالویکا گن متر" کے تعارفی صفحات میں منوّر لکھتے ہیں:۔

"اصل یہ ہے کہ ازلی شاعرِ والمیک اور ویاس کے بعد سنسکرت زبان کا عروج دوبارہ کالی داس کے زمانے میں ہوا۔ انھیں کے بعد بھوبھوتی نیز دوسرے باکمال ناٹک کار وجود

---

[1] سہ ماہی "نخلستان" جے پور۔ جلد ۹، شمارہ ۳، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۸ء صفحہ ۷، مقالہ کالی داس کی شہ کار تخلیق از پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر بمبئی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

میں آئے۔ جنوبی ہند میں دِنگ ناگ نے بھوبھوتی کی طرح "کُند مالا" نام کا ناٹک لکھ کر سیتا بن باس کے لیے کو تازہ کیا۔[۱]

کالی داس کی عظمت و شہرت کا سکّہ پُوری دنیا نے مانا ہے۔ بقول ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد:

"مشرق و مغرب کے نقّاد اور فن کار دونوں اس کی عظمت تسلیم کرتے ہیں اور اس بات پر متفق ہیں کہ وقت کے جھونکے کالی داس کی فنکارانہ بلندی کے چراغ پر کبھی اثر انداز نہیں ہو سکتے۔"[۲]

کالی داس کی لگ بھگ ساری تمثیلات کے ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں اور ہندوستانی زبانوں میں کیے جا چکے ہیں۔ اُردو میں بھی ان ڈراموں کے متعدد ترجمے پہلے ہی شائع ہو چکے ہیں۔ فرخ سیر کے عہد میں نواز کشیر نامی شاعر نے شکنتلا کی ۱۷۱۶ء میں برج بھاشا کی ایک شکل اردو میں پیش کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر گلکرائسٹ کی تحریک پر اسے مرزا کاظم علی جوان نے آسان اُردو میں منتقل کیا۔ نواز نے گیت اور دوہوں میں ترجمہ کیا تو جوان نے نثر میں۔ ۱۸۰۲ء میں مولوی سید محمد تقی نے "رشکِ گلزار" کے نام سے مثنوی میں ڈھال کر اسے اُردو دانوں سے روشناس کرایا۔ ۱۹۳۹ء میں اختر حسین رائے پُوری نے اسے اُردو کا جامہ پہنایا اور انجمن ترقی اردو حیدر آباد دکن نے ۱۹۴۳ء میں شائع کیا۔ قدسیہ بیگم کے اُردو ترجمہ کو انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ نے زیورِ طبع سے آراستہ کرایا۔ ہندی میں بھی اس کے متعدد تراجم شائع ہو چکے ہیں جن میں راجا لکشمن سنگھ کے ترجمے کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ مختلف منفرد ترجموں کے علاوہ کالی داس گرنتھاولی میں بھی اس کا نثری ترجمہ شامل ہے۔

اُردو میں بعض باکمالوں نے ترجمہ کرنے کی بجائے شکنتلا کی کہانی کو آزادانہ طور پر نظم کر کے شائع کیا۔ مرحوم سحر ہنگامی کی "مثنوی سحر"، جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی کی مثنوی شکنتلا (غیر مطبوعہ) اور کشن چند زیبا، نیز جگجیت سرن داس کی کاوشیں اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ سب سے آخر میں مرحوم ساغر نظامی کا شکنتلا کا ترجمہ شائع ہوا جس پر جواہر لال نہرو، سید سجاد ظہیر اور ڈاکٹر تارا چند نے اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ منور لکھنوی کی رائے ہیں:

"ساغر صاحب نے اپنے خیال کے مطابق مختلف ڈرامائی کیفیات کی تصویر کشی کے لیے

۱۔ مالویکاگنی متر (ترجمہ منوّر لکھنوی) مطبوعہ ۱۹۷۳ء صفحہ ۱۰-۱۱ (کچھ کالی داس کے بارے میں)

۲۔ منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (مرتب راج نرائن راز) صفحہ ۲۳۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تمام ترجمے کو اپنے پسندیدہ شعری انداز میں پیش کیا ہے۔ اگرچہ اصل سنسکرت میں جو ڈرامہ ہے اس میں نثر اور نظم دونوں سے کام لیا گیا۔ ساغر صاحب نے اپنے ترجمے میں بعض مقامات پر جو اندازِ نگارش اختیار کیا ہے وہ بعض اہل الرائے کی نظر میں غیر قدرتی ہے اور مکالمے کے لیے نامناسب بھی۔۔۔۔۔۔"[۱]

اسی لیے منوّر لکھنوی کے بعض دوستوں نے جو اُن کے "مدرا راکشس" "درگا سپت شتی" اور قرآنِ کریم کے بعض حصص کے تراجم کا مطالعہ کر کے ان کی ترجمہ کی صلاحیتوں سے صد درجہ متاثر ہو چکے تھے، ان سے یہ فرمائش کی کہ وہ مروجہ فنی قدروں کا احترام رکھتے ہوئے "شکنتلا" کا ایک ترجمہ پیش کریں۔

محمود ہاشمی فرماتے ہیں :-

"اردو زبان و ادب کی بدقسمتی ہے کہ ہمارے یہاں ایسے تراجم کی تعداد بہت کم ہے جو براہِ راست اصل زبان سے ترجمہ ہوئے ہوں .... اردو والے "شکنتلا" کے ہندی یا انگریزی سے ترجمہ کیے ہوئے ان تلخیصی تراجم ہی سے روشناس ہو سکے تھے جن میں ترجمے کی خامیوں کے علاوہ اصل متن کے بنیادی علائم، سنسکرت ناٹک کے فن، اور کالی داس کے اسلوب سے عدم واقفیت کے باعث بہت سے پہلو یکسر تشنہ رہ گئے تھے۔ ان تمام خامیوں اور کوتاہیوں کو دور کرنے کے لیے ایک ایسے بنیادی ترجمے کی سخت ضرورت تھی جو کالی داس کے اس شہرۂ آفاق ناٹک کے اصل متن سے ہمیں روشناس کرا سکے اور زبان کی بدلتی ہوئی علامتی منطق کے مطابق آئندہ کیے جانے والے زیادہ بہتر تراجم کے لیے راہ ہموار کر سکے۔ یہ کام حضرتِ منوّر لکھنوی نے "شکنتلا" کے اس ترجمے کی صورت میں انجام کو پہنچایا ہے۔"[۲]

اپنے قدردانوں اور دوستوں کی فرمائش کا احترام کرتے ہوئے منوّر لکھنوی نے تقریباً ایک سال کے اندر یہ ترجمہ مکمل کیا۔ ترجمہ کی تاریخِ آغاز جو ابھگیان "شکنتلا" میں چھپی ہے وہ ۲۲ مئی ۱۹۶۲ء ہے۔ ترجمے کا آغاز دہلی میں کیا گیا اور یہ ترجمہ منوّر نے بنارس میں ۱۸ جون ۱۹۶۳ء

---

[۱] ابھگیان شکنتلا (ترجمہ منوّر لکھنوی) سالِ اشاعت ۱۹۶۳ء، صفحات ۱۰-۹ مضمون: شکنتلا کا یہ ترجمہ کیوں: منوّر

[۲] منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (مرتب: راج نرائن راز) ایڈیشن ۱۹۷۰ء، صفحات ۲۴۷-۲۴۸

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کو مکمل کیا۔ ابھگیان شکنتلا (ترجمہ) کی ضخامت ۲۱۶ صفحات ہے اور اسے آدرش کتاب گھر فیض گنج، دریا گنج دہلی نے ۱۹۶۳ء ہی میں شائع کیا۔ اس ترجمے میں نظم کے حصّوں کا ترجمہ شاعری کی مختلف بحور میں کیا گیا ہے اور منثور حصّوں کا ترجمہ نثر میں کیا گیا ہے۔ منوّر کا دعوےٰ ہے کہ اس ترجمے میں "اصل سے بغاوت یا گریز کہیں نہیں کیا گیا ہے۔ زبان حتی المقدور بیشتر ادبی ہے۔"

اس کے برعکس "شکنتلا" کے پہلے کے مطبوعہ تراجم، جیسے اختر حسین رائے پوری کا نثری ترجمہ، سلام مچھلی شہری کے جزوی ترجمے اور بیگم قدسیہ زیدی کا سادہ اور سپاٹ ترجمہ بعض بنیادی خامیوں سے پُر ہیں۔ اور یہ بہت حد تک ناٹک کی بنیادی خصوصیات سے عاری ہیں۔ منوّر لکھنوی کا ترجمہ ان سب کے بعد منظرِ عام پر آیا ہے اور اس میں کالی داس کے ناٹک کی روح اور ڈرامائی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے اس دور کی مخصوص تہذیب اور سماجی ماحول کے کلیدی عناصر کو بڑی کامیابی سے اُجاگر کیا گیا ہے۔ جو زیرِ ترجمہ تصنیف کے بنیادی اجزا و عناصر سے مترجم کی کامل آگاہی پر دال ہے۔ کیوں کہ منوّر نے اس تمثیل کا ترجمہ براہِ راست سنسکرت متن سے کیا ہے۔ تصدیق و توثیق کے لیے کالی داس گرنتھاولی" اور راجہ لکشمن سنگھ کے ہندی ترجمے پر کچھ حد تک انحصار کیا ہے۔

ناٹک کا پلاٹ کچھ اس طرح ہے کہ راجہ دشینت اپنے رتھ پر سوار ایک ہرن کا تعاقب کرتے ہوئے کنو رشی کے آشرم کے مضافات میں پہنچ جاتا ہے، جہاں آشرم میں رہنے والے کچھ تپسوی راجہ سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ اس ہرن کو تیر کا نشانہ نہ بنائے۔ کیوں کہ یہ ہرن آشرم کا پالتو ہرن ہے اور آشرم میں قدم رنجہ فرما کر انھیں میزبانی کا شرف بخشے۔ کنو رشی سوم تیرتھ کی یاترا پر گئے ہوئے ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں دشینت کی ملاقات رشی کی بیٹی شکنتلا سے ہوتی ہے، جو دراصل اندر سبھا کی ایک اپسرا مینکا کی بیٹی ہے، جس کی پرورش کنو رشی نے اپنے آشرم میں کی ہے۔ دشینت اور شکنتلا کی ملاقاتیں محبت کے راز و نیاز میں بدل کر گندھرب دواہ (رشتۂ ازدواج) کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ دشینت کچھ روز آشرم میں قیام کے بعد شکنتلا کو جلد اپنے رنواس (حرم) میں بلا لینے کا وعدہ کر کے اپنی راجدھانی ہستنا پور لوٹ جاتا ہے۔ لیکن اس اثنا میں رشی دُرواسا مذکورہ آشرم کی طرف سے گزرتے ہیں۔ شکنتلا اپنے بچھڑے ہوئے پریتم کے دھیان میں بے خود و مست ہوتی ہے اور رشی دُرواسا کی آواز نہیں سنتی۔ دُرواسا

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کی آواز نہیں سُنتی۔ درواسا اسے اپنی توہین سمجھتے ہیں اور اُن کے شراپ کے زیرِ اثر شکنتلا کا پریتم راجہ دشینت اسے بھول جاتا ہے۔ نہ اُسے اپنا معاشقہ یاد رہتا ہے اور نہ ہی عہد و پیمان رشی درواسا ہندو اساطیر میں ایک ایسا کیرکٹر ہیں جو اپنے ہیٹھ پن اور اپنے غصّے کی وجہ سے مشہور ہیں۔ زود رنجی اور بات بات پر شراپ (بد دعا) دینا ان کی فطرت کا خاصا ہے۔ شکنتلا اپنی بے خودی میں بد دعا کو نہیں سن پاتی۔ لیکن شکنتلا کی سہیلیاں اسے سُن کر خوفزدہ ہو جاتی ہیں۔ وہ رشی درواسا سے معذرت کرتی ہیں اور شراپ واپس لینے کی استدعا کرتی ہیں۔

دوارسا رشی پسیج جاتے ہیں اور اپنی بد دعا میں اتنی ترمیم کر دیتے ہیں کہ اگر شکنتلا یا کوئی اور اُس کے محبوب کو اُس کا زیور یا نشانی دکھا دے تو اُن کی بد دعا کا اثر زائل ہو جائے گا۔

کنو رشی تیرتھ یاترا سے لوٹ کر آتے ہیں تو انھیں اپنی بیٹی اور راجہ دشینت کے گندھرب وِواہ کی خبر ملتی ہے اور وہ بڑے چاؤ سے شکنتلا کو اپنے سسرال جانے کے لیے وداع کرتے ہیں لیکن جب آشرم کی معمّر خاتون گوتمی اور کچھ دیگر رشی شکنتلا کو ہمراہ لے کر ہستنا پور کے راج دربار میں پہنچتے ہیں تو دُرواسا رشی کی بد دعا کے زیرِ اثر پُورو خاندان کا تاجدار دشینت اپنا معاشقہ اور شادی بھول چکا ہوتا ہے اور شکنتلا کو اپنی رانی کی حیثیت سے قبول کرنا تو درکنار اُسے پہچاننے سے بھی انکار کر دیتا ہے۔ دشینت کی دی ہوئی انگوٹھی راستے میں شکنتلا کی ہاتھ کی اُنگلی سے کھسک کر ندی میں گر چکی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اپنے خاوند دشینت کو اُس کی کوئی نشانی بھی نہیں دکھا سکتی۔ درواسا رشی کی بد دعا اپنا اثر دکھا چکی ہوتی ہے۔

شکنتلا کی اصلی والدہ مینکا اپسرا جب اس مصیبت اور بے کسی کے عالم میں اپنی بیٹی کو آہ و زاری کرتے دیکھتی ہے تو آسمانوں سے اُتر کر اُسے اپنے ہمراہ اپسرا تیرتھ لے جاتی ہے۔

کچھ مدت کے بعد قریبی گاؤں کا مچھیرا ایک ہیرے کی انگوٹھی بازار میں فروخت کرتا ہوا پکڑا جاتا ہے۔ اس انگوٹھی پر راجہ دشینت کا نام کندہ ہے۔ ہستنا پور کا کوتوال اس انگوٹھی کو راجہ کے حضور پیش کرتا ہے۔ تفتیش کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگوٹھی ایک روہو مچھلی کا پیٹ چاک کرنے پر مچھیرے کو ملی تھی۔ دراصل یہ وہی انگوٹھی ہوتی ہے جو شکنتلا کو راجہ دشینت نے اپنی نشانی کے طور پر دی تھی اور شکنتلا کی اُنگلی سے پھسل کر ندی میں جا گری تھی۔ مچھیرے کی تو جان بخشی ہو جاتی ہے لیکن راجہ دشینت کو سارا واقعہ یاد آجانے کے باعث دل میں بہت پشیمانی ہوتی ہے۔ اپنی محبوبہ کی فرقت، اور اُس سے راج دربار میں اپنی جانب سے کیے گئے سلوک پر ندامت کے کرب سے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

دشینت کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں۔

اسی دوران مہاراج دُشینت کو راجہ اِندر کے بُلاوے پر اُس کی مدد کے لیے اِندر لوک جانا پڑتا ہے۔ اِندر کے دشمنوں کی سرکوبی کر کے جب دُشینت واپس روانہ ہوتا ہے تو دورانِ سفر پر جاپتی کیشپ رِشی کے آشرم میں ایک کم عمر لڑکے سرودمن سے اس کی ملاقات ہوتی ہے جو ایک شیر کے بچّے کے ساتھ کھیل رہا ہوتا ہے۔ وہ دراصل شکنتلا کے بطن سے جنما ہوا راجہ دُشینت کا اپنا بیٹا ہوتا ہے۔ اس لڑکے کی ہتھیلی میں اُس کے چکرورتی راجہ ہونے کی ریکھائیں (لکیریں) پائی جاتی ہیں۔ یہیں سب راز کھلتا ہے۔ دُشینت اور شکنتلا کا دوبارہ مِلن ہوتا ہے۔ راجہ اظہارِ ندامت کرتا ہے اور شکنتلا کو اپنے رنواس میں مہارانی کے طور پر قبول کرتا ہے۔

شکنتلا کے پلاٹ اور کہانی کے اجزا پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر فرماتے ہیں :-

"الغرض شکنتلا صحت مند روحانی قدروں اور انسانی اصولوں کا ایسا نچوڑ ہے جو بالخصوص کمزور طبقہ یعنی مظلوم عورت کی نہ صرف حمایت کرتا ہے بلکہ بڑی حد تک انصاف کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ "شکنتلا" ہندوستانی کلچر کے "اُپ وَن" میں ایک " سدا بہار" کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ اس میں انسانیت کے ساتھ روحانیت کا جذبہ بھی کارفرما نظر آتا ہے .... اِس طرح کالی داس نے "شکنتلا" میں اپنے عہد اور اپنی قوم کے جمالیاتی، اخلاقی اور روحانی اصولوں و اقدار کو فنکارانہ انداز میں خوب صورتی کے ساتھ ایک واحد نقش میں سمو دیا ہے۔ بالفاظِ دیگر " کالی داس نے "شکنتلا" میں انسانی جذبات اور حسّیات کو نرم و نازک اسلوب میں پیش کیا ہے، جو جمالیاتی حس کے ساتھ ذوقِ حسن کی بھی تسکین کا سامان مہیا کرتا ہے اور جو بالفعل تزکیۂ نفس کا سبب بنتا ہے۔"[1]

اس عظیم شاہکار کے ترجمے میں منوّر لکھنوی کا مشاق قلم اور پختہ اندازِ نگارش مذکورہ بالا جمالیاتی اخلاقی اور روحانی اقدار کو اردو نظم و نثر کے مزاج سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اور بھی نمایاں اور روشن کر دیتا ہے۔ شکنتلا کو دُرواسا رشی کی زبان سے دیے گئے شراپ (بددعا) کے زیرِ اثر

---

[1] سہ ماہی نخلستان جے پور، شمارہ ۱۵ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۶ء صفحہ نمبر ۱۰ (مقالہ کالی داس کی شہکار تخلیق شکنتلا)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

جب دشینت اپنے گندھرب وِواہ کو بھول کر سرِ دربار شکنتلا کو اپنانے سے صاف انکار کر دیتا ہے تو آشرم سے شکنتلا کو رنواس میں پہنچانے کے لیے ساتھ جانے والا راہب شارنگ رو دشینت سے کیا کہتا ہے۔ اس مکالمے کو منوّر نے سنسکرت اشلوکوں سے اُردو کا شعری جامہ کن الفاظ میں پہنایا ہے، ملاحظہ ہو اور مکالمے کا نثری حصّہ بھی :۔

شارنگ رو :۔ اچھا اچھا۔ آپ اِس لڑکی قبول نہ کریں۔ دیکھا جائے گا۔

زیبا ہے آپ کو یہی انکار کیجیے — ہرگز نہ اپنے جُرم کا اقرار کیجیے
توہین یہ رشی کی ہمارے ہی سامنے — سب شرم چھوڑ دی دہنِ بے لگام نے
نیکی کا یہ عوض ہے؟ شرافت کا یہ صلہ؟ — عفو و عطا کا مہر و مروّت کا یہ صلہ؟
ڈالا ہے جس شریف کی اس لاڈلی پہ ہاتھ — اتنے کمینے پن کا سلوک آہ! اس کے ساتھ
بے آب جس کے گوہرِ عصمت کو کر دیا — ناپاک جس کے دامنِ عفت کو کر دیا
اُس کو حوالے آپ کے کرنا ہے جُرم کیا — نیکی کے راستے سے گزرنا ہے جُرم کیا

کنیا رشی کی اب جو ہے انعامِ دست بُرد[۱]
چوری کا مال جیسے ہو خود چور کے سپرد

منوّر لکھنوی نے کالی داس کے نظم کیے ہوئے مکالمے کو ایسے مُؤثر الفاظ میں اردو کا لباس پہنایا ہے کہ عہدِ قدیم کے ہندوستان کی اخلاقی اقدار اور معاشرے کے نظام کی ایک روشن تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ راہب اور رشی راج دربار میں سب اراکینِ سلطنت کے روبرو حاکمِ وقت کو اس طرح کی کھری کھری سنا سکتے تھے، اُسے اپنے فرائض کی یاد دِلا سکتے تھے اور اس کے لیے سخت ترین الفاظ استعمال کرنے کی جُرأت کر سکتے تھے۔

ڈرامہ کے اسی ایکٹ ۵ میں جب مہاراجہ دشینت کے "میں نہ مانوں" رویّے سے مایوس ہو کر شکنتلا آنچل سے منہ ڈھانپ کر زار زار رونے لگتی ہے۔ اُس موقعے پر راہب شارنگ رو کا مکالمہ منوّر کے الفاظ میں ملاحظہ ہو :۔

۱۔ "ابھگیان شکنتلا (منوّر لکھنوی) مطبوعہ ۱۹۶۳ء۔ صفحہ ۱۳۷-۱۳۸

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

شارنگ رو :۔ سوچے سمجھے بغیر جو کام کیا جاتا ہے۔ اس بد انجام کار اسی قسم کی مصیبتیں پیش آتی ہیں :

چوری چھپے کا ربطِ محبت بجا نہیں — بے غور و خوض ایسی جسارت بجا نہیں
بیگانہ خو کے ساتھ بھلا دوستی ہی کیا — اس دوستی سے جو ہو خوشی وہ خوشی ہی کیا
رہتی ہے دشمنی میں بدل کر یہ دوستی — ہوتی نہیں درست منوّر یہ دوستی [1]

کنوّرشی کے آشرم کے قریب شکار کھیلنے کی مناہی کرتے ہوئے مہاراجہ دشینیت رشیوں کی جفاکشی اور پاکبازی کا ذکر کرتا ہے۔ منوّر لکھنوی نے ان مکالموں کو اُردو لباس پہنایا ہے، یہ نمونہ بھی ملاحظہ ہو :۔

دُشینیت : جو سنگوے لوگ آگے بڑھ گئے ہیں، ان کو واپس بلالو۔ سپاہیوں کو بھی سمجھا دینا کہ کوئی ایسی کارروائی عمل میں نہ لائیں جس سے تپوبن کے کاموں میں ہرج واقع ہونے کا اندیشہ ہو۔ دیکھو نا

تحمّل گرچہ ہے رشیوں کا پیشہ — سُکوں کے ساتھ رہتے ہیں ہمیشہ
مگر تیج ان میں ہوتا ہے بلا کا — سُکوں پر اُن کے جب پڑتا ہے ڈاکہ
نگاہِ قہر ہوتی ہے شرر بار — جلاکر اس کو کر دیتے ہیں فی النار
ہیں خاصیت میں سورج کانت ہیرا — نظر آتا ہے جو ہر وقت ٹھنڈا
مگر پڑتی ہیں جب سورج کی کرنیں — حرارت سی اُبھر آتی ہے اس میں

کالی داس کے شلوکوں اور مکالموں کو کس چستی اور سلاست سے اُردو کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ قاری کو مفہوم سمجھنے کے لیے اپنے ذہن پر ذرا بھی زور نہیں ڈالنا پڑتا۔

شکنتلا کو آشرم سے سسرال کے لیے وداع کرتے وقت کنوّرشی جو ہدایات دیتے ہیں وہ مشرقی معاشرے میں عورت کے مقام و مرتبے کے ساتھ اُس کے فرائض و حقوق پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔ یہ قدریں صدیوں سے بھارتی سماج کا سنگِ بنیاد رہی ہیں۔ منوّر کی نثر اور نظم میں ان کا بیان بالکل قدرتی معلوم ہوتا ہے اور اس پر ترجمے کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ مکالمے دیکھیے :۔

کنوّرشی :۔ بیٹی شکنتلا، مَیں تمھیں کچھ ہدایتیں دینا چاہتا ہوں۔ اگرچہ ہم لوگ بن باسی ہیں، سنیاسی ہیں، پھر بھی دُنیوی رسم و رواج سے واقف ہیں۔

---

[1] ابھگیان شکنتلا (منوّر لکھنوی) صفحہ ۵۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

شارنگ رو: دانشوروں سے کون سی بات چھپی ہے۔ وہ کیا نہیں جانتے۔

کنور رشی:

بننا شوہر کے گھر کی زینت جب تم — ہونا آگاہِ رازِ خلوت جب تم
ہوں جتنے بزرگ ان کی عزّت کرنا — عزّت کے ساتھ ساتھ خدمت کرنا
سوتوں سے ہو مہر کا محبّت کا سلوک — برتاؤ خلوص کا مروّت کا سلوک
شوہر کی طرف سے کچھ جو بے قدری ہو — پروا نہ ذرا بھول کے بھی اُس کی ہو
اچھا نہیں تم کو اُس پہ غصہ آنا — جھگڑے کا نہ ذکر بھی نہ زباں پر لانا
ہر عیب کو حسن کو پرکھنا ہوگا — دل اپنے ملازموں کا رکھنا ہوگا ؎۱

بھارتی سماج کی اخلاقی قدروں اور ازدواجی رشتوں کے تقدّس کو پامال کرنے والی لغزش کے متعلق مہاراجہ دشینت بھرے دربار میں راہبہ گوتمی کا یہ طنز ملاحظہ ہو۔ منوّر نے اس کے مکالمے کو کیا شستہ اور شائستہ زبان دی ہے:۔

شکنتلا جس کے بطن میں راجہ دشینت کا نطفہ ہے کی طرف دیکھتے ہوئے گوتمی کہتی ہے:۔

آریہ! مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے، حالاں کہ آپ حضرات کے معاملات میں میرے لیے زبان کھولنا مناسب نہیں ہے۔ کیوں کہ:۔

اُف رے اس کی یہ نادانی — کر ڈالی کیسی من مانی
پوچھا تاچھا کچھ نہ کسی سے — کام لیا اپنی مرضی سے
آپ نے بھی اندھیر کیا ہے — نادانی سے کام لیا ہے
کچھ نہ بڑے بوڑھوں سے پوچھا — کی نہ عزیزوں کی کچھ پروا
چُھپکے چُھپکے بالا بالا — آپس میں سب کچھ کر ڈالا
دیکھ کے ہیں دونوں کی لیلا
چُپ نہ رہوں تو اور کروں کیا ؎۲

اِسی طرح شارنگ رو اُس دور کی گھریلو زندگی اور معاشرے کے طرزِ زندگی رسوم و رواجات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ دشینت سے کہتے ہیں:۔

۱؎ ابھگیان شکنتلا (منوّر لکھنوی) ۱۱۷-۱۱۶

۲؎ ابھگیان شکنتلا (منوّر لکھنوی) ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۳۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

شارنگ رَو : آپ کو دنیا کے چلن کا بیوہار کا بت ہے۔ پھر آپ ایسی باتیں زبان پر کیسے لاتے ہیں

کتنی بھی کوئی عورت ہو جاں نثارِ شوہر
رہتی نہیں اگر وہ زیبِ کنارِ شوہر
شادی کے بعد ساکن ہو باپ ماں کے گھر میں
ہوتی ہے مشتبہ وہ ہر شخص کی نظر میں
بدنام گھر کے اندر بدنام گھر کے باہر
الزام سو طرح کے رکھتے لوگ اس پر[1]

علم وفن شاعری وثقافت، فنونِ لطیفہ کا فروغ وسرپرستی راج دربار کے فرائض میں شمار ہوتے تھے۔ اس امر کی تصدیق تاجدار کی اس تمنا سے ہوتی ہے جو وہ مہرشی ماریچ سے وردان مانگتے ہوئے کرتا ہے۔ آخری ایکٹ کے آخری منظر میں جب شہنشاہ دشینت کا مہرشی ماریچ کے آشرم میں اپنی محبوبہ اور بیاہتا شکنتلا اور بیٹے سرودمن سے ملاپ ہو جاتا ہے تو رشی فرماتے ہیں:

مہرشی ماریچ : بیٹا دشینت! کوئی منت مانگو، کوئی مراد پیش کرو، دل میں جو خواہش ہو بے تامل ظاہر کرو۔

دشینت : اس سے بڑھ کر بھی کوئی اور بات ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود اگر مجھے نوازنا ہی چاہتے ہیں تو :

حکمراں اپنی رعایا پر کرم کرتے رہیں
جو بھی ہوں سامانِ آسائش بہم کرتے رہیں
شاعرانِ فاضل وممتاز پائیں دادِ فن
ان کی قدر ومنزلت ہو انجمن در انجمن
اپنے ہی خود جنم داتا ہیں جو خلاقِ جہاں
نام سے بھگوان شو کے ہیں جو مشہورِ جہاں
کاش میرے حال پر ہو ان کی چشمِ التفات
ہوں نہ آئندہ کبھی پابندِ زنجیرِ حیات

ساتویں ایکٹ میں پورو راج ونش کی روایات کو فخر سے بیان کرتے ہوئے دشینت خود کہتا ہے:

کام رہتا ہے حکومت سے جوانی میں انھیں
لطف ملتا ہے زمیں کی پاسبانی میں انھیں
ان کو رہتا ہے بہم شام وسحر سامانِ عیش
ان سے رہتی ہے ہمیشہ زینتِ ایوانِ عیش
پھر بڑھاپے میں ہٹا لیتے ہیں دل دنیا سے یہ
شادماں رہتے ہیں بس آبادیِ صحرا سے یہ
باوفا بیوی کو لے کر ساتھ رہتے ہیں وہاں
پیڑ کے نیچے بناتے ہیں کُٹی بہرِ اماں[2]

اُس عہد میں راجا کے ادارہ سے پرجا کی کیا توقعات ہوتی تھیں، اور خود راجاؤں کا طرزِ بود وباش

---

[1] ابھگیان شکنتلا (منوّر لکھنوی) ۱۹۶۳ء - صفحہ ۱۳۵

[2] " " " " ۲۰۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کیا تھا' ان تاریخی حقائق پر یہ ڈرامہ خاطر خواہ روشنی ڈالتا ہے۔ منوّر نے زیرِ ترجمہ ناٹک کو محض ایک جمالیاتی اور رُوحانی شاہکار اور حُسن و عشق کے راز و نیاز کا لذت انگیز قصہ بنا کر پیش نہیں کیا۔ جس کا مقتضی جمالیات کا خالص مغربی نظریہ عموماً دِکھائی دیتا ہے۔ اس کے برعکس منوّر نے اپنے ترجمے میں قدیم ہندوستانی معاشرے کی بنیادی مقصدیت اور اعلیٰ روحانی اقدار' نیز اسلاف کی صالح' مقدّس اور مفید رسوم و روایات کی بھی دیانتداری سے عکاسی کی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا اپنی تصنیف "اردو شاعری کا مزاج" میں رقمطراز ہیں :۔

" بیشک کالیداس کے ہاں اخلاقی قدروں کی طرف ایک واضح جھکاؤ موجود ہے اور اُس کے ہاں لفظی صنعت گری کا ایک نمایاں رجحان ملتا ہے (اور یہ دونوں باتیں سنسکرت ادب کی روایت کا حصہ ہیں) تاہم کالی داس کے ہاں شعر میں ایک انوکھی لطافت' تازگی اور جذبات کے اظہار میں انسان دوستی اور توازن کے قیمتی عناصر موجود ہیں۔[۵۵]"

اور یہی وہ مثبت صفات و عناصر ہیں۔ جنھوں نے منوّر جیسے متین مترجم اور خلّاق شاعر کو کالی داس کی لگ بھگ سبھی تصانیف کا ترجمہ کرنے کی جانب مائل کیا۔

منوّر نے "شکنتلا" کے ترجمے میں اس کے اصل مصنّف کے اسلوب' مواد اور فنّی نزاکتوں کو پوری طرح اپنی حفاظت میں لیا ہے جبکہ بقول جناب محمود ہاشمی :۔

" دیگر تراجم اخذ و تلخیص' یا شخصی نوعیت کی توضیحات' اصل سے انحراف یا ذاتی غلوگوئی کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ غالباً اس کا سبب وہی لذّت آمیز جمالیات کی تبلیغ ہے جو مغربی مفکرین کے باعث ہمیں مرعوب کرتی رہی ہے۔[۵۶]"

تاہم بقولِ غالب۔ ؎ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

محبت اور اس کے راز و نیاز اور ہندوستانی جمالیات بھی کالی داس کے ڈراموں کا ایک اہم عنصر ہیں۔ عورت اور مرد کا باہمی پیار عالمگیر جذبہ ہے اور انسانی فطرت کا تقاضا بھی۔ اس فطری تقاضے اور حسن و عشق کے اختلاط کی عکّاسی کو بھی جسے سنسکرت ادب میں شنگار رس کا نام دیا گیا ہے' منوّر نے شکنتلا کے اپنے ترجمے میں خوب نبھایا ہے۔ کالی داس نے جذبات'

۵۔ منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (مرتبہ راج نرائن رازؔ) صفحہ ۲۵۶

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

رس اور ماورائے منطق لطیف اور نازک احساسات سے مملو مکالموں کو نظم کی شکل میں تحریر کیا ہے۔ اور منطقی سلسلۂ گفتگو کو مکالموں کی صورت میں۔ منوّر لکھنوی نے اپنے ترجمے میں پوری دیانت داری سے اس سلسلے کو نہ صرف اصل صورت میں برقرار رکھا ہے بلکہ اپنے زورِ بیان، محاورہ آشنا اور منجھی ہوئی زبان کی لفظیات سے اس کی لذّت آفرینی، فنی لطافت اور نزاکت میں اضافہ کیا ہے۔

محرم راز سہیلی پریم وَدا اور شکنتلا کی پیار بھری گفتگو ہی کو لیجیے جو جوانی کی امنگوں سے لبریز ہے۔

پریم ودا: (ہنس کر) کیا خوب! مجھ پر چولی کس کر باندھنے کی تہمت! اپنی جوانی کو کچھ نہیں کہتیں، جس کے سبب سینہ اُبھرتا ہی چلا آتا ہے۔

کب تنِ نازک کے لائق چھال کی پوشش ہے یہ
زیوروں کی طرح پھر بھی جانِ آرائش ہے یہ
خوبصورت جسم پر ہر شے کا بڑھتا ہے وقار
خوبصورت جسم پر ہر شے کو ملتا ہے نکھار [1]

تمثیل کے پہلے ایکٹ میں رشی آشرم کے قیام کے دوران راجہ دُشینت آشرم میں سادہ زندگی بسر کرنے والی حسیناؤں کو دیکھ کر کیا محسوس کرتا ہے۔ منوّر کے اشعار میں دیکھیے:-

آشرم کی لڑکیوں کا اُف رے یہ حسن و جمال — رانیوں کے بھی مقدّر میں نہیں یہ خد و خال
جنگلی بیلیں یہ رنگ و نور میں نایاب ہیں — باغ کی بیلیں بھی ان کے سامنے بے آب ہیں [2]

رومانی مناظر کی سحر کاری کے بیان میں بھی کالی داس کا قلم جولانیاں دکھاتا ہے اور منوّر اپنے ترجمے میں پوری طرح اُس کا ساتھ دیتے ہیں بلکہ وہ سائے کی طرح اصل مصنّف کے ہم قدم رہتے ہیں۔ حسن و عشق کے اختلاط کا ایک منظر دیکھیے۔ راجہ دُشینت سایہ دار اشجار کی گھنی چھاؤں سے گھرے لتا منڈپ میں شکنتلا سے ملتا ہے۔ شکنتلا اُٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے تو راجہ کہتا ہے:

جانِ جاں! آپ کس لیے اُٹھیں — مہرباں آپ کس لیے اُٹھیں؟
دل شکن آپ کی یہ زحمت ہے — اس تکلف کی کیا ضرورت ہے
آپ نے بن کے آتشیں پیکر — کروٹیں لیں جو بسترِ گُل پر
پتیاں بھیگ کر پسینے میں — رہ گئی ہیں چمٹ کے سینے میں [3]

١۔ ابھگیان شکنتلا (منوّر لکھنوی) صفحہ ۲۳
٢۔ " " " " ۳۰
٣۔ " " " " ۸۳

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اسی ملاقات میں اظہارِ حالِ دل کے بعد گفتگو کا سلسلہ بڑھتا ہے، شکنتلا کی ناسازیِ طبع کے پیشِ نظر شہنشاہ دُشینت سراپا نیاز و انکسار بن کر کہتا ہے :-

دشینت : گھبرانے کی کیا بات ہے۔ آپ کی خدمت بجالانے کے لیے بندہ تو موجود ہی ہے۔

فرمائیے کہ آپ کے کام آؤں کس طرح | خلوت میں دل جناب کا بہلاؤں کس طرح
پنکھا کنول کا جھل کے تھکاوٹ مٹاؤں میں؛ | تسکینِ دل کی آپ کو صورت دکھاؤں میں؛
یا رکھ کے پاؤں آپ کے میں اپنی گود میں | جیسے کنول ہوں سُرخ کسی آبِ رود میں
ہاتھوں سے اپنے، حکم اگر دیں تو داب دوں | چاہیں تو یوں دوائے غم و اضطراب دوں[1]

لطیف و نازک انسانی رشتوں، اولاد کے لیے ماں کی ممتا، شفقتِ پدری، یعنی باپ کی فطری چاہت اور شیفتگی جیسے جذبات کی حقیقت پسندانہ عکاسی کالی داس نے ایک ماہرِ نفسیات کی طرح کی ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی اُس کے ترجمے میں منور کی ذاتی حسرت و محرومی کی ایک زیریں لہر بھی شامل ہو گئی ہے جو منور کے خود بے اولاد ہونے کے باعث ایک جاودانی خلش بن کر ان کی زندگی کا جزو بن چکی تھی۔ اگرچہ عمر کے آخری حصے میں اپنی رفیقۂ حیات کا دل رکھنے کے لیے انھوں نے اپنے سالے کے بیٹے عزیزی دیپک سکسینہ کو باقاعدہ طور پر گود لے کر متبنّیٰ بنا لیا اُسے بال پن ہی سے اپنی حقیقی اولاد کی طرح پالا لیکن اپنی عدم آسودہ تمناؤں اور ناکام حسرتوں کی پٹاری کو گاہے گاہے کھنگالنا انسانی فطرت کا خاصہ ہے اور یہ عمل غیر شعوری طور پر بھی انسان سے سرزد ہوتا رہتا ہے۔ اس تڑپ اور حسرت کی شدّت کی آمیزش بھی کالی داس کے ان شلوکوں کے ترجمے میں ہوئی ہے جو راجہ دُشینت کی اپنے بیٹے سرودمن سے پہلی ملاقات کے موقعہ پر اس کے دل میں عجیب سے اپنائیت کے جذبات اچانک پیدا ہونے کے ردِّ عمل کے عکّاس ہیں۔ دشینت پر تب یہ راز بھی منکشف نہیں ہوا ہوتا کہ وہ کمسن بچہ خود دُشینت ہی کی حقیقی اولاد ہے۔ شیر کے بچے کے ساتھ کھیلتا ہوا کم سن سرودمن تتلا کر تپسوِنی سے کہتا ہے :-

لڑکا : (تتلا کر) اَتّا اَتّا (اچھا اچھا) تب تک میں اچھی (اسی) سے کھیلتا ہوں

(یہ کہہ کر اور تپسوِنی کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگتا ہے)

کتنا خوش بخت ہوگا وہ انساں | گود میں جس کی طفل یہ ناداں

---

[1] "ابھگیان شکنتلا" (منور لکھنوی) صفحہ ۲۰۰

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کھیلتا ہوگا لاڈ پیار کے ساتھ — موہتا ہوگا دِل دُلار کے ساتھ
دُرجِ لب جب بھی کھولتا ہوگا — خوب تُتلا کے بولتا ہوگا
دُھول سے اپنے جسمِ عُریاں کی — ازلی جلوۂ فروزاں کی
قالب اس کا سنوارتا ہوگا — جذبِ دل کو اُبھارتا ہوگا[1]

اس ترجمے کے بارے میں ڈاکٹر ذاکر حُسین صاحب نے جو اُن دِنوں نائب صدر جمہوریہ ہند تھے' اپنے گرامی نامہ محررہ ۱۵ رمئی ۱۹۶۳ء میں منوّر لکھنوی کو لکھا:۔

"سچ یہ ہے کہ آپ نے اپنے تراجم سے اردو کی بڑی خدمت کی ہے اور صرف ادبی خدمت نہیں کی بلکہ ایک قابلِ قدر قومی خدمت بھی۔ افکارِ عالیہ اور جذباتِ لطیفہ کا جو خزانہ سنسکرت میں ہونے کی وجہ سے اُردو پڑھنے والوں کی دسترس سے باہر تھا اُسے آپ نے اُن تک پہنچا دیا' اور کس خوبی سے پہنچایا ہے۔ سب ترجمے مَیں نے پڑھے ہیں جن میں "ابھگیان شکنتلا" بھی ہے اور کہیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ یہ ایک باکمال اردو شاعر کا کلام نہیں۔۔۔۔ ترجموں کی رُوانی کہتی ہے کہ اصل کا دامن ہاتھ سے چھوٹا نہیں ہے۔ ورنہ ترجمے اکثر اُکھڑے اُکھڑے ہوتے ہیں اور ان کے پڑھنے میں جی نہیں لگتا۔ آپ کے ترجمے بڑے دل نشیں ہیں۔"[2]

منوّر لکھنوی کا ترجمہ "ابھگیان شکنتلا" کالی داس کی اس عظیم تصنیف کے اصل اسلوب کے تتبع کے باعث کالی داس کی منفرد فنّی نزاکت وصداقت کا امین وپاسدار ہے' جو کالی داس کے ناٹکوں کی ایک تہہ دار روایت کا وسیلۂ اظہار ہے ـــــ بقول محمود ہاشمی :۔

"آئندہ اگر اردو میں "شکنتلا" کے مزید ترجمے ہوں تو اُن کا سفر منوّر صاحب کے ترجمے سے ہی شروع ہوگا۔"[3]

۱؎ "ابھگیان شکنتلا" (منوّر لکھنوی)۔ صفحہ ۲۰۰

۲؎ " " ۱۹۶۳ء ایڈیشن۔ صفحہ ۳-۴

۳؎ منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (مرتب راج نرائن رازؔ) صفحہ ۲۵۸

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کُمار سمبھو

منوّر لکھنوی اُردو کے پہلے شاعر تھے جنھوں نے سنسکرت کے شاعرِ اعظم کالی داس کے ایک اہم ادبی کارنامے کُمار سمبھو کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے اس کے منظوم ترجمہ کی طرف توجہ دی۔ اگرچہ کالی داس کے دوسرے ادبی شہ کاروں کو بھی اُردو کے قالب میں منتقل کرنے کا شرف مُنوّر لکھنوی کو حاصل رہا۔ جن میں ابھگیان شکنتلا" "مالویکا گن متر" "وکرم اُروشی" "رگھو ونش" وغیرہ شامل ہیں، تاہم مذکورہ ادب پاروں کے ترجمے کچھ دیگر اردو ادیب کر چکے تھے لیکن "کمار سمبھو" اُردو دنیا کے لیے تب تک اچھوتی اور انجانی تخلیق تھی، جسے مُنوّر لکھنوی نے دنیائے اردو سے روشناس کرایا اور فی الواقعی ایسے مقدس صحیفے کے ساتھ جو بھگوان شِو اور پاربتی کے پاکیزہ عشق و وصال کی داستان پر اساس پذیر ایک مہاکاویہ (طویل نظم) ہے، اُردو ترجمے میں انصاف کر پانا ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کسی عام ادیب کو اس طویل منظوم داستان کے ترجمے کا حوصلہ نہ ہوا۔ منوّر جیسا بلند پایہ اور باشعور مترجم ہی ایسے شاہکار کے ترجمے کا حق ادا کر سکتا تھا۔ منوّر واحد اردو ادیب ہیں جنھوں نے اس دُشوار منزل کو سر کیا ہے۔ اُن کا ترجمہ اُردو ادب میں ابھی تک "کمار سمبھو" کا واحد منظوم ترجمہ ہے۔

زیرِ نظر ترجمہ کو جو ۱۸۰ صفحات پر محیط ہے، ۱۹۵۲ء میں انجمن ترقی اُردو بک ڈپو اُردو بازار دہلی نے دیدہ زیب گیٹ اپ کے ساتھ شائع کیا۔ منوّر نے اس کتاب کا انتساب اپنے اُستاد مرحوم منشی نوبت رائے نظرؔ کے نام اس شعر کے ساتھ کیا ہے :۔

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم ۔۔۔ شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

ابتدائی صفحات میں منوّر اس عظیم ادب پارے کے خالق مہاکوی کالی داس کے لیے محوِ سپاس ہیں اور اُسے مخاطب کر کے استدعا کرتے ہیں :۔

ہاں اے کالی داس بجھا ۔۔۔ میرے دل کی پیاس بجھا
مجھ کو مئے لافانی دے ۔۔۔ پیاسا ہوں میں پانی دے
آجائے ہم رنگِ صبوح ۔۔۔ میرے جسم میں تیری رُوح
نظم نہ ہو یہ میری نظم ۔۔۔ دنیا سمجھے تیری نظم

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

میری صورت میں تو ہو اُردو تیری اُردو ہو[۱]

منوّر لکھنوی اپنے اِس ترجمے کے متعلق اپنے تعارفی نوٹ میں لکھتے ہیں :۔

" شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ سنسکرت زبان کے زندۂ جاوید شاعر کالی داس کے شاہکار کمار سمبھو کا منظوم ترجمہ اردو میں میرے ذریعے پیش ہو۔ مگر سالہا سال سے میری خود بھی یہ خواہش تھی کہ فردوسِ شاعری کے اِس باغبانِ لافانی کی گُلکاریوں کا مترنم عکس ادب اردو کے شیشے میں اُتاروں .... ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمگیر جنگ کے ساتھ کمار سمبھو کا یہ ترجمہ شروع ہو کر اسی جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی ۱۹۴۵ء میں پورا ہو گیا۔ ترجمہ شوقیہ تھا کوئی پابندی یا کسی قسم کا دباؤ نہیں تھا۔ اِس لیے جب فرصت ملی یا طبیعت حاضر ہوئی ترجمہ لے کر بیٹھ گیا ......"[۲]

"کمار سمبھو" کا یہ ترجمہ اپنی اشاعت سے قبل ہی ملک میں کافی شہرت پا چکا تھا۔ اس کا کچھ حصہ رسالہ "مانسروور" الہ آباد میں اور کانپور کے مشہور ادبی جریدہ "زمانہ" میں شائع ہو چکا تھا۔ زمانہ کے ایڈیٹر منشی دیا نرائن نگم تو اس ترجمے کے شیدائی تھے۔ علامہ کیفی کی وساطت سے اس ترجمے کی رسائی ہندوستانی اکاڈمی اور انجمن ترقیٔ اُردو تک ہو چکی تھی۔

ہندی ادب کے ناقدوں نے "کمار سمبھو" کو "مہا کاویہ" کہا ہے جبکہ کالی داس کی دیگر مشہور تخلیقات "شکنتلا" "مالویکا گن متر" "وکرم اروشی" وغیرہ "ناٹک" کے زُمرے میں شمار کی گئی ہیں ۔ "رگھوونش" کو بھی "مہا کاویہ" (منظوم داستان) کا درجہ دیا گیا ہے۔ "کمار سمبھو" میں کُمار یعنی لڑائی کے دیوتا "کارتک" کی پیدائش کا حال ہے۔ شارحین اور نقادوں کا یہ خیال ہے کہ یہ وہ پہلی طویل نظم ہے جو کالی داس نے خود اپنی جوانی کے اُمڈتے ہوئے جذباتِ عشق و محبت کی اساس پر تصنیف کی ہے۔ اور غالباً اُس کی پہلی اولاد کے جنم لینے کے موقعے پر مکمل ہوئی ہوگی۔ اس منظوم داستان کے کرداروں کی تفصیل اِس طرح دی گئی ہے۔

۱۔ موقع و مقام : ہمالہ پربت
۲۔ بھگوان شِو : ترک دنیا کا آئیڈیل
۳۔ پاروتی : حقیقی عشق کا آئیڈیل۔ مادرِ قدرت کی جمالی شکل

۱، ۲۔ کمار سمبھو (منوّر لکھنوی) سال اشاعت ۱۹۵۲ء، صفحات بالترتیب ۴ – ۲۰

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

۴۔ راجہ اندر : نیکی کا نمائندہ
۵۔ کام دیو : جذباتِ شہوانی کا نمائندہ
۶۔ بسنت : موسم بہار۔ خواہشاتِ نفسانی کو ابھارنے والا موسم
۷۔ رتی : کام دیو کی زوجہ۔ لذاتِ نفسانی کی علامت
۸۔ گر راج : ہمالہ (گری یہ پہاڑ) کا حکمران
۹۔ مینا : گری راج کی مہارانی
۱۰۔ میناک : گری راج کا فرزند
۱۱۔ تارک اسر : بدی کا نمائندہ
۱۲۔ برہم چاری : بھگوان شو دوسرے بھیس میں
۱۳۔ سپت رشی : مہادیو شو کے قاصد (سات رشی)
۱۴۔ ارندھوتی : مہرشی وششٹ کی زوجہ محترمہ

زیر ترجمہ منظوم داستان کا پلاٹ کچھ اس طرح ہے کہ نیکی کی قوتوں کا نمائندہ راجہ اندر، بدی کی طاقت کے پیکر تارک اسر کے ہاتھوں شکست کھا کر برہما کے پاس جا کر فریاد کرتا ہے۔ اُس کا دلی مدعا ہے تارک اسر کی ہلاکت جس سے اندر کی قوت اور وقار بحال ہو سکے۔ برہما کا مشورہ یہ ہے کہ بھگوان شو کی صلبی اولاد سوامی کارتک کے ہاتھوں ہی تارک اسر کا خاتمہ ممکن ہے۔ لہٰذا ایسی ترکیب کی جائے کہ شوجی مہاراج شادی کر کے اولاد پیدا کریں۔ بھگوان شو وحدت الوجود کے فنائی اور جلالی پہلو کے نمائندہ ہیں۔

ستی اپنے پچھلے جنم میں بھگوان شو کی زوجہ تھیں لیکن ایک بار جب وہ اپنے والد کے یہاں یگیہ میں حصہ لینے گئی ہوئی تھیں تو اُن کے والد مہاراجہ دکھش نے کچھ اس طرح کی دانستہ حرکات کیں جن سے ستی کے شوہر کی توہین ہوئی۔ اسی غم میں ستی نے یگیہ کی اگنی میں خود کو نذرِ آتش کر دیا۔ بھگوان شو کو پتہ چلا تو اُن کے "گنوں" نے آ کر راجہ دکھش کے یگیہ کو تحس نحس کر دیا۔ تب سے شوجی تارکانہ اور مجردانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ چوں کہ ہندو عقیدے کے مطابق شو اور ستی ایک دوسرے کے ازلی و ابدی ساتھی ہیں۔ مسئلہ یہ در پیش ہوا کہ انھیں پھر سے کس طرح یکجا کیا جائے۔ ستی اب پاربتی کے نام سے ہمالہ پربت کے حکمراں ہم وان عرف گر راج (یعنی پہاڑ کے راجہ) کے گھر میں دوسرا جنم لے چکی تھیں۔ رشی نارد کی ہدایت کے مطابق وہ بھگوان شو کو پھر سے شوہر کے روپ میں حاصل کرنے کے لیے کڑی تپسیا کر رہی تھیں۔ راجہ اندر کے مفاد کی تکمیل کے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

لیے بھی یہ ضروری تھا کہ کسی نہ کسی ترکیب سے پاروتی جی کو بھگوان شو کی انیسِ خلوت و جلوت بنایا جائے۔

لیکن شو جی کو تجرد توڑنے اور پھر سے ازدواجی بندھن قبول کرنے کے لیے کیونکر آمادہ کیا جائے؟ اس کام کے لیے کام دیو (شہوت کے دیوتا) کی خدمات حاصل کی گئیں۔ شیو جی اپنی سمادھی (عالمِ استغراق) میں محو ہوتے ہیں جب کام دیو اُن پر اپنی پھولوں بھری کمان سے تیر چلا دیتا دیتا ہے۔ شو جی کی سمادھی ٹوٹ جاتی ہے اور وہ مراقبے سے بیدار ہو کر کام دیو کی شرارت کو دیکھتے ہیں اور کام دیو کو بھسم کر دیتے ہیں۔

بھگوان شو کو پاروتی کی گھور تپسیا کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی کہ وہ خود اُنھیں خاوند کے رُوپ میں پانے کے لیے اتنی کڑی ریاضت اور ایذا سے گزر رہی ہیں۔ وہ ان کی صداقتِ مقصد کا امتحان لینے کے لیے سپت رشی کو بھیجتے ہیں جو طرح طرح سے شو جی کی بُرائی اور تضحیک کر کے پاروتی کا ارادہ بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن پاروتی اپنے ارادے میں ٹس سے مس نہیں ہوتیں۔ بھگوان شو خود برہم چاری کے بھیس میں پاروتی کی تپسیا کے آشرم میں جاتے ہیں اور پاروتی کے سامنے شو جی کی ہیئت گدائی اور ناقابلِ رشک و ستائش زندگی کا مذاق اُڑاتے ہیں لیکن پاروتی اپنے محبوب کی بُرائی میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتیں۔ بالآخر جب شو اُن کے ارادے کو چٹان کی طرح اٹل دیکھتے ہیں تو اپنا اصلی رُوپ ظاہر کر کے پاروتی کو بخوشی اپنا لیتے ہیں۔

اب سپت رشی شادی کا پیغام لے کر پاروتی کے والد گری راج ہِموان کے پاس جاتے جاتے ہیں۔ رشتہ طے ہو کر شادی کی رسم ادا ہوتی ہے۔ پاروتی جی کے بطن سے سپاہیانہ زندگی کے نمائندہ سوامی کارتک کا جنم ہوتا ہے اور اُس کے ہاتھوں بالآخر تارک اُسر مارا جاتا ہے۔ راجہ اندر کا اقتدار بحال ہو جاتا ہے۔

"کمار سمبھو" میں یوں تو اٹھارہ سرگ ہیں مگر منوّر کا ترجمہ صرف سات سرگوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ یوں بھی نو سرگوں کے متعلق نقادوں کی رائے یہ ہے کہ وہ کالی داس کی تخلیق نہیں بلکہ بعد میں جوڑے گئے ہیں۔ ان کا اسلوب اور طرزِ بیاں کالی داس کے مخصوص رنگ سے بالکل مختلف ہے اور دو سرگوں میں رشتۂ ازدواج کے بعد کی جنسی زندگی کی اس قدر مفصل عکاسی کی گئی ہے کہ سنسکرت ادب کے علما، ناقدین اور کالی داس کے مخلص مدّاح بھی اس حصّے کو فحاشی کا نمونہ قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا منوّر نے اپنا ترجمہ سات سرگوں تک ہی محدود رکھا ہے یعنی شو جی اور پاربتی کی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

باہم شادی کے فیصلے تک۔

کالی داس کے اس مہا کاویہ (منظوم داستان) میں زبان کی نرمی، شیرینی، سلاست اور گھلاوٹ، استعاروں اور تشبیہات کا بانکپن، قدرتی لب ولہجہ، حسنِ فطرت کی بھرپور منظر کشی، اظہارِ جذبات کا والہانہ پن، قدیم ہندوستانی تہذیب واخلاق کی عقیدت آفریں عکاسی، ازدواجی رشتوں کے استحکام وتقدس کی تصویر، اور پوری داستان میں تاریخ وثقافت کے امین ہمالہ پربت کی عظمت کا اظہار اس ادبی شاہکار کی منفرد اور نمائندہ خصوصیات ہیں۔ منور لکھنوی نے اپنے پورے ترجمے میں مکمل احتیاط اور چوکسی کے ساتھ اصل متن کی ان حسین خصوصیات کی حفاظت کی ہے اور اکثر اس ترجمے پر اصل کا گمان ہونے لگتا ہے۔

فراق گورکھپوری اس ترجمے کے محاسن کی نشان دہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"حضرت منور کی قوتِ نظم کا سب کو قائل ہونا پڑے گا۔ یہ ترجمہ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ سنسکرت شاعری کی روح، اس کی فضا، اس کا نظریہ، اس کی وجدانیت اور رنگا رنگ خوبیاں اس منظوم ترجمے میں اس طرح جھلک رہی ہیں جیسے صبح کے آئینہ خانے میں شبستان جلوہ گر ہو۔"[۱]

فراق گورکھپوری کے مذکورہ بالا اظہار رائے کا جواز زیرِ نظر ترجمہ میں اکثر مقامات پر ملتا ہے۔ آغازِ ترجمہ میں کالی داس ہمالہ کی عظمت کے بیان میں رطب اللسان ہے۔ منور نے کالی داس کے جذبات کو اپنے اردو ترجمے میں کس سلیقے اور نفاست سے برقرار رکھا ہے ملاحظہ ہو:۔

مایۂ نازِ سرافراز ہمالہ پربت
سب پہاڑوں سے ہے ممتاز ہمالہ پربت

اس کے دامن کا ہے یہ عرض کہ پہلائے شمال
اک عجب شان سے ہے انجمن آرائے شمال

کسی پربت کا نہیں ہے جو وقار اس کا ہے
دیوتاؤں میں ہمیشہ سے شمار اس کا ہے

اس کے مشرق میں بھی مواج ہے بحرِ ذخار
اس کے مغرب میں بھی ہے اک یم دلکش کی بہار

ان محیطوں کے لیے ایک یہی مرکز ہے
دونوں اطراف کے مابین زمیں کا گز ہے[۲]

۱؎ کمار سمبھو (ترجمہ منور لکھنوی) مطبوعہ ۱۹۵۲ء۔ صفحہ، مضمون "تربینی کے سنگم سے" از فراق گورکھپوری

۲؎ " " " ۱ " ۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہندوستانی روایت کے مطابق سُمیرو پربت روئے زمین کا مرکز ہے۔ پرانوں میں تحریر ہے کہ اسی مرکز کے گرد سیارے گردش کرتے ہیں۔ مختلف برِاعظم اسی مرکز سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہمالہ کی کانوں اور جڑی بوٹیوں کا بیان دیکھیے :-

بوٹیاں سینکڑوں آتی ہیں میسّر اس سے
پتھروں کا چمک اُٹھتا ہے مقدّر اس سے
جگمگاتی ہوئی ہر کان اُبل پڑتی ہے
اس میں دولت جو چھپی ہے وہ نکل پڑتی ہے[1]
کبھی دھندلا نہیں ہوتا رُخِ روشن اس کا
برف گرنے پہ بھی بے داغ ہے دامن اس کا
اِک عجب کیف کا عالم ہے فضا میں جس کی
نازنینوں کی ہے رفتار ہوا میں جس کی
اس کے جھونکے جگر و دل میں اتر جاتے ہیں
پَر بکھرتے ہوئے موروں کے بکھر جاتے ہیں
اس کی ہر جنبشِ مستانہ غضب ڈھاتی ہے
دیودار ایسے درختوں کو ہلا جاتی ہے[2]

محاکات اور تخیّل کا یہ حسین امتزاج کالی داس کے فن کی فسوں کاری کو مزید گہرا کرتا ہے۔ اس امتزاج سے کالی داس کی جذبات نگاری میں شراب دو آتشہ کی سی دیوانہ ساز تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ حسنِ فطرت کی تصویر کشی اور تشبیہات کی ندرت میں کالی داس سنسکرت شعرا میں سب سے الگ، منفرد اور ممتاز نظر آتا ہے۔ منوّر لکھنوی نے کالی داس کی اِس منظریہ شاعری کے حسن اور تشبیہ نگاری کو بڑے سلیقے سے محفوظ اور برقرار رکھا ہے۔ ہمالہ کے حُسن کے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

بوٹیاں اس کی ضیا بخش نظر ہیں کیسی
جلوہ گستر صفتِ ماہ و قمر ہیں کیسی
دُور ان سے جو نہ ہو جائے وہ ظلمت ہی نہیں
ان چراغوں کے لیے تیل کی حاجت ہی نہیں
روشنی ان کی چھلکتی ہے جہاں رات کے وقت
اِک عجب لطف کا ہوتا ہے سماں رات کے وقت
ذکر ہوتا ہے جو محبوب سے یک جائی کا
جاگ اُٹھتا ہے مقدّر کسی صحرائی کا[3]

اپنے والد دکھش پرجاپتی کے یگیہ میں اپنے شوہر بھگوان شو کی توہین و اہانت دیکھ کر احتجاجاً اپنے جسم کو پاروتی نے یوگ اگنی میں بھسم کر دیا تھا۔ پھر دوسرا جنم گری راج کے گھر میں لیا۔ اس واقعہ کو منوّر اجمالاً بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

---

[1] کمار سمبھو (ترجمہ منوّر لکھنوی)۔ مطبوعہ ۱۹۵۲ء "مضمون تر بینی یہ سنگم سے" از فراق گورکھپوری

[2] 〃 〃 〃 〃 صفحہ ۱

[3] 〃 〃 〃 〃 〃 ۶

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

آپ شوجی کی دلِ آرام تھیں اس سے پہلے — دکھشس کی دخترِ خوش کام تھیں اس سے پہلے
بزم میں شمع صفت سوختہ ساماں ہو کر — باپ کی تنگ نگاہی سے پریشاں ہو کر
آپ نے دردِ نہانی کی دوا کر لی تھی — یوگ سے ہستیِ جاوید فنا کر لی تھی ۱؎

پھر مگر قالبِ ثانی کو شرف بخشا ہے
اب کے گر راج کی رانی کو شرف بخشا ہے

ہستیِ جاوید کو یوگ اگنی میں فنا کرنا (جاوید چیز فنا تو ہو ہی نہیں سکتی لیکن یہاں جس تعلق سے ایسا کہا گیا ہے وہاں یہ معنوی طور پر بھی درست ہے اور صفتِ تضاد سے یہاں شعری حسن بھی پیدا ہو گیا ہے)، پھر قالبِ ثانی میں نمودار ہونا وغیرہ شعری ٹکڑوں شمع صفت جلنا وغیرہ کی تشبیہات سے روشن ہے کہ کالی داس کے اصل متن اور اس میں مخفی عقائد کو منوّر نے خوب سنبھالا ہے۔ پاروتی جی، شوجی جیسے عظیم دیوتا کی رفیقۂ حیات ہونے کی حیثیت سے امر اور لافانی ہیں۔ ان کے لیے ہستیِ جاوید کی ترکیب بالکل موزوں ہے۔

پاروتی کے عنفوانِ شباب اور سحر انگیز حسن کی توصیف میں کالی داس کا قلم کیا کیا رعنائیاں بکھیرتا ہے اور منوّر اپنی محاورہ بندی اور ٹکسالی لکھنوی زبان کی نفاست سے کالی داس کے ارشادات کو کیا پیکر عطا کرتے ہیں، ملاحظہ ہو:-

صبحِ دلکش کی تھی اعضا میں صباحت پیدا — حسن میں کانِ نمک کی تھی ملاحت پیدا
نازنیں جسم تھا پنہاں تہِ ملبوسِ جمال — شمعِ گلریز تھی اک زینتِ فانوسِ جمال

جیسے کرنیں مہِ تاباں کی ہوں مائل بہ نمو
تنِ سیمیں سے چھٹکتی تھیں شعاعیں ہر سو ۲؎

حسن کی سحر طرازی اور حشر سامانی کا یہ بیان بھی دیکھیے:-

گرچہ یہ جسمِ حسیں اسلحہ بر دوش نہ تھا — کون عشوہ تھا جو ہستی میں جفا کوش نہ تھا
بند آنکھیں کبھی مائل تھیں حیاداری پر — ڈال تھی شوخ نگاہی کبھی طرّاری پر
ان سے مستانہ خرامی کا سبق پایا تھا — راج ہنسوں سے یہ اندازِ روش پایا تھا

۱؎ کمار سمبھو (منوّر لکھنوی)، صفحہ ۸

۲؎ " " " ۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

درسِ اندازو اَدا وہ بھی لیا کرتے تھے
جانِ پازیب کی چھم چھم پہ دیا کرتے تھے [۱]

نقش کھینچا تھا یہ نقّاشِ ازل نے ایسا — بھر دیا رنگ حسیں شوقِ عمل نے ایسا
سحر اس میں تھا طلسم اس میں تھا جادو اس میں — کوئی چھوٹا ہی نہ تھا حُسن کا پہلو اس میں
اس عمارت کی بنا حُسن کے آثار پہ تھی — جو اَدا اس کی تھی اتری ہوئی معیار پہ تھی [۲]

تشبیہات کے ترجمے میں منوّر لکھنوی نے کیا دل نوازی پیدا کی ہے۔ الفاظ و علائم کا انتخاب دیکھیے۔ پاروتی کے حسین جسم کو فانوسِ جمال میں رکھی ہوئی شمعِ گلریز، رُخِ روشن کی صباحت کو صبحِ دل کش اور گدرائے ہوئے بدن کی ملاحت کو کانِ نمک کہنا، نیز راج ہنسوں سے شوخیِ رفتار کی مماثلت اور عشووں سے لیس جسمِ حسیں کو اسلحہ بردوش جسم تصوّر کرنا ترجمے کے حُسن و معیار کو دوبالا کر رہا ہے۔

زبان کا چٹخارہ، محاورہ بندی اور فصاحتِ کلام اس ترجمے میں قدم قدم پر قاری کو دعوتِ تلذّذ دیتے ہیں۔ تارک اُسُر جو بدی اور ظلم و استبداد کی طاقتوں کا نمائندہ ہے۔ دیوتاؤں کے لیے طرح طرح کی پریشانیاں پیدا کرتا ہے۔ اس کی جارحیت اور دہشت سے سہمے ہوئے دیوتا اپنی قوّت و توانائی، ہمّت و حوصلہ سب ہار بیٹھے تھے۔ اِس عالم کو منوّر نے کیسی مُوثر محاورہ بند اور دل نواز زبان میں ترجمے میں ڈھالا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ خط کشیدہ محاورات ذیل کے اشعار میں کیسے نگینے کی طرح جڑے ہوئے لگتے ہیں اور شعریت میں کیا تلطّف پیدا کر رہے ہیں۔ ہراساں دیوتا برہماجی کے سامنے جا کر فریاد کرتے ہیں۔

اِس لیے اِندر کو سردار بنایا اپنا — جا کے برہما سے کہا حال پرایا اپنا
دیوتاؤں کے جو چھوٹے ہوئے چھکّے دیکھے — گُلِ پژمُردہ سے مُرجھائے جو چہرے دیکھے
غیب سے ذاتِ پُرانوار نمودار ہوئی — اسی تدبیر سے تسکینِ دلِ زار ہوئی
دیوتاؤں نے کیا شوق سے دیدار اُن کا — نہ رہا کوئی بھی جلوہ پسِ دیوار اُن کا
اب ادب سے ہوئے پابوس جبیں سائی کی — لب پہ تھی حمد و ثنا مالکِ گویائی کی [۳]

دیوتاؤں کے گُروبر ہسپتی، آفرینشِ کائنات کے دیوتا برہماجی سے دیوتاؤں کا حالِ زار بیان کرتے ہیں۔ با محاورہ زبان دیکھیے :۔

---

[۱] [۲] [۳] [۴]
کمار سمبھو (منوّر لکھنوی)۔ صفحات بالترتیب ۱۲-۲۱۸-۲۲۱-۲۲۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

پہلے تھے تاج بسر خاک بسر ہیں اب یہ
جس کی شاخیں ہیں شکستہ وہ شجر ہیں اب یہ [۱]

غیر کتنا غم جانکاہ سے حال ان کا ہے
آتشِ سرد کے مانند جلال ان کا ہے

وجہِ حیرت ہے یہ بگڑا ہوا نقشہ ان کا
شکلِ تصویر ہے اترا ہوا چہرہ ان کا

(آدتیہ دیوتا کی پریشاں حالی)

مُروّتوں کی وہ جو پہلی تھی ہوا آج نہیں
زور سے ان کے قیامت وہ بپا آج نہیں [۲]

کیوں نہیں تیزیِ رفتار ذرا بھی اِن میں
کیوں نہیں گرمیِ بازار ذرا بھی ان میں [۳]

رُخ یہ پلٹا ہے زمانے کی ہوا نے کیسا
دے دیا آپ نے بردان نہ جانے کیسا [۴]

سامنے اُس کے ہے دریاؤں کا پتہ پانی
اب جو بھرتے ہیں تو بھرتے ہیں اُسی کا پانی [۵]

تارکا سُر نے قیامت سی اُٹھا رکھی ہے
خاک کرنے کے لیے آگ لگا رکھی ہے [۶]

نفسیاتی نکات اور معراجِ شوق کے نازک مراحل کے بیان و وضاحت پر کالی داس کو دسترس حاصل تھی۔ اردو ترجمے میں ان کیفیات کا عکس دیکھیے۔ کام دیو (شہوانی جذبات کا دیوتا) شوجی کی ریاضت میں خلل انداز ہونے کے لیے اُن کے تپوبن میں پہنچتا ہے تاکہ شوجی کے دل میں شادی کی امنگ جاگے اور کسی نہ کسی تدبیر سے اُن کی شادی اُماں (پاروتی جی) سے کروائی جائے۔ راجہ اندر کا حصولِ مقصد صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ شوجی کے مراقبے کو بھنگ کرنے کے لیے کام دیو اپنی پھولوں سے آراستہ کمان پر محبت کا تیر چڑھائے ہوئے وار کرنے کو تیار تھا۔ حُسن و عشق کے اختلاط کا موسم بسنت بھی اس کے ہمراہ تھا لیکن موسمی لوازمات کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ کام دیو دل شکستہ تھا۔ اتنے میں پاروتی جی سکھیوں کو ساتھ لیے اپنے معبود کو پھول پتی چڑھانے کے لیے وہاں چلی آئیں۔ ان کے ہاتھوں میں شوجی کو پیش کرنے کے لیے کنول گٹوں کا ایک ہار بھی تھا۔ کام دیو کا اب کچھ حوصلہ بڑھا۔

کچھ نظر کام کی اِس طرح دمِ دید بندھی
اب اُسے کار برآری کی پھر اُمید بندھی

دلِ سرکش کو جو قابو میں کیے رہتے ہیں
ہاتھ میں اپنے جو ترشول لیے رہتے ہیں

خاک میں اُن کی ریاضت کو ملا ڈالے گا
ناوکِ گُل کا ہدف اُن کو بنا ڈالے گا [۷]

---

[۱] تا [۷] کمار سمبھو (منور لکھنوی)۔ صفحات بالترتیب ۲۹-۳۰-۳۲-۳۶-۳۳-۳۲-۶۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

پاربتی کی پُر خلوص عبادت اور دیوانگیٔ شوق کا اثر بھگوان شو پر ہوتا ہے :-

کثرتِ شوق کا شو نے جو یہ عالم دیکھا
اپنے قدموں پہ جو یوں پائے اُماں خم دیکھا
لبِ خاموش پہ فوراً یہ دعا آہی گئی
سحر یہ کر ہی دیا معجزہ فرما ہی گئی
جس سے قسمت تری تاباں ہو وہ گوہر مل جائے
جس پہ جی جان سے قرباں ہے وہ شوہر مل جائے [1]

بھگوان شو پر اُماں کے عشقِ صادق اور جذبۂ کامل کا جادو چل جاتا ہے :-

شام کے وقت طلوعِ مہِ نورانی سے
جیسے ہیجان سمندر میں ہو طغیانی سے
آ گیا فرق سدا شو کے سکوں میں کچھ کچھ
پھنس گئے کام کے نیرنگِ فسوں میں کچھ کچھ
دلِ ساکت میں ہویدا ہوئی بے تابی سی
کیفیت اب تھی اِس آئینے میں سیمابی سی
بے قراری تھی طبیعت میں پریشانی تھی
دل سے جو موج بھی اُٹھتی تھی وہ طوفانی تھی [2]

بھگوان شو کا دل اضطراب کا شکار ہو جاتا ہے۔ دل میں جذباتِ محبت سے ہلچل مچ اُٹھتی ہے۔ اس سے آگے کے نفسیاتی مراحل اور فتنے کی جڑ کام دیوتا کا حشر قابلِ غور ہیں۔

تین آنکھوں سے جو یہ رُدر نے عالم دیکھا
بزمِ جذبات کو کچھ درہم برہم دیکھا
رُخصتِ ہوش کا امکان نظر آتا تھا
آج کچھ اور ہی سامان نظر آتا تھا
آپ نے ضبطِ مکمل سے مگر کام لیا
گر رہی تھی جو طبیعت اُسے پھر تھام لیا
سوچتے تھے سببِ نقصِ طبیعت کیا ہے
کس نے ڈھائی ہے قیامت یہ مصیبت کیا ہے

دل کے اندر کبھی دیکھا کبھی باہر دیکھا
آپ نے چار طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا

آنکھ اُٹھی تو عجب شعبدہ بازی دیکھی
ہر طرف کام کی ہنگامہ طرازی دیکھی
قوسِ گلریز کے چلّے پہ تھی چٹکی اُس کی
داہنی آنکھ کے گوشے پہ تھی مٹھی اس کی
قوس کو حلقہ بنائے ہوئے استادہ تھا
وار کرنے کو مہادیو پہ آمادہ تھا [3]

مہادیو شو جذبۂ محبت کا تو شکار ہو ہی گئے لیکن کام کو اُس کی جسارت کی پاداش میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ یہ اُس قوتِ جلالی شو شنکر کا فوری ردِ عمل تھا۔

جب یہ ہنگامہ یہ طوفان یہ فتنہ اُٹھا
تیسری آنکھ سے اِک آگ کا شعلہ اُٹھا

---

[1] تا [3] کمار سمبھو (منوّر لکھنوی)۔ صفحات بالترتیب ۶۵-۶۶-۶۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کام کو آپ نے محرومِ بقا کر ہی دیا   تیسری آنکھ کے شعلے سے فنا کر ہی دیا [۱]

پاروتی کے جذبۂ عشق کی صداقت اور خلوص کا امتحان لینے کے لیے بھگوان شو برہمچاری کے بھیس میں پاروتی کے مقامِ ریاضت پر پہنچ جاتے ہیں جہاں موروں سے بھرے ایک کنج میں پاروتی جی بھگوان شو کو پتی رُوپ میں پانے کے لیے برسوں سے تپسیا کیا کرتی ہیں۔

برہم چاری یہ رُواں شکل گدا رہتا تھا   ہاتھ میں ڈھاک کی لکڑی کا عصا رہتا تھا

برہم میں لین تھا ہر وقت جٹا دھاری تھا   شکلِ خورشیدِ سحر محوِ ضیا باری تھا [۲]

برہم چاری کی آؤ بھگت اور اتھی ستکار کیا گیا۔ دورانِ گفتگو برہمچاری نے پاربتی کی کڑی ریاضت کا مقصد دریافت کیا تو پاروتی کی ایک سہیلی نے اُسے بتایا کہ پاروتی جی یہ سخت تپسیا بھگوان شو کو شوہر رُوپ میں حاصل کرنے کے لیے کر رہی ہیں۔ تب برہمچاری نے اُماں پاروتی جی کے اس جذبے اور بے مصرف تمنّا کی ہنسی اُڑانے کے ساتھ ساتھ شو جی کے رہن سہن اور عادات کی ہنسی اُڑائی۔ اور ازراہِ تمسخر کہا:۔

برہم چاری نے شرارت سے تپایا اُس کو   چھیڑ کر اور بھی نادان بنایا اُس کو [۳]

ہم کناری کا بلا خیز قرینہ ہوگا   خاک آلُود مہادیو کا سینہ ہوگا

آپ کا جسم جو چندن سے مہکتا ہوگا   مہرِ پُر نُور کی مانند چمکتا ہوگا

اُس پہ اب راکھ چتاؤں کی جگہ پائے گی   آپ کو بات یہ کس طرح پسند آئے گی [۴]

برہم چاری نے مزید کہا کہ شو جی کے حسب و نسب کا کچھ پتہ نہیں۔ شمشانوں میں رہتے ہیں۔ جیب خالی ہے۔ بدشکل ہیں۔ سواری کے لیے بیل رکھا ہوا ہے۔ خاوندی کا کوئی بھی وصف اُن میں نہیں۔ اُن کے ساتھ شادی کر کے تو آپ دنیا بھر میں تمسخر کا نشانہ بن جائیں گی۔

پاروتی جی برہم چاری کے ان جملوں سے آگ بگولہ ہو گئیں۔ کہنے لگیں:۔

مجھے تسلیم کہ مرگھٹ میں ہے مسکن اُن کا   اس جگہ سے کبھی اُٹھتا نہیں آسن اُن کا

پھر بھی یہ ہر دو جہاں قبضۂ قدرت میں ہیں   جاگزیں کون و مکاں دامنِ رحمت میں ہیں

ذاتِ اقدس میں نہاں نور بھی ہے نار بھی ہے
کوئی شو جی کی حقیقت سے خبردار بھی ہے [۵]

یہ کہہ کر وہ غصّے میں وہاں سے چل دیں۔

---

[۱] تا [۵] کمار سمبھو منظور لکھنوی ۱۹۵۲ء ایڈیشن۔ صفحات بالترتیب ۶۸۔ ۹۴۔ ۱۰۷۔ ۱۰۹۔ ۱۱۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہوگئی جامے سے بیزار چڑھا جوش اِتنا　　ہے کہاں چھال کی پوشاک نہ تھا ہوش اتنا
ہٹ گئی سینۂ تاباں سے ذرا سی چادر　　نظر افروز ہوا حُسن کا جوہر کھل کر

مُسکراہٹ سے مہادیو نے اب کام لیا
رُوپ اصلی وہ دِکھایا کہ اُسے تھام لیا[1]

عشقِ صادق کی اس حقیقی داستان کو نقطۂ عروج تک لاتے لاتے جو نفسیاتی مراحل شاعر نے طے کیے ہیں اور مترجم نے جس وفاداری، خلوص اور دیانتداری سے اُردو میں اُن کا عکس اُتارا ہے، قاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ طوالت کے خدشے سے بہت سے دوسرے پہلو یہاں زیرِ بحث نہیں لائے جا رہے ہیں۔ کالی داس کے ڈراموں کے تراجم کا جائزہ لیتے وقت ان پہلوؤں کو ملحوظِ نظر رکھا جائے گا۔ تاہم اس منظوم داستان کے کلیدی عناصر کے ساتھ بھی شاعر اور مترجم دونوں نے بھرپور اور مکمّل انصاف کیا ہے۔

منوّر لکھنوی نے "کمار سمبھو" کے اِس ترجمے میں اصل مصنّف کالی داس کے موضوعِ سخن، اندازِ نگارش اور فکری رویّوں کے ساتھ زیرِ ترجمہ منظوم داستان کے واقعات و واردات اور سیاق و سباق کی ہر طرح سے حفاظت کی ہے۔ کالی داس نے اس صحیفے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جسمانی کشش و ہوس پر احساس پذیر عامیانہ عشق قابلِ تفریں ہے۔ تپ اور تیاگ (ریاضت اور ایثار) کی بھٹی میں تپ کر ہی سچے پیار کا سونا جلا پاتا ہے اور کُندن بن کر نکھرتا ہے اور وہ جاودانی راحت و سکون کا باب وا کرتا ہے۔ پاروتی کی محبت جسم کی نہیں روح کی محبت ہے جو ریاضت اور ایثار کے کڑے اور جاں گُسل مراحل سے گزر کر اپنی معراج تک پہنچی ہے۔ منوّر نے فنِ ترجمہ میں اپنی مشّاقی اور چابک دستی سے اس داستانِ تقدس کو اُردو کے قاری کے لیے اور بھی دامن کشِ دل بنا دیا ہے۔

مالویکا گن متر

سنسکرت کے عظیم شاعر اور تمثیل نگار کالی داس کے تمثیلی ادب میں سب سے پہلا ڈرامہ ہے۔ لیکن منوّر لکھنوی نے "شکنتلا" کے اپنے ترجمے کی اشاعت کے بعد اس

---

[1] "کمار سمبھو" (منوّر لکھنوی) صفحہ ۱۱۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ڈرامہ کو اردو ترجمے کا جامہ پہنایا اور یہ منوّر کی وفات کے بعد زیورِ طبع سے آراستہ ہو سکا۔ اُس ترجمے کی افادیت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اِسے منوّر لکھنوی کے انتقال کے تین برس بعد مارچ ۱۹۷۳ء میں انجمن ترقّی اردو ہند، علی گڑھ نے شائع کیا اور یہ ۱۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اُتر پردیش اُردو اکاڈمی نے اِس کتاب پر انعام بھی عطا کیا۔

منوّر لکھنوی نے اِس ترجمے کا انتساب اُردو کے محسنِ اعظم پنڈت سندر لال کے نام کیا ہے۔ عرضداشتِ مترجم میں منوّر فرماتے ہیں:

"جہاں تک مجھے معلوم ہے کالی داس کے شاہکار "رگھو ونش" اور "مالویکاگن متر" کا ترجمہ ابھی تک اردو میں نہیں ہوا ہے۔"

اگرچہ یہ ترجمہ منوّر لکھنوی نے ۱۹۵۳ء میں شروع کیا تھا اور یہ مئی ۱۹۶۵ء میں مکمّل ہوا۔ لیکن دیکھا جائے تو حساب سے اِس ترجمے کی تکمیل محض چھ ماہ میں ہوئی۔ کیوں کہ بیچ کے بارہ برسوں کے وقفے میں منوّر دیگر تراجم کی طرف متوجّہ رہے اور اِس دوران مختلف ادبی شاہکاروں کے اٹھارہ ترجمے منوّر نے اُردو دنیا کو دیے۔ یہ اٹھارہ کتابیں مختلف اشاعتی اداروں کی جانب سے ان بارہ برسوں میں شائع کی گئیں۔

"مالویکاگن متر" خالص رُومانی ناٹک ہے اور تمثیلی ادب میں کالی داس کا نقشِ اوّل۔ اگرچہ بقولِ منوّر لکھنوی:۔

"اس نقشِ اوّل کے کالی داس سے "شکنتلا" کا کالی داس بہت آگے ہے۔ پھر بھی "مالویکاگن متر" کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مالویکاگن متر کالی داس کی دین ہے اور دوسری یہ کہ اس سے سنسکرت ناٹک کے ایک نئے اور اہم دَور کا آغاز ہوتا ہے۔"

کالی داس کی شہرۂ آفاق تصانیف کے ماخذ عموماً ہندوؤں کے دھرم گرنتھ رہے ہیں۔ جیسے "رگھو ونش" کے لیے رامائن، "شکنتلا" کے لیے مہابھارت اور "کمار سمبھو" کے لیے "شیو پران" لیکن "مالویکاگن متر" اور "وکرم اُروشی" کے پلاٹ ہندوؤں کے عہدِ حکومت کی تاریخ کے کچھ واقعات پر اساس پذیر ہیں اور یقیناً کالی داس کے دورِ حیات سے تھوڑا عرصہ پیشتر رونما ہوئے واقعات و واردات پر۔

عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ کالی داس محض ڈرامہ نگار تھا۔ لیکن یہ رائے صحیح نہیں کالی داس

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

نے صرف تین ڈرامے تخلیق کیے ۔ "مالویکا گن متر" "وکرم اُروشی" اور" ابھگیان شکنتلا" ۔ اُس کی باقی تصانیف "مہا کاویہ" (منظوم داستانیں) کہلاتی ہیں ۔ "رگھوونش" اور " کمار سمبھو" نمایاں مہا کاویہیں کالی داس کی باقی تصانیف "کھنڈ کاویہ" یعنی جزوی طور پر طویل نظمیں کہلاتی ہیں ۔ ان میں" میگھ دُوت" اور رِتوشرنگار" مشہور کھنڈ کاویہ ہیں ۔

مالویکا گن متر میں وِدِشا کے حکمراں اگنی متر اور وِدربھ دیش کی ایک شہزادی مالویکا کے باہمی عشق اور ملاپ کی داستان مختصر تمثیل کے رُوپ میں قلم بند کی گئی ہے ۔حسن اور عشق سنسکرت زبان کی شاعری میں کالی داس کا محبوب ترین موضوع رہا ہے اور اس کے باریک ترین نفسیاتی نکات، کیفیات اور رموز کو سمجھنے، محسوس کرنے اور ان کو اپنے جمالیاتی تصوّر و تخیل کی سطور پر پیش کرنے کا جو سلیقہ کالی داس کو حاصل ہے وہ سنسکرت کے بہت کم شعراء کے حصّے میں آیا ہے ۔حکمران اگنی متر کی دو اور بھی حسین وجمیل رانیاں ہیں لیکن اس تاجدار کے ذوقِ جمال اور جذباتی تشنگی کی تسکین اس وقت ہوتی ہے ۔جب مالویکا اُن کے دردِ دل کی دوا بن کر ان کے حرم میں داخل ہوتی ہے اور خلافِ توقع ہمارے اس ہیرو کو حصولِ مقصد کے لیے اپنی دوسری رانیوں کے اشتراک و رضامندی سے مدد ملتی ہے ۔شاید اسی لیے مہا کوی تلسی داس نے حکمرانوں کی روِش اور حرکات سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ "سمرتھ کو نہیں دوش گوسائیں روی سُرسری پاوک کی نائیں"۔ اگرچہ تلسی داس نے یہ بات قدرے مختلف سیاق و سباق میں کہی ۔ لیکن اس چوپائی کے مصرعہ اولیٰ کا ترجمہ عموماً یہی کیا جاتا ہے ۔یعنی سمرتھ (مقدور، طاقت و توفیق) والا غلط کام بھی کرے تو اُسے کوئی دوش یا عیب نہیں سمجھتا۔ مفلس اگر عشق کرے تو وہ بدمعاش کہلائے گی ۔ راجہ یا مالدار انسان عشق کرے تو وہ عیاشی گردانی جائے گی ۔فعل ایک ہی ہے لیکن سماج انھیں الگ الگ نام دے گا ۔ رفعت سروش بھی اپنے شعر میں عشق کے نت نئے تجربات کا جُواز مہیا کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

عمر بھر ایک ہی دامن سے لپٹ کر رونا کیا اسی جبرِ مشیت کو وفا کہتے ہیں

"مالویکا گن متر" اسی "جبرِ مشیت کی زنجیروں کو توڑتے ہوئے ایک حکمران کے نئے معاشقے میں کامیاب ہونے کی سیدھی سادی کہانی ہے جسے کالی داس نے تمثیل کا پیکر عطا کیا ہے ۔اس کا پلاٹ بالکل سیدھا سادا ہے لیکن کالی داس کی صناعی وفنکاری نے اس میں کچھ دلکشی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کا اضافہ کر دیا۔

مالویکا ریاست وِدربھ کی ایک راج کماری ہے۔ اس کے حقیقی بھائی مادھوسین اور چچیرے بھائی یگیہ سین کے مابین باہمی تنازعہ اور پرخاش کے نتیجے میں مادھوسین کو گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ مالویکا اپنی ریاست سے ہجرت کرتی ہے اور سنیاسن (راہبہ) پری براجکا کی رفاقت میں ریاست وِدیشا میں پہنچ جاتی ہے جہاں اُسے ایک سال بھر باندی کے بھیس میں راج محل کی سیوا پر مامور ہونا پڑتا ہے۔ وِدیشا کا حکمران اگنی متر کتھک رقص کے دو ماہر اُستادوں ہردت اور گن داس کے باہمی مقابلہ رقص میں مالویکا کو رقص کرتے ہوئے دیکھتا ہے اور اُس پر لٹّو ہو جاتا ہے۔ مالویکا بھی پہلی نظر میں راجہ اگنی متر کو دل دے بیٹھتی ہے۔

اِن دو چاہنے والوں کو باہم قریب لانے اور بالآخر رشتۂ ازدواج میں منسلک کروانے کے لیے راجہ کا مصاحب اور درباری مسخرہ (وِدُشک) گوتم ایک دوسرے نسوانی کردار بکلا وکلا کے ذریعے کچھ دل چسپ تدابیر عمل میں لاتا ہے۔ اُدھر وِدیشا کی افواج سپہ سالار پُشپ متر کی قیادت میں وِدربھ کی حکومت پر قابض حکمران یگیہ سین کی سرکوبی کر کے مالویکا کے حقیقی بھائی مادھوسین کو اس کی قید سے رہا کراتی ہیں اور اُسے ریاست وِدربھ کا آدھا راج دِلواتی ہیں تب یہ راز بھی کھلتا ہے کہ مالویکا وِدربھ کے شاہی خاندان کی راج کماری ہے۔ آخری ایکٹ میں مالویکا اور اگنی متر کی شادی ہو جاتی ہے جو راجہ اگنی متر کی پہلی دونوں رانیوں دھارنی اور ایراوتی کی رضامندی سے سرانجام ہوتی ہے۔ اِس سادہ سی کہانی میں کالی داس کی فنکارانہ چابک دستی نے کیا کیا رنگ بھرے ہیں، ان کا عکس ہم منوّر لکھنوی کے زیرِ نظر دل چسپ ترجمے میں دیکھتے ہیں۔ اِس سادہ سے ڈرامے میں جہاں حسن و عشق کے راز و نیاز اور فطرت کی منظر کشی قاری پر سحر طاری کرتی ہے وہاں متعلقہ عہد کے سیاسی اور جنگی عوامل اس عہد کے مشہور رجواڑوں اور ریاستوں، شہروں اور اہم مقامات کا تاریخی اور سماجی پس منظر، حکمرانوں کی جانب سے شاعری، رقص و موسیقی وغیرہ فنونِ لطیفہ کی سرپرستی، حکمرانوں کی نفسیات، تعیّش پسندی اُن کے مشاغل اور ذوقِ جمالیات اِس ڈرامے میں خوب اُبھر کر قاری کے پیشِ نظر آتے ہیں۔ منوّر کا سلیس اور دل چسپ ترجمہ اور لذّت انگیز پیرایۂ اظہار متاثر کرتے ہیں۔

مناظرِ فطرت کی عکاسی ہو چاہے فنونِ لطیفہ کی محفلوں کا ذکر، منوّر کے الفاظ میں کالی داس کی روح کیسے بولتی ہے، ملاحظہ فرمایئے۔ دو ماہرینِ رقص ہردت اور گن داس کا مقابلہ شروع

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہوتا ہے۔ گُن داس کی شاگردہ مالویکا (ملازمہ کے بھیس میں ودربھ کی شہزادی) رقص کی اعلیٰ تدریس و تربیت کا نمونہ پیش کرنے کے لیے مقابلے میں اُترتی ہے۔ ابھگیان شکنتلا“ کی طرح اِس ڈرامے میں بھی منوّر نے نثری مکالموں کا ترجمہ نثر میں اور منظوم مکالموں کا اشعار میں قلم بند کیا ہے۔

سنیاسن (راہبہ) پری براجکا اس مقابلۂ رقص کی منصف ہے۔ اُس سے مہاراجہ اگنی متر یوں مخاطب ہوتا ہے۔

”پری براجکا! لیجیے سنگیت شروع ہوگیا۔

تھاپ مردنگ کی تا بام فلک جاتی ہے — یہ صدا وہ ہے جو موروں کو پسند آتی ہے

سحر پرور جو یہ کیفیتِ زیر و بم ہے — تال میں ایک عجب لطف ہے تاثر مدھم ہے

ہے فقط راگ کی بارش سے شرابور تمام — شور بادل کا سمجھتے ہیں اسے مور تمام“

مہاراجہ یوں تو مقابلۂ رقص میں بظاہر نکاتِ فن کا ناظر ہے لیکن اُس کے ذہن و دل اپنی محبوبہ مالویکا کے سراپا کا طواف کر رہے ہیں اور دل اشتیاقِ وصل سے بے قرار ہے۔ اس نفسیاتی نکتے کا اظہار اور معشوق کے سراپا پر نقد و نظر منوّر کے اشعار میں دیکھیے:۔

اُستاد گُن داس رقص کی باریکیوں کی جانب مہاراجہ کی توجّہ دلانا چاہتے ہیں تو مہاراجہ کہتا ہے:۔

مہاراجہ: میں نہایت توجّہ سے ہمہ تن گوش ہوں۔ میرے دل میں آچاریہ گُن داس کی بڑی عزّت ہے۔ (گُن داس چلے جاتے ہیں اور مہاراجہ ایک کنارے ہوکر ودوشک سے جو اُس کا ہم راز ہے کہتا ہے)

پسِ پردہ جو آفتِ جاں ہے — شمع فانوس میں جو پنہاں ہے

اُس کے دیدار کا میں خواہاں ہوں — سخت بے تاب ہوں پریشاں ہوں

میری آنکھیں ہیں کس قدر بے چین — ہائے وہ حُسن، حاصلِ کونین

مقابلۂ رقص کے دَوران مہاراجہ خودکلامی کے انداز میں کہتا ہے:۔

مہاراجہ (خود سے): اس کا بے داغ حُسن تو عضو عضو سے پھوٹا پڑتا ہے۔

چہرے پہ بڑی بڑی ہیں آنکھیں — ہیروں کی سی جڑی ہیں آنکھیں

ہے نور شرد کے چندرماں کا — انداز ہے ماہِ ضو فشاں کا

لمبے لمبے حسین بازو — ہم وضع ہیں صورتِ ترازو

سینے کا گٹھا وہ عنوان — باہم دِگر ملے وہ پستان

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کو لہے ڈھلوان صاف ستھرے   جن پر پائے نگاہ پھسلے

دوسرے ایکٹ کے آخر میں بھی مہاراجہ کی شیفتگی عروج پر ہے، مالویکا کے رقص کو دیکھ کر وہ کہتا ہے :۔

قدرت نے اس کو بخش دیا اک طرفہ جمال   اور ایک سمت کر کے عطا فن میں یہ کمال

ناوک کو کام دیو کے قاتل بنا دیا   اس تیر کو تو زہر میں گویا بجھا دیا

کتھک رقص کی باریکیوں اور محاسن کو منوّر نے کن سادہ الفاظ میں یہاں گنوا دیا ہے۔ رقص کے مقابلہ کی منصف مالویکا کے رقص کی یوں مدح کرتی ہے۔

متکلم سارے اعضا تھے   معنی بالکل آئینہ تھے

ہاتھوں کی جنبش تھی پیاری   نرم و نازک تھی اداکاری

درجے جو اداکاری کے تھے   اُن میں پُر کیف تواتر سے

اک "بھاؤ" کی جب رو اٹھتی تھی   لے لیتی جگہ وہ دوسرے کی

انداز بدل تو جاتا تھا   رس میں کچھ فرق نہ آتا تھا

سیاسی چالوں اور جنگی امور کا بیان دیکھنا ہو تو پہلے ایکٹ میں دیکھیے۔ مہاراجہ اگنی متر کو ریاست ودربھ کے نئے حکمران یگیہ سین کا خط پڑھ کر سنایا جاتا ہے جس میں وہ مالویکا کے بھائی مادھو سین کی رہائی کے بدلے موریہ سچو کی رہائی کا سودا کرنا چاہتا ہے۔ مہاراجہ اگنی متر کا ردِ عمل یہ ہے :۔

مہاراجہ اگنی متر : کیا کہا؟ کیا کہا؟ یہ بے دال کا بودم مجھ سے سودا کرنا چاہتا ہے؟ ودربھ کا راجہ میرا پیدائشی دشمن ہے اور میرے منہ آنا چاہتا ہے۔ دیکھو واہنک ویرسین کے تحت جس قدر فوجیں ہیں ان کو فوراً حکم دے دو کہ قبل اس کے کہ کوئی دشمن ہمارے مقابلے پر آنا چاہے اس کا پہلے ہی تیا پانچا کر دیا جائے۔ بیک بینی و دو گوش اسے ملکِ عدم کو روانہ کر دیا جائے۔ یہاں تو پہلے ہی سے یہ طے کر رکھا ہے کہ ایسے ظالم دشمن کو بیخ و بن سے نیست و نابود کر دینا ہی مناسب ہے۔

وزیر :۔ جہاں پناہ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ عین راج نیتی کے مطابق ہے۔ آئینِ سیاست کی رو سے تو ایسا ہی ہونا چاہیے کیوں کہ

تازہ تازہ سلطنت آئی ہو جس دشمن کے ہاتھ   اس کو ہم برباد کر سکتے ہیں آسانی کے ساتھ

ملک پر اُس کا تسلط معتبر ہوتا نہیں   زور اُس کا طبقۂ محکوم پر ہوتا نہیں۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

جیسے ہوتا ہے بہت کمزور پودا نونہال ‏ ‏ جس میں دم ہوتا نہیں جڑ اس کی ہوتی ہے ٹھال
خاتمے کی ہے علامت اس کا جو عنوان ہے ‏ ‏ اس کو دنیا سے مٹا دینا بہت آسان ہے

کالی داس کے عہد کے سماجی حالات، راج محلوں کے رسوم و رواجات، حکمرانوں کی تعیش پسندی، عورت پر مرد کی برتری اور صنفِ نازک کے جذبۂ ایثار پر جو روشنی ڈرامے کے مصنف نے ڈالی ہے، اس کی حقیقی تصویر منوّر نے اپنے ترجمے میں کھینچی ہے۔ ڈرامے کے پانچویں ایکٹ میں جب کہانی کی تمام اُلجھی ہوئی کڑیاں سلجھنے لگتی ہیں اور بہت سے اسرار منکشف ہوتے ہیں، مالویکا کے حسب نسب کا راز کھلتا ہے کہ وہ وِدربھ کے راج کمار مادھوسین کی حقیقی بہن ہے۔ وِدیشا کی پٹ رانی (ملکۂ عالیہ) دھارنی اپنے خاوند اگنی مترا اور مالویکا کی باہم شادی کرواتی ہے، وہاں کالی داس کا تبصرہ بالفاظِ منوّر راج محلوں کے دستور و روایات اور سماجی رسوم پر سے پردے اُٹھاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

دل سے جو خاوند کو کرتی ہیں پیار ‏ ‏ جان و دل سے اس پہ رہتی ہیں نثار
سوکن اُس کے واسطے لاتی ہیں خود ‏ ‏ اپنے اوپر یہ ستم ڈھاتی ہیں خود
پھر بھی شوہر ہی کا وہ رکھتی ہیں دل ‏ ‏ اُس کی راحت میں نہیں ہوتیں مخل
جیسے عالی ظرف ندیاں بے شمار ‏ ‏ جو سمندر سے ہوئی ہیں ہم کنار
اور ندیوں کو بھی لے کر اپنے ساتھ ‏ ‏ ہاتھ میں ان سب کے دے کر اپنا ہاتھ
وصلِ دلبر کا دکھا دیتی ہیں رُخ ‏ ‏ یوں سمندر کا دکھا دیتی ہیں رُخ

کالی داس سمندر اور ندی کے استعارے سے عورت کی قربانی کو اُس کی مجبوری کی بجائے ایک فطری عمل ثابت کرتا ہے۔ ہندوستانی عورت کے اس ضرب المثل روایتی ایثار و جاں نثاری کی روش ازمنۂ قدیم سے ہندوستانی معاشرے میں، بالخصوص شاہی خاندانوں میں عورت کا خاصہ رہی ہے اور ہمیں تلسی داس کے "سمرتھ کو نہیں دوش گوسائیں" والے مصرعہ کو اپنے ذہن میں برابر منقوش رکھنے کا جواز مہیا کرتی ہے۔ ازدواجی معاملات میں مرد کو جو مطلق العنانانہ اور یک طرفہ حقوق ملے ہوئے تھے، ان کو اُجاگر اور واضح کر کے کالی داس نے ہندوستانی معاشرتی نظام کے کچھ اہم امور سے پردے اُٹھائے ہیں۔ پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر کے الفاظ میں:۔

"یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ کالی داس کا فن خوش حال سماج اور باوقار زندگی کی نمائندگی کرتا ہے اور اُن کا ہر کردار غمِ دوراں کا رونا رونے کے بجائے غمِ جاناں کو ایک

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تہذیب، ایک تمدن اور ایک معاشرت کی حیثیت سے اُجاگر کرتا ہے۔[1]

زیرِ تبصرہ ڈرامہ "مالویکاگن متر" اس کی ایک موزوں مثال ہے۔ اس ترجمے سے منوّر نے کالی داس اور اُس کے فن کو اُردو کے قاری کے ذہن و دل سے قریب تر کردیا ہے۔

وکرم اُروشیم کا ایک ترجمہ بیسویں صدی کے ابتدائی دہاکے میں چھپا تھا جو عزیز مرزا مرحوم کی ذہنی کاوش تھی۔ مذکورہ ترجمہ نثر میں تھا لیکن منوّر لکھنوی کا ترجمہ جزوی طور پر نثر میں ہے اور جزوی طور پر نظم میں شکنتلا اور "مالویکاگن متر" کے ترجمے کا اسٹائل ہی اس ترجمے میں اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی جن مکالموں کو خود کالی داس نے نثر میں لکھا ہے، ان کا ترجمہ منوّر نے نثر میں کیا ہے اور شعری حصّوں کا نظم میں۔ خود منوّر اس غیر مطبوعہ قلمی مسوّدے کے پیش لفظ میں اعتراف کرتے ہیں کہ اس ترجمے کے شعری حصّے کا اسلوب کہیں قدیم ہے اور کہیں کہیں پر جدید یعنی قافیہ ردیف کی پابندی سے آزاد۔ پھر بھی غیر مقفّیٰ اور غیر مردّف اشعار پابندِ لے ہیں۔ یعنی یہ بحر کے سُر تال میں بندھے ہوئے ہیں اور ان میں وزن اور روانی دونوں موجود ہیں۔ اگرچہ یہ آزاد نظم کی شکل میں آئے ہیں۔

سنسکرت میں اِس ڈرامے کا نام "وکرم اُروشیم" ہے اور اردو میں اسے سادہ الفاظ میں "وکرم اُروشی" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جو اس تمثیل کے ہیرو اور ہیروئن ہیں۔ یعنی بالکل اُسی نمونے پر جس پر "لیلیٰ مجنوں" "وامق و عذرا" "ہیر رانجھا" "سوہنی مہیوال" وغیرہ تمثیلات کے نام رکھے گئے ہیں۔ سنسکرت ڈرامہ روایت کے مطابق "منگلاچرن" یعنی نغمۂ خیر (دعائیہ) سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد حسبِ روایت تعارفِ تمثیل کا ایکٹ یا منظر سامنے آجاتا ہے۔ جس میں روایتی "سوتر دھار (اسٹیج منیجر) اپنے نائب اور معاون اداکاروں کو بتاتا ہے کہ آج وہ رنگ منچ پر کالی داس کا تخلیق کردہ ناٹک "وکرم اُروشی" پیش کروائے گا۔ سوتر دھار کا اعلان ختم کرنے سے پہلے ہی پردے کے پیچھے سے "بچاؤ بچاؤ، آریو! بچاؤ" کی پُرشور آوازیں اُبھرنے لگتی ہیں۔ مہتمم یا سوتر دھار تذبذب میں ہے کہ یہ آوازیں کیسی ہیں۔ پھر وہ خود ہی اس شور و غوغا

---

[1] سہ ماہی رسالہ "نخلستان"، راجستھان اُردو اکاڈمی جے پور، جلد ۹ شمارہ ۳، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۸، صفحہ ۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کی وجہ بیان کرتا ہے اور ناٹک شروع ہوجاتا ہے۔ مہتمم کہتا ہے:۔

سب کے پروردگار نارائن　　نر کے ہیں دوست دار نارائن
ران سے اُن کی جانِ حسن وفا　　اُروشی اپسرا ہوئی پیدا
کر چکی جب کبیر کی خدمت　　اُن کے دربار سے ہوئی رخصت
راہ میں مکر وفن دکھا کے اسے　　راکشس لے گئے اُڑا کے اُسے

اپسرائیں ہیں اس لیے گریاں
لا رہی ہیں زباں پہ آہ وفغاں

راجہ پُرُرواسمع ایک ساتھی کے سٹیج پر نمودار ہوتا ہے۔ اس کے دریافت کرنے پر اپنی مصیبت کا دُکھڑا روتی ہیں اور کہتی ہیں:۔

"راجن! کسی کی ریاضت سے خوف کھا کر اُس کو ریاضت سے باز رکھنے کے لیے اندر جس اپسرا کو اپنا نازک ہتھیار بنا کر بھیجتے ہیں اور جس اپسرا کے حسین و دلکش خدوخال کے آگے لکشمی جی کا حسن وجمال بھی نہیں ٹھہرتا اور جس سے سورگ لوک کی زینت ہے، ہماری اُس پیاری سہیلی اُروشی کو، جس وقت وہ کُبیر کے دربار سے واپس آرہی تھی، کیشی نام کا راکشس چتر لیکھا کے ساتھ پکڑ کرلے گیا ہے۔

اپسرائیں ہم کوٹ پربت کی چوٹی پر انتظار کرتی ہیں۔ راجہ پُرُروا اپنے رتھ "سوم دت" میں سوار ہو کر راکشس کا پیچھا کرتا ہے اور دونوں اپسراؤں کو چھڑا کر لے آتا ہے اور وہ دونوں اپنی سکھیوں کے ساتھ اندر لوک کو واپس چلی جاتی ہیں۔ لیکن اس اثنا میں اُروشی اور راجہ پُرُروا ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو چکے ہوتے ہیں۔ اب دونوں ایک دوسرے کی جُدائی میں ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتے ہیں۔ یہاں یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ اندر کی متعدد بار مشکل اوقات میں مدد کرنے کے باعث راجہ پُرُروا کو راج رِشی کا لقب حاصل ہو چکا ہے۔

احسان مند اور اسیرِ عشق اُروشی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر راج رِشی پُرُروا سے ملنے کے لیے پرمدبن میں آئی ہے۔ جہاں راجہ پُرُروا اپنے دوست مانوک (جو وِدوشک یعنی درباری مسخرا ہے) کے ساتھ اپنے مضطرب دل کو بہلانے کے لیے آبیٹھا ہے۔ اُروشی بھوج پتر پر اپنا پیامِ محبت لکھ کر راجہ کے آگے پھینک دیتی ہے۔ ملاقات ہوتی ہے۔ راز و نیاز کے دَوران دیو دت کا بلاوا آجاتا ہے۔ اُروشی کو فوراً طلب کیا گیا ہے۔ کیوں کہ اندر سبھا میں بھرت مُنی کا تخلیق کردہ ناٹک اندر سبھا میں پیش کیا جا رہا ہے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اندر اور لوک پال اس تازہ تصنیف کردہ ناٹک کو دیکھنا چاہتے ہیں اور اس میں اُروشی کو بھی جو اس ناٹک کی اداکارہ ہے، دیوی لکشمی کا پارٹ ادا کرنا ہوتا ہے۔

سٹیج پر لکشمی کا پارٹ ادا کرتے ہوئے اپنے مکالمے میں جہاں اُسے بھگوان وِشنو کو "پُرشوتم" کہنا ہوتا ہے۔ مذکورہ مکالمے کی ادائیگی کے وقت اُس کے منہ سے پُرشوتم کی جگہ پُرروا نکل جاتا ہے۔ بے ساختہ منہ سے نکلے ہوئے اس تخاطب سے اُس کے دل کا بھید سب پر کھُل جاتا ہے۔ گورو بھرت منی اس سہو کی وجہ سے اُروشی کو سُورگ سے نِکل جانے کی سزا (بد دعا) دیتے ہیں۔ لیکن اِندر بذاتِ خود رِشی پُرروا کا برسوں سے احسان مند ہے۔ لہٰذا وہ اُروشی کو اپنی محبت کو نباہنے کی تلقین کرتا ہے۔

اُدھر پُرروا کی بیوی مہارانی جو کاشی کے حکمران کی بیٹی ہے۔ اپنی سکھی نپونکا کے ہمراہ پرمد بن میں چہل قدمی کرنے آتی ہے اور بھوج پتر پر لکھا ہوا اُروشی کا پیام اُس کے ہاتھ لگ جاتا ہے جسے پڑھ کر وہ مہاراجہ پُرروا سے برگشتہ خاطر ہو جاتی ہے۔ تاہم اپنے شوہر کو رجھانے کے لیے وہ برت رکھتی ہے اور بالآخر اپنے شوہر کا دل رکھنے کی خاطر پُرروا اور اُروشی کے رشتۂ ازدواج پر معترض نہ ہونے کا عہد کر لیتی ہے اور وہ اس سچائی سے سمجھوتہ کر لیتی ہے کہ اس کے پتی کی خوشی میں ہی اس کی خوشی ہے۔

راجہ پُرروا اپنی محبوبہ اُروشی کے ہمراہ سیر و تفریح کے لیے گندھ مادن پربت پر جاتے ہیں۔ مندا کنی ندی کے کنارے اُروشی کھیل میں مصروف ہوتی ہے۔ یکایک وہ دیکھتی ہے کہ راجہ پُرروا ایک شخص وِدیا دھر کی بیٹی اُدے وتی کی جانب ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہے۔ اُروشی کا غصّہ بھڑک اُٹھتا ہے اور وہ احتجاجاً کارتی کیہ "کے نیم (قانون)، کو نظر انداز کر کے کمار بن" میں دھرنا دے کر بیٹھ جاتی ہے۔ مذکورہ قانون کے مطابق عورتوں کا کمار بن میں جانا ممنوع ہے۔ اُروشی کے کمار بن میں قدم رکھتے ہی اُس کے بارے پر وہ ایک بیل (لتا) بن جاتی ہے۔ در اصل بھرت مُنی کی بد دعا کے زیرِ اثر ہی اُروشی کی عقل ماری جاتی ہے۔ راج رِشی پُرروا اُسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے بے حال ہو جاتا ہے۔ وہ کبھی جنگل کے پکھشیوں سے، کبھی ندیوں، پہاڑوں اور مناظرِ فطرت سے پوچھتا ہے کہ اُس کی محبوبہ کہاں ہے۔ بالآخر اُسے ایک لعل دستیاب ہوتا ہے۔ غیبی آواز اُسے آگاہ کرتی ہے کہ جو اس لعل کو پھینکنے کی بجائے سنبھال کر اپنے پاس رکھے وہ ضرور اپنے من کی مُراد پاتا ہے۔

بالآخر پُرروا اُس جنگلی بیل تک پہنچ جاتا ہے جس میں ایک بھی پھول نہیں اُگا ہوتا۔ تاہم اُس بیل کو دیکھتے ہی اُسے باطنی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ وہ بیل کو گلے لگا لیتا ہے تب اُس میں سے فوراً اُروشی نمودار ہو جاتی ہے اور اپنی بے جا برہمی اور دل آزاری کی خطا کے لیے اپنے محبوب سے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

معذرت کرتی ہے وہ اعتراف کرتی ہے کہ اُسے اپنے محبوب پُرروا کے بیقراری میں بن کے اندر بھٹکنے اور تڑپنے کی پوری آگاہی رہی ہے۔ اُروشی خود اُسے بتاتی ہے کہ مدتوں پہلے سوامی کارتک (شو جی کے بیٹے) نے جاودانی برہم چرج (عہد تجرد) اختیار کر کے مقدس پہاڑ گندھ مادن کے اس جنگل (کمار بن) میں ڈیرا جمایا تھا اور اس پربت پر عورتوں کے آنے کی ممانعت کر دی تھی اور یہ سزا بھی مقرر کر دی تھی کہ جو کوئی عورت وہاں قدم رکھے گی فوراً جنگلی بیل کی شکل میں مبدل ہو جائے گی اور بیل (لتا) کے قالب سے اس کی نجات تب ہوگی۔ اگر کوئی سوامی کارتک کی والدہ پاروتی جی کے پیروں کی سرخی سے پیدا شدہ لعل (سنگم منہ) کو حاصل کر کے اس عورت کے گناہ کا کفارہ کرے گا۔

آگے چل کر کہانی کا پلاٹ مزید اُلجھ جاتا ہے۔ اُروشی اور پُرروا اپنی راجدھانی پرتشٹھان پوری کو لوٹ آتے ہیں۔ لیکن ایک دن تاڑ کی کھلی پٹاری میں پڑے ہوئے لعلِ مُراد (سنگم منہ) کو گوشت کا ٹکڑا سمجھ کر ایک گدھ لے اڑتا ہے۔ یہ گدھ کسی کے تیر کا شکار ہو کر گرتا ہے اور راج داروغہ کنچکی تیر سے مصلوب گدھ کو اٹھا لاتا ہے۔ لعلِ مُراد کو پانی اور آگ سے پاک شدھ کر کے پیٹی میں رکھ دیا جاتا ہے، گدھ کے جسم سے جو تیر نکالا جاتا ہے اُس پر تیر چلانے والے کا نام کندہ دیکھ کر راجہ پُرروا حیرت میں پڑ جاتا ہے۔ یہ پُرروا اور اُروشی کے بیٹے "آیو" کا نام ہے۔ راجہ کو اُروشی کے حاملہ ہونے اور بچے کو جنم دینے کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ چیون رشی کے آشرم سے ایک تپسوی ستیہ وتی تیر کمان ہاتھ میں لیے ہوئے اور ایک کمسن بچے کو ہمراہ لیے ہوئے راج محل میں آتی ہے اور انکشافِ راز کرتی ہے کہ اُروشی اس بچے کو جنم دے کر اُس کے سپرد کر گئی تھی اور اس کے جنم کے سلسلے میں جتنی ضروری رسومات تھیں وہ چیون رشی نے انجام دی تھیں۔ رشی نے راج کمار کو شاستروں کی تعلیم کے بعد شستر ودیا یعنی تیر اندازی وغیرہ بھی سکھا دی تھی۔ آج یہ نونہال رشی آشرم کے لیے پھول سمدھا اور کُشا لانے کے لیے رشی آشرم کے دوسرے رشی کماروں کے ساتھ جا رہا تھا کہ اُس نے پیڑ پر بیٹھے ایک گدھ کو جو گوشت کا ٹکڑا چونچ میں پکڑے ہوئے تھا اپنے تیر کا نشانہ بنایا۔ چیون رشی کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو انھوں نے حکم دیا کہ اُروشی کی اس امانت کو اُسی کے سپرد کر آؤ۔

بیٹے اور ماں باپ کے ملاپ پر پورے راج پریوار میں اور دربار شاہی میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے لیکن اروشی کو یک لخت راجہ اندر کا حکم یاد آ جاتا ہے۔ اندر نے اُروشی کو ہدایت کی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تھی کہ تم اپنے گورو بھرت مُنی کی بددعا کے باوجود راج رشی پُرُروا کے ساتھ اپنے پریم کا عہد نباہو، لیکن جب راجہ تمہارے بطن سے پیدا ہونے والے ولی عہد کا مُنہ دیکھ لے تو تم میرے پاس واپس آجانا۔ وہ اپنے شوہر کو بتاتی ہے کہ اِسی وجہ سے اس نے اپنے بیٹے "آیو" کو اِتنا عرصہ چیون رشی کے آشرم میں ستیہ وتی کے پاس بطورِ امانت رکھا ہوا تھا۔ لہٰذا اب اُسے واپس اِندرلوک جانا پڑے گا۔

اب راج رشی پُرُروا بھی راج پاٹ ترک کرکے اور اپنے بیٹے "آیو" کو تخت نشین کرکے تپو بن میں چلے جانے کا قصد کر لیتے ہیں، لیکن اُسی وقت مہرشی نارد آکاش سے راجہ اِندر کا ضروری پیغام لے کر وہاں آ پہنچتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ :-

"جن مُنیوں کو تینوں زمانوں کا حال معلوم ہوا ہے۔ انھوں نے یہ پیش گوئی کی ہے کہ دیوتاؤں اور راکھشسوں کے درمیان بڑی زبردست جنگ ہونے والی ہے۔ چوں کہ تم (راجہ پُرُروا) فنِ جنگ میں ماہر ہو اور ہمیشہ دیوتاؤں کی مدد کرتے آئے ہو اس لیے تم ہتھیار ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ اُروشی اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمھاری رفیقِ زندگی رہے گی۔" [1]

راج کمار آیو کی رسمِ تاج پوشی ادا کی جاتی ہے۔ اُروشی اور راجہ پُرُروا ابھی راج بھون میں مستقل ازدواجی رشتے میں بندھے ہوئے عیش و استراحت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور ڈرامہ اِس دعا پر اختتام پذیر ہوتا ہے :-

خوب ہر شخص اب پھلے پھُولے — رنج دل سے ہَوا ہو۔ غم بھُولے
آرزو سب کے دل کی بر آئے — نخلِ امید میں ثمر آئے
عیش کا دو جہاں میں چرچا ہو — سُکھ کا ہر سمت دور دَورہ ہو

زیرِ نظر ترجمے پر بھی مترجم نے حسبِ معمول بہت محنت اور جاں فشانی سے کام کیا ہے۔ نثری اور شعری دونوں طرح کے ترجمے دل چسپ اور لطف انگیز۔ مشق و ریاضت کے طویل اُدوار، فطری صلاحیت، بزرگوں سے ورثہ میں ملے فنّی سلیقے اور عملی تجربے کے طفیل منوّر کی تحریر

---

[1] وکرم اُروشی (قلمی مسوّدہ۔ منوّر لکھنوی) صفحہ ۱۴۳۔ تاریخ تکمیل ترجمہ اکتوبر ۱۹۶۹ء
[2] // // // ۱۴۴ // //

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

میں جو قابلِ رشک برجستگی، رُوانی اور موضوع کو گرفت میں لینے کی بے مثال قدرت پیدا ہو گئی تھی، اِس کا بھرپور اظہار " وِکرم اُروشی " کے ترجمے میں بھی ملتا ہے۔ اس ترجمے میں ایک نیا عنصر جو داخل ہوا ہے وہ ہے غیر مقفیٰ اور آزاد نظم میں کیے گئے کچھ جزوی ترجمے تاہم آزاد نظم میں بھی منوّر نے خوب جان ڈالی ہے۔

راجہ پُرُروا جب راکشس کیشی سے اُروشی کو چھڑا کر اپنے رتھ "سوم وت" میں بٹھا کر ہم کوٹ پربت پر واپس لاتا ہے تو دورانِ سفر کی رفاقت دونوں کو ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اُروشی کے حُسن کی تعریف راجہ پُرُروا کی زبان سے اُردو ترجمے میں دیکھیے۔ جسے آزاد نظم کے ہیکر میں ڈھالا گیا ہے :۔

چاند بر ہما بن گیا ہو گا خود اُس کو جنم دینے کے لیے
خالق اُس کا دیوتا شنگار رس کا یا، وہ ظالم کام ہو گا
موسمِ گُل نے دیا ہو گا اُسے یا باغِ عالم میں یہ قالب
وید پڑھ پڑھ کر رشی ورنہ جو پتھر بن گئے ہیں
اور جن کو روز و شب لذاتِ نفسانی سے مطلب ہی نہیں کچھ
کیسے کر سکتے ہیں پیدا حُسن کا ایسا نظر پرور سراپا [۱]

مانا کہ مذکورہ بالا اشعار آزاد نظم میں ہیں لیکن یہ بحر اور وزن سے باہر نہیں۔ پابند لَے ہیں۔ پانچ بار " فاعلاتن " لفظ کا اعادہ کیا جائے تو ان مصرعوں کی تقطیع پوری ہو جاتی ہے اور غیر مقفیٰ ہونے کے باوجود اَدائے مطلب و مفہوم میں کامل اثر رکھتے ہیں۔

راجہ کی حمد و ثنا بیتالک (شاہی بھاٹ) گا کر کرتے ہیں۔ ان کی قصیدہ گوئی کو بھی منوّر نے آزاد نظم میں ڈھالا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں ایک جانب آپ
دوسری سمت نیّرِ تاباں
روز کا کام ٹھیک کرتے ہیں
دونوں پابندِ فرض ہیں یکساں

---

[۱] قلمی مسوّدہ وِکرم اُروشی (ترجمہ مُنوّر لکھنوی) صفحہ ۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

دُور کرتا ہے وہ اندھیرے کو

دُکھ مٹاتے ہیں آپ پر جل کے[1]

راجہ پُرروا اپنی محبوبہ کی یاد میں بے قرار ہے۔ محل کی چھت پر بے چینی سے اروشی سے ملاقات کا انتظار کرتا ہے اور اپنے دوست وِدُوشک مانوک سے آزاد نظم میں یہ مکالمہ کہتا ہے :-

جب چٹانیں کہیں آجاتی ہیں اُوبڑ کھابڑ

ندیاں اور بھی تیزی سے رواں ہوتی ہیں

اپنے محبوب سے ملنے میں جب آتا ہے خلل

سوگُنی اور جلن پیار کی بڑھ جاتی ہے[2]

یہ اشعار بھی غیر مقفّٰی اور غیر مردّف ہونیکے باوجود دِلی جذبات کا اظہار کرنے میں کم تاثیر نہیں رکھتے۔ محبت کی یہ نفسیاتی کیفیت جس طرح سنسکرت شلوکوں میں اصل مصنّف کالی داس نے بیان کی ہے اُسی کو بلا کم و کاست آزاد شاعری میں مانوک وِدُوشک کے آگے بیان کیا گیا ہے۔

وِدُوشک (یا شاہی مسخرہ) سنسکرت ناٹک کا ایک روایتی کردار ہے جو ہر ناٹک میں موجود ہوتا ہے۔ یہ عام طور پر ہیرو کا ہم راز دوست ہوتا ہے اور چارہ گر بھی۔ اسٹیج پر مزاح پیدا کرنے کا کام بھی اسی سے لیے جاتا ہے۔ ڈرامے میں اس کا رول نیم سنجیدہ، نیم مزاحیہ قسم کا ہوتا ہے۔ تمثیل کا ہیرو خواہ راجہ ہو، یا کوئی عام آدمی، وِدُوشک اس کے مصاحب اور جلیسِ خاص کی حیثیت میں اُس کے قریب موجود رہتا ہے اور ہیرو کی مشکلات کا حل ڈھونڈنے کے لیے طرح طرح کی ترکیبیں ڈھونڈتا رہتا ہے۔ ہر تمثیل میں اس کا نام بدلتا رہتا ہے۔ "وِکرم اُروشی" میں وِدُوشک "مانوک" کے نام سے موسوم ہے تو مالویکا گن مِتر میں یہ راجہ اگنی مِتر کی رفاقت میں گوتم کے نام سے موجود ہے۔ "ابھگیان شکنتلا" میں یہ حضرت جانکہ کے نام سے دشینت کے شاہی دربار کی رونق بڑھاتے ہیں۔ مزاح کا عنصر پیدا کرنے کے لیے عموماً اسے پیٹو دِکھایا جاتا ہے۔ اسے بھوک بہت زیادہ لگتی ہے۔

جذبات نگاری ہو خواہ منظر نگاری کالی داس کو دونوں میں یدِ طولےٰ حاصل ہے۔ اس سلسلے میں چند مثالیں درج ذیل ہیں۔ گندھ مادن پربت پر اُروشی کمار بن کے خطۂ ممنوعہ میں کھو جاتی

---

[1] [2] قلمی مسودہ وِکرم اُروشی (ترجمہ منوّر لکھنوی) صفحات ۲۰ - ۵۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہے اور وہ ایک نئا دبیل، کا قالب اختیار کرلیتی ہے تو راج رشی پُرروا اُس کی تلاش میں پاگلوں کی طرح پربت پر گھومتا ہے۔ کبھی وہ جنگل کے پرندوں اور چرندوں سے اپنی کھوئی ہوئی محبوبہ کا پتہ پوچھتا ہے، کبھی ندیوں اور پہاڑوں سے۔ جنگل کے ہرن کو مخاطب کرکے راجہ کہتا ہے، آزاد شاعری میں یہ جذبات نگاری دیکھیے :-

دھیمی ہے جس کی چال تنتمبھوں کے بوجھ سے
پستاں دبیز سینۂ رنگیں پہ جس کے ہیں
جو قلزم شباب میں ہر وقت غرق ہے
پتلی کمر پہ جس کی ہے عنقا کا احتمال
رفتار جس کی ہنس کی مانند مست مست
آنکھوں پہ جس کی چشم غزالاں نثار ہے
اُس اپسرا کو تم نے جو دیکھا ہو محوِ گشت
اِس بن میں آسمان کی صورت جو ہے سفید
اِس کا پتہ نشان بتاکر بصد کرم
تم قلزم فراق سے مجھ کو نکال لو[1]

منظر نگاری کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ پرمد بن میں بسنت رُت اپنے جوبن پر ہے۔ آدھا دن چڑھ آیا ہے۔ وِدُوشک (راجہ کا دوست) واپس راج بھون میں چلنے کی صلاح دیتا ہے۔ راجہ بھی گرمی کے احساس سے اِس مشورے پر صاد کرتے ہوئے کہتا ہے :-

تلملاکر تپش سے گرمی کی
پیڑ کی جڑ کے سرد تھالے میں
مور یہ سر چھپائے بیٹھا ہے
یہ جو رنگیں کنیر کی ہے کلی
اِس کا منہ کھول کھول کر بھنورا
اپنی جائے اماں کا جویا ہے

---

[1] قلمی مسودہ "وکرم اُروشی (منوّر لکھنوی) صفحہ ۵۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

چھوڑ کر آب گرم چشمے کا
اس کملنی کی چھاؤں میں جا کر
جا کے بیٹھا ہے مُرغِ دریائی [۱]

سماجی رسوم اور شاہی خاندانوں کی روایات کے حوالہ جات ان ترجموں کے وسیلے سے قاری کے تاریخی علم و آگہی میں اضافہ کرتے ہیں۔ راجہ پُرُروا اپنے نوعمر بیٹے کو تخت نشین کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو باپ بیٹے کے مابین کیا گفتگو ہوتی ہے۔ راج کمار آیُو اپنے والد سے کہتا ہے:۔

راج کمار : رتھ کے بھی جوئے کو بڑا بیل کھینچتا ہے۔ اسے چھوٹے سے بچھڑے کے کندھے پر ڈال دینا مناسب نہیں۔

راجہ : میرے جانِ جگر ایسا نہ کہو۔
جیسے اونچی نسل کے ہاتھی کا بچہ بیشتر
زیر کر دیتا ہے نیچی نسل کے ہم جنس کو
زہر جیسے اک سنپولے کا ہو اُتنا ہی مہیب
جس قدر ہوتا ہے مہلک تر بڑے سانپوں کا زہر
ایسے ہی راجہ کا بیٹا کتنا ہی کم عمر ہو
خوب کر لیتا ہے عالم پروری کا انتظام
منحصر کب ہے ادائے فرض سن و سال پر
نسل و فطرت کے مطابق جوہر آجاتا ہے یہ [۲]

جمالیاتی مضامین ہوں چاہے سنجیدہ سیاسی اور سماجی امور کا بیان، منوّر کی قدرتِ کلام ترجمے میں ترجمے کا حق ادا کرتی ہے۔ کالی داس کے تینوں ناٹکوں کے ترجمے سپردِ قلم کر کے منوّر لکھنوی نے اُردو ادب کے سرمائے میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔

مہاکوی کالی داس کا آدرش رامائن کے خالق والمیک تھے۔ ہندی ادب کے بیشتر ناقدین کا خیال

۱۔ مسوّدہ وکرم اُروشی (منوّر لکھنوی) صفحہ ۴۷ - ۴۸

۲۔ وکرم اُروشی (ترجمے کا غیر مطبوعہ قلمی نسخہ۔ منوّر لکھنوی) صفحہ ۱۳۶

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہے کہ مہا کوی کالی داس کی زبان میں والمیک ہی کی زبان کا اظہار ہے۔ انہی سے متاثر ہو کر انھوں نے کمار سمبھو کی تخلیق کر کے شوجی اور پاربتی کے وواہ کی داستان نظم کی۔ والمیک کی تقلید و تتبع میں ہی کالی داس نے **رگھوونش** جیسا مہا کاویہ نظم کیا۔ اسے کالی داس کی اعلیٰ ترین تصانیف میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس منظوم داستان میں کالی داس نے رام چندر جی مہاراج کے خاندان کی، جو اُن کے پرکھے مہاراجہ رگھو کے نام پر رگھوونش کہلاتا ہے منظوم تاریخ رقم کی ہے۔ یہ ایک طرح سے رُوحانی صحیفہ بھی ہے، ادبی فن پارہ بھی اور تاریخی دستاویز بھی۔

منوّر لکھنوی نے کالی داس کے اس تخلیقی شاہکار کا ترجمہ منظوم مارچ ۱۹۵۳ء میں شروع کیا تھا لیکن وقفے وقفے سے۔ "رگھوونش" کافی ضخیم گرنتھ ہے جو اکیس سرگوں پر مشتمل ہے۔ منوّر لکھنوی کے قلمی نسخے میں صرف تین سرگوں کا ترجمہ دستیاب ہوا ہے جو ۱۳۲ صفحات پر محیط ہے۔ پہلے سرگ کا ترجمہ انھوں نے ۱۲؍ستمبر ۱۹۵۷ء کو مکمل کیا۔ دوسرے سرگ کا ترجمہ ۲۳؍دسمبر ۱۹۶۵ء کو تکمیل پذیر ہوا۔ ظاہر ہے کہ درمیانی عرصے میں وہ اس ترجمے کی جانب متوجہ نہ ہو سکے۔ تیسرے سرگ کا ترجمہ بھی ۳۶ویں بند تک ہی ملتا ہے جس کے نیچے تاریخ تکمیل ۱۲؍نومبر ۱۹۶۹ء درج ہے۔ ۲۴؍مئی ۱۹۷۰ء کو منوّر نے نقدِ جاں جاں آفریں کے سپرد کر دی لہٰذا یہ ترجمہ اشاعت پذیر نہ ہو سکا۔

ترجمے کے لوازمات و محاسن کی کسوٹی پر "رگھوونش" کا یہ ترجمۂ نامکمل منوّر کے سبھی تراجم میں افضل ترین ثابت ہوتا ہے۔ خصوصاً پہلے اور دوسرے سرگ کے ترجمے کا پُر تاثیر اور رواں دواں انداز، بندش کی چستی اور نگینے کی طرح جڑے ہوئے الفاظ و تراکیب، شعریت اور غنائی لب و لہجہ قاری پر ایک سحر سا طاری کر دیتے ہیں۔

اس ترجمے کے آغاز کے تیور ملاحظہ فرمائیے۔ "رگھوونش" کا پہلا سرگ شوجی اور پاروتی جی کی استتی (حمد) سے شروع ہوتا ہے۔ دوسرے بند میں شاعر مہاراجہ رگھو کے اس عظیم اور پاکیزہ خاندان کی عظمت بیان کرنے میں اپنے عجزِ طبع کا اظہار نہایت مؤثر پیرایہ میں کرتا ہے۔ ابتدائی بندوں میں شاعر نے اپنا کلیجہ نکال کر قاری کے سامنے رکھ دیا ہے اور "رگھوونش" کی عظیم اور مقدس ہستیوں کے تئیں جن میں "رامائن" کے ہیرو رام چندر جی بھی شامل ہیں، اپنی عقیدت کا اظہار انتہائی عجز و خاکساری کے ساتھ کیا ہے۔ کالی داس کے باطنی جذبات کے ساتھ منوّر نے اپنے ترجمے میں مکمل انصاف کیا ہے اور اپنے زورِ بیان، بندش کی چستی اور وسیع و مؤثر ذخیرہ

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

الفاظ کی وساطت سے قاری کے دل و دماغ پر زبردست جذب و اثر مرتّب کیا ہے۔

پہلا بند

دُور دوری سے، یک قلم بے فصل — حرف و معنیٰ کی شکل با ہم وصل
اک طرف شَہَ وہ با کمال جتی — اِک طرف لازوال پایہ وَ تی
جو دو عالم کے جنم داتا ہیں — اِک پتا اور ایک ماتا ہیں
سر یہ دونوں کے سامنے خم ہے — بندگی کا عجیب عالم ہے
کامراں تا کہ یہ ہَوَس ہو مری — حرف و معنی یہ دسترس ہو مری [1]

(۲)

اِک طرف سورَیہ بنس کی تکریم — خانداں وہ، وہ دودمانِ قدیم
اِک طرف مجھ سا مردِ بے مایہ — صورتِ خاک پست، کم پایہ
فرقِ ارض و سما ہے دونوں میں — کوئی نسبت بھلا ہے دونوں میں ؟
میں لکھوں اور داستاں اُس کی — ہوں رقم مجھ سے خوبیاں اُس کی
یہ سکت یہ مجال مجھ میں کہاں — یہ ہُنر یہ کمال مجھ میں کہاں
یہ حماقت تو دیکھیے میری — یہ جسارت تو دیکھیے میری
اپنی حدِ مجال سے بڑھ کر — ایک تنکوں کی ناؤ پر چڑھ کر

سر میں سودا ہے یہ کہ کر لوں پار
بحر وہ جو ہے اِک بِہم ذخّار

جانتا ہوں کہ بے بضاعت ہوں — مانتا ہوں کہ تنگ جودت ہوں
پھر بھی یہ آرزو ہے، خواہش ہے — ہے اسی واسطے جو کوشش ہے
دھوم وہ عالمِ سخن میں ہو — میری گنتی بھی اہلِ فن میں ہو
جو سنے گا وہی ہنسے گا مجھے — مجھ پہ دُنیا کسے گی آوازے
یہی کہہ کر کریں گے سب بدنام — مینڈکی کو بھی ہو رہا ہے زُکام [2]

(۳)

مجھ سے پہلے جو شاعرانِ قدیم — لکھ چکے ہیں یہ داستانِ قدیم

---

[1] [2] رگھوونش (منوّر لکھنوی) صفحات بالترتیب ۱ — ۲-۳

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کر چکے ہیں کشادہ بابِ سخن — ہو چکے ہیں وہ کامیابِ سخن
اُن کے سانچے میں بیش و کم ڈھل کر — اُن کے طور و طریق پر چل کر
مَیں بھی نقدِ مُراد پا لوں گا — مَیں بھی اُن کا طلوں کو جا لوں گا
جب کنی آبدار ہیرے کی — ضو فگن نور بار ہیرے کی
اپنی عظمت کا بھید دیتی ہے — کسی پتھر کو چھید دیتی ہے
چھید میں تار ڈال سکتے ہیں — رہِ مطلب نکال سکتے ہیں [۱]

منوّر نے اِس ترجمے میں مثنوی کی صنفِ سخن اختیار کی ہے، جو اپنی روانی، سبک روی، اور اختصارِ بحر کے طفیل قاری کو اپنے افسوں کی گرفت میں برابر لیے رکھتی ہے۔ اس پر کالی داس کے جذبات کی لطافت و نزاکت، پھر اُس پر منوّر کے الفاظ و محاورات کی سحر کاری آخر تک قاری کی دلچسپی اور توجہ کو برقرار رکھتی ہے۔

رگھو ونش کے حکمرانوں کی مجموعی توصیف میں منوّر فرماتے ہیں :-

ذکر اُس خانداں کا لکھتا ہوں — حال اُس دودماں کا لکھتا ہوں
دیوتا جس کے گرد رہتے تھے — جسے رگھو بنس لوگ کہتے تھے
کون رگھو بنس جس کا اِک اِک فرد — ذی ہِمم، قول کا دھنی، با مُرد
حرف ساحل بہ ساحل اُس کا بسیط — ظرف قلزم بہ قلزم اس کا محیط
رتھ سبک گام وہ صبا رفتار — مثلِ چرخ بلند، جو دوّار
بیشتر زیبِ حلقۂ دارین — تھے رواں عرش و فرش کے مابین
چال میں تیز تر قیامت سے — آتے جاتے تھے باغِ جنّت سے [۲]

رگھو ونش کے قدیم ترین پُرکھے منوُ تھے جو سوریہ کے فرزند تھے۔ اسی لیے یہ خاندان رگھو ونش کے علاوہ سوریہ ونش بھی کہلاتا ہے۔ منوُ سے ہی یہ نسب آغاز پذیر ہوا۔ ان کے بارے میں شاعر اور مترجم فرماتے ہیں :-

"اوم" جس طرح حرفِ افضل ہے — پاک ویدوں کا حرفِ اوّل ہے

---

[۱] رگھو ونش (منوّر لکھنوی) صفحہ ۴
[۲] قلمی نسخہ رگھو ونش " ۶

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ایسے ہی تھے بزرگ باعظمت — منوئے نامدار، وے وسوت
سُوریہ کے لختِ دل، جگر پیوند — اوجِ اقبال سے سعادت مند

منوؔ کے خاندان میں نامور راجہ دلیپ پیدا ہوئے جو اپنی سطوت وجلال میں یگانہ تھے لیکن ان کے اولاد نہ تھی۔ مایوس ہو کر مہاراجہ دلیپ اپنی مہارانی سُدکھشنا کو ہمراہ لے کر عظیم راہب اور عارفِ ہمہ داں مہرشی وشسشٹ کے آشرم میں پہنچے۔ راج کاج کا بوجھ انھوں نے عارضی طور پر اپنے وزرا کے کاندھوں پر ڈال دیا۔ وشسشٹ آشرم میں انھوں نے رات کو تخلیے میں وشسشٹ منی سے حرفِ مدعا بیان کیا۔ یہ مکالمے دیکھیے جن سے تریتایگ کے رشیوں کی عظمت و احترام اور سماج میں ان کے مقام کا پتہ چلتا ہے۔

مردِ کامل خدا رسیدہ ہیں — آپ برہما کے نورِ دیدہ ہیں
آپ سے منتر آشکارا ہیں — آپ کے منتر عالم آرا ہیں
ان میں تاثیر ہے قیامت کی — ہیں یہ تمہیدِ شامِ شامت کی
دُور سے ان کے وار ہوتے ہیں — دشمن ان کے شکار ہوتے ہیں
ردّ و کد سے کوئی نہیں بچتا — ان کی زد سے کوئی نہیں بچتا
یگیہ کا اہتمام آپ سے ہے — یگیہ کا انصرام آپ سے ہے

حرفِ مدعا لب پہ لاتے ہوئے مہاراجہ دلیپ یوں گویا ہوئے :۔

لیکن اے میرے چارہ ساز بزرگ — مردِ آگاہ۔ حق نواز بزرگ!
میری پتنی یہ آپ کی داسی — رحمتِ ایزدی کی ہے پیاسی
رُوئے اولاد کو ترستی ہے — یہ غزل داد کو ترستی ہے[1]
میرے جاہ و جلال کا وارث — میری دولت کا مال کا وارث
بطن سے اس کے آشنا ہی نہیں — کوئی ایسا پسر ہوا ہی نہیں
جب گزر جاؤں گا میں دنیا سے — کون پھر دے گا پنڈ دان مجھے
جو ہے بے نور وہ نظر ہوں میں — جو ہے بے آب وہ گہر ہوں میں

بے پسر دلفگار رہتا ہوں
رات دن بے قرار رہتا ہوں[2]

---

[1] رگھوونش (منوّر لکھنوی) قلمی مسودہ۔ صفحات ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵

[2] رگھوونش صفحہ ۵۰

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

مہرشی وششٹ نے اپنی دِویہ درشٹی (غیبی نگاہ. رُوحانی آنکھ) سے دیکھ کر بتایا کہ مہاراجہ اور مہارانی کی ایک بڑی تقصیر کے باعث کام دھینو گائے نے ان دونوں کو بد دعا دے دی تھی، جس کے باعث وہ اولاد سے محروم رہے ہیں۔ انھوں نے راجہ دلیپ سے کہا: ”برسوں پہلے جب تم راجہ اِندر کی خدمت بجا لانے کے بعد سوَرگ (فردوس) سے واپس آرہے تھے تو راستے میں میری گائے جس کا نام کام دھینو ہے“کلپ تُرو” (شجر مراد بخش) کی چھاؤں میں سستا رہی تھی۔ اُس وقت مہارانی تمھارے ساتھ تھی اور ایامِ حیض کے بعد غسل کر کے پاک ہوئی تھی۔ اس وقت خانگی فرض کا ادا کرنا اگرچہ تم پر واجب تھا لیکن لوٹتے وقت تمھیں کام دھینو (نعمتیں بخشنے والی مقدس گائے) کی پُوجا (عبادت) اور پری کرما (کام دھینو گائے کا طواف) لازم تھی۔ لیکن تم نے اِن فرائض کو نظر انداز کر کے وہاں جنسی فعل کیا۔ اِسی توہین کی پاداش میں تم دونوں کو کام دھینو نے شراپ (بد دعا) دے دیا۔

چوں کہ آکاش گنگا میں اُس وقت دِگج (دِشاؤں یعنی اطراف کو سہارا دینے والے ہاتھی) نہاتے ہوئے کلیلیں کر رہے تھے۔ اُن کی چنگھاڑ کے شور میں تم کام دھینو کی بد دعا کو سُن نہیں پائے تمھارا رتھ بان بھی اس شور میں یہ بد دعا نہ سن سکا۔ اب جب تک تم اپنے اس گناہ کا پرائشچت (کفارہ) نہیں کروگے تب تک صاحبِ اولاد نہیں ہو پاؤ گے۔ اس کا کفارہ یہی ہے کہ تم اس گائے یا اس کی نسل کی پرورش اور عبادت کر کے اس کی خوشنودی حاصل کرو۔ چوں کہ کام دھینو ان دنوں ورُن دیوتا کے یگیہ میں آہوتی ڈالنے کے لیے پاتال لوک کو گئی ہوئی ہے، اس لیے کیوں نہ تم اُس کی بیٹی نندنی کی پُوجا کرو جو اس وقت یہاں موجود ہے۔

چناں چہ مہاراجہ اور مہارانی نے اکیس دن کا پاکیزگی کا برت لیا۔ مہاراجہ گوالے کی طرح دن بھر نندنی گائے کے ہمراہ رہتا اور خدمت کرتا۔ صبح و شام دونوں میاں بیوی اس کی پُوجا کرتے۔ ایک روز نندنی گائے نے دلیپ راجا کا امتحان لینا چاہا۔ چرتے چرتے وہ پربت کی ایک گپھا میں جا پہنچی۔ مہاراجہ دلیپ نے دیکھا کہ ایک شیر نے نندنی پر حملہ کر دیا ہے۔ دلیپ نے شیر کو اپنے تیر کا نشانہ بنانا چاہا تو شیر پکار اُٹھا کہ مَیں شوجی کا گن (خادم) کُمبھودر ہوں۔ کسی بھی شستر دھاری (ہتھیار بند شخص) کا وار مجھ پر اثر نہیں کر سکتا۔ مہاراجہ نے شیر کو پیش کش کی کہ وہ نندنی گائے کی جان بخش دے اور اس کے عوض مہاراجہ کو کھا کر اپنی بھوک مٹالے۔ یہ کہہ کر وہ شیر کے آگے لیٹ گئے لیکن شیر مہاراجہ پر حملہ آور نہیں ہوا۔ کچھ دیر بعد نندنی کی یہ آواز مہاراجہ کے کان

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

میں پڑی۔

میرے بیٹے! اُٹھو میرے بیٹے — ہو بہت دیر سے یہاں لیٹے
کھیل مَیں نے یہ سب رچایا تھا — اس طرح تم کو آزمایا تھا [1]

چنانچہ نندنی نے راجہ کو اپنی مراد مانگنے کے لیے کہا۔ دلیپ کے اظہارِ آرزو پہ وہ بولی :۔

تھی نظر اس قدر عنایت کی — اس نے راجا کو یہ ہدایت کی
ایک دونے میں دُھ کے دودھ مرا — آپ پی لیجیے بشوق و رضا
اس تمنا کی داد پائیں گے — آپ دل کی مُراد پائیں گے [2]

چنانچہ مہاراجہ دلیپ کے گھر میں ولی عہدِ سلطنت رگھو کا جنم ہوا۔ انہی کے نام پر یہ خاندان "رگھو ونش" کہلایا۔ منوّر کا ترجمہ ولی عہد رگھو کی شادی اور تاج پوشی سے آگے نہیں بڑھتا۔ تاہم جتنے حصے کا بھی ترجمہ منوّر نے کیا ہے وہ اعلیٰ ترجمے کی ایک قابلِ رشک مثال ہے۔

کالی داس مناظرِ فطرت کی عکاسی اس مہارت سے کرتے تھے کہ الفاظ میں تصویر کھینچ کر رکھ دیتے تھے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔ مہاراجہ دلیپ اور مہارانی سدکھشنا رتھ میں سوار وششٹ آشرم کی جانب جا رہے ہیں۔ مناظرِ راہ کیا کیا ان کا دل لبھاتے ہیں :۔

راستہ جو بھی تھا کشادہ تھا — عطر آگیں غبارِ جادہ تھا
راستے میں ہوا جو چلتی تھی — پیکرِ نازنیں میں ڈھلتی تھی
تازگی بخشِ جان و جسم تھی وہ — ایک نیرنگ تھی طلسم تھی وہ [3]

مہاراجہ دلیپ منی وششٹ کے مشورے کی تعمیل میں نندنی گائے کی دیکھ بھال کے لیے جنگل میں اس کے ہمراہ جاتے تھے۔ وہاں کی منظرکشی ملاحظہ ہو :۔

دیوتا بن میں گیت گاتے تھے — دولتِ نغمگی لٹاتے تھے
گونج بانسوں کی تہہ سے بھی اُٹھتی — جیسے بنسی بجا رہا ہو کوئی
کوہساروں کی تھی نرالی شان — آبشاروں سے پڑ رہی تھی جان
ان پھواروں کا لُطف اُٹھاتے تھے — بیڑ مستی میں جھوم جاتے تھے
لپٹیں خوشبو کی ان سے آتی تھیں — دل کو جھولا سا اِک جھلاتی تھیں [4]

---

[1] تا [4] قلمی مسودہ رگھو ونش (مترجم منوّر لکھنوی) صفحات بالترتیب ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۲۹، ۸۳

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

"رگھوونش" میں کالی داس کی بالغ نظری اور پختہ کاری کا بھرپور تعارف ملتا ہے۔ اس کی تخلیقی صلاحیتیں اس شاہکار تصنیف میں اپنے پورے عروج پر نظر آتی ہیں۔ اس لیے سنسکرت اور ہندی ادب کے نقّادوں کے حلقے میں کالی داس کو "رگھو کار" کے نام سے پکارا جانے لگا ہے۔ منوّر نے اپنے ترجمے میں محاورات کے التزام اور تحمّلِ الفاظ کی بدولت اردو میں اس ادبی شاہکار کو اور بھی مؤثر اور حسین بنا دیا ہے۔ اس ترجمے کا مطالعہ قاری کو ہزاروں برس پہلے کے عظیم آریائی سماجی نظام اور پُر تقدّس تہذیبی ماحول میں ذہنی طور منتقل کر دیتا ہے۔

مُدرا راکھشس

سنسکرت زبان کے مشہور زماں کلاسیکی تمثیل نگار وشاکھادت کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے اور اس کا آزاد اردو ترجمہ منوّر نے کمال احتیاط اور عرق ریزی سے کیا ہے اسے انجمن ترقیِ اُردو ہند، علی گڑھ نے شائع کیا تھا۔ یہ اُردو ترجمہ ۲۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ ڈرامہ بیشتر کلاسیکی سنسکرت ناٹکوں کی طرح رامائن، مہابھارت یا پُرانوں جیسی مقدّس کتابوں سے اخذ کردہ واقعات پر اساس پذیر نہیں بلکہ کچھ تاریخی حقائق و واقعات کی کڑیوں کو جوڑ کر تصنیف کیا گیا ہے۔ چندر گپت موریہ کے ریاست مگدھ میں برسرِ اقتدار آنے کے بعد اُس کے مشیرِ خاص اور سرپرست چانکیہ نے اُن مخاصمانہ عناصر سے، جو چندر گپت کے استحکام کے لیے خطرہ بنے ہوئے تھے کس طرح اپنے سیاسی داؤ پیچ کے ذریعے چندر گپت کا نہ صرف تحفظ کیا بلکہ بالآخر انھیں چندر گپت کی حمایت اور پشت پناہی کے لیے آمادہ کیا۔ اس تمام کش مکش کی داستان کو ڈرامے کا رُوپ دے کر وشاکھادت نے سنسکرت ادب کے عظیم الشان سرمائے میں ایک بیش بہا اضافہ کیا۔

ظاہر ہے کہ وشاکھادت نے جس کا زمانۂ حیات موریہ عہدِ حکومت کے چند صدی بعد مانا جاتا ہے ریاست مگدھ یعنی موجودہ صوبۂ بہار کی تاریخ سے ان واقعات کو اخذ کیا ہوگا جو مُدرا راکھشس نامی ڈرامے کا دلچسپ اور حیرت انگیز پلاٹ بن گئے۔ اس ناٹک کا پلاٹ کالی داس کے ڈراموں کے پلاٹوں کی طرح دیومالائی داستانوں کا کوئی ٹکڑا یا حصّہ نہیں۔ نہ ہی شاعرانہ تخیّل پردازی کی اُپج، بلکہ یہ ٹھوس حقائق و

۱؎ رگھوونش۔ قلمی مسوّدہ (منوّر لکھنوی) صفحات ۲۹ - ۸۳

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

واقعات پر مبنی ہے جو چند صدی پہلے کی تاریخ کا حصہ بن چکے تھے۔ اور جن کی تصدیق و ترتیب کے لیے ممکن ہے مصنّف نے چانکیہ کی عظیم تصنیف "ارتھ شاستر" اور اس عہد کے دیگر تاریخی ماخذوں سے استفادہ کیا ہو۔

مہابھارت کے زمانے میں مگدھ دیش میں پورو خاندان کے مہاراجہ جراسندھ کی حکومت تھی لیکن کئی صدیوں بعد یہ نند خاندان کے حکمرانوں کے ہاتھوں میں منتقل ہوگئی۔ انھوں نے اپنی سلطنت کی توسیع کرکے قریب قریب سارے ہندوستان کو اپنی سلطنت میں مدغم کر لیا۔ پاٹلی پتر یا پٹنہ اس سلطنت کا پایۂ تخت تھا۔ اس خاندان کا آخری تاجدار مہانند تھا جس کے تکبّر، تنک مزاجی اور نازیبا رویّے سے کچھ طاقتور سیاسی شخصیات اُس سے خفا ہوگئیں۔ اُس کے دو مقتدر وزرا میں سے ایک کو جس کا نام شٹکار تھا اس نے کسی بات سے خفا ہو کر معزول کر دیا اور مدّتوں اسے جیل میں رکھا لیکن بعد میں اس کی ذہانت سے قائل ہو کر اس کی خطا کو معاف کر دیا اور اُسے دوبارہ بطور نائب وزیر اپنے سرکاری منصب پر بحال بھی کر دیا۔

شٹکار من ہی من میں انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ اتفاق سے اس کی ملاقات ایک ذہین، فاضل اور مصمّم ارادے والے برہمن معلم چانکیہ سے ہوگئی، جس کا اصلی نام وِشنو گپت تھا۔ شٹکار نے شہنشاہ مہانند سے انتقام لینے کے لیے وِشنو گپت کو اپنا آلۂ کار بنایا۔ اُس نے وِشنو گپت (چانکیہ) کو پاٹلی پتر میں ایک پاٹھ شالہ کھولنے کی ترغیب دی اور ہر طرح سے اُس کی مدد کی۔ ایک روز وہ مہاراجہ مہانند کے محل میں شرادھ کی رسم میں وِشنو گپت کو مدعو کر کے لے گیا اور اُسے ایک آسن پر بٹھا کر خود وہاں سے غائب ہوگیا۔ یہ اس کی سوچی سمجھی چال تھی۔

شٹکار کا تیر نشانے پر بیٹھا۔ جب مہاراجہ نند اپنے وزیرِ اعلیٰ راکشش کی ہم راہی میں اُس جگہ آیا جہاں پر شرادھ کی رسم ادا ہونے والی تھی۔ اُس نے ایک بن بلائے مہمان کو آسن پر بیٹھے دیکھا۔ اُس سیہ فام برہمن کی شکل و صورت اور وضع قطع سے مہانند کو سخت کراہت ہوئی اور اُس نے اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ وشنو گپت کے سر کے بال پکڑ کر اُسے شرادھ کی جگہ سے ہٹا دیں۔ وشنو گپت (چانکیہ) اپنی توہین سے بہت برافروختہ ہوا اور اُس نے اپنے سر کی چوٹی کھول کر سرِ دربار قسم کھائی کہ جب تک وہ مہانند کے خاندان کو جڑ سے ختم نہیں کر دے گا وہ اپنی کھلی شِکھا (سر کی چوٹی) کو نہیں باندھے گا۔ اُس روز سے اپنی اس پرتگیا (سوگندھ) کو پورا کرنے کے لیے چانکیہ محوِ عمل ہوگیا۔

اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے اُس نے مہانند کی ایک داشتہ مُرا کے بیٹے چندر گپت کو اپنی طرف ملا لیا۔ یہ نوخیز لڑکا مہانند کی ملکہ کے بطن سے جنم لینے والے دیگر آٹھ بیٹوں کے مقابلے میں زیادہ ذہین اور ہوشیار تھا لیکن چونکہ اُس نے ایک شودر داشتہ کے بطن سے جنم لیا تھا۔ اسے شاہی خاندان

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

میں کم تر درجے کا سمجھا جاتا تھا، حالانکہ وہ عمر میں اپنے سوتیلے بھائیوں سے بڑا تھا اور حقیقتاً راج پاٹ کا حقدار بھی وہی تھا۔

چانکیہ نے ایک طرف تو نند حکمرانوں کے خلاف اندرونِ ملک بڑھتی ہوئی ناراضگی اور بے چینی کو ہوا دی۔ دوسری طرف اپنے جاسوسوں کے ذریعے راج محل کے اندرونی حالات پر نظر رکھی اور اُس کے ساتھ ساتھ دریائے سندھ کی نواحی ریاستوں اور کچھ پہاڑی پردیشوں کے حکمرانوں کو چندر گپت کا ساتھ دینے پر آمادہ کیا۔ چندر گپت نے ان سے یہ وعدہ کیا کہ مگدھ کے نند خاندان کو شکست دینے کے عوض مگدھ کا آدھا راج وہ اپنے ان مددگاروں کو نذر کر دے گا۔ چنانچہ چندر گپت اور مذکورہ راجاؤں کی متحدہ فوج نے مگدھ پر حملہ کر کے مہانند کی فوجوں کو شکست دی۔ مہانند اور اس کے اقربا مارے گئے۔ اور موریہ شہزادہ چندر گپت مگدھ کی سلطنت پر تخت نشین ہو گیا۔

اب چندر گپت کے استحکام کے لیے یہ ضروری تھا کہ راج بھگتوں کے اس گروہ کا صفایا کیا جائے جو نند خاندان کے وفادار تھے اور پاٹلی پتر سے باہر روپوش رہ کر چندر گپت کی مخالف طاقتوں کو موقع پا کر پاٹلی پتر پر حملہ کرنے کے لیے منظم کر رہے تھے، ان کا سرغنہ مہانند کا سابق وزیر آمتیہ راکشس تھا۔ دوسری طرف چندر گپت موریہ نے جن ساتھی راجاؤں کی مدد سے نند خاندان کا خاتمہ کیا تھا۔ وہ پوروِدیش کے حکمران پُروتک کی قیادت میں مگدھ کے نصف راج کی آس لگائے بیٹھے تھے اور آمتیہ راکشس سے ساز باز کر رہے تھے۔

چانکیہ نے اپنی شاطرانہ چالوں اور انتہائی محتاط اور چوکس جاسوسی نظام کی مدد سے پُروتک کو موت کے گھاٹ اُتروا دیا۔ کیونکہ نند خاندان کے وفادار وزیر آمتیہ راکشس نے جو وِش کنیا چندر گپت کی جان لینے کے لیے بھیجی تھی، وہ چانکیہ نے چالاکی سے پورودیس کے حکمران پُروتک کے پاس بھجوا دی۔ وِش کنیا ایسی حسینہ ہوتی تھی جس کی رگوں میں مسلسل زہریلے خون کی پرورش و افزائش کی جاتی تھی اور دشمن کے خاتمے کے لیے اس حسینہ کو اُس کے پاس بھیجا جاتا تھا۔ اس حسینہ سے جو بھی مباشرت کرتا وہ فوری طور پر لقمۂ اجل بن جاتا تھا۔ شہوت پرست پُروتک چانکیہ کے جال میں پھنس گیا اور وِش کنیا کے ساتھ مباشرت کر کے اپنی جان گنوا بیٹھا۔ اب چانکیہ کو پروتک کے بیٹے ملے کیتو سے چھٹکارا پانا تھا۔ چانکیہ نے اپنے ایک معتبر ساتھی بھاگو رائن کے ذریعے ملے کیتو کے یہ بات ذہن نشین کرا دی کہ چانکیہ کے ہاتھوں بالآخر اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو اس کے باپ کا ہوا ہے۔ ملے کیتو خوفزدہ ہو کر بھاگو رائن کی مدد سے اپنے فوجی پڑاؤ کُسم پور کو چھوڑ کر بھاگ نکلا اور واپس اپنی ریاست

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کو چلا گیا۔

چانکیہ چندر گپت کی حفاظت و عافیت نیز موریہ حکومت کے استحکام کے لیے یہ ضروری اور ناگزیر سمجھتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح آمتیہ راکھشس کو قابو میں لاکر اُسے چندر گپت کا وزیر اعظم بنایا جائے کیوں کہ نند ونش کا وفادار آمتیہ راکھشس چانکیہ کی اِس پیش کش کو پہلے حقارت سے ٹھکرا چکا تھا۔ زیر نظر ناٹک انہی چالوں اور سیاسی ریشہ دوانیوں کی روداد ہے جن کے ذریعہ چانکیہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا اور بالآخر آمتیہ راکھشس کو چندر گپت موریہ کی حمایت اور وزارتِ عظمےٰ کا عہدہ بسر و چشم قبول کرنا پڑا۔

دراصل آمتیہ راکھشس اپنے بیوی بچوں کو اپنے ایک دوست ساہوکار چندن داس کی حفاظت میں چھوڑ کر خود روپوش ہو گیا تھا اور جنگل میں کسی خفیہ مقام سے اپنی مخاصمانہ سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھا۔ وہ چندر گپت پر حملہ کرنے کے لیے طاقت بٹور رہا تھا۔ چانکیہ نے آمتیہ راکھشس کو ایک جعلی خط لکھوایا جس کے ذریعہ پوروراجکمار ملےکیتو اور آمتیہ راکھشس کے مابین باہمی بد اعتمادی اور ناچاقی پیدا کروادی اور اس طرح دونوں کے متحدہ حملے کے امکان سے موریہ سلطنت کو بچالیا۔ ادھر چانکیہ نے ساہوکار چندن داس سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ آمتیہ راکھشس کے بیوی بچوں کو حکومتِ وقت کے حوالے کردے اور اس حکم کی عدم تعمیل کی پاداش میں چندن داس کو پھانسی چڑھانے کا جھوٹ موٹ ڈرامہ رچا۔ اصل مدعا یہ تھا کہ آمتیہ راکھشس اپنے دوست اور محسن چندن داس کو پھانسی سے بچانے کے لیے روپوشی سے باہر آجائے گا اور خود کو حکومتِ وقت کے حوالے کردے گا۔ چانکیہ کی اس منصوبہ بندی کا حسبِ توقع نتیجہ نکلا۔ چندن داس ساہوکار کو جب پھانسی پر چڑھایا جانے لگا تو اپنے اس دوست کی جان بچانے کے لیے آمتیہ راکھشس خود ہی اپنی پناہ گاہ سے نکل کر قتل گاہ میں پہنچ گیا۔ اب چندن داس کی جان بخشی کے لیے چانکیہ کی جانب سے یہی شرط رکھی گئی کہ آمتیہ راکھشس چندر گپت موریہ کا وزیرِ اعظم اور موریہ حکومت کا وفادار راج بھگت بن جائے۔ بالآخر یہی ہوا۔ آمتیہ راکھشس نے یہ پیش کش قبول کرلی۔ چانکیہ کی بھی نند خاندان کی بیخ و بنیاد مٹانے کی سوگندھ اب پوری ہو چکی تھی۔ لہٰذا اب اُس نے وہیں اپنی کھلی چوٹی کو گرہ لگادی۔ آمتیہ راکھشس نے وزارتِ عظمےٰ کا منصب قبول کرنے کے ساتھ چانکیہ کے احسانات اور عظمت کا نیز اپنی عزت افزائی کا کھلا اعتراف کیا۔

ڈرامہ مدرا راکھشس کے اصل مصنف وشاکھا دت نے تاریخ کے ایک گزرے ہوئے انقلابی واقعے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کو ایک یادگار ڈرامہ کا رُوپ دے دیا ہے۔ یہ ڈرامہ امریکہ کے سٹیجوں پر بھی کھیلا جا چکا ہے اور ہندوستان میں بھی اسے رنگ منچ پر پیش کیا جا چکا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو سے بھی یہ نشر ہو چکا ہے اور حال ہی میں دوردرشن پر بھی اس کی نمائش ایک سلسلے وار ڈرامے (سیریل) کی شکل میں ۵۲ اقساط میں مکمل ہوئی ہے۔ اگست ۱۹۹۲ء تک اس تمثیل کی اقساط ہر اتوار کو دُوردرشن سے ٹیلی کاسٹ کی جاتی رہی ہیں۔ اگرچہ یہ "چانکیہ" کے زیرِ عنوان ٹیلی کاسٹ ہوتا رہا۔

منوّر لکھنوی نے اصل سنسکرت متن کے علاوہ ہندی میں اس ناٹک کے پہلے سے موجود تراجم سے بھی مدد لے کر اس تمثیل کو اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ جن ہندی تراجم سے مدد لی گئی ہے ان میں بھارتیندو ہریش چندر، پروفیسر ستیہ برت سنگھ، پروفیسر دھرُو اور بلدیو شاستری کے ترجمے قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن منوّر کی رائے میں مذکورہ ہندی ترجموں کے بہ مقابلہ انگریزی زبان میں اگر کسی انگریز مترجم کا اس ناٹک کا ترجمہ دستیاب ہوتا تو وہ یقیناً بہتر ہوتا۔ وہ ترجمے کے میدان میں اپنے وسیع تجربے کی بنا پر یہ یقین رکھتے ہیں کہ سنسکرت ناٹکوں کے انگریزی ترجمے ہندی تراجم کے بمقابلہ زیادہ صاف اور سنسکرت متن کی رُوح سے قریب تر ہوتے ہیں جبکہ ہندی تراجم زیادہ تر طلبا کی ضرورت کی تکمیل کے لیے کیے جاتے رہے ہیں اور کیفیت سے خالی ہیں۔ بقولِ منوّر ان ترجموں سے کلاسز کی ضروریات چاہے پوری ہوتی ہوں لیکن شعری اور ڈرامائی نقطۂ خیال سے ان کوششوں کو سراہا نہیں جا سکتا۔

منوّر لکھنوی نے اس ترجمے پر نظرِ ثانی کے سلسلے میں مشہور محبِ وطن اور فاضل جید پنڈت سندر لال کے گرانقدر مشوروں اور رہنمائی کا اعتراف کرنے کے ساتھ احمد آباد کے مشہور سنسکرت وِدوان دیوان بہادر کے ایچ دھرو کے انگریزی ترجمے سے استفادہ کرنے کا بھی ذکر کیا ہے۔

زیرِ نظر ترجمے میں منوّر نے اُردو کے مخصوص شعری لوازمات یعنی ردیف وقافیہ کی پابندی کا خیال رکھا ہے۔ کچھ مکالمے آزاد نظم میں بھی ہیں۔ منوّر کے دوسرے تراجم کی مماثلت میں اس ترجمے میں بھی اصل متن کے نثری حصّوں کا ترجمہ نثر میں اور منظوم حصّوں کا ترجمہ اشعار میں کیا گیا ہے۔ اس تمثیل کی ابتدا مہادیو شنکر جی کی حمد و ثنا سے ہوتی ہے۔ کلاسیکی سنسکرت ڈراموں کی عام روایت کے مطابق سوتردھار (سٹیج منیجر) اور نٹی کے باہمی مکالموں کے ذریعے ناظرین کو شروع میں تمثیل کے پس منظر سے اجمالاً آگاہ کیا جاتا ہے۔ تعارفی باب کا اختتام اس گفتگو سے ہوتا ہے۔

سوتردھار :

کیتُو کی کج رَوی سے شاید آج   چاند سارا گہن میں آ جائے

(پھر آواز آتی ہے)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کون ہے جو میرے جیتے جی چندر کو گرہن لگا سکتا ہے۔

سوتر دھار: اوہو! اب پتہ چلا۔ یہ آواز تو کوٹلیہ کی ہے [یہ سن کر نٹی گھبرا جاتی ہے اور جانے کا ارادہ کرتی ہے۔ سوتر دھار پھر کہتا ہے]

ارے یہ تو کوٹ نیتی کے ماہر کوٹلیہ کی آواز ہے جو اپنے غصّے کی آگ سے نند ونش والوں کو خاک سیاہ کر چکے ہیں اور ابھی میری زبان سے چندر گرہن کا ذکر سُن کر ان کو معلوم ہو گیا ہے کہ ان کے چندر گپت پر دشمن کی طرف سے کوئی حملہ ہونے والا ہے۔ اسی لیے ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی ہے۔

اچھا اب ہم دونوں کو یہاں سے چلنا چاہیے[1]

پہلے ایکٹ میں چانکیہ جس کا اصلی نام وشنو گپت ہے لیکن جو اپنی گہری اور شاطرانہ چالوں اور کوٹ نیتی کے باعث کوٹلیہ کہلاتا ہے۔ نند خاندان کا تختہ الٹ چکا ہے۔ اس عظیم انقلاب کے بانی کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا منوّر نے خود کلامی کے انداز میں ادا کیے گئے ذیل کے مکالموں میں اظہار کیا ہے۔

(آسن پر بیٹھ کر چانکیہ خود بخود کہنے لگتا ہے)

کیا یہ بھید سب پر کُھل گیا کہ نند خاندان کی تباہی کا باعث میں ہوں اور اسی لیے راکھشس مجھ سے ناراض ہو کر ملے کیتو سے مل گیا جو اپنے باپ کے قتل سے آگ بگولا ہو رہا ہے اور ملیچھ راجاؤں کی مدد سے چندر گپت پر چڑھائی کرنا چاہتا ہے (کچھ سوچ کر) اگر ایسا ہے تو بھی کچھ مضائقہ نہیں۔ میں نے اپنا کام پورا کر ہی لیا۔ دنیا کے دیکھتے دیکھتے میں نے نند خاندان کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اب اگر یہ راز کھل ہی گیا تو اس کو چھپانے سے فائدہ؟ میں راکھشس سے بھی نمٹ لوں گا۔

بیرخ رنو اس کی دیتی ہے گواہی غم کی
پھیر دی ہے رُخِ دشمن پہ سیاہی غم کی

ہو گئی ختم کمینوں کی شرارت ساری — بھسم ہے آگ کے شعلوں سے وزارت ساری
سرکشی جس نے بھی کی اُس کا وہیں سر توڑا — ایک بچہ بھی رذیلوں کا نہ باقی چھوڑا
کس کی گردن پہ رواں خنجرِ فولاد کروں — کوئی باقی ہی نہیں، اب کسے برباد کروں

---

[1] مدرا راکھشس (ترجمہ منوّر لکھنوی) صفحہ ۵۴-۵۵۔ ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اس کے علاوہ :-

جب بگیہ کے آسن سے اٹھایا میں گیا تھا — رسوا سر بازار بنایا میں گیا تھا
جو ہیبت شاہی سے بھی اس وقت زباں بند — جنبش نہ لبوں کو ہوئی تھا قفل دہاں بند
اک لفظ مذمت بھی زباں پر نہیں آیا — غصہ مری حرمت کے زیاں پر نہیں آیا
اب ان کو دکھا دوں گا قیامت کا نظارہ — دیکھیں گے وہ اب قتل کا غارت کا نظارہ [۱]

خود کلامی کے انداز میں یہ مکالمہ کافی طویل ہے۔ اس کے مذکورہ بالا حصے ہی سے چانکیہ کی تمام جدوجہد کا پس منظر اور اس کی پر اسرار چالوں کا مقصد سمجھ میں آجاتا ہے۔ قاری کو نفسِ مضمون کی تفہیم میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ اور وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ترجمہ نہیں بلکہ اصل ڈرامے کا مطالعہ کر رہا ہے۔ ان اشعار اور مکالموں سے قاری بآسانی اس سیاسی انقلاب کے محرکات کو سمجھ لیتا ہے جو ایک معلم کو میدانِ رزم میں لے آئے۔

چند اور نمونے ملاحظہ فرمایئے۔ پانچویں ایکٹ میں چانکیہ کے ایک کارندے اور جاسوس بھاگورائن کا ایک منظوم مکالمہ یوں ہے :-

بھاگورائن :- چانکیہ کی نیتی بھی کچھ عجیب ہے۔ ان کی چالیں سمجھ ہی میں نہیں آتیں۔

حیران ہوں میں ان کی سیاست کو دیکھ کر — انگشت در دہاں ہوں فراست کو دیکھ کر
ہیں حکمتوں کے پیچ کہ قسمت کے پیچ ہیں — عقدے مدبّری کے مشیّت کے پیچ ہیں
جو بات بھی ہے ان کی وہ موقع کی بات ہے — ان کا جہان ایک جہانِ نکات ہے
آتی ہے کوئی بات سمجھ میں کبھی ضرور — ہوتا ہے کوئی راز مگر پھر سمجھ سے دُور [۲]

تیسرے ایکٹ میں چانکیہ اپنے شاگرد چندر گپت کے ساتھ بناوٹی جھگڑا کھڑا کر لیتا ہے جو محض امتیہ راکھشس کو دکھانے اور چکّر میں ڈالنے کے لیے ہے تاکہ وہ یہ تأثر لے کہ چندر گپت موریہ اپنے گُرو سے فرنٹ ہو کر اب خود مختاری سے حکومت کرنے لگا ہے۔ چانکیہ کی خود کلامی منوّر کے الفاظ میں

اِک نیا کھیل اب میں کھیلوں گا — جان ہی ظالموں کی لے لوں گا
لوں گا دے کر انہیں عقل کو چکّر — موریہ سے اک بناوٹی ٹکّر
سلسلہ یہ لگاوٹی ہو گا — خرخشہ یہ بناوٹی ہو گا

---

[۱] [۲] مدرا راکھشس (ترجمہ منوّر لکھنوی)، صفحات ۵۷، ۵۸ — ۱۹۵-۱۹۶ ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

راکھشس لاکھ اِک مدبّر ہے　　پھوٹ کے ڈالنے میں ماہر ہے
زعم میں اپنے چُور ہے کتنا　　اس کو خود پر غرور ہے کتنا
اس قدر اس کو ور غلا دوں گا　　کہ ملئے کیتو سے لڑا دوں گا [1]

کنچکی مہاراج چندر گپت موریہ کا پیغام لے کر چانکیہ کو بلانے کے لیے جاتا ہے لیکن اس شیر سلطنت کے گھر کی سادگی اور مفلسانہ بود و باش کو دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ خود سے کہتا ہے :۔

"تو مہا منتری کے گھر کی دولت و ثروت کا یہ نمونہ ہے ؟"

اِک سمت پڑا ہوا ہے بٹّہ　　اُپلے گوبر کے توڑنے کا
اِک سمت لگی کُشا کی ڈھیری　　لائی ہوئی برہمچاریوں کی
گھر بوسیدہ و شکستہ　　دیوار ہر ایک جس کی خستہ
اس پر لکڑیوں کے انبار　　ہیں یگیہ کے واسطے جو درکار
چھپّر گویہ رُکا ہوا ہے　　چھجّا اس کا جُھکا ہوا ہے

ان اشعار میں مہا منتری چانکیہ کے سادہ جیون اور بے آب و تاب طرزِ معاش کی حقیقی تصویر ملتی ہے۔ جس میں رتی بھر بھی مبالغہ نہیں۔ وشنو گپت عرف چانکیہ کوٹلیہ اوّل و آخر ایک معلّم تھے۔ اور معلّم کے تیاگ اور تپ، سادگی اور ریاضت اور فقیرانہ بود و باش ہی کو انھوں نے تا عمر اپنائے رکھا۔ اس عظیم سیاست دان اور مدبّر کے جوشِ عمل، فراست اور حکمتِ عملی کی مہارت کے ساتھ ساتھ اس کی رفعتِ کردار، ایثار اور قلندرانہ بے نیازی کی عکّاسی منوّر نے بے کم و کاست کی ہے لیکن سادہ سلیس اور موثر پیرائے میں۔

ساتویں اور آخری ایکٹ میں جب چانکیہ کی چال کامیاب اور ثمر ور ہوتی ہے۔ آمتیہ راکھشس روپوشی سے نکل کر خود کو حکومت کے حوالے کرتا ہے۔ اپنے جسم کو چادر سے چھپائے ہوئے اور صرف چہرہ کھولے ہوئے چانکیہ پردے سے باہر نکل کر (خود سے) کہتا ہے۔ گویا دل ہی دل میں وہ آمتیہ راکھشس کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔

آگ شر خا شرج لو دینے ہوئی　　کس نے اِک دھجّی میں لے کر باندھ لی
پھنس گئی آندھی یہ کیوں کر جال میں　　ہے ہمارے سامنے اِس حال میں

---

[1] مدرا راکھشس (منوّر لکھنوی) صفحہ ۱۳۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہوگیا ہے کس کی تدبیروں سے زیر — آپھنسا پنجے میں آخر کیسے شیر
کس نے ایسے بحرِ ہیبت خیز کو — کس نے اس دریائے شور انگیز کو
کر دیا ہے چیر کر سینہ فگار — تیر کر کس نے کیا ہے اس کو پار؟

منوّر لکھنوی نے اس تمثیل کے ترجمے کو حتی المقدور اصل سنسکرت متن سے قریب تر رکھا ہے اور اس کے ساتھ اس کی ادبی ساکھ اور شعری محاسن کو بھی برقرار رکھا ہے۔ ترجمے کے منظوم حصے زیادہ تر مقفےٰ ہیں۔ آزاد نظم اور غیر مقفےٰ اشعار برائے نام ہیں۔ ترجمے کے حصۂ نظم میں جن بحروں کو زیرِ استعمال لایا گیا ہے، بیشتر مترنم اور رواں دواں بحور ہیں۔ اس سنجیدہ کاوش کی بدولت منوّر لکھنوی نے اپنا نام اور اصل مصنف وشاکھادت کا نام روشن اور سر بلند کیا ہے۔ انجمن ترقیِ اردو (ہند) علی گڑھ جیسے مؤقر اور محترم ادارے کا اس ترجمے کو اشاعت کے لیے منظور کرنا بذاتِ خود اس تمثیل کی اہمیت اور ترجمے کے محاسن کا بیّن ثبوت ہے۔

مالتی مادھو

سنسکرت کے ایک اہم ڈرامہ نگار بھوبھوتی کا پہلا تمثیلی کارنامہ ہے جس کے پلاٹ کی ساخت و تشکیل میں جزوی طور پر مہاکوی بھاس کے ناٹکوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے اور رائج الوقت لوک کتھاؤں سے بھی۔ یہ دس ایکٹوں پر مشتمل ایک ڈرامہ ہے جس میں مالتی نامی حسینہ اور مادھو کے باہمی عشق کی واردات کو تمثیل کا روپ دیا گیا ہے۔ ریاست کے وزیر بھوری وسو کی بیٹی مالتی اور ایک متوسط طبقے کا حسین نوجوان کسی تقریب میں ایک دوسرے کو دیکھ کر پہلی نظر ہی میں ایک دوسرے کو دل دے بیٹھتے ہیں اور باہم میل جول بڑھانے کی شعوری کوشش کرتے ہیں۔ کامندکی نام کی ایک بودھ راہبہ مالتی کی مدد کرتی ہے۔ شو مندر کے قریب مادھو سے اس کی ملاقات کروانے کی ترکیب کرتی ہے لیکن موقعے پر ان کی ملاقات سے قبل ایک شیر کے اچانک نمودار ہو جانے سے بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ مادھو کا دوست مکرند موقعہ پر آجاتا ہے اور وہ شیر کو مار ڈالتا ہے۔ مکرند زخمی ہونے کے باعث بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر وہ مالتی کے ہمراہ اس کی ایک سہیلی مدینتکا کو دیکھ کر اس کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

وزیر بھوری وسو اپنی بیٹی مالتی کی شادی نندن سے کرنا چاہتا ہے اور شادی کی تاریخ بھی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

طے ہو جاتی ہے لیکن شادی سے قبل کاپالک اگھور گھنٹ (شمشان کا پہرے دار) مالتی کو کرالا دیوی کی بھینٹ چڑھانے (انسانی قربانی دینے) کے لیے اغوا کر لے جاتا ہے لیکن مادھو موقع پر پہنچ کر اگھور گھنٹ کا کام تمام کر دیتا ہے اور مالتی کو بچا لیتا ہے۔

بودھ راہبہ کامندکی اپنی فراست سے نندن کو جُل دے کر اس کی شادی نوجوان مکرند سے کروا دیتی ہے اور مالتی کا بیاہ اُسے شِو مندر میں لے جا کر مادھو کے ساتھ کروا دیتی ہے۔ نندن کو جب یہ پتہ چلتا ہے کہ اُس کی دُلہن کے لباس میں مالتی نہیں بلکہ مادھو کا دوست مکرند ہے تو وہ اُسے بُرا بھلا کہہ کر چلا جاتا ہے۔

یہیں جب نندن کی بہن مدینتکا آتی ہے تو وہاں مکرند کو پا کر خوش ہو جاتی ہے لیکن مدینتکا کو بھگانے کے الزام میں سپاہی مکرند کو پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ یہ جان کر مادھو وہاں آتا ہے۔ اسی بیچ موقع پا کر کپال کنڈلا اپنے گورو اگھور گھنٹ (شمشان کے مرحوم پہرے دار) کے قتل کا بدلا لینے کے لیے مالتی کو بھگا کر شری پربت پر لے جاتی ہے۔ سپاہیوں اور مادھو و مکرند میں لڑائی ہوتی ہے۔ ان کی بہادری سے خوش ہو کر راجہ انھیں چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد راہبہ کامندکی عقل مندی سے مالتی کی حفاظت کرتی ہے اور اُس کا بیاہ مادھو کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ اور مکرند کا بیاہ اس کی محبوبہ مدینتکا کے ساتھ ہوتا ہے۔

زیرِ نظر ڈرامہ میں کچھ واقعات بہت پھیکے، غیر فطری اور تعجب خیز سے لگتے ہیں لیکن مصنف نے انھیں بڑی ہوشیاری سے کہانی کے پلاٹ میں داخل کیا ہے جس سے یہ تمثیل تھوڑی بہت دلچسپ بنی ہے۔ اس تمثیل کا مقصد بدھ دھرم کے زوال پر روشنی ڈالنا لگتا ہے۔ اس میں ایک بودھ بھکشنی (راہبہ) کامندکی اپنے آشرم دھرم کو چھوڑ کر اس پریم لیلا میں ممد و معاون نظر آتی ہے اسی پر ہی اکتفا نہیں اُس کی ایک شاگردہ سوداَمنی بھی مالتی اور مادھو کے معاشقے کو کامیاب بنانے میں کامندکی کے ساتھ سرگرم شریک کار ہے۔ تاہم تمثیل نگار بھوبھوتی نے ان کرداروں سے اپنے اس اوّلین تخلیقی فن پارے میں خوب کام لیا ہے۔

منوّر لکھنوی نے اس تمثیل کا نثری ترجمہ اپنی طبعی مہارت اور جاں فشانی سے کیا ہے لیکن اس ترجمے کا جو قلمی مسوّدہ دستیاب ہوا ہے وہ نظرِ ثانی کا محتاج ہے۔ بیچ بیچ میں کچھ مکالمے غائب بھی ہیں اور ان میں کافی کاٹ چھانٹ کی گئی ہے۔ اگر چہ اس ترجمے کی تاریخ تکمیل مسوّدہ کے اختتام پر ۲۰ نومبر ۱۹۶۸ء درج کی گئی ہے تاہم ایسا لگتا ہے کہ شاید منوّر فرصت میں اس

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

مسوّدہ پر نظر ثانی کرنا چاہتے تھے۔

اِس ترجمے میں مکالموں کی طوالت اور الجھاؤ قاری کو بوریت اور ذہنی بوجھل پن سے دو چار کرتے ہیں لیکن اس کی ذمّے داری اصل مصنّف پر آتی ہے نہ کہ مترجم پر۔ بعض مکالمے تو مسوّدہ کے دو دو صفحات پر مسلسل پھیلے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر ساتویں ایکٹ میں مدنتِکا اور اُس کی سہیلی لونگِکا کے مابین گفتگو میں اکثر مکالمے خاصے طویل اور قاری کے لیے صبر آزما ہیں۔ چند نمونے درج ذیل ہیں۔

لونگِکا: تم تو فضول گپ بازی سے بہک گئی ہو۔ اب ہرگز تم سے نہ بولوں گی۔

مدنتِکا: سکھی! ایشور کے لیے ذرا تم کچھ تو مُروّت سے کام لو۔ مَیں نے کچھ تم کو براہِ راست تھوڑے ہی کہا ہے۔ سچ پوچھو تو یہ بات ہم سب لوگوں کو معلوم ہے کہ مالتی ہر وقت مادھو کے خیال میں محو رہتی ہے۔ اس کی رگ رگ میں نس نس میں مادھو ہی بسے رہتے ہیں۔ درحقیقت یہ کسی نے نہیں دیکھا ہے کہ مالتی کے نازک نازک جسم کے حُسن کی تکمیل کیتکی کے پھولوں کے درمیانی حصّے کی طرح ملائم ملائم اس کی صباحت سے ہوتی ہے اور اسس میں جان ہے تو اس کی گردن میں پڑے ہوئے بکل کے پھولوں کے اُس ہار سے ہے جسے مادھو نے خود اپنے ہاتھوں سے گوندھا ہے اور پھر کسی نے نہیں دیکھا ہے صبح کے وقت ڈھلتے ہوئے چاند کے حلقے کے مانند دُبلے پتلے اور زرد رُو مادھو کو۔ اور اس کے علاوہ کیا تم نے اس روز اُس جگہ پر ملاقات کے دوران میں جہاں کسی اک پھلواری کے دامن سے سڑک کی طرف راستہ جاتا ہے۔ دونوں کی آنکھوں کو آپس میں چار ہوتے نہیں دیکھا۔ ان آنکھوں کو جن کی جگمگاہٹ سے بھری ہوئی جنبشیں نتیجہ ہیں ان جادو بھری پتلیوں کے چنچل پن کا۔ ان میں یہ چنچل پن ان آنکھوں کی اٹھکیلیوں کے ساتھ ساتھ جاری ہے۔ جو کنول کی مانند حسین اور خوبصورت پھیلی پھیلی ہیں۔ ان آنکھوں میں اشتیاق وحیرت سے کشادگی اور اُن سے ایک دلکش چمک پیدا ہے۔ یہ رعنائی اور طراری میں ڈوبا ہوا دلفریبی کا ایک مرقّع ہیں۔ یہ طراری عضو عضو سے پھوٹی پڑ رہی ہے اور یہ فیض ہے اُس تعلیم کا جو فنِ رقص کے ماہر یعنی عشق کے دیوتا کی زیرِ ہدایت حاصل ہوئی تھی۔ اور کیا تم نے ان دونوں کے دلوں کو جڑوں کی مانند ایک دوسرے سے گتھے ہوئے نہیں دیکھا جن کی جسمانی خوبصورتی اس اذیتِ عظیم کے پھیلاؤ سے ماند پڑتی جا رہی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہے جس کا آغاز اس وقت سے ہو گیا تھا جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ مالتی میرے بھائی کے سپرد کی جا رہی ہے۔ مجھے تو ایک اور بات بھی یاد ہے.....‘‘

لونگا : وہ اور بات کیا ہے۔

مذکورہ بالا مکالمے کا ترجمہ چاہے کتنی نفاست اور صحت کے ساتھ بھی کیا گیا ہو اس کی طوالت مترجم اور قاری دونوں کے ذہن پر بوجھل بن جاتی ہے اور اسی نوع کے کئی طویل مکالمے اس تمثیل میں موجود ہیں جو خطابت کا انداز لیے ہوئے ہیں۔

بھوبھوتی نے اس تمثیل میں مزاح کا عنصر لانے کے لیے شمشان کا سیاق وسباق اس میں جوڑ دیا ہے اور اگھور گھنٹ جو ایک کاپالک یعنی انسانی کھوپڑیوں کے ذریعے تسخیر وسدھی کے عوامل میں مشغول رہتا ہے۔ مالتی کو ’’بلی‘‘ کے لیے اُٹھالے جاتا ہے اور کرالا دیوی کے آگے بھینٹ چڑھانا چاہتا ہے لیکن مالتی کا پریمی مادھو عین موقع پر پہنچ کر اُسے اگھور گھنٹ سے نجات دلاتا ہے لیکن اس منظر سے مزاح کی بجائے کراہت اور ہراس کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں تو چوری کے بیاہ کا منظر زیادہ مزاح انگیز ہے جس میں دھوکے سے مدینتکا کے عاشق مکرند کو جھوٹ موٹ کی دلہن بنا کر نندن کا بیاہ مالتی کی بجائے مکرند سے کرا دیا جاتا ہے۔

روایتی طربیہ ڈراموں کی طرح اس تمثیل میں بھی کہانی کا اختتام ہیرو ہیروئن کے ملاپ اور ازدواجی بندھن کی تکمیل میں ہوتا ہے۔ سائڈ ہیرو اور سائڈ ہیروئن کی بھی شادی ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ ملاپ گوناگوں مشکلات اور کرب انگیز مہ وسال کی آزمائشوں اور رکاوٹوں کے بعد ہوتے ہیں۔ روایتی طربیہ ڈراموں کا سنسکرت ادب میں یہی سٹائل رہا ہے۔ دس ایکٹوں کے اس ڈرامے میں کہانی کو بلا وجہ طول دے کر پیچیدہ بنایا گیا ہے۔ شمشان کے مناظر اور شری پربت میں ہیرو ہیروئن کے جا چھپنے کے غیر ضروری واقعات کو پلاٹ میں شامل کر کے ناٹک کو قدرے طویل اور دلچسپ تر بنانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن ان واقعات میں تفاصیل کچھ ٹھونسی ہوئی سی لگتی ہیں۔ کردار نگاری بھی بہت عمدہ نہیں کہی جا سکتی۔

اس ڈرامے کے پلاٹ میں بھوبھوتی نے اپنے پیش رو ڈرامہ نگار بھاس سے کچھ حد تک استفادہ کیا ہے۔ فطرت کی منظر کشی بھی بھاس کے اسلوب میں کی گئی ہے۔ پلاٹ میں دوہراؤ اور اعادہ بھی پڑھنے والے کو بار گزرتا ہے۔ قیاس ہے کہ اسی لیے منوّر نے اس ناٹک کو زیادہ

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سنجیدگی سے نہیں لیا اور اس پر نظرِ ثانی اور اس کی اشاعت کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دی۔ حالانکہ اُن کے یہاں اُس تربیت، ریاض اور سلیقے کی کمی نہیں تھی جو کلاسیکی ادب کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کے لیے درکار ہوتا ہے۔

جنوبی ہند کے تمثیل نگار دِنگ ناگ کا عظیم الشان ناٹک کُند مالا چھ ایکٹوں کا ایک سنسکرت شاہکار ہے جسے منوّر لکھنوی نے اگست ۱۹۶۵ء کو یعنی اپنی وفات سے لگ بھگ پانچ برس قبل مکمّل کیا۔ یہ اُردو میں صاف ٹائپ شدہ مسوّدہ کی صورت میں منوّر لکھنوی کے کاغذات میں ملا ہے اور فُل سکیپ کے ۹۵ صفحات پر محیط ہے۔ اس ترجمے کے پیش لفظ محرّرہ ۵ اگست ۱۹۶۵ء میں منوّر رقم طراز ہیں:۔

"اردو ہمارے ہی ملک کی زبان ہے۔ اس میں ہندو شاعروں، ادیبوں اور مصنّفوں نے بھی بہترین ادب کی تخلیق کی ہے اور خوش قسمتی سے مَیں بھی اسی کاروانِ ادب کا ایک ناچیز فرد ہوں۔

مگر خدمتِ ادب کے لیے میری تشنگی ابھی تک مکمّل طور پر رفع نہیں ہو سکی۔ اگرچہ مَیں اب عمر کے آخری حصّے میں قدم رکھ چکا ہوں۔ معلوم نہیں قدرت کو مجھ سے ابھی اور کیا کیا کام لینا ہے۔ پتہ نہیں کس وقت ملک الموت کا پیغام آجائے اور مَیں اپنے باقی ارمانوں کی دنیا سینے میں دفن کیے ہوئے چل دوں۔ اگر آواگون کا مسئلہ صحیح ہے (اور مجھے اس کی صداقت میں مکمل یقین ہے) تو شاید مجھے اپنے ناآسودہ ارمانوں کی تکمیل کے لیے دوبارہ جنم لینا پڑے گا۔"[1]

زیرِ نگاہ تمثیل کے اصل مصنّف دِنگ ناگ نے غالباً بارھویں صدی میں اس ناٹک کی تخلیق کی تھی۔ وہ جنوبی ہند کے خطّۂ ارارال کے باشندے تھے۔ محققین ابھی تک اُن کے عہد کا تعین نہیں کر پائے۔ مگر بیشتر محققوں کی رائے یہی ہے کہ وہ کالی داس کے ہم عصر تھے کیونکہ

---

[1] کُند مالا یا سیتا بن باس (غیر مطبوعہ ٹائپ شدہ مسوّدہ منوّر لکھنوی) صفحہ ۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کالی داس کے کھنڈ کاویہ میگھ دوت " میں دِنگ ناگ جی کا ذکر ملتا ہے۔ لہٰذا اغلب ہے کہ کُندمالا" کا زمانۂ تصنیف ساتویں اور گیارھویں صدی کے درمیان رہا ہوگا۔ اسی زمانے میں سنسکرت کے ایک اور مشہور تمثیل نگار نے بھی اِسی موضوع "سیتا بن باس" پر اپنا ڈرامہ "اُتّر رام چرت" تصنیف کیا تھا۔

منوّر لکھنوی نے اِس تمثیل کے ترجمے کے لیے پروفیسر کیلاش ناتھ بھٹناگر کے ہندی ترجمے سے استفادہ کیا ہے۔ بھٹناگر صاحب موصوف نے ۱۹۵۵ء میں یونیورسٹی کے لیے اس سنسکرت ڈرامے کا ترجمہ شرح وبسط کے ساتھ کیا تھا۔

سنسکرت ڈراموں کی مروجہ روایت کے مطابق اس تمثیل کا آغاز بھی منگلاچرن یعنی کلمۂ برکت سے ہوتا ہے۔ پہلے منظر میں لکشمن جی سیتا کو رتھ میں بٹھا کر گنگا ندی کے قریب ایک جنگل میں چھوڑ آتے ہیں۔ کیونکہ بھگوان رام نے اپنی جان سے پیاری رفیقۂ حیات سیتا کو لوک مریادا کی خاطر تیاگ دیا ہے۔ رام چندر جی کے ایودھیا کی حکومت سنبھالنے کے کچھ عرصہ بعد چونکہ ان کی راجدھانی ایودھیا کے ایک دھوبی نے اپنی بیوی سے گھریلو جھگڑے کے نتیجے میں یہ کہہ کر اپنی بیوی کو گھر سے نکال دیا تھا کہ مَیں رام نہیں ہوں جس نے گھر سے باہر راون کی قید میں سال بھر رہی ہوئی سیتا کو پھر سے اپنی گرہستی میں قبول کر لیا۔ محض ایک شہری کے اس طعنے سے متاثر ہو کر رائے عامہ کا احترام کرتے ہوئے انھوں نے اپنی بیوی سے مستقل جُدائی کا فیصلہ کر لیا۔ لکشمن جی بڑے بھائی کی حکم عدولی نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں اپنے دل پر پتھر رکھ کر اس حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ سیتا جی گربھ وتی (حاملہ) تھیں۔ ایسی حالت میں انھیں جنگل میں تنہا چھوڑ کر آنے کے حکم کی تعمیل میں ان کا دل رو رہا تھا۔ گنگا کنارے اپنی بھاوج کو چھوڑ کر جاتے ہوئے وہ وفورِ جذبات اور احساسِ ندامت سے مغلوب تھے۔ وہ فطرت کی قوتوں، دیوی دیوتاؤں، بن دیویوں سے گنگا ندی سے اور لوک پالوں سے دست بستہ گزارش کرتے ہیں کہ وہ ہر آڑے وقت میں ان کی مصیبت زدہ بھاوج کی حفاظت کریں اسی ضمن میں منوّر کے ترجمے کا ایک منظوم حصّہ دیکھیے:۔

ممتاز ندیو، اے لوک پالو   اے ننگ والو، اے نام والو!
اے پاک گنگا، مسجود دیوی   مسجود دیوی، معبود دیوی
اے پربتوں کے سرتاج بھائی   تم میں ہے اوجِ بامِ رسائی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہیں جانکی جی اِک راج کنیا — رکھنا ہمیشہ تم دھیان ان کا
ہر وقت کرنا ان کی حفاظت — ہر طرح ان کو حاصل ہو راحت
مجھ لکشمن کی ہے یہ گزارش — تم سب کو لازم ہے یہ نوازش [1]

والمیک آشرم سے کچھ دُور اشومیدھ یگیہ شروع ہونے والا ہے۔ والمیک رشی کی پیشوائی کے لیے رام چندر جی اپنے بھائی لکشمن کے ہمراہ گومتی ندی کے کنارے کنارے چل رہے ہیں۔ (سیتا جی کو رشی والمیک نے اپنے آشرم میں پناہ دی ہوئی ہے) رام چندر اندر سے بہت دُکھی ہیں۔ من سے نہ چاہتے ہوئے بھی انھیں سیتا کی مستقل جُدائی گوارا کرانا پڑی۔ سیتا کے ساتھ کی گئی بے رحمی اور بے انصافی پر اُن کا دل ندامت اور پشیمانی کے احساس سے نڈھال ہے۔ سرد آہیں بھر رہے ہیں اور دل میں سوچ رہے ہیں۔

پُل سمندر پہ لاکھ باندھ لیا — خاک اس کا نہ احترام کیا
اور اگنی نے جو گواہی دی — آزمائش کے وقت سیتا کی
آہ میں نے اُسے نہیں مانا — پاک دامن اسے نہیں جانا
نہ کیا اکشو اِک بنس کا دھیان — اپنے ہاتھوں مٹائی اس کی آن
پھر بھی غفلت سے میں نہ باز آیا — جانکی جی پہ یہ ستم ڈھایا [2]

مناظرِ قدرت کا مشاہدہ کرتے ہوئے دونوں بھائی دریا کی جانب اُتر جاتے ہیں۔ دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پانی کی سطح پر تیرتی ہوئی ایک گُندمالا آم کو نظر آتی ہے۔ وہ ٹھٹک جاتے ہیں۔ انھیں فوراً یاد آجاتا ہے کہ ایسی گُندمالا جانکی سیتا جی کے علاوہ کوئی دوسرا گوندھ ہی نہیں سکتا۔ اِس موقعے کے کچھ مکالمے ملاحظہ ہوں:

لکشمن: معلوم ہوتا ہے یہاں سے قریب ہی کوئی آبادی ہے۔ ریتیلے کناروں میں چلنے والوں کے پاؤں کے نشان دکھائی دے رہے ہیں۔ ندی کے کنارے جو بیلیں پھیلی ہوئی ہیں ان میں صرف ڈنڈیاں رہ گئی ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان بیلوں کے پھول چُنے جا چکے ہیں اور درختوں سے جو پتے توڑ لیے گئے ہیں اُن سے اِن کی چھاؤں چھدسی گئی ہے۔

---

[1] [2] گُندمالا عرف سیتا بن باس (منوّر لکھنوی)، ٹائپ شدہ غیر مطبوعہ مسوّدہ۔ صفحات بالترتیب ۱۶-۱۷ — ۲۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

دیو پوجا میں چڑھائے ہوئے پھولوں سے تمام
ہیں ہم آغوش کنارے جو یہ ریتیلے ہیں
کُند مالا بھی ہے ناگن کی طرح مائلِ رقص
ایسی لہروں میں جو دریا میں سماں باندھے ہیں

رام چندر جی : انسانوں کی بستی صرف قریب ہی نہیں ہے بلکہ دریا سے اوپر کی طرف ہے۔
(پھر آگے دیکھ کر) میرے پیارے لکشمن! اس مالا کے گوندھنے میں جیسا کمال نظر آرہا ہے
مَیں وہ اس سے پیشتر بھی کبھی دیکھ چکا ہوں۔

لکشمن : کیا دیکھ چکے ہیں بھائی صاحب؟

رام : ایسا کمال اور کس میں پایا جا سکتا ہے؟

لکشمن : کیا آپ کی مُراد بھابی جی سے ہے؟

رام : اور نہیں تو کیا۔ ہ[1]

اسی واقعے سے دِنگ ناگ نے اپنے ناٹک کا نام "کُند مالا" اخذ کیا ہے۔ لیکن اس ایکٹ میں مصنف نے کچھ واقعات اپنے تخیّل سے بھی جوڑ دیے ہیں جو سراسر فرضی معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً بھگوان رام چندر کے باؤلی میں اشنان کرنے اور وہاں سیتا جی اور رام کے باہم ملن کا واقعہ۔ والمیکی رامائن اور تلسی کرت رام چرت مانس میں دیے گئے واقعات کے ساتھ زیرِ بحث ناٹک کے پلاٹ کا تقابلی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دِنگ ناگ نے اپنی تصنیف کی ڈرامائی نوعیت کے پیشِ نظر ناٹک کے ناظرین کے تفنّنِ طبع کے لیے اور محض زیبِ داستان کے لیے چند فرضی واقعات کا اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے۔ اصلی تاریخی حقائق سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ کوشک نامی وِدُوشک (درباری مسخرے) کا رول بھی کچھ اسی نوعیت کا اضافی رول ہے جو سنسکرت ڈرامے کی روایت کی تقلید میں ڈرامے کے شائقین کی ضیافتِ طبع کے لیے ناٹک میں جوڑ دیا جاتا ہے۔ بہرحال مترجم کو تو اصل مصنف کے متن ہی کی ترجمانی کرنی ہوتی ہے۔ لہٰذا منوّر نے دِنگ ناگ ہی کے بیان کو بلا کم و کاست اپنے ترجمہ کا حصّہ بنا لیا ہے۔

والمیکی رامائن میں اس داستان کا اختتام دُھرتی کے پھٹ جانے اور جانکی جی کے اُس میں سما جانے کے اَلمیے پر ہوتا ہے لیکن کُند مالا میں دِنگ ناگ نے اسے طربیہ کے رُوپ میں

---

[1] مسوّدہ کُند مالا (مترجم منوّر لکھنوی) صفحہ ۳۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

پیش کیا ہے اور ناٹک کا اختتام رام اور سیتا کے مستقل ملاپ اور مابعد اُن کے بڑے بیٹے کو ولی عہد سلطنت بنانے کی رسم پر ہوتا ہے۔ اس ڈرامے میں اشومیدھ یگیہ کا گھوڑا چھوڑے جانے اور رام چندر جی کے بیٹوں لَو اور کُش کے ذریعے اس گھوڑے پر قابض ہو کر ایودھیا کی افواج کے ساتھ نبرد آزما ہونے کا ذکر کہیں نہیں آتا، جو سب سے قدیم رامائن۔ رامائن والمیکی میں آتا ہے۔ حالاں کہ والمیک رشی کی تخلیق کردہ رامائن ہی دراصل بعد کی بھی رامائنوں کا ماخذ تسلیم کی جاتی ہے۔ تاہم منوّر نے اصل مصنف کی شعری صلاحیتوں کو سلامت رکھ کر ناٹک کے متن کو پوری دیانت داری اور وفاداری کے ساتھ اُردو کا پیکر عطا کیا ہے۔

خون کے رشتے خود بخود بول اُٹھتے ہیں۔ اگرچہ رام چندر جی پر اُس وقت تک اس راز کا انکشاف نہیں ہوا ہوتا ہے کہ کم سن رشی کمار لَو اور کُش دراصل اُن کے اپنے بیٹے ہی ہیں۔ پھر بھی اُنس و تعلق کا ایک انوکھا سا جذبہ ان بچوں کو دیکھ کر رام جی کے دل میں بے اختیار ابھرتا ہے۔ اس نفسیاتی نکتے کو ونگ ناگ کے متن سے منوّر نے اُردو میں کیسے منتقل کیا ہے، یہ قابلِ توجہ ہے۔

رام: اور مجھے ان دونوں تپسوی کماروں کو دیکھ کر ناقابلِ برداشت تکلیف ہو رہی ہے۔

کہیں پردیس میں بیٹے کا جب آتا ہے خیال ۔۔۔ سوچتا ہے یہ بشر کیسے وہ پڑھتا ہوگا
کن مدارج سے گزرتے ہوئے رفتہ رفتہ ۔۔۔ کیسے پروان رہِ عمر میں چڑھتا ہوگا
ایسے ہی غیر کے بیٹے کی طرف کر کے نگاہ ۔۔۔ دیکھ کر اُس کے سن و سال کو آگے بڑھتے
یک بیک باپ کا جذبۂ امڈ آتا ہوگا ۔۔۔ از رہِ دردِ دروں دل کے پسیج اُٹھنے سے [1]

"کُندمالا" کے زیرِ بحث ترجمے میں ونگ ناگ کی رُوح کو اُردو نظم و نثر میں اُتارنے کی مساعی میں رامائن کے ہیرو رام چندر جی کے تئیں اور اُن کی رفیقۂ حیات جانکی جی کی جانب منوّر لکھنوی کی مذہبی عقیدت و ارادت اور خشوع و خضوع بھی شامل کار رہا ہے جس نے اس ترجمے کو ایک کامیاب اور دل چسپ اُدبی اور رُوحانی کارنامے کا پیکر عطا کیا ہے۔ یہ ترجمہ ۹۴ صفحات پر مشتمل اُردو میں ٹائپ شدہ مکمل مسودے کی صورت میں منوّر صاحب کے متبنّٰے جناب کلدیپ سکسینہ کے پاس محفوظ ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ نسخہ اور منوّر کے چھوڑے ہوئے دوسرے غیر مطبوعہ اُدب پارے زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر قارئین کو مستفید کر سکتے۔

---

[1] مسودہ کُندمالا (منوّر لکھنوی)، صفحہ ۶۸

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

چارودت

دکھنی بھارت کے سنسکرت شاعر بھاسؔ کے چار ایکٹوں پر مشتمل ڈرامہ چارودت کا ترجمہ بھی منوّر لکھنوی کے غیر مطبوعہ مسوّدات میں دستیاب ہوا ہے۔ یہ ۔ ۲ صفحات پر مشتمل ہے، اور اس ترجمے کو منوّر نے ستمبر ۱۹۵۲ء میں شروع کر کے نومبر ۱۹۵۳ء میں مکمّل کیا۔ اس کا دیباچہ اوّل منوّر صاحب نے ۸ دسمبر ۱۹۵۴ء کو قلم بند کیا اور دیباچہ ثانی ۲۲ جنوری ۱۹۶۴ء کو۔

اگرچہ اس ناٹک کا مصنّف جنوبی ہند کے سنسکرت شاعر بھاسؔ کو تسلیم کیا جاتا ہے، تاہم اس کے اصل خالق کی شناخت کا سوال مدّتوں بحث کا موضوع رہا ہے۔ بعض عالموں کی رائے میں چارودت دراصل بھاس کے متقدّمین میں سے کسی نے لکھا اور بھاس کا "چارودت" دراصل ایک اور رُدپک (FEATURE) دردِ چارودت" کا خلاصہ ہے۔ بعض محققین بھاس کے اس ناٹک کو ایک اور ناٹک "مرچھ کٹکم" (مٹّی کی گاڑی) کا ایک حصّہ مانتے ہیں۔

منوّر نے زیرِ جائزہ ترجمہ اصل سنسکرت ناٹک سے براہِ راست نہیں کیا۔ ان کے ترجمے کا دار و مدار گنپتی شرما کے انگریزی ایڈیشن پر ہے۔ انھوں نے فرگوسن کالج کے پروفیسر دیوادھار کے ترجمے سے بھی استفادہ کیا۔ اپنے پہلے کے تراجم کے برعکس منوّر نے اس ترجمے میں اختصار اور جامعیت کی خاطر منظوم اشلوکوں کے ترجمے مقفّیٰ نظم میں کرنے کی بجائے نظم معرّیٰ سے زیادہ کام لیا ہے۔ ہندی کے مشہور فلاسفر ادیب جینیدر کے ساتھ ہوئی ایک طویل بحث کے دوران موصوف کے نظریے سے متاثر ہو کر منوّر نے اِس ترجمے میں آزاد نظم کا اسلوب اپنانے کا فیصلہ کیا۔

کہانی اِس طرح ہے کہ "چارودت" اُجّین کے ایک متموّل بیوپاری کا بیٹا ہے وہ اپنی نیک چلنی، شریف النفسی، نجابت، بلند کردار اور فیّاضی کے لیے مشہور ہے لیکن گردشِ ایّام کا شکار ہو کر فی الوقت مفلس اور قلّاش ہو چکا ہے۔ اس فلاکت کا سبب کافی حد تک اُس کی سخاوت اور فیّاضی ہے۔ رقّاصہ وسنت سینا، نوجوان چارودت کے حُسن و جمال اور نیک شہرت پر فدا ہو کر اُسے دل دے بیٹھتی ہے۔ حاکمِ وقت کا بہنوئی شکار اوباش قسم کا آدمی ہے۔ شکار اور اُس کا مصاحب وِٹ دونوں وسنت سینا کا تعاقب کرتے ہیں اور اُسے اپنے دامِ ہوس میں پھنسانے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کی کوشش کرتے ہیں۔ وسنت سینا بھاگتے بھاگتے چارودت کے مکان میں گھُس کر اُس کے ہاں پناہ لیتی ہے۔ وہاں چارودت کا جلیس وِدُوشک میترے بھی موجود ہے (ودوشک یا مسخرے کا کردار ہر سنسکرت ناٹک میں مزاح پیدا کرنے کے لیے دانستہ جوڑا جاتا رہا ہے) راجہ کا عیاش بہنوئی شکار، وِدوشک میترے کی زبانی چارودوت کو تہدیدی چیتاونی دیتا ہے کہ جس رقاصہ وسنت سینا کو اُس نے اپنے گھر میں پناہ دی ہے اُسے وہ شکار کے پاس پہنچا دے ورنہ اُسے اس گستاخی کے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ شکار کی حریص نگاہیں وسنت سینا کے زیورات پر بھی ہیں جنھیں وہ ہتھیانا چاہتا ہے۔ زیورات کی حفاظت کے خیال سے وسنت سینا اپنے قیمتی زیورات چارودت کے پاس بطور امانت چھوڑ جاتی ہے۔ چارودت کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے وِدُوشک میترے رقاصہ کو اُس کے گھر چھوڑ آتا ہے۔

چور چارودت کے گھر میں نقب لگا کر وسنت سینا کے زیورات چُرا لے جاتے ہیں۔ چارودت کو یہ خدشہ بُری طرح کچوٹتا ہے کہ دُنیا یہی سمجھے گی کہ چارودت اپنی مفلسی کے باعث رقاصہ کا زیور ہڑپ کر گیا ہے۔ اس نقصان کو پورا کرنے کے لیے چارودت کی بیاہتا بیوی اپنا ایک لاکھ روپے کا انمول موتیوں کا ہار رقاصہ وسنت سینا کو بھجواتی ہے۔

اُدھر چارودت کے گھر سے زیور چُرانے والا سجلک رقاصہ وسنت سینا کی ملازمہ مدنکا کے عشق میں گرفتار ہے۔ وہ دراصل چارودت کے گھر میں چوری اس مقصد سے کرتا ہے کہ مذکورہ زیورات مدنکا کی مالکہ رقاصہ کو دے کر محبوبہ مدنکا کو اس کی بندھوا مزدوری سے چھُڑا لے اور اُس سے شادی کر لے۔ رقاصہ اپنے زیورات کو پہچان لیتی ہے۔ پھر بھی وہ دو پریمیوں کے راہ کی دیوار نہیں بنتی اور مدنکا کو جو اُس کی چہیتی نوکرانی ہے، اپنی ملازمت سے آزاد کر دیتی ہے اور اُس کی شادی سجلک کے ساتھ بخوشی منظور کر لیتی ہے۔ اُسے چارودت کی بے گناہی کا بھی ثبوت مل جاتا ہے۔ اس لیے مسروقہ زیورات دوبارہ چارودت کے پاس واپس پہنچا دیے جاتے ہیں۔

بھاس کا ناٹک یہیں ختم ہو جاتا ہے لیکن "مرچھ کٹکم" کے مصنف نے اس چار ایکٹ کے ڈرامہ میں چھ ایکٹ اور جوڑ دیے ہیں۔ منوّر کا ترجمہ بھاس کے چار ایکٹوں والے ڈرامے تک ہی محدود ہے اور انھوں نے اپنے مسودے کا نام چارودت عرف "مفلس کا عشق" رکھا ہے۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اس ترجمے میں آزاد نظم کا سہارا لینے کی وجہ سے منوّر کو اپنے ترجمے میں شعری اور فنّی محاسن کے التزام کے لیے غیر ضروری الفاظ و محاورات کے اضافے نہیں کرنے پڑے اور کم سے کم الفاظ میں پورے مفہوم کو ڈھال کر اظہار کی راہِ اختصار دریافت کر لی ہے۔ مثال کے طور پر وِدوشک میترے اپنے مفلس دوست چارودت کی مفلوک الحالی پر اظہارِ تاسّف کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

وِدوشک : "میرے دوست! وہ سب دولت کہاں چلی گئی۔ انبار کے انبار کدھر غائب ہو گئے۔ کہاں کہاں سے لا کر لکشمی اکٹھا کی تھی۔ شہروں شہروں کا مال و متاع جمع تھا۔ نجانے کس کس سمندر کے رتن نکال کر لائے گئے تھے۔

چارودت : میرے دوست! وہ دولت بھی اُسی سمندر میں غرق ہو گئی جس میں میری قسمت ہو گئی ہے۔

لٹا ہے کام آنے کے لیے اپنوں کے گھر میرا
ہوا ہے دوستوں پر صرف میرا مال و زر میرا

کبھی جنبش لبِ انکار کو دی ہی نہیں میں نے
کبھی ردّ آشنائے التجا کی ہی نہیں میں نے

مرا وہ حوصلہ باقی، مری ہمت وہ اب بھی ہے
ہمیشہ اعتمادِ دوست کی قیمت ادا کی ہے

وِدوشک : کیا تم دولت اور اقبال مندی کے چلے جانے کا افسوس کرتے ہو؟

چارودت : نہیں۔

کبھی امکان ہے پھر اُس کے پلٹ آنے کا
غم نہیں کچھ مجھے دولت کے چلے جانے کا

راس آجائے گی جب پھر کبھی قسمت میری
پاس آجائے گی پھر لوٹ کے دولت میری

غم ہے اس کا کہ ہے شل دستِ رفاقت میرا
بڑھ گیا سر و بہت جوشِ سخاوت میرا [۵۷]

یہ تو کچھ مکالمے قافیہ بند نظم کے تھے۔ اب غیر مقفّیٰ آزاد شاعری کے قالب میں چند مکالمے دیکھیے۔ رقاصہ وسنت سینا کو اپنے گھر سے رخصت کرتے ہوئے چارودت چراغ لانے کے لیے وِدوشک سے کہتا ہے :

وِدوشک : چراغ میں تیل تو ہے ہی نہیں بالکل اُسی طرح جیسے کسی گنِکا (رقاصہ) کے دل میں محبت کا جذبہ نہیں ہوتا جس دل میں پریم کا نام تک نہیں پایا جاتا۔

چارودت : اچھا اچھا۔ چراغ کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھو پرماتما نے چاند کی شکل

---

۵۷ چارودت (قلمی نسخہ) منوّر لکھنوی۔ صفحہ ۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

میں اپنا دیپک جلا رکھا ہے۔

چاند جو دوست ہے حسینوں کا
آج بھیگی کھجور کی مانند
زرد ہے کس قدر فسردہ ہے

تیرگی کی سیاہ چادر سے
چھن کے آتی ہیں اس کی جو کرنیں
رنگ ان کا سفید ہے ایسا
جیسے وہ دودھ خشک جو ہو جائے
ریت کے ڈھیر پر لڑھکنے سے [1]

سجلک چوری کر کے مسروقہ زیورات رقاصہ کو دیتا ہے تاکہ ان کے عوض اپنی محبوبہ مدنکا کا ہاتھ مانگ لے۔ مالکن رقاصہ وسنت سینا اور اُس کی ملازمہ مدنکا شک کرتے ہیں کہ وہ کسی بھلے مانس کے ساتھ دھوکا کر کے یہ قیمتی زیورات لے آیا ہے یا کسی کو قتل کر کے۔ وہ اسے سچ بولنے پر مجبور کرتی ہیں۔ جب انھیں پتہ چلتا ہے کہ وہ زیورات سوداگر زادے چارودت کے مکان سے چرائے گئے ہیں تو دونوں بوکھلا جاتی ہیں۔ دونوں خواتین کو سہما اور گھبرایا ہوا دیکھ کر سجلک کہتا ہے :— یہ مکالمہ بھی آزاد نظم میں ہے اور مدنکا سے تخاطب کیا گیا ہے۔

سجلک : تمام جسم مرقع ہے اِک مصیبت کا
ہے خلفشار سا اِک خلفشار آنکھوں میں
شبیہہ ایک ہو تم اُس غریب ہرنی کی
تمام جسم ہو جس کا فگار تیروں سے
نظر نظر سے مگر ہو جو رحم کی طالب

ملازمہ : مجھ سے سچ سچ سارا حال بتا دو۔ سوداگر کے گھر میں گھس کر تم نے جو حرکت کی ہے اُس سے کسی کی جان تو نہیں چلی گئی۔ کسی نوجوان کا خون تو نہیں ہو گیا۔؟ [2]

کالی داس کے عہدِ حیات یعنی پہلی صدی عیسوی تک بھاس بطور ڈرامہ نگار کافی مشہور

---

[1] [2] چارودت (قلمی مسودہ منور لکھنوی)، صفحات بالترتیب ۲۸ - ۲۹ اور ۶۰ - ۶۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہو چکے تھے۔ کالی داس نے اپنی پہلی تمثیل "مالویکا گن متر" میں بھاس کا ذکر کیا ہے۔ بھاس کے ناٹک دکھنی ہندوستان میں سٹیجوں پر کھیلے جانے کے باعث مقبولِ عوام ہو چکے تھے۔ لیکن ان میں کالی داس جیسی شعریت، فنی نزاکتیں اور عصری تقاضے ناپید ہیں۔ اگرچہ ان کا ناٹک "چارودت" بہت بار آکاش وانی سے نشر کیا گیا ہے اور "دُوردرشن" پر بھی اس کی نمائش اس کے اضافہ شدہ رُوپ میں کی جا چکی ہے۔

منوّر لکھنوی کا یہ ترجمہ بھی اُن کی مہارت اور مشّاقی کا مظہر ہے لیکن اس ترجمے کی اشاعت کی حسرتِ ناکام دل میں لیے ہوئے وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ "چارودت" کے دیباچہ ثانی میں انھوں نے ۲۲ جنوری ۱۹۶۴ء کو لکھا:۔

"بہر حال بھاس کے اس ناٹک کا اُردو ترجمہ پیش کر کے مَیں نے اپنی ایک دیرینہ خواہش پوری کی ہے...... یہ سب خامہ فرسائی کس لیے ہے جس کی تحریک سے میں شوقِ ترجمانی میں کاغذ کے کاغذ سیاہ کرتا چلا جاتا ہوں۔ بہر حال اس کے پسِ پشت کوئی ارادۂ کار ضرور ہوگا۔ کیونکہ بقول جگر مراد آبادی۔

قدم یہ اُٹھتے نہیں ہیں اُٹھائے جاتے ہیں۔" [۵]

۵؎ مسودہ چارودت (منوّر لکھنوی) صفحہ ۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

باب پنجم (ج)

بنگلہ ادب کے تراجم

(۱) گیتانجلی یا نذرانۂ رُوح
(رابندرناتھ ٹیگور)

(۲) ساگر سنگیت یا بحرِ ترنم
(دیش بندھو سی آر داس)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بنگلہ ادب کے تراجم

رابندر ناتھ ٹیگور کی لازوال تصنیف "گیتانجلی" کا منظوم ترجمہ منوّر لکھنوی نے صرف تیرہ ماہ کے قلیل عرصہ میں مکمّل کیا۔ اِس ترجمے کے قلمی مسوّدہ میں درج تفاصیل کے مطابق موصوف نے یہ ترجمہ ۲۲ ستمبر ۱۹۵۵ء کو شروع کیا اور اس کی تاریخ تکمیل ۳۱ اکتوبر ۱۹۵۶ء تھی۔ یہ قلمی مسوّدہ ۲۰۳ صفحات پر مشتمل ہے اور یہ منوّر کے ذاتی اشاعتی ادارہ آدرش کتاب گھر فیض گنج، دریا گنج دہلی کے اشاعتی پروگرام میں شامل تھا لیکن یہ زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہوسکا اس ترجمے کے دیباچہ میں منوّر لکھتے ہیں کہ ٹیگور کی تصنیف باغبان (THE GARDENER) کے کچھ گیتوں کے منظوم تراجم انھوں نے ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء میں کیے تھے جو کہ ماہ ہے رسالہ "زمانہ" کانپور میں شائع ہوتے رہے اور بعد میں منوّر کے مجموعۂ نظمیات "کائناتِ دل" کا حصّہ بنے۔ لکھتے ہیں:-

"لیکن طبیعت اس سے سیر نہ تھی اور آخر ٹیگور کی گیتانجلی بھی میرے شوقِ ترجمانی کے احاطے میں آگئی جس کی تحریک خاص طور پر میرے عزیز دوست باوا کرشن گوپال مغموم نے ۱۹۵۵ء میں اپنے سفرِ دہلی کے دوران کی تھی......

سنسکرت اور انگریزی کے متعدد شاہکاروں کا ترجمہ کامیابی کے ساتھ کرچکا ہوں۔ لیکن ان تراجم میں مجھے اتنی دشواری نہیں پیش آئی جتنی ٹیگور کی گیتانجلی کے ترجمے میں پیش آئی ــــ وجہ ظاہر ہے۔ اگرچہ بنگالی زبان سنسکرت ہی کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے لیکن اس کا مزاج الگ ہے۔ اسی لیے بنگالی زبان کے شعری ادب میں ایک قسم کی معنوی لطافت اور نزاکت پائی جاتی ہے جس کی عکّاسی کرنا جوئے شیر لانے کے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

برابر ہے...... ؎[1]"

ترجمے کے اختتامی نوٹ محررہ ۱۹، ستمبر ۱۹۵۶ء میں منوّر نے فرمایا ہے کہ انہوں نے "گیتانجلی" کا منظوم اُردو ترجمہ براہِ راست اُس انگریزی ترجمے سے کیا ہے۔ جو خود ٹیگور نے انگریزی زبان میں کیا تھا۔ اردو میں "گیتانجلی" کا سب سے پہلا نثری ترجمہ کرنے کا شرف مولینا نیاز فتحپوری کے حصے میں آیا۔ چنانچہ انھوں نے گیتانجلی کے سب سے پہلے اردو مترجم کی حیثیت سے مولینا نیاز فتحپوری کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے زیرِ نظر "نغموں کا نذرانہ" (گیتانجلی) کا انتساب انہی کے نام کیا ہے۔ نیاز فتحپوری صاحب کے علاوہ "گیتانجلی" کے منظوم اور منثور تراجم متعدد دیگر ادیبوں نے بھی کیے ہیں جن میں فراق گورکھپوری، عبدالعزیز خالد، سیّد ظہیر عباس وغیرہ کے ترجمے عمدہ تراجم میں شمار کیے جاتے ہیں، لیکن منوّر لکھنوی کا ترجمہ اپنی کچھ منفرد خصوصیات رکھتا ہے۔ منوّر نے اس ترجمے کا نام "نذرانۂ روح" رکھا۔ بعد میں اسے بدل کر "نغموں کا نذرانہ" کر دیا۔ جو مسوّدہ کے سرورق پر تحریر ہے۔

منوّر کے اس ترجمے کے حصص جناب گوپال متّل کے ماہنامہ جریدہ "تحریک" میں گاہے بگاہے شائع ہوتے رہے تھے۔ گیتانجلی میں شامل ٹیگور کی تخلیقات چوں کہ گیتوں کی شکل میں ہیں اس لیے منوّر نے عمداً یہ کوشش کی ہے کہ ان کے ترجموں میں حتی الامکان مترنم بحور استعمال کی جائیں تاکہ اصل گیتوں کی غنائیت اور نغمگی کا عنصر برقرار رہے۔ لیکن موسیقیت کے تحفّظ کی خاطر قوافی و مرادیف کی قید نے تراجم کو خاصا طویل بھی کر دیا ہے۔ ٹیگور کے اصل متن کے مفہوم کا مکمل طور پر اُردو کے منظوم ترجمے میں احاطہ کرنے کے لیے ایسا کرنا ناگزیر ہوگیا تھا۔ ان منظوم تراجم میں سے منتخب اشعار درج کیے جا رہے ہیں۔

پچاسویں گیت میں شاعر ایک بھکاری کی صورت سرِ راہ کھڑا ہے۔ اُس کا رازق شہنشاہ اپنے زرنگار رتھ میں سوار اُدھر سے گزرے گا۔ اس گیت کا ترجمہ یوں شروع ہوتا ہے۔

دُور کوسوں یہاں سے کوسوں دُور — رتھ ترا زر نگار، بقعۂ نور
جب ہوا مائلِ ضیا باری — جب سفر اس کا ہوگیا جاری
گاؤں کی راہ لے چکا تھا میں — در بدر بھیک مانگتا تھا میں

---

[1] نغموں کا نذرانہ یعنی گیتانجلی (مترجم: منوّر لکھنوی) قلمی مسوّدہ صفحہ ۷ دیباچہ بعنوان منظوم پیش گفتار (احوالِ واقعی)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh. Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اور بھی بڑھ رہی تھیں اُمیدیں — عرش پر چڑھ رہی اُمیدیں
خاتمہ اب بُرے دِنوں کا ہے — رُخِ تقدیر پھرنے والا ہے

شاعر کو دیکھ کر شہنشاہ نے اپنا زرنگار رتھ روک لیا۔ شاعر کو یوں محسوس ہوا کہ بس اب تقدیر جاگ اُٹھے گی اور وہ اس کی جھولی بھر دے گا۔ لیکن اس شہنشاہِ عالی نے رتھ روک کر کیا کرم کیا۔؟

دفعتاً دستِ راست پھیلا یا — اور یوں مجھ سے تو نے فرمایا
دیکھ لے اپنے روبرو مجھ کو — بول کیا دے رہا ہے تو مُجھ کو
اُف رے تیرا مذاقِ شاہانہ — حاجتِ دو جہاں سے بیگانہ
اِک بھکاری کے روپ میں آ کر — اور دستِ سوال پھیلا کر
اِک بھکاری سے مانگتا ہے بھیک — اِک تمسخر ہے یہ مرے نزدیک
اُڑ گئے ہوش دیکھ کر یہ سماں — آئینہ بن گیا دلِ حیراں
میرے جھولے میں تھا اناج جو کچھ — بھیک پائی تھی مَیں نے آج جو کچھ
دے دیا پھر وہ دان میں تجھ کو — نظر آئی رہِ اماں مجھ کو

لیکن اُس کے بعد کیا معجزہ ہوتا ہے۔ ٹیگور کا بیان منوّر کی زبان میں سماعت فرمائیے:

جب ہوئی دن کی روشنی رُخصت — مجھ کو یہ دیکھ کر ہوئی حیرت
مَیں نے جھولے کو جب کیا خالی — فرش پر دن کی بھیک جب ڈالی
اس میں سونے کی اِک ڈلی نکلی — بھیک کے ڈھیر میں جو پنہاں تھی
اب میں تھا جائے اُمن کا جویا — یک بیک پھوٹ پھوٹ کر رویا
یہی سوچا جو بھیک دی تھی تجھے — اپنی پونجی جو نذر کی تھی تجھے

حوصلہ مَیں نے یہ کیا ہوتا
تجھ پہ سب کچھ لُٹا دیا ہوتا ۱؎

ٹیگور کے حسین، نازک اور دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے جذبات کو منوّر نے کیسے نرم اور شیریں الفاظ میں ڈھال کر اردو نظم کا رُوپ دیا ہے۔ شری نواس لاہوٹی فرماتے ہیں:

۱؎ نغمۂ زنداں (ادبی گیتانجلی) مترجم منوّر لکھنوی کا قلمی مسوّدہ صفحہ ۸۰

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh. Funding by IKS-MoE 2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

"گیتانجلی کی ایک سو تین مسلسل چھوٹی چھوٹی نظموں کا جو موضوع ہے وہ ایک طرح سے زندگی کی تعلیم ہے۔ اس میں زندگی اور دنیا کو جھٹلانے کی بجائے اس کی بے پناہ قدر وقیمت کا اظہار کیا گیا ہے جو دنیا سے دل کو اُچاٹ اور بے زار کرنے کی بجائے اس میں نہایت سرگرم اور سدا بہار دلچسپی کو پیدا کرنے کی سعی ہے۔"[1]

لہٰذا وجدان اور ضمیر کی روشنی ٹیگورؔ کے گیتوں کے ہر بول میں کرن کرن نزول کرتی دِکھائی دیتی ہے۔ ان کے داخلی درد کی مصوّری کی حدیں مناظرِ قدرت کی رنگا رنگی کی اقلیم کی حدوں سے اس طرح گھُل مل گئی ہیں کہ یہ امتزاج وحلول عالمی ادب میں اور کہیں کم ہی دِکھائی دیتا ہے۔ اردو ترجمے میں منوّرؔ نے ٹیگور کی شاعری کی ان جزئیات کی ہُو بہو عکسی تصویر اُس کی تمام تر نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر اُتار دی ہے۔ گیتانجلی کے پہلے ہی گیت کے ترجمے کی کچھ سطور دیکھیے:-

جاوداں تو نے بنایا ہے مجھے ۔۔۔ ہے یہی تیری رضا تیری خوشی
ہے جو یہ برتن بہت کم زور سا ۔۔۔ اس کو تُو کرتا ہے پَے دَر پَے تہی
اور بھرتا ہے مسلسل تو مُدام ۔۔۔ اس میں اِک تازہ سے تازہ زندگی
جب ترے ہاتھوں کو چھو لیتا ہوں میں ۔۔۔ لمس میں جن کے ہے کیفِ سَرمَدی
پھُول اُٹھتا ہے مرا ننھا سا دل ۔۔۔ حد مسرت کی نہیں رہتی کوئی[2]

۷اویں گیت میں شاعر اپنی زندگی کو وقفِ محبّت کرنا چاہتا ہے۔ یہ محبّت کیا ہے، مجازی یا حقیقی؟ انسان کے لیے ٹیگور کی یہ محبت غیر شعوری طور پر اپنے معبود اور خالقِ کُل کی محبّت کا رُوپ لے لیتی ہے۔ اس کی نظر میں پریم ہی بھگوان ہے۔ ٹیگورؔ کے ان پاکیزہ جذبات کو منوّرؔ نے کس سلیقے اور حسیت کے ساتھ اُردو کا شعری جامہ پہنایا ہے۔

ضابطے قانون لے کر چلے آتے ہیں لوگ ۔۔۔ ان میں سختی سے مجھے پابند کرنے کے لیے
ٹال دیتا ہوں مگر میں ان کو۔ محوِ انتظار ۔۔۔ جادۂ تعلیم سے آخر گزرنے کے لیے
لاابالی کہہ کے مجھ کو اِک جہاں کرتا ہے یاد ۔۔۔ متّہم کرتے ہیں مجھ کو لوگ: کہتے ہیں بُرا
مَیں بھی کہتا ہوں یہی مَیں بھی سمجھتا ہوں یہی ۔۔۔ ہے درست الزام سب ان کا یہ تہمت ہے بجا

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

[1] ماہنامہ انشا کلکتہ۔ شمارہ مئی ۱۹۸۹ء صفحہ ۸۸

[2] نغموں کا نذرانہ (منور لکھنوی) صفحہ ۱۱

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

میں محبت کے لیے ہوں صرف محوِ انتظار

میرا سب کچھ ہو بالآخر تا کہ ہاتھوں میں ترے [۱]

ٹیگور کے مفہوم کو مکمل طور پر واضح کرنے کے لیے منوّر کو اپنے منظوم ترجمے میں کہیں کہیں طوالت سے کام لینا پڑا ہے کیوں کہ منوّر جیسا قادر الکلام شاعر اور مترجم اُدائے مفہوم کے لیے سلیقے اور شعری نفاست کو بالائے طاق رکھ کر محض سپاٹ ترجمہ قاری کے مقابل رکھنا گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ ٹیگور کا متوقع قاری بھی ذہین اور حساس ہی ہو سکتا تھا اور منوّر نے بھی قاری کے ذوقِ سلیم کو تسلیم کر کے ترجمے کے مراحل سے گزرنا ضروری سمجھا۔ اس لیے وہ "گیتانجلی" کے گیتوں کے خالق کی پُر رمز حقیقت پسندی اور زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی نقاب کُشائی کو بہتر سے بہتر اُردو الفاظ کا جامہ پہنا کر قاری کے روبرو رکھ پایا۔ ٹیگور کی نگاہ میں ایسی عبادت و ریاضت کا کیا مصرف ہے جو زندگی کی اصل حقیقتوں سے آنکھیں موند کر عابد کو گوشہ نشینی میں مصروفِ بندگی ہونے پر مائل کرے۔ ٹیگور کے اس اندازِ فکر کی تصویر گیارھویں گیت کے منوّر کے ترجمے میں دیکھیے :-

چھوڑ یہ لے بازیاں، اگا نا یہ چھوڑ ۔۔۔ چھوڑ ہاں مالا کا مٹکانا یہ چھوڑ

گوشۂ تاریک میں تنہا نشیں ۔۔۔ جس کے اندر اور کوئی بھی نہیں

ہر طرف سے بند دروازے کیے ۔۔۔ اپنی پاکیزہ عبادت گاہ کے

کس کی پوجا کر رہا ہے بول تو ۔۔۔ بند جو آنکھیں ہیں ان کو کھول تو

دیکھ کیا تجھ کو نظر آتا نہیں ۔۔۔ سامنے تیرے خدا بھی ہے کہیں

وہ تو ظاہر ہے، نمایاں ہے وہاں ۔۔۔ جوتتا ہے ہَل کو ہَل والا جہاں

اپنی محنت کا مشقت کا امیں ۔۔۔ گوڑتا ہے اپنی محنت کی زمیں

خستہ دل، خستہ طبیعت، خستہ جاں ۔۔۔ توڑتے ہیں مرد و زن پتھر جہاں

آ ذرا نیچے اُتر کر آ ذرا

خاک سے بھی آشنا ہو جا ذرا [۲]

سوامی ویویکانند بھی اپنے مُریدوں کو یہی تعلیم دیا کرتے تھے کہ بھگوان محنت کشوں میں بستا ہے اور غریبوں کی بستیوں میں۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh. Funding by IKS-MoE-2025-Grant

[۱] [۲] نغموں کا نذرانہ (ترجمہ گیتانجلی ۔ منوّر لکھنوی) صفحات ۳۲ ۔ ۱۹ تا ۲۱

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

غالب نے کہا تھا ؎

ہُوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا	نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

ٹیگور کے دل کو بھی یہ خلش کچوٹتی ہے کہ جس عظیم مقصد کی تکمیل کے لیے وہ اِس خاکدانِ حیات پر لایا گیا تھا، وہ مقصد ابھی معرضِ التوا میں پڑا ہوا ہے۔ ادھورے پن کا یہ احساس "گیتانجلی" کے تیرھویں گیت میں عکس ریز ہے، منوّر کے منظوم ترجمے کی گرفت میں کس انداز سے آیا ہے :۔

جس گیت کو مَیں گانے آیا	اُس کو نہ ابھی تک گا پایا
اب تک تو ساز ملانے میں	پَردوں کو ٹھیک بٹھانے میں
دِن اپنے بتائے ہیں مَیں نے	اوقات گنوائے ہیں مَیں نے
دُھن ٹھیک ابھی بیٹھی ہی نہیں	لفظوں سے ہم آہنگی ہی نہیں
دیکھا نہیں مَیں نے مُنہ اُس کا	اب تک نہ سُنی ہے اُس کی صَدا
چاپ اُس کے قدموں کی دھیمی	مَیں نے ہے بسا اوقات سُنی
اُس کے آسن کو بچھانے میں	زینت دہِ فرش بنانے میں
دِن اتنا لمبا گزرا ہے	اُف کتنا عرصہ گزرا ہے
گھر میں تو دیا روشن ہی نہیں	پُر نُور مرا مسکن ہی نہیں
میں اُس کو بلاؤں تو کیسے	اس گھر میں لاؤں تو کیسے[1]

بقول بشری نواس لاہوتی :۔

"بیسویں صدی کے ہندوستانی ادب میں، خاص طور پر شاعری میں دو ایسی قدآور شخصیتیں پیدا ہوئیں جنھوں نے نہ صرف ہندوستانی ادب کو مالامال کیا بلکہ اس کو عالمی ادب سے ہم کنار کیا۔ میری مُراد ٹیگور اور اقبال سے ہے۔ دونوں نہ صرف ہم عصر ہیں بلکہ بنیادی طور پر ان کی شاعری کے ڈانڈے ایک دوسرے سے اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ انھیں جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہی اُن کی آفاقیت کا بیّن ثبوت ہے۔ ایک نے اسلامی تصورِ حیات کو اپنا کر مردِ مومن کا تصور پیش کر کے انسانیت کو سر بلند کرنے کی کوشش کی تو دوسرے نے گیتا کے فلسفے کو بنیاد بنا کر کرم یوگی کا تصور پیش کیا اور جہدِ مسلسل کے ذریعے اپنی شاعری کی

---

[1] نغموں کا نذرانہ (ترجمہ گیتانجلی۔ منور لکھنوی)، قلمی نسخہ صفحہ ۲۵-۲۶

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

لازوال برکتوں سے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ دونوں باشعور تھے۔ انسان دوست اور سامراج دشمن تھے۔"[۱]

ملک کی آزادی کی اُمنگ، انصاف و مساوات پر مبنی جمہوری نظامِ حکومت کا خوش آئند تصور اور تعصبات سے غیر ملوث ایک بے لاگ سماج کا سپنا ٹیگور کی "گیتانجلی" کے گیت نمبر ۳۵ میں پرتو فگن ہے۔ اس مشہورِ عالم اور ہندوستان میں مقبول گیت کو منور کے موزوں اور مترنم اشعار میں دیکھیے :-

جہاں اونچا رہے سر، بو نہ کچھ خطرے کی آتی ہو
جہاں تعلیم میں پیدا رکاوٹ کی نہ جاتی ہو
جہاں جھگڑوں بکھیڑوں نے ہزاروں گھر نہ گھالے ہوں
جہاں دنیا کے ٹکڑے تنگیوں نے کر نہ ڈالے ہوں
بصد وارفتگی تعمیر کی تشکیل کی جانب
نہایت شد و مد سے سرحدِ تکمیل کی جانب
جہاں اَن تھک مشقت ہاتھ پھیلائے ہی رہتی ہو
بڑی زحمت اٹھاتی ہو بڑے آزار سہتی ہو
جہاں تیری قیادت میں یہ دل محوِ ترقی ہو
جہاں تیری ہدایت باعثِ تزئینِ قلبی ہو
جہاں ہوشیاری میں بڑھے آگے وطن اپنا
وہاں اے میرے خالق! نیند سے جاگے وطن اپنا[۲]

ڈاکٹر عنوان چشتی ٹیگور کی تحریر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ٹیگور نے "گیتانجلی" کے بارے میں یہ تسلیم کیا ہے :-

"گیتانجلی" میں میرے جو گیت ہیں وہ میں نے قصداً نہیں لکھے۔ دراصل یہ میری روح کی آواز ہیں میری روح کی صدائیں ہیں۔ ان کے اندر میری زندگی کے وہ سارے دکھ سکھ اور وہ ساری کیفیتیں ہیں جو الفاظ کا روپ اختیار کر چکی ہیں۔"[۳]

گیتانجلی کا شاعر اپنے باطن کی مذکورہ کیفیات کو زندگی بھر گیتوں کا لباس پہناتا رہا اور بصد عجز و

---

[۱] ماہنامہ "انشا" کلکتہ۔ شمارہ مئی ۱۹۹۱ء، صفحہ ۸۹
[۲] نغموں کا نذرانہ (ترجمہ گیتانجلی منور لکھنوی) قلمی مسودہ، صفحہ ۵۳، ۵۴
[۳] گیتانجلی (اردو ترجمہ منظوم از سید ظہیر عباس) مقدمہ از ڈاکٹر عنوان چشتی (روحِ نغمہ اور نغمۂ روح کا شاعر) صفحہ ۲۲، ۲۳ ناشر رنگ محل پبلی کیشنز، مظفر نگر

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

انکسار گیتوں کی یہ "انجلی" بطورِ نذرانہ اُس معبود و مسجود، جانِ جاناں کو پیش کرتا رہا۔ یہی اس کی زندگی کی تمام مساعی و توقعات کا حاصل تھا۔ چنانچہ "گیتانجلی" کے اختتامیہ حصّے میں وہ اس خوش گوار تجربے کے جس کیف انگیز تلذّذ کا اقرار کرتا ہے، اُسے منوّر کے الفاظ میں دیکھیے اور محسوس کیجیے :۔

زبانِ حال پر نغمہ بہ نغمہ پے بہ پے لا کر — تجھے ڈھونڈا ہے میں نے زندگی بھر گیت گا گا کر
انھیں نغمات نے یوں در بدر مجھ کو پھرایا ہے — انھیں سے جزوِ احساس و تجسّس تجھ کو پایا ہے
دلِ حسّاس میں، ساری یہی ہیں چشمِ جویا میں — تجھے چاروں طرف میں دیکھتا ہوں ان کی دنیا میں
سبق میں نے جو سیکھے میرے نغموں نے سکھائے ہیں — انھیں نے راستے وہ سب جو مخفی ہیں بتائے ہیں

میں آخر کار آ پہنچا ہوں کس قصرِ منوّر پر
سفر کے خاتمے پر مجھ کو لے آئے یہ کس در پر [1]

"گیتانجلی" کے آخری گیت میں ٹیگور نغمہ پرداز ہیں :۔

ایک سجدے میں اے خدائے انام — پھیل جائیں مرے حواس تمام
جس طرح سے اساڑھ کی بدلی — جو ابھی تک رہی ہو اَن برسی
اپنے بارِ گراں سے جھک جائے — جھک کے یوں ایک در پہ رُک جائے
میرے گیتوں کی یہ تمام دھنیں — ایک ہی دھار مل کے بن جائیں
دُور اُس بحر کی ہوں سمت رواں — جس میں ہر سمت خامشی ہے رواں
یہ وجودِ تمام ہے جو مرا — سفر اس گھر کی سمت ہو اس کا

جو دوامی ہے جاودانی ہے
ایک دنیائے غیر فانی ہے [2]

"گیتانجلی" دراصل نغمۂ رُوح ہے اور اس کے ترجمے کے ساتھ منوّر لکھنوی جیسا بلند رُوحانی اور جذباتی سطح کا پاکیزہ نفس شاعر اور مترجم ہی انصاف کر سکتا ہے۔ دراصل ٹیگور کی تمام شاعری روح کی شاعری ہے اور روح کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی شاعری ہے۔ وہ روحانی اقدار کی جاودانیت اور تسلسلِ بقا میں یقین رکھتے تھے۔ روحانی تموّل اور جذباتی آسودگی کے ساتھ تشنگانِ ادب کو کیفِ

---

[1] [2] نغموں کا نذرانہ (ترجمہ گیتانجلی۔ منوّر لکھنوی) صفحات بالترتیب ۱۹۲-۱۹۳ — ۱۹۸۔ ۱۹۹ء

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

دوام عطا کرنے والی اس لازوال تصنیف کا منوّر لکھنوی کا یہ منظوم ترجمہ ٹیگور کے افکارِ عالیہ کی ترسیل و ابلاغ کے لیے ایک کامیاب وسیلہ ہے۔

ساگر سنگیت

بنگالی ادب کا ایک اور شاہکار ہے جس کا ترجمہ منوّر لکھنوی نے "بحرِ ترنّم" کے نام سے کیا ہے۔ یہ مشہور محبّ وطن اور مجاہد آزادی دیش بندھو چترنجن داس کی لاہوتی تخلیق ہے"۔ ساگر سنگیت" ۱۹۶۲ء میں آدرش کتاب گھر، فیض گنج، دریا گنج دہلی نے شائع کی تھی۔ اس کا انتساب منوّر نے اپنے مخلص دوست جناب راجیشور ناتھ زیبا کے نام کیا ہے جن کی تحریک سے" ساگر سنگیت" کا یہ نثری ترجمہ مکمل ہوا۔ اناسی۷۹ گیتوں کا یہ ترجمہ ۹۶ صفحات کی ضخامت کا ہے۔

"ساگر سنگیت" کے اصل مصنف دیش بندھو سی آر داس نہ صرف ایک بلند پایہ وکیل اور ماہرِ قانون تھے۔ بلکہ ملک گیر شہرت کے سیاسی رہنما اور شاعر بھی تھے۔ وہ ایک سچے وشنو تھے اور عشقِ معرفت کے بحرِ بے پایاں کے یکتا شناور۔ ساگر سنگیت میں انہی کی بے لوث بھگتی کا دریا موجزن ہے اور بقولِ منوّر اس کا ایک ایک لفظ وجدانی نغمہ ہے۔

اصل ساگر سنگیت بنگلہ بھاشا کا ادبی شاہکار ہے۔ وصال نصیب مہایوگی اروند گھوش نے اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا تھا۔ منوّر لکھنوی کے ترجمے کا ماخذ اروند گھوش کا انگریزی ترجمہ ہی ہے۔ یہ نثری ترجمہ مشہور ادبی رسالہ "زمانہ" کانپور کے مالک و مدیر منشی دیا نرائن نگم کو بیحد پسند تھا لہٰذا وہ اسے بالاقساط "زمانہ" میں شائع کرتے رہے۔ منوّر کے اس نثری ترجمے کی مقبولیت کو دیکھ کر مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی نے "ساگر سنگیت" کی روح کو شعری قالب میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ ان کے ارشادات بھی "زمانہ" میں شائع ہوتے رہے۔ لیکن مولانا موصوف کا جلد انتقال ہو گیا اور یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔

منوّر نے اس ترجمے کا نام "ساگر سنگیت" کے لغوی معنیٰ کے "مطابق سرودِ قلزم" رکھا تھا۔ لیکن ایڈیٹر "زمانہ" نے اسے "بحرِ ترنّم" کے نام سے سلسلہ وار شائع کیا۔ لہٰذا منوّر نے اخلاقاً اور احتراماً ترجمے کا یہی نام قبول کر لیا۔ منوّر کی رائے میں سی آر داس کی یہ تصنیف شعری محاسن اور

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تاثر کے لحاظ سے ٹیگور کی گیتانجلی سے کسی طرح کم نہیں لیکن اس کو عالم گیر شہرت حاصل نہ ہو سکی جس کے لیے سی آر داس کی قبل از وقت موت بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔

متوّر لکھنوی کا ترجمہ اِس بنگلہ تصنیف کا اُردو میں واحد ترجمہ ہے۔ اس کے ابتدائی صفحات میں "زمانہ" کانپور کے جون ۱۹۲۵ء کے شمارہ میں مطبوعہ ایک مضمون بھی نقل کیا گیا ہے جس میں سی آر داس کے سوانح حیات رقم کیے گئے ہیں۔ اس کے مطابق چترنجن داس کا جنم ۱۸۷۰ء میں ڈھاکہ کے ایک اعلیٰ خاندان میں ہوا تھا۔ انھوں نے ۱۸۹۴ء میں وکالت کی ڈگری لے کر کلکتہ میں وکالت شروع کی۔ انھوں نے انڈین سول سروس کا امتحان پاس کر لیا تھا لیکن کسی وجہ سے آپ کو سرکاری ملازمت میں داخل ہونے کا موقع نہیں دیا گیا۔

۱۹۱۰ئہ میں موصوف کو دیسی ریاست کرم راون کا مشہور مقدمہ جیتنے پر بے پایاں شہرت حاصل ہوئی اور ان کی وکالت اس قدر چمکی کہ ۱۹۲۱ء میں جب انھوں نے سب کچھ چھوڑ کر جنگِ آزادی میں کودنے کا فیصلہ کیا تو ان کی آمدنی تقریباً چھ لاکھ روپے سالانہ تھی۔ انھوں نے اپنے کنبے کے لیے بمشکل دو سو روپے ماہوار کا سرمایہ چھوڑ کر اپنی باقی تمام دولت اور مکان تک قوم کی نذر کر دیا۔

دیش بندھو ابتدا میں مہاتما گاندھی کے پیرو کار رہے لیکن موتی لال نہرو کے اشتراک سے انھوں نے حکومت کے ساتھ داخلی جنگ کے لیے سوراجیہ پارٹی قایم کی۔ جب اُن کی پارٹی کی شہرت اپنے نقطۂ عروج پر تھی اور ملک کے تمام صوبوں میں ان کی حکمتِ عملی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا تو اچانک ۱۶ر جون ۱۹۲۵ء کو ۵۴ برس کی عمر میں دیش بندھو کا انتقال ہو گیا۔

راتوں رات آپ کی موت کی خبر سارے بنگال میں پھیل گئی۔ گاندھی جی اُس وقت بنگال کے دَورے پر تھے۔ انھوں نے اپنے سارے پروگرام ملتوی کر دیے۔ ۱۸ر جون کو سی۔ آر داس کی لاش دار جیلنگ سے کلکتہ لائی گئی۔ ریلوے اسٹیشن پر لاکھوں کا ہجوم منتظر تھا۔ ارتھی کا جلوس شمشان بھومی تک پہنچتے پہنچتے آٹھ لاکھ برہنہ پا انسانوں کے جمِ غفیر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ٹرام اور گاڑیاں بند رہیں۔ ارتھی پر پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔ گاندھی جی پیچھے پیچھے موٹر پر سوار تھے۔ یوروپین اور انگلش لیڈیوں کی خاصی تعداد بھی ارتھی کے ہمراہ تھی۔ ارتھی کو چتا پر رکھتے وقت لوگ مہاتما گاندھی کے منع کرنے کے باوجود سی۔ آر داس کے آخری دیدار کے لیے باڑھ توڑ کر شمشان میں گھس آئے۔ اُن کی وفات پر اُن کے مخالفین نے بھی جو اُن کے مجوزہ ہندو مسلم معاہدے اور سیاسی پالیسیوں

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سے متفق نہ تھے۔ ان کے خلوصِ عمل، نیک نیتی اور خدماتِ وطن کی تعریف کی۔

اگرچہ بنگلہ زبان کا اپنا ایک منفرد مزاج ہے اور اس کا سرمایۂ الفاظ زیادہ تر سنسکرت بھاشا سے ماخوذ ہے، تاہم یہ اس برِّصغیر کی ایک نہایت متموّل اور امیر زبان تسلیم کی جاتی ہے۔ اس نے دنیا کو رابندر ناتھ ٹیگور، بنکم چٹرجی اور نذر الاسلام جیسے قد آور ادیب، شاعر اور فنکار دیے ہیں۔ اس زبان کی فطری شیرینی رُوحانی کیفیات اور نازک رومانی جذبات دونوں کے اظہار کے لیے یکساں موزوں اور سازگار ہے۔ "ساگر سنگیت" کی غنائی شاعری کے لیے یہی زبان ہی موزوں ترین آلۂ ترسیل ہو سکتی تھی۔

بنگال کی غنائی شاعری میں وہ ادبی زبان استعمال میں لائی گئی ہے جو لغوی معانی کی نمائندگی کم اور مجازی معانی کی عکاسی زیادہ کرتی ہے۔ اس زبان میں رمزیت اور اشاریت کا عنصر بطورِ خاص شامل ہوتا ہے۔ اس میں تشبیہوں، استعاروں، پیکروں اور علامات کا اچھا خاصا نظام ہے اور ایسی شاعری کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا شیشہ گری کا ہُنر ہوتا ہے۔ لیکن منوّر نے اس فریضے کو کامیابی سے نبھایا ہے۔ ان کے نثری ترجموں میں جن کی مثالیں اجمالاً ذیل میں دی جا رہی ہیں۔ وہی شیرینی، وہی لہجے کی نرمی اور لوچ، جذباتیت کی وہی دھیمی دھیمی آنچ اور عقیدت کی لَو موجود ہے جو اس نوع کی رومانی شاعری کے لیے درکار ہوتی ہے اور جو سی آر داس کی "ساگر سنگیت" کے ہر مصرع میں سمائی ہوئی ہے۔ پہلے ہی گیت کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

> " آج اتفاقاً تیرا دیدار حاصل ہو گیا۔ تیری ذات عجیب و غریب ہے۔ تجھ کو ہمیشہ شعبدہ بازیوں میں مزا آتا ہے۔
>
> ٹھہر ٹھہر تھوڑی دیر ٹھہر۔ مجھ پر عنایت کر۔ میرے واسطے رُک۔ میں اپنے ترانوں کی لڑیوں میں تجھے گوندھ لوں۔
>
> ماہتاب کا زرد زرد نور ہر طرف پھیلا ہوا ہے، اور بحرِ خاموش عالمِ خواب میں مست تھر تھر کانپ رہا ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ واقعی تو یہاں جلوہ فرما ہے تو اے تبسم ریز پُر اسرار ہستی آ اور میرے دل میں قیام کر۔ ورنہ میں کس وقت تیرا ذکر اپنے ترانوں میں نظم کر سکوں گا۔؟
>
> ابھی تھوڑی دیر اور ٹھہر۔ رُک جا۔
>
> سمندر کی ترانہ سنجیوں اور اپنے دل کے بے صدا نغموں کے ساتھ تجھ کو بھی نظم کا جامہ پہناؤں گا

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اور اس جامہ زیبی کی شان تمام محاسنِ شاعری سے بدرجہا افضل ہوگی۔ اس طرح نیرا ذکر نظم کرلوں گا تو تُو میرے دل کے لافانی گوشۂ تنہائی میں پابستہ ہوجائے گا...... "[۱]

گیت نمبر ۵ کے کچھ بول دیکھیے :-

"آہ! وہ سینہ کس کا ہے جس پر مَیں اپنے سر کا بار رکھوں۔ اپنے آنسوؤں کا تحفہ کس کو نذر کر دوں۔ آج کا روز نہایت طرب اندوز ہے اور کسی کو مجال نہیں کہ میری مسرت بے انداز کو روک دے یا میرے اضطرابِ ناگہانی سے چشم پوشی کرے۔

میرے سرورِ سرمدی کی دولت آج اپنا جلوہ دکھلائے گی۔ آج میرے تمام آلام سرود و ترنم میں ظاہر ہوکر رہیں گے۔

اے سمندر! بتا، تو ہی بتا کہ آج کے دن جو نہایت مسرت خیز ہے۔ میرے دل کا بار کون سنبھال سکے گا۔"[۲]

گیت نمبر ۹ میں سے چند سطور بطور اقتباس درج ذیل ہیں :-

"تمام دن میرے دل میں تیرے راگ کی صدا سنائی دیتی رہتی ہے ...... اومطرب خوش نوا! میں ستار ہوں، کاش تو مجھے چھیڑے جا۔ میرے تاروں کو مرتعش کرتا رہ۔ اپنی تعجب خیز مایا کے عالم میں جہاں بے مثل۔ اس سرے سے اُس سرے تک بقعۂ نور۔ میری مشتاق نگاہیں۔ پھولوں کے حسن و جمال کے نظارے کے لیے دوڑتی پھرتی ہیں....

لیکن آج مجھے تیرے گُل کدہ کی تلاش نہیں۔ مَیں صرف تیرے راگ کا مشتاق ہوں۔ ترنم ساز ہوجا۔ مَیں اس کی آواز کی موجوں پر بڑی دُور تک تیرتا چلا جاؤں گا.... مَیں اس آواز کے سمندر میں ڈوب جاؤں گا........"[۳]

شاعر ان گیتوں میں اُس حُسنِ ازل اور نُورِ ابدی سے مخاطب ہو رہا ہے، جو رُوحِ کائنات ہے۔ ان گیتوں میں حُسنِ فطرت کے جلوے بھی ہیں اور الفاظ میں مناظر کی تصویر کشی بھی۔ شاعر کی روح کی تڑپ بھی ہے جو اپنے محبوبِ ازلی سے وصال کے لیے مضطرب ہے۔ ترجمے کے ترنم و نازک الفاظ میں منوّر لکھنوی نے اصل مصنف کی سپرٹ کو کامیابی کے ساتھ منتقل کر دیا ہے۔ اُردو ترجمہ میں وہی

---

[۱][۲][۳] بحرِ مترنم یا ساگر سنگیت (مترجم منوّر لکھنوی) صفحات بالترتیب ۱۳-۱۶-۱۹ مطبوعہ ۱۹۶۲ء

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سرمستی، وجدان، ربودگی اور دلفریب نغمگی ہے جو اصل بنگلہ تصنیف میں اپنا طلسم بکھیرتی ہے۔

گیت نمبر ۶۹ سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو :-

"کس زمانے میں، کس ملک میں اور کس فراموش شدہ اور دور دراز ساحل پر ہم دونوں کی آنکھیں باہم دگر چار ہوئی تھیں۔

ہم دونوں کو کس مہیب اور دل ہلا دینے والی گرج نے یا کس دلفریب خوشگوار اور فرحت اثر ترنم نے باہم دیگر پہلے جکڑ دیا تھا کس فراخ اور وسیع لق ودق صوتی میدان کے لافانی مقامات میں پہلے پہل ہم دونوں یکجا ہوئے تھے........

اے بحرِ مواج! ہاں کس عظیم الشان روح کی لا ابتدا جاودانیت سے ہم دونوں کے چشمے بہہ نکلے تھے اور اپنے زمانۂ اخراج سے نامعلوم کتنی مرتبہ ہم دونوں جدا ہو گئے اور جُدا رہ کر اس کے بعد نہ جانے کتنی بار پھر آ ملے ہیں........"[۱]

آخری گیت میں شاعر کی روح کی روحِ ازلی کے ساتھ وصال نصیب ہونے کی تڑپ ایک طوفان بن گئی ہے۔ دیش بندھو فرماتے ہیں :-

"کہاں یہ ساحل! اور کہاں وہ! اُف میں تھک گیا۔ ہاتھ پاؤں چھوٹے جاتے ہیں۔ یہ دونوں ساحل بے جان ہو گئے ہیں۔ مجھے اس مقام سے باہر نکال لے اور وہاں لے چل جہاں تیرا کوئی ساحل ہی نہیں ہے۔ میری روح سراسیمگی کی حالت میں اِدھر اُدھر منڈلا رہی ہے اور اس کو تیری اس کثرت میں سکون ملتا ہے۔ جہاں تو کسی پشتے سے محدود نہیں ہے......

اے عالمِ اسرار کے تاجدار! میں تیری تلاش میں دیوانہ ہو رہا ہوں۔ کیا میں نے تجھے کروڑوں جنموں میں تلاش نہیں کیا؟

اے ناخدائے باقی! اے دوستِ نادیدہ تو مجھے آغوش میں لے کر اپنی ذاتِ بے پایاں میں وصل کر دے۔"[۲]

"ساگر سنگیت" کا شاعر صداقت کی کھوج میں سرگرداں دکھائی دیتا ہے۔ اس تجسس میں وجدان و ضمیر کی موسیقی نے اُسے قدم بہ قدم حقیقتِ ازلی سے قریب تر کیا ہے۔ یہ موسیقی خود

---

[۱] بحرِ ترنم (منور لکھنوی) صفحہ ۸۱ [۲] صفحہ ۹۳

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اُس کی رُوح کے "بحرِ ترنم" سے موج در موج اُمڈتی ہے۔ صداقت کی یہی تلاش و تجسس ہی انسان کی زندگی کا مقصدِ ارفع ہے۔ صداقت کے ساحل کی جانب شاعر کی رہنمائی کرنے والی اس موسیقی کی لہروں میں ایک رجائیت آمیز روشنی ہے۔ اس روشنی کو منوّر نے اردو نثر کی گرفت میں لے کر بنی نوعِ انسان کی راہوں کو منوّر کرنے کے لیے ۱۹۶۲ء میں زیورِ طبع سے آراستہ کیا تاکہ اہلِ اُردو بھی بنگلہ شاعری کی اس نادر سوغات سے مستفیض ہو سکیں۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

باب پنجم (د)

جرمن تصانیف کے ترجمے

(۱) فاؤسٹ (گوئٹے)
حصہ اوّل و دوم کا تنقیدی جائزہ

(۲) "سمندری جوان اور دوسرے نادر جرمن افسانے"
پر تنقیدی نظر

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

جرمن تصانیف کے تراجم

جرمن ادب کا شہرۂ آفاق تمثیلی کارنامہ "فاؤسٹ" جرمنی کے شاعرِ اعظم اور فلاسفر گوئٹے کی انمول دین ہے۔ اٹھارہویں صدی کے وسط میں جنم لینے والا یہ ممتاز اہلِ قلم ہندوستانی ادب اور شاعری سے بہت متاثر تھا۔ منور لکھنوی نے گوئٹے کے اس مقبولِ عوام اور نادر تمثیلی شاہکار فاؤسٹ کو اردو کے قالب میں منتقل کیا ہے اور اس ترجمے کا انتساب "ادب و احترام کے ساتھ فاؤسٹ کے عظیم مصنف اور جرمن زبان کے شہرۂ آفاق ہنر زندہ جاوید شاعر، فلاسفر اور تمثیل نگار یوحان ولفگنگ فان گوئٹے کی عرش آشیاں روح کے نام" کیا ہے۔ اس ترجمے کے پیش لفظ میں ہندوستان میں مغربی جرمنی کی فیڈرل ری پبلک کے اُن دنوں کے سفیر ہز ایکسیلنسی بیرن ڈی فان میرنخ نے تسلیم کیا ہے کہ گوئٹے ہندوستانی ادب اور شاعری سے حد درجہ متاثر تھے۔ فرماتے ہیں کہ

"شاید اس ملک میں لوگوں کو وسیع پیمانے پر اس بات کا علم نہیں کہ گوئٹے کی توجہ ہندوستانی ادب اور شاعری کی جانب تمام عمر رہی۔ ابھی جب وہ نوعمر ہی تھے کہ وہ زمانۂ قدیم کے سیاحوں کی تحریریں، ہندوستانی قصے اور روایتیں یا کہانیاں پڑھ پڑھ کر لوگوں کو سنایا کرتے تھے۔ جب وہ سنِ بلوغ کو پہنچے تو "شکنتلا" کا وجود ان کے علم میں آیا۔ انھوں نے کالی داس کے اس نمایاں ترین کارنامے کی تعریف بڑے زوردار اشعار کے ذریعہ فرمائی اور جب اس دانائے روزگار نے پیرانہ سالی میں قدم رکھا تو جرمن زبان کے عالم آگسٹ ولہلم شلیگل کے ترجمۂ رامائن کی توصیف میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اگر ایک طرف "گاڈ اینڈ بایاڈیرے" (GOD AND BAYADERE) اور "پیریا" (PERIA) کے عنوانات کے تحت ان کی نظموں کے ہندوستانی ماخذوں کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف صرف "فاؤسٹ" ہی ان کا وہ کارنامہ ہے جس میں ہندوستان کے تمثیلی ادب کے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تأثرات کارفرما نظر آتے ہیں۔ میری مراد یہ ہے کہ گوئٹے نے اسٹیج کی اس تمہید (افتتاحیہ نغمے) کو جو سنسکرت زبان کے ہر ڈرامے کا جزوِ لازمی ہوتی ہے اور ابتدائی دعا کے بعد کھیل کے پیشتر واقع ہوتی ہے، وسعت دے کر ڈرامے کے گہرے معانی کا اظہار کیا اور تماشائیوں کے ساتھ مصنف کے باہمی ارتباط پہ ایک جاندار مقالہ قلم بند کیا ہے "فاؤسٹ" میں اس تمہید کا شامل کیا جانا جرمن ادب میں ایک بے مثال واقعہ ہے۔ اور یہ گوئٹے کے ۱۷۹۱ء میں "شکنتلا" سے روشناس ہونے کا براہِ راست نتیجہ ہے"![1]

"فاؤسٹ" کے سلیس ترجمے بنگلہ اور تیلگو جیسی ہندوستانی زبانوں میں پہلے سے موجود تھے۔ اردو زبان میں "فاؤسٹ" کا ترجمہ کرنے کا شرف سب سے پہلے منوّر لکھنوی کو حاصل ہوا۔ یہ بات منوّر کے علم میں بھی نہیں تھی کہ اردو نثر میں فاؤسٹ کا ترجمہ ان کے دوست ڈاکٹر عابد حسین جامعی۔ براہِ راست جرمن زبان سے کر چکے تھے۔ جو انجمن ترقیٔ اردو اورنگ آباد (دکن) کی جانب سے شائع ہو چکی ہے۔ بہر حال منوّر کا ترجمہ منظوم ہے اور انھوں نے اپنے ترجمے کی بنیاد انگریزی مترجم لیتھم کے منظوم ترجمے پر رکھی۔ اگرچہ انھوں نے کہیں کہیں ٹیلر، فلپ وین اور فریزر جیسے انگریز مترجموں کے "فاؤسٹ" کے تراجم سے بھی مدد لی ہے اور اپنے منظوم ترجمے کو حتی الامکان "سلیس"، عام فہم، نیز لفظاً و معناً قابلِ پذیرائی بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ منظوم ترجمہ کسی واحد عروضی بحر میں نہیں کیا گیا۔ لیکن مکالمے مقفّٰے ہیں، آزاد شاعری یا نظم معرّیٰ میں نہیں۔ منوّر کے ترجمے میں حصہ اول کی ضخامت ۲۲۰ صفحات اور حصہ دوم کی ۱۹۸ صفحات ہے اور اسے میکس مولر بھون نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۶۹ء میں منظرِ عام پر لایا گیا۔

منوّر لکھنوی نے اس ترجمے کے کچھ حصص خلد آشیانی نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کو سنائے جو اردو، انگریزی، عربی اور فارسی زبانوں کے ماہر اور بالغ نظر ادیب تھے۔ جناب شبیر حسین خاں جوش ملیح آبادی نے اس ترجمے کے کچھ حصے منوّر لکھنوی کی زبانی سماعت کیے۔ ان دونوں مقتدر ادبی شخصیات نے اس ترجمے کو سراہا۔ ہندوستان میں جرمن سفارت خانے کی کچھ اہم شخصیتوں نے بھی اس ترجمہ کا مطالعہ کرنے کے بعد اسے حیرت انگیز ادبی شہ پارہ قرار دیا۔

---

[1] فاؤسٹ (اردو ترجمہ از منوّر لکھنوی) ناشر: میکس مولر بھون۔ نئی دلی۔ طبع اول ۱۹۶۹ء پیش لفظ از سفیر جرمنی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

فاؤسٹ کا مصنف گوئٹے جرمنی کا نامور شاعر، ڈرامہ نگار، فلاسفر اور سائنس داں تھا۔ جس کی ولادت ۱۷۴۹ء میں فرینک فرٹ آن مین میں ہوئی۔ اس عظیم مصنف نے ۸۳ سال کی طویل عمر پائی۔ گوئٹے نے ۱۷۶۸ء میں لیپزگ میں اپنی قانون کی تعلیم مکمل کی اور ۱۷۷۱ء میں سٹراس برگ سے ڈاکٹر آف لا کی ڈگری حاصل کی۔ وہیں اس نے علم نباتات، تشریح الاعضاء، کیمسٹری وغیرہ کے علوم میں دسترس حاصل کی۔ اگلے دس برسوں میں اس نے کئی ذمہ دار سرکاری عہدوں پر کام کیا۔ اس دوران اس کی ایک شعری تصنیف "انیٹے" ایک ڈرامہ "ڈائی لائنے ڈیس ورلیٹین" ایک کامیڈی "ڈائجن" متغزلانہ کلام کا ایک مجموعہ سیبن ہم لائیڈر، تاریخی ڈرامہ "گوئٹز فان برلی چنگن" اور کچھ ڈرامائی طنزیے شائع ہو چکے تھے۔ ادبی شہرت کے طفیل گوئٹے کو ۱۷۸۲ء میں "امرا" کے زمرے میں شامل کرنے کا اعلان ہوا۔ ۱۸۵۶ء میں ۷، ۵ برس کی عمر میں گوئٹے نے اپنی محبوبہ کرسٹیئن ولپیس کے ساتھ شادی رچائی۔ ۱۷۹۱ء اور ۱۸۱۷ء کے درمیانی عرصے میں اس کے متعدد مشہور ڈرامے نیز بیانیہ شاعری اور گیتوں کے کئی مجموعے منظر عام پر آئے۔ وائمر میں گیارہ برسوں کے اپنے قیام کے دوران وہ وائمر کورٹ تھیٹر میں ہدایت کار بھی رہا۔

گوئٹے کے شہرۂ آفاق ڈرامہ "فاؤسٹ" کا حصّہ اول ۱۸۰۸ء میں قلم بند ہوا اور اس کا حصّہ دوم ۱۸۳۳ء میں منظر عام پر آیا۔ گوئٹے نے جرمن اہل قلم کی رومانٹک ری وولٹ (رومانوی بغاوت) کی قیادت کی لیکن رفتہ رفتہ اس کا ذہن مذہب سے بھی کافی متاثر ہوا۔ اُس نے علمِ مخفی کے اکتساب میں بھی کافی وقت صرف کیا۔ رنگوں کی تھیوری اور علم الحیوانات کے اصولوں کا بھی مطالعہ کیا۔ ان سائنسی مشاغل کے اثرات اس کے زیر نظر ڈرامہ "فاؤسٹ" پر نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

"فاؤسٹ" حصّہ اول کے ترجمہ کے ابتدائی صفحات میں منوؔر لکھنوی نے ۳۲ صفحات پر مشتمل اس مشہورِ عالم ڈرامہ کا ایک تنقیدی جائزہ شامل کیا ہے۔ اس کے مطابق:-

"فاؤسٹ کا خاکہ اس کے خالق گوئٹے کے ذہن میں" پورے ساٹھ سال تک تیار ہوتا رہا۔ گویا اُن کی علمی زندگی کا بیشتر حصّہ "فاؤسٹ ہی کے تصوّر اور اس کی تخلیق میں صرف ہوا۔ اس کی ابتدا اس زمانے میں ہوئی تھی جب گوئٹے کی عمر صرف بیس سال تھی۔۔۔ اور جب تک گوئٹے ۸۳ سال میں داخل نہیں ہو گیا اس وقت تک اس کا اختتام عمل میں نہیں آسکا تھا"[1]

---

[1] فاؤسٹ (اردو ترجمہ از منور لکھنوی) طبع اول ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۳

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منوّر کے مطابق یہ ڈرامہ "آئیڈیلزم (آدرش واد) کے اصول کا ایک پُراسرار کارنامہ ہے"! اس کے حصہ اول میں جذبہ اور عقل کا امتزاج واشتراک نمایاں ہے۔ اور انہی خوبیوں کی بنا پر گوئٹے کا شمار دنیا کے عظیم ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ منوّر لکھنوی نے یہاں گوئٹے کے بارے میں مشہور ناول نگار اور نقاد ٹامس مین کے اس قول کا حوالہ دیا ہے کہ:۔

"گوئٹے بذات خود اس حقیقت کی ایک مثال ہیں کہ انتہائی خالص سادگی یا بھولاپن اور زبردست عقل وادراک یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ دست بدست چل سکتی ہیں.....
تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اپنی جوانی کی تمام نزاکتوں اور ولولوں کے ساتھ گوئٹے میں وضاحت رائے کا غیر معمولی ملکہ بہت جلد نمایاں ہوگیا تھا"!

فاؤسٹ کا کردار خود گوئٹے کے اس بھولے پن اور زبردست فہم وادراک کے مرکب کی مثال نظر آتا ہے جسے منوّر نے اپنے وفادارانہ اور دیانتدارانہ ترجمے اور زبردست قوتِ اظہار کے ساتھ اور بھی نمایاں کر دیا ہے۔ اس ڈرامے کے حصہ اول کے آغاز میں بہشتِ بریں کا منظر دکھایا گیا ہے۔ جس میں رب العالمین کا دربار آراستہ ہے۔ تینوں فرشتے اسرافیل، جبرئیل اور میکائی خدائے پاک کی ثناگوئی کرتے ہیں اور اُس کی جمالی، رحمانی اور جلالی قوتوں کی توصیف کرتے ہیں۔ اس کے بعد شیطان (مفسطوفلیس) خدا کی حمد وثنا کے بعد انسان کی بے ہودگی اور بے بضاعتی، نیز اس کے اطوار وچلن کا شکوہ کرتا ہے لیکن رب العالمین ایک مخلص، سادہ لوح اور پرہیزگار مثالی انسان فاؤسٹ کا ذکرِ فخریہ انداز میں کرتا ہے۔ شیطان خدا کے اس قول کو چلینج کر کے دعوے کرتا ہے کہ وہ فاؤسٹ جیسے شریف اور پاک باطن انسان کو بھی گمراہ کر کے دکھا سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

الٰہی شرط کچھ تو مجھ سے بدلے — رہے گا پھر کے یہ انسان تجھ سے
نہیں محفوظ تیرے ساتھ سے یہ — چلا جائے گا تیرے ہاتھ سے یہ[1]

خدا تعالیٰ شیطان کو فاؤسٹ پر اپنے داؤ آزمانے کی اجازت دے دیتا ہے لیکن بڑے وثوق سے وہ نیک روح کی بازیافت کا بھی دعوے کرتا ہے اور فرماتا ہے:۔

ہمیں منظور ہیں باتیں تمہاری — بڑی دلچسپ ہیں گھاتیں تمہاری
تم اُسکو اپنے بس میں لا سکو گے — تم اُسکو شوق سے بہکا سکو گے

---

[1] فاؤسٹ (ترجمہ از منوّر لکھنوی) صفحہ ۲۵۔ ناشر: میکس مولر بھون۔ نئی دہلی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

کریگی اسکی جب تذلیل و خواری سواری اسکی گردن پر تمہاری
ندامت سے سر اپنا خم کرے گا زبانِ ہوش پہ ماتم کرے گا
رہے وہ خواہ کتنا تیرہ مشرب رہے وہ خواہ کتنا پست منصب
پھر آجائیگا غالب نیر کی پر نظر اٹھ کر رہے گی روشنی پر[1]

اس مکالمے کے آخری اشعار ہی اس ناٹک کا وہ پیغام اور اخلاقی سبق ہیں جو شاعر اپنے قارئین کو دینا چاہتا ہے کہ جس انسان کی خصلت میں نیکی ہے وہ یقیناً کبھی نہ کبھی پھر اُبھرے گا۔ چنانچہ شیطان فاؤسٹ کو طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر گمراہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ اسے اپنی کھوئی ہوئی جوانی کو ازسرِ نو حاصل کرنے کے لئے جادوئی مرکبات و مشروبات نوش کرنے کے لئے آمادہ کرتا ہے اور ایک حسینہ گریٹشن کے دامِ محبت میں پھنساتا ہے۔ عیش و عشرت کی محفلوں اور شراب خانوں میں لے جاکر فاحشہ عورتوں کی صحبت میں دادِ عیش دینے کی بھی ترغیب دیتا ہے۔ اور گریٹشن کی محبت کے جوش میں اس سے قتل بھی کروا دیتا ہے۔ اُسے عالمِ جنت اور ما فوق الفطرت مناظر کی سیر کرواتا ہے لیکن اس نیک روح انسان کی بنیادی اور فطری پاکیزگی اور اخلاصِ باطنی پر قدرت پانے میں ناکام رہتا ہے۔ کیونکہ یہ پاکیزہ فطرت انسان محبت اور معصیت میں تمیز کرنے کی قوت و شعور رکھتا ہے۔ جس ایک غریب لڑکی کے ساتھ وہ عشق کرتا ہے اُسے آخر تک نباہتا ہے اور شیطان کی ریشہ دوانیوں سے اُس کی شدید نفرت تادمِ آخر قائم رہتی ہے۔ شیطان نے ہمیشہ کی رفاقت کا جو وعدہ فاؤسٹ سے لیا تھا، وہ اُسے بادلِ ناخواستہ ہی کچھ مدت تک ایفا کرتا ہے۔ لیکن اس کی روح اس پیمان کی جکڑبند سے آزاد ہونے کے لئے ہمیشہ پر پھڑپھڑاتی رہتی ہے۔ یہی اس ناٹک کا پلاٹ ہے۔

منور لکھنوی نے جس طرح اس ڈرامے کے مختلف مناظر اور واقعات کی اپنے مؤثر ترجمے میں قدرتی انداز سے عکاسی کی ہے اُس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اُس کا وسیع ذخیرۂ الفاظ، انگریزی اُردو اور فارسی زبانوں پر اُس کی کامل دسترس، اور اصل متن کے صحیح مفہوم کی ترسیل کے لئے صحیح اور موزوں ترین الفاظ و تراکیب کے انتخاب کا شعور اُسے ایک کامیاب اور مشاق مترجم کے مقام پر لا کھڑا کرتا ہے۔ فاؤسٹ جیسے دانش ور پروفیسر کی مطالعہ گاہ کی منظر کشی ہو خواہ مے خانے اور قحبہ خانے کے ماحول کی عکاسی، یا کسی جادوگرنی کے مطبخ کی تفاصیل کا بیان۔ خواہ مختلف مواقع اور مختلف المزاج

---

[1] فاؤسٹ، ترجمہ از منور لکھنوی، صفحہ ۲۷، ناشر مکتبہ دیا بھون نئی دہلی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

انسانوں کی نفسیاتی کیفیات کی ترجمانی، موزوں اور صحیح الفاظ ہاتھ باندھے اس مترجم کی بارگاہ میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ اشعار میں بندش کی چستی منظوم ترجمے اور اصل متن کے فرق کو بالکل محو کر دیتی ہے اور ترجمے پر اصل نظم کا گمان ہونے لگتا ہے۔ مثلاً ڈرامہ کے ابتدائی حصے میں فاؤسٹ اپنی مطالعہ گاہ میں بیٹھا یہ سوچ رہا ہے کہ عالم و فاضل، نیز آگاہِ راز بن کر اور دوسروں کو درسِ آگہی دے کر اُسے زندگی سے کیا ملا۔ اس وقت کی نفسیاتی کیفیت کو اس ترجمے میں جرمن زبان کے اصل متن سے کتنا قریب اور یک رنگ کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

راہیں جتنی بھی دکھاتا ہوں — جو کچھ اوروں کو سکھاتا ہوں
بے مائیگی اس کی جانتا ہوں — کم ظرفی اُس کی جانتا ہوں
جب پاس نہ ہو اک پیسا بھی — اُس حال میں تو اک کتّا بھی
کیا زیست بسر کر سکتا ہے — کس طرح گزر کر سکتا ہے
اب اور ہی راہ میں چلتا ہوں — دستورِ حیات بدلتا ہوں
جادو یہ دکھا بھی سکتا ہوں — رُوحوں کو بُلا بھی سکتا ہوں
جنات کچھ اپنی قدرت سے — اعجازِ عمل کی ندرت سے
سُن سکتے ہیں پیغام مرا — کر سکتے ہیں کچھ کام مرا[1]

شہر لیپزگ میں آئر باغ کے تہ خانے میں اک شراب خانہ ہے جہاں یارانِ طریقت جمع ہیں۔ مے خوار وہاں مصروفِ ناؤ و نوش ہیں۔ اور ایک دوسرے پر فقرے بازی کر رہے ہیں۔ شیطان فاؤسٹ کو اس محفل میں لے جاتا ہے اور کہتا ہے۔

اپنی ہی دنیا میں یہ سب مست ہیں — کچھ انوکھے ان کے بندوبست ہیں
اس طرح کرتے ہیں یہ سرمستیاں — جیسے اپنی دُم سے کھیلیں بلّیاں
دردِ سر سے ہوں نہ جب تک مضمحل — ہو نہ جائے غم یہ جب تک جاں گُسل
مال جب تک قرض پر ملتا رہے — دل کا غنچہ اس طرح کھِلتا رہے
فکر ہوتی ہے نہ کچھ شرمندگی — کاٹتے ہیں کس مزے سے زندگی[2]

شیطان اپنی جادوگری دکھاتا ہے۔ ایک برمہ منگوا کر میز کے چاروں کونوں میں چھید کر ڈالتا

---

[1] [2] فاؤسٹ (ترجمہ منوّر لکھنوی) صفحہ ۳۱ ——— صفحات ۱۷۶-۱۷۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہے۔ ان سوراخوں میں لکڑی کے کارک لگا دیے جاتے ہیں۔ شیطان اپنا افسوں طاری کرکے میز کے ان کونوں کو شراب کی صراحیاں بنا دیتا ہے۔ جن سے شراب بہہ کر گلاسوں میں گرتی ہے۔ شرکائے محفل اسے پی کر بدمست ہو کر مل کے گاتے ہیں۔

مستانہ ہم کہتے ہیں مے سے بھیگے لٹے ہیں
پانچ سو آج سُور گویا اس محفل میں اکٹھے ہیں

اس ہنگامے کے بیچ شیطان اپنی شیطانی حرکات کرتا ہے۔ لاپرواہی سے شراب پیتا ہے۔ شراب فرش پر گرتی ہے اور فوراً بھبکا دیتی ہے۔ اس شعلے سے آگ لگ جاتی ہے۔ باہمی گالی گلوچ شروع ہو جاتی ہے۔ دو رندانِ بدمست چاقو نکال کر شیطان کی طرف بڑھتے ہیں لیکن شیطان کی تقریر کے افسوں سے سحرزدہ ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کا منہ تکتے ہیں۔ انھیں جادوئی مناظر نظر آنے لگتے ہیں۔ ان میں سے ایک شرابی کہتا ہے:۔

دل مرا دیکھ کے حیران ہوا جاتا ہے
مجھ کو انگور کا ایک باغ نظر آتا ہے

زبیبل کہتا ہے:۔

چشمِ حیراں کے لیے بیحد مسرت ناک ہیں
سامنے میری نظر کے خوشہ ہائے تاک ہیں

برینڈر بھی اسی سحر کا شکار ہے اور کہتا ہے:۔

کیسی یہ دل کش صورت ہے
ہری بھری بیلوں کی چھت ہے
لٹکے سے پڑتے ہیں گچھے
پکے پکے انگوروں کے[1]

برینڈر یہ کہہ کر زبیبل کی ناک پکڑ لیتا ہے۔ باقی اشخاص بھی ایک دوسرے کی ناک پکڑ کر چاقو اٹھا لیتے ہیں۔ اسے انگور کا خوشہ سمجھ کر ایک دوسرے پر لپکتے ہیں اور شیطان سنجیدگی سے کہتا ہے:۔

اے فریب چشم، اے سحر نگاہ
کھول دے اب ان کی آنکھیں کھول دے
دیدنی ہے دیدنی اس کا مذاق
شعبدے کچھ دیکھ اب شیطان کے[2]

یہ کہہ کر شیطان فاؤسٹ کے ساتھ غائب ہو جاتا ہے۔

جادوگرنی کے باورچی خانے میں ایک کڑھاؤ گرم ہو رہا ہے۔ کڑھاؤ میں سے بخارات اٹھ رہے ہیں۔ جن کی تہ میں عجیب و غریب صورتیں دکھائی دے رہی ہیں۔ ایک مادہ لنگور کڑھاؤ کے پاس بیٹھی اُبال اُتار رہی ہے۔ لنگور اور اُس کے بچے آگ تاپ رہے ہیں۔ دیواروں اور چھتوں پر جادو کی حیرت انگیز

[1,2] فاؤسٹ (مترجم منور لکھنوی) صفحہ ۱۹۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اشیا بھی ہیں۔ شیطان فاؤسٹ کو ساتھ لے کر وہاں نمودار ہوتا ہے۔ فاؤسٹ بیزار ہو کر کہتا ہے:

کس آگ سے یہ میرا سینہ دہک رہا ہے — شعلہ سا ایک شعلہ پیہم بھڑک رہا ہے
سہنے کو آنچ اس کی لائیں جگر کہاں سے — شیطاں کی ہے یہ بھٹی چل دیں ہم اب یہاں سے [1]

لنگورنی کی توجہ کڑھاؤ سے ہٹ جاتی ہے۔ اس غفلت سے کڑھاؤ میں زبردست شعلہ بھڑک اٹھتا ہے اور چمنی کے اوپری سرے تک پہنچتا ہے۔ ایک جادوگرنی شعلے سے چیختی چلاتی نمودار ہوتی ہے اور کہتی ہے۔

یہ بدنصیب جانور — ہیں کچھ عجیب جانور
کڑھاؤ یونہی چھوڑ کر — یہ چل گئی ادھر اُدھر
یہ ظلم کیا بپا کیا — جلا کے مجھ کو رکھ دیا
یہ بدنصیب جانور — سُوَر ہیں واقعی سُوَر [2]

شیطان اور فاؤسٹ کو دیکھ کر جادوگرنی چلاتی ہے:۔

کون ہو تم، کیسے آئے ہو یہاں — ماجرا کیا ہے، کرو مجھ سے بیاں
پھونک کر رکھ دے تمہیں دوزخ کی آگ — خاک کر ڈالے تمہیں دوزخ کی آگ
ہڈی ہڈی ہو سپردِ التہاب — کھوپڑی یہ بھُن کے ہو جائے کباب [3]

(جادوگرنی کڑھاؤ میں چمچہ ڈال کر آگ اُچھالنے اور شعلے برسانے لگتی ہے........)

جہاں گوئٹے کو مافوق الفطرت مناظر کی عکاسی میں ملکہ حاصل ہے وہاں منوّر کے ترجمے کی نفاست کا بھی جواب نہیں۔

اس ڈرامے میں جہاں جہاں گوئٹے نے ماحول کے مطابق دل چسپ گیت ڈالے ہیں، منوّر نے بھی نہایت دل کش الفاظ اور رسیلی بحروں میں ان کا ترجمہ پیش کر کے ان گیتوں کی موسیقیت اور ان کی منفرد فضا کو محفوظ و برقرار رکھا ہے۔ دروازۂ شہر کے باہر چھٹی منانے والے جوق در جوق آ رہے ہیں۔ کارخانوں کے دستکار و کامگار، کچھ نوکرانیاں، باندیاں، کچھ کالجیٹ طلبا، لڑکے لڑکیاں یہاں ایسٹر کی چھٹی منانے چلے ہیں۔ کچھ کھیتوں اور باغوں میں رواں ہیں، کچھ ندی میں کشتی رانی کر رہے ہیں، کچھ پہاڑی پگڈنڈیوں کا نظارہ کر رہے ہیں۔ لیموں کے پیڑ کے نیچے کسان ناچ گا

---

[1] [2] [3] فاؤسٹ (ترجمہ منور لکھنوی)۔ صفحات بالترتیب ۲۰۷ — ۲۰۸ — ۲۰۸

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

رہے ہیں۔ دیکھیے اردو ترجمے میں ان کا رگیت کیا مزا اور چٹخارہ دیتا ہے :۔

چلا بن ٹھن کر چرواہا
سجیلا بانکا تن تن کے
چلا چرواہا بن ٹھن کے

مزے کا دن ہے یہ اتوار
کیا ہے اس پر خوب سنگار
تھرک کر چھیلا ناچے گا
یہ مردِ البیلا ناچے گا

ہوا میں ہنستا لہراتا
گلے میں اس کے پھول مالا

چٹکارہ بولے جاتا ہے   گرہ یہ کھولے جاتا ہے
وہ اس کا کوہے مٹکانا   نچنیوں میں گھس گھس جانا
نویلی تھی اک چنچل نار   اسے دی اس نے کہنی مار
تھا گرم اس الھڑ کا پارا   پلٹ کر اس نے پھٹکارا
یہ کیا حرکت ہے اے بدکار   نکمے مادر زاد گنوار
یہ کیا اک یووتی پر اُتپات   نہیں کیا مورکھ تو بدذات

اہاہا۔ ہاہا۔ ہاہاہا [1]
چلا بن ٹھن کر چرواہا

اسی نوعیت کے خوش آیند اور مزاحیہ گیت اس کہانی میں متعدد مواقع پر ڈرامہ میں داخل کیے گئے ہیں۔ رندوں کی محفل میں کہیں "ری ٹورل۔ ہاں نورل لی" گایا جاتا ہے تو کہیں "دردِ محبت اٹھے جیسے" کی گت پر چوہے کا مرثیہ گایا جا رہا ہے۔

پھر جب بہروں دن چڑھ آیا   گھر کی رسوئی میں بڑھ آیا

---

[1] فاؤسٹ (مترجم منوّر لکھنوی) حصہ اوّل۔ صفحہ ۷۷ تا ۷۹

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بھُن سا گیا گر کر چُولہے میں   تڑپا ہر پھر کر چُولہے میں
دیکھ کر اُس کو کھاتے پلٹے   باورچن نے مارے ٹھٹھے
آخری سانسیں لیں پھر ایسے
دردِ محبت اُٹھے جیسے [۱]

ہر ناٹک میں کچھ مناظر زیبِ داستان کے لیے اور محض ناظرین کے تفننِ طبع کے لیے بھی ایزاد کیے جاتے ہیں۔ "وال پر گِس کی رات" زیرِ مطالعہ ڈرامہ میں اسی طرح کا ایک ایکٹ ہے شیطان فاؤسٹ کو کوہستانِ ہرز پر لے جاتا ہے جہاں اَرواح اور جنّات کا قیام ہے۔ وہاں جادوگرنیوں کے گانے اس ماحول کی دہشت، پُر اسراریت اور نحوست کی جھلک دکھاتے ہیں۔ جادوگرنیاں مِل کر گا رہی ہیں :۔

رستہ ہے لمبا چوڑا   کیوں ہے یہ دھکم دھکا
چُبھ چُبھ جاتی ہے جھاڑو   دل بَرماتی ہے جھاڑو
پاؤں یہ کیسا پڑتا ہے   بیحد پنجہ گڑتا ہے
گھُٹتا ہے بچّے کا گلا   پیٹ دریدہ ہے ماں کا [۲]

سنجیدہ فلسفیانہ مسائل اور دانش ورانہ مضامین پر مبنی مکالمات کے ترجمے میں بھی منوّر کے قلم نے معرکے کی جولانیاں دِکھائی ہیں۔ فاؤسٹ علمِ مخفی کی مدد سے رُوح کو بلا کر رازہائے سربستہ کو منکشف کرنے کا ارادہ باندھتا ہے۔ کتاب میں عالمِ کبیر کی نشانی اور کرۂ ناسوت (خاکی) کی روح کی علامت کو پڑھ کر رُوح کو بُلاتا ہے اور روح اُسے شرمندہ کر کے واپس چلی جاتی ہے کہتی ہے :۔

تیرے دیدار کے خواہاں تھے طلبگار تھے تم   حبسِ انفاس کے زنداں میں گرفتار تھے تم
بصد اخلاص سرِ بامِ ریاضت چڑھ کر   کر لیا تم نے مجھے بس میں دعائیں پڑھ کر
اَب جو میں سامنے حاضر ہوں تو دہشت کیوں ہے؟   کیا سبب خوف کا آخر ہے یہ وحشت کیوں ہے؟ [۳]

روح اپنے کردار و خواص کی وضاحت بھی کرتی ہے اور کہتی ہے :۔
عمل کا یہ طوفاں، یہ سیلِ حیات   یہ سب شورشِ عالمِ کائنات

۱۔ فاؤسٹ (مترجم منور لکھنوی) حصہ اوّل۔ صفحہ ۷۷ تا ۷۹
۲۔ " " " دوم " ۱۳۷
۳۔ " " " اوّل " ۱۴۱-۱۴۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

مرے سامنے ہے یہ سب ساز و برگ — ہے اک سمت ہستی ہے اک سمت مرگ
یہ اک بحر ہے، بحر بھی بے کنار — کہیں بھی نہیں اس کا پایانِ کار
یہ ہستی کا جیسا بھی ہے تار و پود — مَیں دیتی ہوں اس کو مسلسل وجود ۱؎

فاؤسٹ کا احساسِ ندامت و پشیمانی ملاحظہ ہو:-

مجھ کو اپنی ذات پر تھا یہ گماں — مَیں نہیں ننگِ وجودِ خاکیاں
شکل میری گو خدا کی شکل ہے — خالقِ ارض و سما کی شکل ہے
نور کے عالم میں ہے میرا مقام — ہے تجلّی انتہا میرا مقام
مرتبہ میرا فرشتوں سے بلند — ارجمندی خود ہے مجھ سے ارجمند
اب مگر میرا وہ دعویٰ ہی نہیں — اب کہیں میرا ٹھکانا ہی نہیں
اس قدر نیچے بلندی سے گرا — آسماں گویا زمیں پر آ رہا ۲؎

رُومانی مناظر اور نیاز و ناز کے مظہر مکالمات کا ترجمہ دیکھیں تو وہ بھی اپنی جگہ نِک ٹک اور جاذبِ دل و نظر ہے۔ وہی فاؤسٹ جو احساسِ کم تری کا شکار ہے اور عشق کے معاملے میں مایوس اور دل شکستہ ہو کر شیطان سے کہتا ہے:-

مرے بال کھورے ہیں لمبی ہے داڑھی — نہیں مجھ میں زندہ دلی نام کو بھی
مہم کوئی بھی مجھ سے اب سَر نہ ہوگی — کبھی فتح مندی میسّر نہ ہوگی ۳؎

وہ فاؤسٹ شیطان کی ترغیب کے بعد مارگریٹ (گریٹیشن) کے ساتھ محوِ بوس و کنار ہو کر کہتا ہے:-

دن کبھی کیا نہیں وہ آئے گا — اپنی صورت نہیں دکھائے گا
جب میں آغوش میں بٹھا کے تمھیں — مرکزِ آرزو بنا کے تمھیں
دل کے ارمان سب نکالوں گا — تم سے نقدِ وصال پالوں گا ۴؎

اور جب مارگریٹ اس مشکل کو بسدِّ رہ بتاتی ہے کہ میری والدہ کی نیند بہت کچی ہے۔ وہ

۱؎ فاؤسٹ (منوّر لکھنوی) حصہ اوّل صفحہ ۴۳
۲؎ 〃 〃 〃 ۵۳
۳؎ 〃 〃 〃 ۹۷
۴؎ 〃 〃 〃 ۹۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

جاگ جائے گی تو طوفان کھڑا کر دے گی۔ تو فاؤسٹ جیسا پاک باز دانشور اپنی محبوبہ کو یہ عیارانہ مشورہ دیتا ہے:

مدّت سے ہو تم زینتِ ایوانِ تمنا
یہ کون بڑی بات ہے اے جانِ تمنا!
دیتا ہوں تمھیں ایک عرق کی میں یہ شیشی
موجود دوا اس میں ہے اماں کے مرض کی
پانی میں فقط بوند یہ تین اس کے ملا دو
موقع کوئی مل جائے تو اماں کو پلا دو
پی کر اسے اک آن میں ہو جائیں گی غافل
سو جائیں گی، سو جائیں گی، سو جائیں گی غافل[1]

چوں کہ کالی داس کی مشہور تمثیل "شکنتلا" گوئٹے کے زیرِ مطالعہ آچکی تھی، اور وہ ہندوستانی ڈرامے سے بے حد متاثر تھے، انھوں نے سنسکرت ڈرامے کی تکنیک کا تتبع اپنی "فاؤسٹ" میں کیا۔ سنسکرت ڈرامے کی ابتدا میں سوتر دھار یعنی اسٹیج منیجر اور ڈرامے کے کسی اداکار کے مابین گفتگو کے ذریعے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اسٹیج پر کون سا ڈرامہ دکھایا جانے والا ہے۔ ڈرامہ کے نام کا براہِ راست اعلان کرنے کی بجائے اسٹیج منیجر اور اداکاروں یا کسی اداکارہ کے ساتھ ہونے والی گفتگو میں بات سے بات نکالی جاتی ہے جو پیش کی جانے والی تمثیل کی نشان دہی کر دیتی ہے۔ یہی سلسلہ گوئٹے نے پہلی بار جرمن ڈرامے میں جوڑا اور اس کا اوّلین تجربہ فاؤسٹ میں کیا گیا۔

منوّر نے گوئٹے کے اس ابتدائیہ کو بھی اپنے حسنِ بیان اور دلکش اردو لفظیات سے مرصّع کر کے بڑے سلیقے سے نظم کیا ہے۔ "فاؤسٹ" کے ابتدائی باب میں اسٹیج منیجر ڈرامہ نگار شاعر سے مخاطب ہو کر اور اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کے اعتراف کے بعد اس سے ایک منفرد انداز کا ڈرامہ پیش کرنے کے لیے اصرار کرتا ہے۔ اس طویل گفتگو میں سے مختصر اقتباس دیکھیے:۔

چار بجنے کو ہیں اور شام ہوئی جاتی ہے
اور جیسے ہی ٹکٹ گھر کی کھلے گی کھڑکی
گر دنیں ایک ٹکٹ کے لیے تڑوائیں گے
ہوگی آپس میں کچھ اس ڈھنگ سے ھینگا مشتی
ایسے مجمع کے لیے ایسی کشاکش کے لیے
شاعرِ فرد و یگانہ کی ہے موزوں ہستی
اے مرے دوست! مرے دوست دکھا دو اعجاز
میرے کام آؤ بڑی مجھ پہ عنایت ہوگی[2]

ناٹک کا مسخرہ بھی لقمہ دیتا ہے:۔

کچھ کرشمہ، معجزہ ہو آشکار
شعبدہ سا شعبدہ ہو آشکار
بہترین اک کارنامہ پیش ہو
کھیل وہ ایسا ڈرامہ پیش ہو

---

[1] فاؤسٹ (منوّر لکھنوی) حصّہ دوم صفحہ ۹۸

[2] " " " اوّل " ۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ڈُولہ جس میں ہو جس میں جوشش ہو ۔۔۔ آگہی جس میں ہو جس میں ہوش ہو [1]

پھر سٹیج منیجر کہتا ہے :-

یہ تماشا پیش اگر قسطوں میں ہو ۔۔۔ اس سے تسکین نظر قسطوں میں ہو
پیش اگر کر دو گے سارا کھیل تم ۔۔۔ اپنی ہی عظمت میں ہو جاؤ گے گُم
مجھ کو ڈر ہے پھر نہ ہو گے کامیاب ۔۔۔ کھیل کی ہو جائے گی مٹی خراب [2]

شاعر جواباً کہتا ہے :-

شاید تمھیں توقیر کا احساس نہیں ہے ۔۔۔ فنکار کی عظمت کا ذرا پاس نہیں ہے
فنکار کو یہ پند و نصیحت نہیں اچھی ۔۔۔ کرتے ہو جو تم پیش وہ صورت نہیں اچھی
اُن سے تمھیں کیا کام ہیں جو لوگ ہُنر مند ۔۔۔ مدّاح تم اُن کے ہو سخن ور ہیں جو تنگ بند [3]

سٹیج منیجر :-

خلقت کی طرف دیدۂ فنکار اٹھاؤ ۔۔۔ کرنا ہے اگر کام تو اوزار اٹھاؤ
اب عام پسندی کے تقاضے کی ہو تکمیل ۔۔۔ اس طرح کرو ان کے خیالات کو تبدیل [4]

شاعر :-

جاؤ اور ڈھونڈو کوئی تم اور ہی اپنا غلام ۔۔۔ کچھ تمھیں معلوم بھی ہے کیا ہے شاعر کا مقام
کچھ خبر بھی ہے کہاں ہے اس کا وجدانی مقام ۔۔۔ کس جگہ سے بھیجتا ہے وہ دلوں کو مہر پیام
راہ پر بھٹکی ہوئی دنیا کو لانے کے لیے ۔۔۔ اتحاد و آشتی کے راگ گانے کے لیے [5]

ترجمہ بہت محنت، ریاضت اور مہارت کا کام ہے، پھر دوسروں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی اور وہ بھی نظم کی صورت میں، واقعی پُلِ صراط پر سے گزرنا ہے۔ کیوں کہ محض ایک زبان کی لفظیات کو دوسری زبان کی لفظیات میں منتقل کرنے کا نام ترجمہ نہیں۔ ترجمے میں اصل تخلیق کی روح کو سمونا ہی اصل جوہر ہے۔ لیکن یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ منوّر لکھنوی نے گوئٹے کے زیرِ جائزہ ڈرامے کے تمام متاثر کن عناصر۔ یعنی فلسفیانہ دلائل و تعقّل، سنجیدہ مذہبی عقائد، نیز بذلہ سنجی، ہمدردی، سحر و افسوں، شک و شبہ، طنز و تضحیک، ہجو و طعنہ سنجی، خوش الحانی و موسیقیت، اخلاقی تلقین و ہدایت اور نیک و بد کی داخلی کش مکش وغیرہ کو ثابت و سالم ہی نہیں رکھا، بلکہ انھیں اپنے ترجمے میں اور بھی نمایاں کر دیا ہے۔ زبان و بیان کی نفاست سے اس کے تلذّذ کو فروغ دیا ہے اور اُردو

---

[1] تا [5] فاؤسٹ (ترجمہ منوّر لکھنوی) پہلا ایڈیشن ۱۹۶۹ء صفحات بالترتیب ۵-۶-۷-۷-۸

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کے قاری کے لیے فاؤسٹ کے کرداروں کی نفسیاتی کیفیات، فکری رویوں اور دو صدی قبل کے جرمن معاشرے کی تفہیم و آگہی کو سہل تر بنا دیا ہے۔ نیز اردو ڈرامے کے قلیل تمثیلی سرمایہ میں اس جرمن ڈرامے کے اضافے سے "فاؤسٹ" کے ابتدائیہ صفحات میں پیش کیے گئے اس دعوے پر مہرِ تصدیق ثبت کردی ہے کہ ؎

صدیوں رہے گا جس پہ ادب دوستوں کو ناز
ہم نے ادب دیا ہے وہ اُردو زبان کو

سمندری جوان اور دوسرے نادر جرمن افسانے

جرمن زبان کے یہ افسانے جرمنی کے مشہور ادیب اور تنقید نگار وولف گانگ لنگین بوکر نیز دیگر ادیبوں کے انتخاب سے لیے گئے ہیں اور سرزمینِ ہند پر پہلی مرتبہ انھیں قارئینِ اُردو سے روشناس کرانے کا فخر منوّر لکھنوی کو حاصل ہوا۔ اس مجموعے کے کوائف اشاعت حسبِ ذیل ہیں:

سنِ اشاعت : ستمبر ۱۹۶۸ء

ضخامت : ۲۰۶ صفحات

مترجم : منوّر لکھنوی

ناشر : آدرش کتاب گھر، دریا گنج۔ دلی۔ بشرکت ہورسٹ ارڈمین ورلاگ مغربی جرمنی و سوئٹزرلینڈ۔

اس کتاب میں مشمولہ افسانے دوسری جنگِ عظیم کے بعد کے جرمنی کی ادبی، ثقافتی، سیاسی اور تمدنی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ یورپ کی دونوں عظیم جنگیں جن کا محرک خود ملک جرمنی تھا۔ جرمن قوم کی زندگی پر اَمِٹ ذہنی اور نفسیاتی اثرات چھوڑ گئیں۔ یہ جرمن قوم کے فکری رُیوں میں جس حیرت انگیز تغیّر کا باعث بنیں وہ دوسری اقوام کے لیے بھی ایک درسِ عبرت تھا۔ جرمن ادب اور لسانیات پر ان تبدیلیوں نے جو اثرات مرتب کیے اور انھوں نے جن نئے ادبی رُجحانات کو جنم دیا وہ ان منتخب افسانوں میں پُر تا ثر ... ہیں

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اِن کہانیوں کا انتخاب سویڈن کے ایک معروف اہلِ قلم سیگرڈ کاہلے نے کیا تھا۔ اور ان کہانیوں کے اپنے انگریزی ترجمے میں اُس نے جرمن ادب کے رجحانات پر ایک سیر حاصل تبصرہ بھی شامل کیا تھا۔ جس کا اُردو ترجمہ زیرِ نظر کتاب میں منوّر نے شامل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جرمنی کے نازی رہنماؤں نے نہ صرف اتحادی ملکوں کو بمباری کا شکار بنایا بلکہ جرمن زبان کو بھی تحس نحس کر کے رکھ دیا سیاسی پروپیگنڈہ کی غرض سے جرمن اُدب کو کلیتاً نظریاتی بنانے کا عمل ۱۹۳۳ء میں ہٹلر کے برسرِ اقتدار آتے ہی شروع ہوگیا تھا۔ سینکڑوں مصنف جو"خون اور مٹی" کے اِس نظریے سے سمجھوتہ نہیں کر سکے اور آزادانہ لکھنا اپنا دھرم سمجھتے تھے، ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ کچھ نے ذہنی فرار کی راہ اپنائی اور ہلکے پھلکے موضوعات پر لکھنا شروع کر دیا۔ یا ایسی اشارتی عبارت اور اسلوب استعمال کرنے لگے جو نازی جابروں کی گرفت میں نہ آسکے۔ اکثر مصنّفوں نے "خون اور مٹی" کے نظریے سے سمجھوتہ کر لیا۔ لیکن جنگ کے بعد ایسے مصنّفوں کی تخلیقات یکسر نظر انداز کر دی گئیں اور جلاوطن ادیبوں کو جرمنی کے اُدبی حلقے میں واپس لا کر اُن کی تصانیف شائع کی گئیں تاکہ نئی جرمن نسل کی رہنمائی کی جاسکے اور نظریاتی ادب کے اثرات کو ذہنوں سے زائل کیا جاسکے۔ نیز ۱۹۴۵ء میں دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے ساتھ ہی عالمی اُدب کے دروازے جرمنوں کے ذہنوں پر وا کر دیے گئے، جو نازیوں نے یکسر بند کر رکھے تھے۔

۱۹۶۰ء تک کے جرمن اُدب میں ایک پوری نسل کی مایوسیوں اور بے چارگیوں کی تصویر تھی۔ جنگ سے اہلِ جرمنی کی تباہیوں، بیواؤں، یتیموں اور جنگ کے دوران جسمانی طور پر ناکارہ ہوئے اشخاص کی دُبی دبی چیخیں تھیں۔ ادیبوں کی اس نسل کے پاس دینے کو صرف ایک ہی پیغام تھا اور وہ یہ ۔ کہ اب اس کے بعد کوئی جنگ ہرگز برپا نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن جرمنی کو دو حصوں میں تقسیم کر دینے والی دیوار منشائے قدرت کے خلاف تھی۔ اگرچہ مشرقی جرمنی میں جلاوطن کمیونسٹ ادیب اب واپس آگئے تھے۔

جرمن مصنّفوں کی جدید نسل اسلوب اور زبان کی حفاظت بڑی چوکسی سے کر رہی ہے۔ وہ اب عُلانیہ یا خفیہ آمرانہ تاثرات کے خلاف زبان کی تجدید اور محافظت کو ضروری سمجھتی ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ "زبان کی طہارت زندگی کی طہارت ہے۔ اس کی روشنی زندگی کی روشنی ہے۔"[۱] منوّر نے مابعد جنگ کے اس پیش منظر اور پس منظر کو ذکاوت و ذہانت کے ساتھ سمجھتے ہوئے جرمن ادیبوں

۱؎ سمندری جوان اور دوسرے نادر جرمن افسانے (ترجمہ منوّر لکھنوی) ۱۹۶۸ء ایڈیشن۔ صفحہ ۳۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کی نو (۹) افسانوی تخلیقات کو ترجمے کے دائرے میں لیا ہے۔

"سمندری جوان" اِس افسانوی مجموعے کا اوّلین اور اہم ترین افسانہ ہے جو جرمن کہانی کار ہینس ایرک نوسیک کی تخلیق ہے۔ اس افسانہ کا اسلوب نیم حقیقی نیم تجریدی ہے۔ سمندر میں بسی جل پری سے اچانک ملاقات ایک مافوق الفطرت واقعہ ہی سہی لیکن اکثر قصے کہانیوں اور ادبی یادداشتوں میں اس کا ذکر آتا رہتا ہے۔ اس کہانی میں جل پری کے بجائے سمندر سے اچانک نمودار ہونے والا ایک حسین مافوق الفطرت جوان لڑکا کہانی کا ہیرو ہے۔ اُسے مقابل رکھ کر افسانہ نگار نے افسانے کی ہیروئن کے بیانیہ میں دوسری جنگِ عظیم کی نازل کردہ تباہیوں اور ہولناکیوں کی منظر کشی کی ہے اور اُن سے جنم لینے والی عوام کو درپیش مشکلات پر سے نقاب اُٹھائے ہیں۔ ہیروئن کا خود کلامی کا انداز جنگ کے تعلق سے مصنّف کے ذہنی رُویے اور تنقیدی ردِ عمل کو خود میں سمیٹے ہوئے ہے۔ جسے منوّر نے اپنے پُر اثر ترجمے کے ذریعے اردو کے قاری تک پہنچایا ہے۔ ترجمے کی سلاست دیکھیے:۔

"ہنتا نے سر جھکا کر دیکھا کہ آخر معاملہ کیا ہے اور اس کو ایسا محسوس ہوا کہ ایک چھوٹے سے ہاتھ نے اس کے زانو کو مضبوطی سے جکڑ لیا ہے۔ یہ ہاتھ بالکل ننھا سا تھا۔ درحقیقت یہ ایک توہم سا تھا جو پانی کے سبب سے دل میں پیدا ہو گیا تھا۔ ہنتا اس وقت حیرت زدہ تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ نصف کے قریب وہ گھوم گئی اور اُس نے پانی کی تہہ میں دیکھا۔ اُس کو اپنے پیروں کے قریب ایک سفید شکل کی سی کوئی چیز نظر آئی لیکن وہ اس کو بالکل پہچان نہیں پائی۔ اس نے چیخ کر کہا" مجھے جانے دو" اس کے یہ کہتے ہی اُس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی مگر وہ شکل سمندر کی تہہ میں ہنتا کے گرد گھومتی رہی۔ ...... اس نے پھر چیخ کر کہا" باہر نکل آؤ"، اس کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ پانی پیروں سے اوپر کی طرف اس کے جسم پر دباؤ ڈال رہا ہے۔ اتنے میں ایک جوان کا سر سمندر سے پانی سے باہر نکل آیا۔[1]

ایک اور پیراگراف دیکھیے:۔

---

[1] سمندری جوان اور دوسرے نادر جرمن افسانے (مترجم منوّر لکھنوی)۔ صفحہ ۴۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

"نوجوان نے فرماں برداری سے کام لیا۔ جب وہ ریت کے ساحل کی طرف آیا اس وقت ہنّا کو محسوس ہوا کہ نوجوان تو مادر زاد ننگا ہے۔ اس سے ہنّا کے دل میں کسی قدر پس و پیش کی صورت پیدا ہوگئی۔ اس پر نوجوان فوراً ہی خاموش کھڑا ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ اس کو اندیشہ تھا کہ وہ اس کا تعاقب نہیں کرے گی۔ ہنّا نے چلّا کر پھر اس سے کہا۔" اور آگے کی طرف بڑھتے چلے جاؤ۔ وہ میرا غسل کرنے کا تولیہ پڑا ہے اسے اپنی کمر سے لپیٹ لینا۔"[۱]

نازی حکمرانوں نے ہر تندرست و توانا لڑکے کو جنگ میں جھونک دیا۔ وہ جبراً بھرتی کرکے ایک پوری نسل کو توپوں کا لقمہ بنا رہے تھے۔ جل پری کی طرح سمندر سے برآمد ہونے والے لڑکے کو مخاطب کرکے کہانی کی ہیروئن کہتی ہے۔

"اب ہنّا نے آہیں بھر بھر کر پوچھا" تو پھر میں تم سے کس طرح پیش آؤں۔ وہ لوگ تو تمہیں فوجی پوشاک پہنا کر لڑائی پر بھیج دیں گے۔ یہی سلوک وہ لوگ اور سب کے ساتھ کرتے ہیں اور میں اس بارے میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتی.......

اگر تم یہاں سے چند قدم آگے اندرونِ ملک جاؤ تو تم کو پتہ چلے گا کہ ہر چیز تباہ و برباد ہوچکی ہے۔ ہم لوگ تو ان حالات کے عادی ہوگئے ہیں۔ اب ہمیں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔"[۲]

اس مجموعے کی دوسری کہانی "تفرقہ" وولف ڈیٹرش شنزرے کی تخلیق ہے۔ جرمنی کی راجدھانی برلن کو دو حصّوں میں تقسیم کرنے والی دیوار جو اتحادیوں نے باشندگانِ برلن پر زبردستی ٹھونس دی تھی۔ تاریخ کے کئی دہاکوں تک ان کی چھاتی پر مونگ دلتی رہی۔ اس سیاسی بندر بانٹ کے باعث جرمنوں کو جس اقتصادی اور جذباتی بحران و ہیجان کا سامنا کرنا پڑا وہ اس افسانے کا مرکزی خیال ہے۔ مغربی برلن جو امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے زیرِ اثر تھا، خوش حال تھا۔ وہاں زندگی کی تگ و دو، جوش، ولولہ اور نشاط انگیز سرگرمیاں تھیں۔ مشرقی برلن جو کمیونسٹوں کے زیرِ اثر تھا عسرت زدہ اور بجھے بجھے مایوس لوگوں کا مسکن تھا۔ یہاں کے ایک محنت کش جوڑے کو زیرِ نظر افسانے کا مرکزی کردار بنا کر ان کے مکالموں کے ذریعے شنزرے نے مشرقی برلن کے باشندوں کی نفسیاتی

---

[۱] [۲] سمندری خوان اور دوسرے نادر جرمن افسانے (مترجم منّت لکھنوی) صفحہ [illegible] بالترتیب

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کش مکش کی عکاسی کی ہے۔ جو مغربی برلن والوں کی پُر رونق اور متمول زندگی کو رشک اور حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ایلیسے مغربی برلن کی طرف ہجرت کرنے کے ارادے سے اپنے شوہر والٹر سے علیحدگی کا صدمہ برداشت کرنا بھی گوارا کرلیتی ہے۔ اُسے پولیس کی نظریں بچا کر مغربی برلن کی ٹرین میں سوار ہونا ہے۔ منوّر کے اُردو ترجمے میں اُس کی ذہنی کیفیت کا بیان دیکھیے:

"..... اس دروازے کی دوسری جانب پہنچ جانے پر اس کے لیے ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا تھا۔ یہ شہر برلن اِدھر بھی تھا' اُدھر بھی۔ نباتات کے اُگانے کا سلسلہ جاری تھا۔ چڑیا گھروں سے بھی اسی طرح کوّوں کی آواز سُنائی دیتی تھی جس طرح اِدھر کے علاقے میں شنکل پلاٹز کے درختوں میں یہ کوّے بولا کرتے تھے۔ بایں ہمہ دوسری جانب ایک نئی دنیا کے آغاز کا احساس ہو رہا تھا۔ اُس طرف کی آب و ہوا میں بھی آزادی کا وجود نظر آتا تھا۔" [له]

لیکن مغربی برلن کے ریلوے سٹیشنوں سے گزرتے ہوئے ایلیسے کو طرح طرح کے خیالات گھیرے رہتے ہیں۔ اُس کے تصوّر میں مشرقی برلن والوں کے اُداس چہرے اُبھر آتے ہیں۔

"وہاں بیٹھے ہوئے سارے لوگ بالکل اس سے ملتے جلتے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ تھکے ماندے تھے۔ ان کی طبیعت نڈھال ہو رہی تھی۔ ان کے شانے گویا کسی بڑے بھاری بوجھ سے خمیدہ تھے۔ لیکن یہ سب لوگ برلن کے رہنے والے تھے۔ یہ برلن کے وہی اصلی باشندے تھے جنھوں نے مشرقی برلن میں جنم لیا تھا اور بڑے صبر و ضبط کے ساتھ انھوں نے طرح طرح کی سختیاں جھیلی تھیں۔ یہ لوگ مشرقی برلن سے فرار نہیں اختیار کر رہے تھے..... ان کو اپنے وہ گھر آنگن بڑے عزیز تھے، جنھیں جنگ نے برباد اور خستہ حال بنا دیا تھا۔" [لله]

ایلیسے انہی سوچوں کے زیرِ اثر اگلی ٹرین سے مشرقی برلن میں اپنے گھر کو پلٹ آتی ہے۔ دوسری بار اس کا شوہر والٹر بھی مغربی برلن کو ہجرت کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بھی ایسے ہی ذہنی کرب سے گزر کر مشرقی برلن کی اپنی مفلوک الحال زندگی میں لَوٹ آتا ہے۔

له لله سمندری جوان اور دوسرے نادر جرمن افسانے (منوّر لکھنوی) صفحات بالترتیب ۷۷، ۸۰، اور ۸۲

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اگلی کہانی "روپوشی" جرمن افسانہ نگار الزبتھ لنگیسر کی تصنیف ہے۔ جس میں ایک یہودی عورت کی اپنی ایک جرمن سہیلی کے گھر میں پناہ لینے اور چھپے رہنے کے واقعے کو افسانے کا پلاٹ بنایا گیا ہے۔ نازیوں کے دورِ اقتدار میں جرمنی میں رہنے والے یہودی خاص طور پر حکمرانوں کے عتاب کا نشانہ بنے۔ نام نہاد نازی قانون کے شکنجے سے بھاگ نکلنے والی اس یہودن کو بالآخر گرفتار کر لیا جاتا ہے اور پناہ دینے والے بھی اس کی پاداش بھگتتے ہیں۔

تیسری کہانی ہے "اس منگل کو" روس کے ساتھ نازیوں کو جنگ بہت مہنگی پڑی۔ جرمنی کے لاکھوں نوخیز لڑکے دشمنوں کے ساتھ جنگ میں مارے گئے یا روس کی شدید سردی کا شکار ہو کر ہلاک ہوئے یا اپاہج ہو گئے۔ اس کہانی میں بھی جنگ کی مذمت بچّوں کے جذبات کو روشنی میں لا کر کی گئی ہے۔ اس افسانے کا مختصر سا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

" وہ بھی منگل کا دن تھا جب اُلّا کے والد کپتان ہنسے کے مُردہ جسم کو اسٹریچر پر لاد کر ہسپتال کے باہر پھینکا گیا۔ اُس منگل کو ___
اُلّا شام کے وقت بیٹھ گئی۔ اور اس نے لکھنے والی کتاب میں بڑے حرفوں میں لکھا:۔

" لڑائی میں سب باپ سپاہی ہوتے ہیں
لڑائی میں سب باپ سپاہی ہوتے ہیں"
اُس منگل کو اُس نے یہ عبارت دس بار بڑے حرفوں میں لکھی ہے[1] "

زیرِ نظر افسانوں کے تراجم میں کہیں کہیں الجھاؤ بھی نظر آتا ہے، جس کے اسباب کتابت کی اغلاط کے علاوہ غیر ملکی زبان کے جداگانہ مزاج اور اسلوبِ نثر میں بھی ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ "مُردہ لڑکیوں کی سیر" اس مجموعے کی نویں اور آخری کہانی ہونے کے علاوہ سب سے طویل کہانی ہے۔ کہانی بیان کرنے والی لڑکی کو اپنی سیاحت کے دوران اپنی کچھ مرحوم سہیلیوں کی رُوحیں دکھائی دیتی ہیں۔ فلیش بیک (FLASH BACK) میں ہر لڑکی کی ایک الگ کہانی ہے۔ ان لڑکیوں کو نازی عہدِ حکومت کی سخت گیری کا شکار ہو کر موت کے گھاٹ اُترنا پڑا

---

[1] سمندری جوان اور دوسرے نادر جرمن افسانے (منوّر لکھنوی) صفحہ ۱۱۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اس کہانی میں خاصا الجھاؤ ہے جس کا عکس ترجمے پر بھی پڑا ہے۔ یہی الجھاؤ "اندھیرا اُجالا" نام کے افسانے میں بھی ہے۔ جس میں شرابیوں کی بہکی بہکی باتیں ہیں۔ کہانی کسی منطقی انجام تک پہنچتی ہی نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ منوّر لکھنوی نے ان کہانیوں کا ترجمہ فرمائش پر اور جلدی جلدی میں کیا ہے۔ جس کے باعث کہیں کہیں زبان کی معمولی لغزشیں نظر آتی ہیں۔

مجموعی طور پر یہ تراجم کامیاب اور دل کش ترجمے ہیں، جن سے عصری حقائق اور ان افسانوں کے عہدِ تصنیف کے ماحول، واقعات اور اُن کے محرکات، نیز اُن کے تئیں ان کہانیوں کے کرداروں کے ردِ عمل کی صحیح صحیح عکاسی ہوتی ہے۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

باب پنجم (۵)

متفرق تراجم اور نثری تالیفات

① افکارِ بلند
② درخشاں نکتے
③ جین گرنتھ سار
④ درسِ عظیم (وِدُر نیتی) اور دیگر کتابچے
⑤ متفرق نثری تصانیف / مجاہدۂ حُسینی اور اِسلام
⑥ صدر کی گیتا
⑦ لمعاتِ اُفق
⑧ منوّر کی نثر کا مجموعی تاثر

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

متفرق تراجم اور نثری تالیفات

افکارِ بلند (قلمی مسوّدہ)

یہ کتاب مختلف ممالک کے مشاہیر کے منتخب ہمہ گیر اقوال کے منظوم ترجموں پر مشتمل ہے۔ جن ممتاز ہستیوں کے اقوال ان تراجم کے لیے منتخب کیے گئے ہیں، ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، رام کرشن پرم ہنس، مہاتما ایمرسن، وکٹر ہیوگو، حضرت یسوع مسیح، گوتم بدھ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ محدود تعداد میں کچھ چیدہ اقوال مہاکوی گوسوامی تلسی داس، فیضی، قاضی عبدالغفار خاں، ڈاکٹر یوسف حسین، سرسید احمد خاں، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر مسعود حسن رضوی، محمد حسین آزاد، خواجہ احمد فاروقی، مولوی عبدالحق، الیگزانڈر ڈیوما، قاری محمد طیب، گورونانک، رحیم خانخاں کے بھی اس کتاب میں منظوم کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا قلمی مسوّدہ منوّر لکھنوی کے صاحبزادے عزیزی کلدیپ سکسینہ کے پاس محفوظ ہے۔ منوّر اپنی زندگی میں اسے شائع نہیں کروا پائے۔ سرورق پر منوّر کے درجِ ذیل اشعار نقل کیے گئے ہیں:۔

اِک برکتِ عظیم خیالِ عظیم ہے
واجب ہے شکر اُس کے لیے کردگار کا
بعد اُس کے ایسے شخص کا احسان مانیے
پہلے پہل زبان سے جس کی ہو یہ ادا
ممنون کچھ ہوں اُس کے بقدرِ گراں پھر آپ
پہلے پہل جو اس کا حوالہ کرے عطا

ان اشعار سے کتاب کی تصنیف کے محرکات و اسباب کی نشان دہی ہوتی ہے۔

سب سے پہلے مولینا ابوالکلام آزاد کی مشہور تصنیف "غبارِ خاطر" سے لیے گئے چند اقوال کے ترجمے شامل کیے گئے ہیں۔ مولانا آزاد مرحوم وہ عظیم المرتبت ہستی تھے۔ جس نے عنفوانِ شباب ہی میں علمائے دین سے اپنے علمی تبحر کا لوہا منوا لیا تھا۔ ان کے سحرِ خطابت سے سارا برِّ صغیر ہند و پاک مبہوت ہو کر رہ گیا تھا۔ انھوں نے مشرق و مغرب کے فلسفوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ بیک وقت ایک عالمِ دین، فقیہہ، مفکّر، مُدبّر، شاعر، نثر نگار، فلاسفر، صحافی اور مقرر سبھی کچھ تھے۔ وہ ایک معقولیت پسند اور

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

مخلص سیاسی رہنما، قوم پرست اور بے تعصب ذہین اور معاملہ فہم سیاستداں، بے نظیر خطیب اور سب سے بڑھ کر ایک سلیم الفطرت انسان تھے۔ مولانا حسرت موہانی نے ان کی نثر کے اسلوب کے بارے میں فرمایا تھا کہ "جب سے ہم نے آزاد کی نثر دیکھی ہے ہماری نظم میں مزا نہیں رہا۔" [۱]

سید سجاد حیدر نے فرمایا تھا:۔

"میرا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا تو مولانا ابوالکلام کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی۔" [۲]

وہ گفتار کے غازی نہیں بلکہ کردار کے غازی بھی تھے۔

منوّر جیسے شریف النفس اور عالی ظرف ادیب کے لیے مولانا آزاد جیسے عظیم ہم عصر مفکّر کے ارفع افکار کی جانب متوجہ ہونا فطری میلان کی بات تھی۔ اس لیے اپنی زیرِ تبصرہ تصنیف میں انھوں نے مولانا آزاد کے اقوال کو تقدیم و اوّلیت دی۔ ذیل میں صرف تراجم ہی دیے جا رہے ہیں لیکن کچھ اقوال کا انتخاب کر کے:۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے اقوال

امّید و یقیں:۔

گُل ہو گئے چراغ امید و یقین کے — اِک شمع بھی جلی نہ سرِ انجمن نئی

کہاں عقل کہاں دل:۔

ہے مسلّم عقل کی بے چارگی — منطقی کیوں منفعل ہوتا نہیں

اضطراب و اشتیاق اس میں کہاں — سینۂ حکمت میں دل ہوتا نہیں

عقل پرست سے:۔

خلفشار اور بھی اُٹھے گا دماغ و دل میں — عقل کو عشق کے نزدیک نہ آنے دینا

خود اعتمادی:۔

مَیں اِک قدم بھی بغیر ان کے چل نہیں سکتا — یقیں ہے دوست مرا اعتقاد رہبر ہے

بے مصرف آگہی:۔

قربان اس شعور پہ اس علم کے نثار — آگاہ دو جہاں سے ہیں اپنی خبر نہیں

---

[۱] ہفت روزہ "صدائے پنجاب" شمارہ ۲ تا ۹ مارچ ۱۹۵۸ء، صفحہ ۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE,2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

خودنگری:۔ جو چاہتا ہے کھلیں تیرے عیب خود تجھ پر
خود اپنی گھات میں بیٹھ اور نکتہ چینی کر

کیرکٹر:۔ اب طبیعت کا یہ سانچہ اس قدر مضبوط ہے
توڑ تو سکتے ہو لیکن موڑ ناممکن نہیں

جرأتِ رندانہ:۔

تر دامنی میں تو نہیں کوئی مضائقہ
آلودگی پکڑ نہ سکے دامنِ حیات

سیرِ حقیقت:۔ اب چاہے جس جگہ سے حقیقت کی سیر ہو
کھولے ہیں بے شمار جھروکے مجاز نے

غلط کاریاں:۔

کچھ غلط کاریاں بھی لازم ہیں
زندگی بے مزا ہے ان کے بغیر

عمر خیّام کا ایک قول

توبہ کر لیں گے کسی روز خدا کے آگے
طعنہ زن کیوں ہے؟ جو پینے سے حذر کرتا ہے

تو ہے اس بات پہ نازاں کہ نہیں تو مے خوار
مے خوری سے بھی بُرے کام مگر کرتا ہے

جپ جی صاحب گورو نانک دیو کی تصنیف ہے۔ ہندو اور سکھ بیشتر باقاعدگی سے روزانہ اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ حمدیہ اشعار کا یہ صحیفہ ۳۸ پوڑیوں (بندوں) پر مشتمل ہے۔ ان میں سے کچھ پوڑیوں کا ترجمہ منوّر نے "افکارِ بلند" میں شامل کیا ہے۔ مثلاً:۔

یاد رکھے کوئی اُس کو کہ فراموش کر دے
وہ تو ہر حال میں بندے کی خبر رکھتا ہے

جو نہیں قائل خدا کا ہائے اُس کو کیا کہیں
سامنے کی چیز بھی اُس کو نظر آتی نہیں

سوامی رام کرشن پرم ہنس کے کچھ اقوال

سوامی رام کرشن پرم ہنس خدا رسیدہ سنت تھے۔ وہ بنگال میں پیدا ہوئے اور بھگوتی دُرگا کے کالی رُوپ کے پرستار تھے۔ مشہورِ زمانہ مفکر اور سادھو سوامی وویکانند انہی کے شاگرد تھے۔ سوامی رام کرشن کے کچھ اقوال کا منظوم ترجمہ منوّر کے الفاظ میں دیکھیے:۔

کتابی علم کا کھوکھلا پن:۔

بارش کے ذکر سے ہیں کتابیں بھری ہوئی
پانی کی ایک بوند میسر مگر نہیں

ظرفِ عارف:۔

ہے محوِ بحث ہیں وہ جو ہے دید سے محروم
مگر خموش ہے جس نے خدا کو دیکھا ہے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

مردِ آزاد :- مردِ آزاد ہے سوکھے ہوئے پتّے کی طرح ‏ ‏ مردِ آزاد کا کیا راستہ منزل کیسی

عارف دوبارہ نہیں جنم لیتے :-

حاصل ہے جنھیں عرفاں ہوتے نہیں پھر پیدا ‏ ‏ بوتا ہے کہیں کوئی اُبلے ہوئے دانوں کو ؟

سچی پیاس :- کسی طرح بھی ہو اس آگ کو بجھانا ہے ‏ ‏ لگی ہو پیاس تو پانی کہیں بھی پی لینا

متفرق اقوال کے تراجم

قدرت کبھی انساں کو مایوس نہیں کرتی ‏ ‏ جس راہ سے ڈھونڈوگے اس راہ سے پاؤگے (بھگوت گیتا)

کوئی یہ آج بیاباں میں صدا دیتا ہے ‏ ‏ بے خطر پاؤں بس اب راہِ خدا میں رکھ دے (متی انجیل)

خدا کی طاقتوں کو کس لیے محدود کرتے ہو ‏ ‏ خدا چاہے تو پتھر سے بھی ہو جائے ہویدا (؍؍)

بچاتی ہے ہمیں شرمندگی سے ‏ ‏ خموشی گفتگو سے لاکھ بہتر (ایمرسن)

ترک کرتا ہے لذتیں دانا ‏ ‏ ان پہ نادان دل لٹاتا ہے

قے جو کرتا ہے آدمی کوئی ‏ ‏ اُسے کتا مزے سے کھاتا ہے (رحیم خانخاناں)

شُدنی پر اگر انسان کا قابو ہوتا ‏ ‏ نہ کبھی بارِ اَلم سر پہ اٹھانا پڑتا

دوڑتے رام نہ زنہار ہرن کے پیچھے ‏ ‏ ساتھ راون کے نہ سیتا کو بھی جانا پڑتا (؍؍)

غیر کے قابو میں جو رہتا ہے جو محکوم ہے ‏ ‏ خواب میں بھی اُس کو راحت مل نہیں سکتی کبھی (تلسی داس)

فن کی بقا کے مدعی غم کو بھی تو دوام دے ‏ ‏ فن کے بغیر غم نہیں، غم کے بغیر فن نہیں

(ڈاکٹر یوسف حسین)

جسم کی پرورش ہے موت مگر ‏ ‏ روح کا تو زیاں نہ ہونے دے (ڈاکٹر نذیر احمد)

ہے کوئی اور ہی مختار بالیقیں اپنا ‏ ‏ کہ اختیار ارادے پہ بھی نہیں اپنا (شوپن ہار)

اگرچہ منوّر کا انتخابِ اقوال بیشتر اخلاق و ادب کے موضوعات سے منسلک رہا ہے اور اخلاق کا گہرا رشتہ مذہب اور دینی تعلیم کے ساتھ ہے لیکن منوّر نے "افکارِ بلند" میں غیر مذہبی شخصیات کے اقوال کو بھی منظوم تراجم کی صورت میں شامل کیا ہے۔ ان تراجم میں بھی منوّر کی وہی خوش سلیقگی، حقیقت نگاری اور فنی مہارت کارفرما ہے جو ترجمے کو اصل سے قریب تر کرتی ہے۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، اردو زبان میں اس طرح کے بیش بہا اقوال اور کارآمد افکار

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کا فصیح و بلیغ اور نک سُک منظوم ترجمہ کر کے اسے کتابی شکل دینے کی کاوش و کوشش ابھی تک کسی اور شاعر نے نہیں کی ہے۔ یہ ایک انقلابی جدّت و جرأت ہے جس کا سہرا منوّر کے سر بندھنا چاہیے۔ افسوس کہ وہ اپنی حیات میں اس بیش بہا ادب پارے کو زیورِ طبع سے آراستہ کروا کر یہ نادر تحفہ قارئین اردو کو پیش نہیں کر پائے۔ تاہم ان کی یہ کاوش ادب دوستوں اور ناشرانِ اردو کی توجہ کی مستحق ہے۔

اس حسین و وقیع علمی وادبی کاوش سے نہ صرف منوّر کی اخلاق پسند اور فیض رساں شخصیت کا ایک اور گوشہ ابھر کر محققینِ ادب کے سامنے آتا ہے۔ بلکہ اس طرح کی شاعری اور ادب کی افادیت کی جانب بھی تحقیق کی نگاہ جاتی ہے، جو مختلف اندازِ فکر، اور مکاتیبِ خیال کے نمائندہ مشرقی و مغربی مشاہیر اور عظیم شخصیتوں کے اقوال و افکار کو یکجا کر کے کم از کم وقت میں ایسے گوناگوں فکری شہ پاروں سے فیضیاب ہونے کی سعادت و سہولت قاری کو فراہم کرتا ہے، جو علمی، اخلاقی اور سیاسی بصیرت کی ایک دنیا خود میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ منوّر مابعدِ آزادی کے مادّی ترقّی کے ریلے کے ان منفی اثرات سے متفکر اور رنجیدہ تھے جو اخلاقی اور روحانی قدروں پر یلغار کر رہے تھے۔ اس نفسا نفسی کے عالم میں منوّر کو اہلِ وطن کے ذہن و نظر تک اس طرح کا ادب پہنچانے کی ضرورت کا شدید احساس رہا جو متزلزل اور منہدم ہوتے ہوئے اخلاقی ڈھانچے کو سہارا دے سکے اور ماضی کی مفید اور صحت مند قدروں کی بحالی کر سکے۔

درخشاں نکتے یا "وویک منی"

شری چدا کاشی ستیہ دھرم منڈل (رجسٹرڈ) کے بانی ویدانت آچارج شری ۱۰۸ (ڈاکٹر) چیتن آنند جی مہاراج چدا کاشی، آیورویدبر ہسپتی۔ ڈی۔ ایس سی آیوروید شرومنی (لنکا) کے ارشاداتِ گرامی کا مجموعہ ہے جسے منوّر لکھنوی نے اردو نثر کا جامہ پہنایا۔ یہ غیر مجلد صحیفہ ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی تاریخ اشاعت ۲۵ ستمبر ۱۹۶۷ء ہے اور اسے شری ست دھرم منڈل (رجسٹرڈ) سوامی ہیمراج مشن مارگ ۵/۷۔ ایسٹ پٹیل نگر نئی دلّی ۸ نے شائع کیا۔

کتاب کے شروع میں اصل مصنف شری چیتن آنند جی مہاراج کا دعائیہ شامل ہے اور پھر "وویک منی" کے سوتروں کا انگریزی ترجمہ کرنے والی چندر کانتا جی کے دیباچہ کا اُردو ترجمہ "اشارے" کے زیرِ عنوان دیا گیا ہے جس میں وہ فرماتی ہیں:-

" زندگی اور اس کے گوناگوں مسائل کے سلسلے میں مسلک و ہدایت کے نقطۂ نظر سے چیتن ایتی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تقدس اور اہمیت کی حامل ہیں، یہ صحیفہ ان کا ایک بے بہا اور نادر گلدستہ ہے ۱۰۸ سوتروں کی شکل میں اس کتابچے کے اندر پڑھنے والوں کے لیے ایک باقاعدہ تشریح کے ذریعے ایک ہدایت اور ایک ایسی تحریک پیش کی گئی ہے جس کی انھیں روحانی اور ساتھ ساتھ مادی ترقی کے لیے ضرورت ہے۔ زندگی کو مادی سطح پر ان سہولتوں اور حالات کے ساتھ بہرصورت بسر کرنا ہے جو سائنس اور صنعت کے اس مشینی دور نے ہمیں مہیا کر رکھی ہیں۔ لیکن یہ زندگی فلسفیانہ انداز کے ساتھ بسر کرنا ہے..... راجہ جنک بڑی شان و شوکت اور اقتدار و اختیار کے ساتھ بادشاہوں کی طرح رہتے تھے لیکن ان کا رجحانِ طبع دنیا سے علیحدگی، کنارہ کشی اور ترک کی طرف تھا۔ اس کے ساتھ وہ پوری دماغی قوت کے ساتھ کام کرتے تھے۔ یہ ہے اصل ویدانت جس میں مادہ اور روح یا آرٹ اور فلسفہ دونوں کے درمیان ایک ربط ایک سلسلہ موجود ہے۔"

اگلے چند صفحات میں منوّر نے اپنے روحانی رہنماؤں کی ایک فہرست درج کی ہے اور کچھ اشعار میں اصل مصنّف سے اظہارِ عقیدت کیا ہے۔ منتخب اشعار درج ذیل ہیں:-

چیتن آنند مہاراج کی جے لکھتا ہوں — اپنے سرِ مُور کی سرتاج کی جے لکھتا ہوں
اِن کی ہستی مِرے مرشد کی اُدا رکھتی ہے — اِن کی بانی مِرے ہادی کی صدا رکھتی ہے
اس قدر نور چراغِ تہہِ دامن میں ہے — پرم آنند کا جلوہ رُخِ روشن میں ہے
یہ شرف بھی مجھے تقدیر سے ہاتھ آیا ہے — سوتروں میں جو سبق آپ نے فرمایا ہے
اس کو میں لہجۂ اُردو میں بیاں کرتا ہوں — اس کے اسرارِ نہانی کو عیاں کرتا ہوں

ذیل میں چند سوتروں کے نثری ترجمے بطورِ نمونہ درج کیے جارہے ہیں:-

وویک سُوتر نمبر ۱: تمام عالمِ کائنات میں اِس رشتے کی مانند جس میں تسبیح کے یا مالا کے دانے پروئے ہوئے ہوتے ہیں، صرف ایک وجود یا حقیقت جاری و ساری ہے۔ اسی حقیقت کو رُوحِ کُل یا شعوری تجلّی کہتے ہیں۔ اس لیے ہمیں ایسی کوشش کرنا چاہیئے کہ ہماری تمام مساعی اسی وجودِ مطلق سے تحریک پائیں اور اُسی وجودِ مطلق سے ان کی تنظیم و انضباط روبکار ہو۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سوتر نمبر ۲ : دھرم انسانی زندگی کا بنیادی جوہر ہے۔ اسی تحریک کے زیرِ اثر انسان ہمیشہ سے عظیم کارنامے سرانجام دیتا چلا آیا ہے۔ بنی نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کا دار و مدار تمام تر دھرم پر ہے........ دھرم ہی کے ذریعے بیداری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ نیز اس سے قوم کو ہمہ گیر قدرت و قوت حاصل ہوتی ہے۔ عمل کے لیے تحریک ہوتی ہے اور عزم و ارادہ میں روحانی طاقت اُبھرتی ہے۔ نیز پائیداری و استقامت کا ظہور ہوتا ہے۔ جس کی مدد سے ایک دانا انسان میں ترکِ نفس سے کام لیتے ہوئے پست قسم کے جذبات پر قابو پانے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ ہر بات کو برداشت کرنے والا ایسا ہی انسان تمام مخلوقات کے ساتھ یگانگی و خیر سگالیوں سے بھری ہوئی زندگی کی منزلیں طے کرتا ہوا اپنے کردار اور عمل سے دھرم کے جوہرِ خالص کی بنیادی حقیقت کو پایۂ تصدیق پر پہنچا دیتا ہے۔ ہمارے ہندوستان میں ہمیشہ سے دھرم کی یہی صورت رہی ہے۔

سوتر نمبر ۵ :- اپنے جذب و کشش کے مرکز کو خود اپنے باہر خارجی دنیا میں تلاش نہ کیجیے..... اپنے عظیم یزدانی خط و خال کی جستجو اپنی ہی ذات میں کیجیے۔ اس پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس کو آنکھوں کے سامنے سے ہٹا دیجیے اور اپنی ربوبیت کے اشراق کا لطف اُٹھائیے۔ اس اشراق کے ذریعے ہی بڑے گہرے رموز اور پوشیدہ اسرار کے خزانوں کی باب کشائی کرکے آواگون کے چکر کا بیخ و بن سے خاتمہ کر دیجیے۔ اگر جڑ نہ رہے گی تو پھر پھول پتے کہاں سے پیدا ہو سکیں گے۔

سوتر نمبر ۳۳ :- پرماتما کی خوشنودی اور مسرت حاصل کرنے کے لیے غریبوں اور محتاجوں کی خدمت تن من اور دھن سے کیجیے اور خود اپنی ہستی کو ان کی ہستی میں وصل کر دیجیے کیوں کہ افلاس و غربت کی یہ تاریکی کسی نہ کسی وقت سب پر غالب آجاتی ہے اور وقت پڑنے پر ہر شخص کو اس قسم کی امداد کا محتاج و متمنی ہونا پڑتا ہے۔ خارجی مال و متاع پر نہ تو کسی ایک شخص کی بپوتی ہوتی ہے اور نہ مستقل طور پر کسی ایک جگہ اس کا قیام رہتا ہے۔

سوتر نمبر ۷۳ :- جو شخص تمام ذی روحوں کے ساتھ رحم سے پیش آتا ہے۔ جسے خود پر اعتماد ہوتا ہے، جو سب کے ساتھ بھلائی کرتا ہے، اس کی نظر ہمیشہ مساوات پر رہتی ہے۔ اس کو رشی یعنی مرتاضِ کامل سمجھنا چاہیے، لیکن جو شخص قدم قدم پر خباثت اور کینہ پروری سے کام لے کر ہر دوسرے شخص کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس کو نقصان پہنچانے کی فکر میں رہتا ہے وہ کبھی دوسروں کے دلوں پر فتح نہیں پا سکتا۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سوتر ۸۱ انانیت یا پندار کی عادت دھوئیں کی مانند آتما یعنی رُوح کو گھیر لیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کو رحمتِ خداوندی سے محروم کر دیتی ہے۔ اس پندار یا انانیت کے علاوہ آپ کا اور کوئی دشمن نہیں رجب پندار سر اُٹھاتا ہے، اس وقت سب سے پہلے نیک و بد اور حق و باطل میں امتیاز کرنے کی قوت جواب دے جاتی ہے ......

ترجمے کے اختتام پر ایک مختصر نوٹ میں منوّر لکھتے ہیں :۔

"یہ ترجمہ شری ۱۰۸ اسوامی (ڈاکٹر) چیتن آنند جی مہاراج چدا کاشی کی نظر سے گزر کر اُن کی مُہرِ قبول حاصل کر چکا ہے۔"

منوّر قارئین سے بھی قدردانی کے آرزومند ہیں اور زیرِ نظر کتاب کے صفحہ ۹ پر درج سوامی جی کے تئیں نذرانۂ عقیدت میں اظہارِ تمنا کرتے ہیں :۔

ترجمانی پہ مری صاد ہے سوامی جی کا
اس کا ہر حرف اِک ارشاد ہے سوامی جی کا

اور بھی اس سے ہو ممتاز ادب اُردو کا
داد گر اس کا ہو ہر خیر طلب اُردو کا

جین گرنتھ سار، درسِ عظیم اور متفرق کتابچے

منوّر کی روحانی تصانیف و تراجم کے جو اور مسوّدات ملے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے "سُری روپ کلا چِتر"، "معروضات"، "فریادیں" (نوحے)، جین گرنتھ سار، "سامنک پاٹھ" اور "درسِ عظیم" کے نام سے چھوٹے چھوٹے رُوحانی کتابچے بھی سپردِ قلم کیے۔ ان میں سے کچھ نامکمل قلمی مسوّدوں کی صورت میں دستیاب ہوتے ہیں۔ جین گرنتھ سار میں جین دھرم کی اہنسا (عدم تشدّد) اور خود ضبطی کی تعلیم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سامنک پاٹھ مُناجاتوں کا کتابچہ ہے۔ یہ کتابچے منوّر کے اس عقیدے کی دین ہیں کہ سبھی مذاہب کی رُوح ایک ہے، منزل ایک ہے، لہٰذا سبھی دینی صحیفے اور اُن کی تعلیمات لائقِ احترام ہیں۔ جین دھرم کی تعلیمات کے بارے میں فرماتے ہیں :۔

(۱) اِک نہر تجلّی کی رواں ملتی ہے
ضَو پاشیٔ صد کاہکشاں ملتی ہے

تعلیم اہنسا کی جہاں ملتی ہے
ہوتے ہیں دماغ و دل منوّر روشن

(۲) عافیت نقدِ دل و جاں ملتی ہے
ہر ظلم سے جور سے اماں ملتی ہے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ہے درس گہِ دوامِ علم و عرفاں　　تعلیم اہنسا کی جہاں ملتی ہے

جین مت کے بانی جینندر مہاویر کے بارے میں "جین گرنتھ سار" میں فرماتے ہیں :-

بہاریں جانفزا آ کر لپٹ جاتی ہیں دامن سے　　گزرتا ہوں جہاں جن راج کے شاداب گلشن سے
عیاں ہے مورتی سے معجزہ یہ تیرتھنکر کا　　ہزاروں پاپیوں کے پاپ کٹ جاتے ہیں درشن سے
رگ و ریشہ میں ہر انسان کے پیوست ہو جائے　　مناسب ہے اہنسا دھرم کی تعلیم بچپن سے

منوّر سکھ مت اور اُس کے پیشواؤں سے بھی عقیدت رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے درویشِ کامل سکھوں کے پہلے گرو شری گورو بابا نانک کے منظوم حالاتِ زندگی رقم کرتے ہوئے اپنی ایک نامکمّل نظم کے تمہیدی حصّے میں فرماتے ہیں :-

ہے واہگورو مری زباں پر　　آمادہ ہوں عرضِ داستاں پر
نانک کے چرتر لکھ رہا ہوں　　گاتھا یہ پوتر لکھ رہا ہوں
خدمت علم و اَدب کی ہو گی　　ساکھی یہ عزیز سب کی ہو گی
ہندو کو ملے گی راحتِ جاں　　اپنائے گا اس کو ہر مسلماں
تزئینِ حیات اس سے ہو گی　　سکھوں کی نجات اِس سے ہو گی
ظاہر اعجازِ فکر ہو گا　　ہر دھرم میں اِس کا ذکر ہو گا
بھوگی ہو خواہ کوئی جوگی　　پوری سب کی مُراد ہو گی

گورو نانک کا سراپا بیان کرتے ہوئے اس نامکمّل نظم میں لکھتے ہیں :-

مُکھڑا معصومیت کی تصویر　　پاکیزہ تمام رُخ کی تنویر
چوٹی وہ گرہ کُشائے عالم　　کیلاش بھی جس کے سامنے خم
طوقِ یزداں گلے میں جس کے　　نورِ ایماں گلے میں جس کے
مینائے شرابِ عارفانہ　　الماس کا اِک نگار خانہ
شبدوں میں سرسوتی کی بانی　　گنگا کی سی ہر نفس روانی
مسند تھی گنیش کی زباں پہ　　تھی رازِ ازل کی ترجماں یہ

منوّر لکھنوی نے اپنی عمر کے آخری سالوں میں "وِدُر نیتی"، جیسے گرنتھ کا ترجمہ "درسِ عظیم" کے نام سے شروع کیا تھا۔ مہاتما وِدُر مہابھارت کے زمانے میں سلطنت ہستناپور کے ...

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کوروؤں کے والد دھرت راشٹر کے وزیرِ اعلیٰ تھے۔ ان کی حکمتِ عملی پر لکھی گئی اِس کتاب کے کچھ اشعار دیکھیے جو زیرِ تصنیف مثنوی کے تعارف میں قلم بند کیے گئے ہیں۔

مَیں نثارِ جلوۂ تمکینِ فکر	روکشِ افلاک ہیں شاہینِ فکر
انگلیاں ہیں پردہ ہائے راز پر	زخمہ زن ہیں زندگی کے ساز پر
کشف والے میرے اعجازوں سے دنگ	قافیہ مجھ سے کراماتوں کا مَنگ
برتر از اسبابِ ناسوتی ہوں مَیں	ماورائے حدِ لاہوتی ہوں مَیں
زندگی کی آخری منزل ہے جب	کچھ کشیدہ سا جہاں سے دل ہے جب
مثنوی کرتا ہوں یہ دُنیا کو پیش	نذر ہے یہ دیدۂ بینا کو پیش
اہلِ دہلی مثنوی جب یہ سُنیں	سُن کے اِک اِک شعر اس کا سَر دھنیں
ہو نہ محنت کاش میری رائیگاں	مجھ کو یہ نسخہ بنا دے جاوداں

چوں کہ اس مثنوی کے محض تعارفی اشعار ہی دستیاب ہو سکے ہیں اور "وِدُر نیتی" کا اصل ترجمہ تو مثنوی کی شکل میں ابھی شاعر کے "آئینۂ ادراک" میں تھا، اِس لیے اس کا تنقیدی جائزہ پیش کرنا ممکن نہیں تاہم اس مثنوی کا طویل شعری تعارف اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اصل تخلیق جب معرضِ وجود میں آتی تو اِک قابلِ رشک ادبی شاہکار ہوتی۔

متفرق نثری تصانیف و تالیفات جو منوّر نے ادب کو دی ہیں اُن سے منوّر کے بطورِ نثر نگار مقام و مرتبہ کا تعیّن بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ وہ محض میدانِ شاعری ہی کے شہسوار نہیں تھے بلکہ نثر نگاری پر بھی انھیں قابلِ رشک عبور حاصل تھا۔ ان کے نثری ترجمے اور طبعزاد نثری تصانیف دونوں ہی ان کی اعلیٰ نثر نگاری کی مثالیں ہیں۔ رامائن والمیکی کا ان کا نثری ترجمہ، جرمن افسانوں کے ترجمے، بچّوں کے لیے نثری تصانیف و تراجم، اپنے والدِ ماجد اُفق لکھنوی مرحوم کی سوانح عمری اور کلام کے تنقیدی مطالعے پر مشتمل ان کی تصنیف لمعاتِ اُفق، تلسی داس کی "ہنے پترکا"، دیش بندھو سی آر داس کی "ساگر سنگیت"، مارشل ولی خان کی "میری یادداشتیں" کے نثری ترجمے، صدر کی گیتا کا مقدمہ اور دیگر مضامین ان کی نفیس اور مدلّل، رواں دواں اور بامحاورہ نثر نگاری پر دال ہیں۔ دیگر زبانوں کے ڈراموں کے ترجمے بھی منوّر نے اسی اسلوب میں

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کیے ہیں کہ نثری مکالموں کو عمدہ اُردو نثر میں اور شعری مکالموں یا شلوکوں کے مفہوم کو منظوم مکالمات کی شکل میں سپردِ قلم کیا ہے۔

منوّر نے اپنی سوانح عمری جو "داستان" کے نام سے مرتّب کی ہے، تمام عمدہ نثر میں قلم برداشتہ لکھی ہے۔ اپنے خُسر علّامہ لچھمن پرشاد صدر لکھنوی کا شرید بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ بھی منوّر نے تالیف کیا ہے جو ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اسی پر ہی بس نہیں، منوّر اپنے عزیز دوست شونرائن بھٹناگر کے روزانہ اخبار "وطن" میں برسوں تک فکاہیہ کالم لکھتے رہے۔

امامیہ مشن لکھنؤ کی فرمائش پر منوّر نے ایک کتابچہ بڑی نفیس اور مدلّل نثر میں "مجاہدۂ حسینی اور اسلام" کے عنوان سے سپردِ قلم کیا جو ۱۹۵۸ء (محرم ۱۳۷۹ء) ہجری میں لکھنؤ سے شائع ہوا اور بے حد مقبول ہوا۔ اِس کتابچے کے تعارف میں سکریٹری امامیہ مشن لکھنؤ سید ابنِ حسین نقوی رقم طراز ہیں:-

"محترمی جناب بشیشور پرشاد صاحب منوّر کی ذات دنیائے ادب میں محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ آپ اگر ایک طرف بہترین شاعر ہیں تو دوسری طرف بہترین نثر نگار بھی۔۔۔
۔۔۔۔۔۔ منشی صاحب موصوف اگرچہ دہلی میں مقیم ہیں مگر آپ کا وطن لکھنؤ ہے۔ لہٰذا آپ کی نثر و نظم دونوں میں وطن کی ٹکسالی زبان کے جوہر جلوہ افگن ہیں۔
"منوّر صاحب تاریخ اسلام پر کافی عبور رکھتے ہیں اور آپ کا کلام اور مضامین اکثر اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ہماری استدعا پر موصوف نے یہ رسالہ مرحمت فرمایا ہے جس کے لیے ہم اُن کے انتہائی ممنون ہیں۔"[1]

"مجاہدۂ حسینی اور اِسلام" میں سے منوّر لکھنوی کی مرصّع نثر کے چند اقتباسات درج کیے جا رہے ہیں:-

"مَیں مسلمان نہیں۔ میری طرح اور لاکھوں انسان حلقۂ اسلام میں داخل نہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ مَیں دنیا کی اس عظیم ترین ٹریجڈی کی طرف سے چشم پوشی کروں جس میں صرف اسلامی قدروں کی ہی نہیں عالم گیر قدروں کی بیخ کنی کرنے میں انسانیت اور

---

[1] "مجاہدۂ حسینی اور اسلام" (منوّر لکھنوی) مطبوعہ ۱۳۷۹ ہجری صفحہ

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اور یزدانیت کے دشمنوں نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہو۔ مسلمان نہ ہونے پر بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر اسلام کو قدرت نے جینے کا حق دیا ہے تو اسے جینا چاہیے۔ اور ہر ایسی قیمت پر جینا چاہیے جس سے انسانیت اور یزدانیت کا خون نہ ہوتا ہو۔

کربلا کے حادثۂ عظیم کے بعد بھی اسلام اُبھرا اور ایک نئے وَلوَلے، ایک نئے جوش اور ایک نئی قوّت کے قالب میں ڈھل کر اُبھرا۔ اسی لیے تو مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے فرمایا تھا۔

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اِسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد" [1]

کیسی برجستہ، رواں اور صنائع لفظی و معنوی سے مرصّع نثر ہے اور اس کی سادگی اور سلاست کتنی مؤثر اور دل کش ہے۔

اگلے صفحات میں منوّر ایک جگہ واضح کرتے ہیں :۔

" واقعۂ کربلا کے بارے میں بھی خود اہلِ اسلام میں دو نظریے ہیں۔ ایک طبقہ اسے تعقّل و استدلال کے نقطۂ نظر سے دیکھ کر اس کی المناکیت کا قائل ہونے کے باوجود اسے اتنی اہمیت نہیں دیتا۔ جتنا ایک دوسرے طبقے والا دیتا ہے۔ دوسرے طبقے میں دلائل و براہین کے ساتھ ساتھ جذبات انگیزی سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ اور وہ اِس واقعے کو تبریک و تقدّس کا لباس پہنا کر اُس کی یاد میں اظہارِ غم و الم کو اپنے لیے توشۂ نجات قرار دیتا ہے۔

صاف الفاظ میں اگر کہا جائے تو سمجھ لیجیے کہ واقعاتِ کربلا کو شیعہ حضرات ایک جُداگانہ نظریے سے دیکھتے ہیں اور اہلِ تسنن کا زاویۂ نظر ان سے قدرے جداگانہ ہے، اگرچہ دونوں ہی فرقے حضرتِ امام حسینؑ کی شہادت کو شہادتِ عظمیٰ قرار دے کر ہر سال عزاداری کرتے ہیں۔ دونوں کے جُداگانہ نظریات کا دار و مدار واقعاتِ کربلا کے پس منظر پر ہے اور یہ اختلاف اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب پیغمبر اسلام کی رحلت کے بعد خلافت

---

[1] مجاہدۂ حسینی اور اسلام (منوّر لکھنوی) مطبوعہ ۱۳۷۹ھ۔ صفحہ ۵ - ۶

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کا حق حضرت علیؓ سے چھین کر دوسرے خلفا کو دے دیا جاتا ہے۔ اسی لیے اکثر اہل الرائے اس پس منظر کو پیشِ نظر رکھ کر واقعاتِ کربلا کو ایک سیاسی کشمکش کا منطقی نتیجہ قرار دیتے ہیں ممکن ہے کہ اس نظریے میں کچھ وزن ہو۔ پھر بھی حصولِ اقتدار کی اس کشمکش کا انجام جس ہولناک صورت سے پیش آیا ہے وہ انسانیت سوز ہی قرار دیا جائے گا، اور اسی لیے اگر مظلوم طبقہ اس انسانیت سوزی کے خلاف اپنے الم انگیز جذبات کا اظہار وقتاً فوقتاً آہ و بکا اور شور و شین کے ساتھ کرتا ہے تو ہمیں اس پر انگشت نمائی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

شہنشاہ اورنگ زیب نے اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ جو سلوک کیا۔ اس میں خواہ کتنی ہی سیاسی مصلحتیں کیوں نہ پوشیدہ ہوں اور مذہبی نقطۂ خیال سے کچھ مسلمان اسے خواہ کتنا ہی جائز کیوں نہ قرار دیں لیکن عام اخلاقی اصول اور اعلیٰ انسانی قدروں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کوئی شخص بھی جو برائے نام بھی فہم و فراست رکھنے کا دعویدار ہو، اورنگ زیب کے اس طرزِ عمل کی کبھی تحسین و ستائش نہ کرے گا۔ کیوں کہ بہر حال اعلیٰ انسانی اقدار اس شہنشاہ کے اس طرزِ عمل سے مطمئن نہیں ہوتیں۔......

جیسا کہ ہمارے دور میں مہاتما گاندھی کا قتل بھی ایک سیاسی نظریہ کا مایوسانہ منطقی نتیجہ تھا......" [1]

مذکورہ بالا نثر کا زورِ بیان، موزونیِ الفاظ اور منطقی استدلال ـــ نکتہ آرائی اور توازن کے دوش بدوش طرزِ تحریر کی سلاست اور روانی، فصاحت و بلاغت اس نثر کے لکھنے والے کی قابلِ رشک صلاحیتوں کی غمازی کر رہی ہیں۔ اس نثر میں کہیں کہیں خطابت کا انداز بھی ملتا ہے۔

اسی طرح "صدر کی گیتا" اور "لمعاتِ اُفق" نامی تالیفات میں سے بھی منورؔ کی نثر نگاری کے بہت عمدہ حوالے دیے جا سکتے ہیں۔ "صدر کی گیتا" عہدِ اکبری کے مشہور دانش ور اور فاضلِ دوراں ادیب فیضیؔ کی فارسی میں منظوم گیتا کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب جو ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے، منورؔ لکھنوی کی تالیف ہے۔ اس میں فارسی کی گیتا کے منظوم ترجمے کے علاوہ صدر لکھنوی کی غیر منقوط

---

[1] مجاہدۂ حسینی اور اسلام (منورؔ لکھنوی) مطبوعہ ۱۳۷۹ ہجری۔ صفحہ ۹۔۱۰۔۱۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

مثنوی "سُداما" بھی شامل ہے۔ گیتا کا یہ منظوم ترجمہ ۱۹۱۰ء میں منوّر کے فاضل خُسر علّامہ لچھمن پرشاد صدر نے مکمّل کیا تھا۔ منوّر نے اسے ۱۹۶۲ء میں اپنے اشاعتی ادارہ "ادرش کتاب گھر دہلی سے شائع کیا۔ اس کے لیے دس صفحات پر مشتمل جو تعارفی مضمون منوّر نے صدر کی گیتا کے ابتدائی صفحات میں شامل کیا ہے، اعلیٰ نثر نگاری کی ایک روشن مثال ہے۔ ایک مختصر اقتباس دیکھیے:۔

"دربارِ اکبری کے نورتن علّامہ فیضی کے منظوم فارسی ترجمہ بھگوت گیتا کا یہ منظوم اردو ترجمہ میرے خُسر مرحوم علّامہ منشی لچھمن پرشاد صدر لکھنوی کی جگر کاوی کا نتیجہ ہے جو ۱۹۱۰ء میں ظہور پذیر ہوا تھا، لیکن اولاً حضرت صدر کی بے نیازی، دوم ان کی ناداری کے باعث یہ ترجمہ مطبوعہ صورت میں پیش نہ کیا جا سکا۔ مجھے معلوم ہے کہ ان کی مالی حالت ۱۹۲۰ء سے برابر بگڑتی ہی رہی صحت بھی خراب ہو گئی تھی۔ ۱۹۲۰ء میں سخت بیمار ہوئے جس کے باعث اپنے محبوبانِ گلفام یعنی شراب و جام سے ایسے کنارہ کش ہوئے کہ ان کی طرف رُخ بھی نہ کیا۔ ۱۹۲۸ء میں اپنے بڑے صاحبزادے منشی امبکا پرشاد کے بسلسلۂ ملازمت دہلی چلے آنے پر حضرتِ صدر بھی ان کے ہمراہ چلے آئے اور ۱۹۳۱ء تک میرے ساتھ رہے۔ ۱۹۳۰ء میں ان کے صاحبزادے کا انتقال ہو گیا۔ اس نے انھیں اور بھی زندہ درگور کر دیا"۔[1]...

اسی مضمون میں سے ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"علّامہ پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی نے فیضی کے نثر ترجمے پر جو تقریظ لکھی ہے۔ اس میں فیضی کے ترجمے کی کچھ خامیاں دکھائی ہیں۔ حضرت صدر مرحوم اور بدری کرشن صاحب فروغ نے بھی فیضی کے ترجمے کو بعض مقامات پر معناً ناقص بتایا ہے۔ فیضی کے ترجمے میں خامیوں کا ہونا تعجبات سے نہیں۔ ان کا یہی کمال کیا کم ہے کہ انھوں نے گیتا ایسے اہم صحیفے کو سب سے پہلے فارسی ترجمے کے ذریعے غیر ہندو دنیا میں پیش کیا۔ ان کا یہ وہ احسان ہے جو ہندوؤں کو تا ابدالآباد فراموش نہیں کرنا چاہیے۔"[2]

منوّر لکھنوی کی ایک اور تالیف "لمعاتِ اُفق" ۳۸۴ صفحات پر مشتمل ایک ضخیم مذکرہ ہے اس میں منوّر نے اپنے والد ملک الشعرا دوارکا پرشاد اُفق لکھنوی کی شخصیت اور فن کا احاطہ و اعتراف اور

---

[1] اور [2] صدر کی گیتا (ترجمہ صدر لکھنوی)۔ مؤلف منوّر لکھنوی۔ مطبوعہ ۱۹۶۲ء صفحات ۵ - ۹ بالترتیب

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اُردو ادب میں ان کے مقام کا تعین کرنے کی کاوش کی ہے۔ اُفق کی علمی و ادبی حیثیت کا تعین کرنے کے لیے یہ مضامین کافی وقیع ہیں اور اُفق کے فنی اور صحافتی کارناموں، نیز اُن کے ادب کی تفہیم میں بہت معاون ہیں۔ ادب کے محقق کو اس کتاب سے کافی روشنی ملتی ہے۔ اُفق کی فکری اساس اور ان کی مکمل شاعری کے مزاج کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ اس میں اُفق لکھنوی مرحوم کا منتخب کلام بھی دیا گیا ہے جو کئی سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس سے اُفق کے معاصرین کا بھی ایک تنقیدی اور تقابلی مطالعہ سامنے آجاتا ہے۔

"لمعاتِ اُفق" میں شامل منوّر کے مضمون "معذرت تاخیر" کے کچھ اقتباس جو درجِ ذیل ہیں۔ منوّر کی نثر نگاری کے معیار پر روشنی ڈالتے ہیں۔ منوّر لکھتے ہیں :-

"والد مرحوم کو دنیا سے اٹھے ہوئے اکیاون سال کا طویل عرصہ ہو گیا۔ یہ عرصہ کسی ملکی اور لسانی ادب میں کوئی معمولی عرصہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس تمام مدت میں زبان نے نہ جانے کتنے پلٹے کھائے۔ ادب نے نہ جانے کتنی کروٹیں لیں۔ سیاست نے نہ جانے کتنے داؤ پیچ کھیلے۔ تہذیب نے نہ جانے کتنے جامے بدلے اور تمدن نے خدا جانے کتنی نئی پوشاکیں اختیار کیں۔ لازمی بات ہے کہ اکیاون سال پہلے کا ماحول آج کا ماحول نہیں ہو سکتا۔ اس وقت کی تحریکیں کیا تھیں، رجحانات کیا تھے۔ نظریوں میں آج کے بمقابلہ کتنا فرق تھا۔ یہ کسی کو معلوم نہیں۔ اسی لیے اکیاون سال پہلے کے ایک باکمال کے فنی تکمیلات کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں خود کو اکیاون سال پہلے لے جانا ہوگا۔"[1]

اسی مضمون سے ایک اور پیراگراف ملاحظہ ہو :-

"والد مرحوم نے عمر بہت کم پائی۔ صرف ۴۹ سال تک اس عالمِ رنگ و بو کی ہوا کھائی اور اتنی قلیل عمر میں نہ جانے کتنے سرد و گرم دیکھے۔ رندانہ مزاجی نے کبھی ایک ٹھکانے سے بیٹھنے نہ دیا۔ کبھی ایک اداسے وابستگی نہیں کی۔ اسی لیے امرا اور رؤسا کی قدردانی کے باوجود تمام عمر تنگ دستی میں بسر کی۔ طبیعت شاہانہ تھی، یا کہیے فقیرانہ۔ جب رقم ہاتھ آگئی بادشاہ بن گئے، جب جیب خالی ہو گئی پھر قرض و دوام پر بسر ہونے لگی۔ خانہ داری

---

[1] لمعاتِ اُفق (منور لکھنوی)، مطبوعہ ۱۹۶۴ء، صفحہ ۱۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کے جھنجھٹوں سے کبھی تعلق نہ رکھا....... انھیں شراب کا شوق تھا۔ پانی کی طرح پیتے تھے۔ غالب کی طرح قرض و دام لے کر پیتے تھے۔ دم دم پر پیتے تھے، مگر پی کر ہمیشہ اپنی حدود میں رہے......"[1]

بامحاورہ اور ٹکسالی زبان میں قلم برداشتہ لکھی ہوئی رواں دواں نثر کے مذکورہ پیراگراف نثر پر منوّر کی کامل گرفت کی دلالت کرتے ہیں۔ ان میں فصاحت بھی ہے اور بلاغت بھی، روانی بھی ہے اور سلاست بھی۔ قاری ایسی نثر کو چٹخارے لے لے کر پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جس طرح نظم گوئی میں منوّر کی طبیعت دریا کی طرح موّاج ہے، اسی طرح اُن کی نثر میں بھی بے پناہ روانی ہے۔ نثر کا طرزِ تحریر بالکل فطری ہے اور تصنع سے پاک و عاری۔ غالب کے خطوط میں اور نثری مضامین میں جو بے ساختگی قاری کو لبھاتی ہے اُسی بے ساختگی اور برجستگی کی چاشنی منوّر لکھنوی کی نثر میں بھی پرتو فگن ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں اور زبردست قوتِ استدلال کے ساتھ موضوع کو واضح کیا گیا ہے۔ کہیں بھی کوئی اُلجھاؤ نہیں، ابہام نہیں، شستہ منجھی ہوئی، شائستہ ٹکسالی زبان میں محاورات و اصطلاحات نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ منوّر کا صاف ستھرا، متین، متوازن اور سلجھا ہوا طرزِ نگارش جو بیانیہ کی پیچیدگیوں، غیر ضروری فارسیّت اور ثقیل ترکیبوں سے پاک ہے جس کی بدولت ان کی نثر کھرے ادب کی کسوٹی پر پوری اُترتی ہے، اسی طرح کی خوبصورت اور رواں دواں نثر کا نمونہ منوّر کی خودنوشت سوانح عمری "داستان" میں ملتا ہے۔

---

[1] لمعاتِ اُفق (منوّر لکھنوی)، مطبوعہ ۱۹۶۴ء۔ صفحہ ۲۷

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

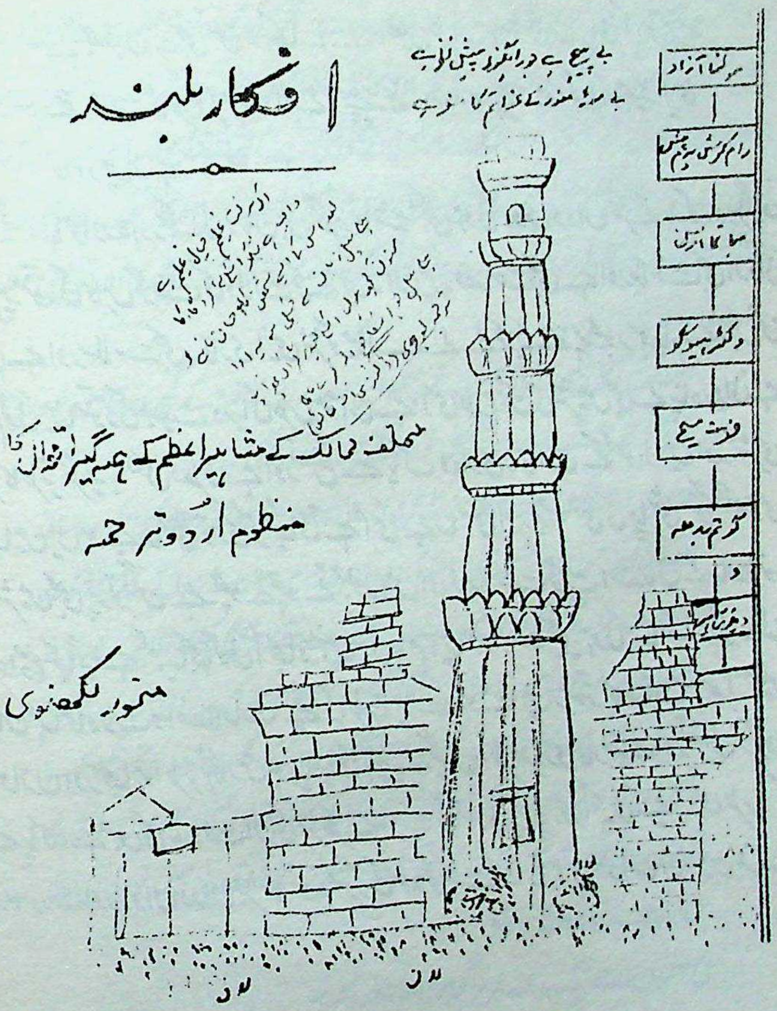

"افکار بلند" کے قلمی مسودے کا سرورق، منور لکھنوی کے خوشخط میں

(عکسی تصویر)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

باب پنجم (س)

بچّوں کے لیے تراجم و تصانیف

- ایلیز روز ویلیٹ
- ذرّے سے آفتاب
- وویکانند
- دادا نہرو اور دیگر تصانیف
- مجموعی تنقیدی جائزہ

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بچّوں کے لیے تراجم و تصانیف

"بچے کھیلتی کلیاں اور انمول موتی ہیں۔ جن کے رنگ، مہک، چہک اور نور سے کسی قوم میں زندگی کی لہر دوڑتی ہے، اور ملک کی تاریخ لکھی جاتی ہے۔ جمہوری ملکوں میں بچوں کو انمول آئینہ مانا ہے۔ انہیں ملک و قوم کی ترقی و تعمیر کی بنیاد کا پتھر مانا جاتا ہے۔" [1]

یہ الفاظ ہیں ڈاکٹر سیفی پریمی کے جو بچوں کے لیے مفید اور دلچسپ کتابوں کی ضرورت کے دل سے قائل ہیں۔ ایسی ہی رائے ہے جناب ظ۔ انصاری کی، جو اپنے مضمون میں رقمطراز ہیں:۔

"دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک جغادری ادیب اور خرانٹ شاعر نے بچوں کے لیے لکھا ہے۔ ڈینئل ڈیفو کو "رابن سن کروسو" (ROBINSON CRUSO) لکھے ہوئے دو صدیاں گزر گئیں۔ آج تک بچے بوڑھے سب پڑھتے ہیں۔ دنیا بھر میں اس کے ترجمے ہو گئے، فلمیں بن گئیں۔ روسی شاعر پوشکن نے بچوں کے لیے اس وقت قلم اٹھایا، جب وہ اپنی معرکے کی نظمیں لکھ چکا تھا ____ ٹالسٹائی جو گاندھی جی کے بھی استاد تھے، انہوں نے قلم سنبھال کر، جی لگا کر بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں۔ اب بھی پڑھائی جاتی ہیں۔ مرشاک اوّل درجے کے شاعر ہیں، بچوں کے لیے خاص کر لکھتے ہیں۔ انگریزی زبان میں درجنوں کتابیں ہیں۔ بچوں کی نظموں اور کہانیوں کی، اعلےٰ درجے

---

[1] اردو میں ادب اطفال (پروفیسر اکبر رحمانی) صفحہ ۱۰۰ (مقالہ از سیفی پریمی)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کے بیکھوں کی لکھی ہوئی اور ایسی بنی ٹھنی جیسے بچے کہیں میلے میں جانے کو نکلے ہوں۔" ؎۱

مذکورہ بالا اقوال سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کسی معاشرہ یا قوم کے لیے بچوں اور بچوں کے ادب کی کتنی اہمیت ہے۔ اُردو میں بچوں کے لیے شعری ادب کی تخلیق کی روایت نظیر اکبر آبادی سے آغاز پذیر ہوئی۔ محمد حسین آزاد، حالی، محمد اسمٰعیل میرٹھی، اقبال، حفیظ جالندھری، محروم، حامد اللہ افسر، صلاح الدین نیر اور دیگر کئی شعرا نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ بچوں کے نثری ادب کی تصنیف و تخلیق میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم صدر جمہوریۂ ہند، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر عابد حسین، کرشن چندر، جگن ناتھ آزاد، کیشو کمار، الیاس احمد مجیبی، عبدالواحد سندھی، ڈاکٹر اطہر پرویز، ڈاکٹر نورالحسن نقوی، شفیع الدین نیر، محمد ندیم، راج نرائن راز، سیفی پریمی، صالحہ عابد حسین، بیگم قدسیہ زیدی، قرۃ العین حیدر، کمال حسین وغیرہ نے بھی حسبِ مقدور اس صنفِ ادب میں اپنا حصہ ڈالا۔

جب اتنے لوگوں نے بچوں کے لیے لکھا تو منور لکھنوی کیوں پیچھے رہتے۔ منور نے بھی بچوں کے ذوقِ مطالعہ کے فروغ وارتقاء کے لیے لگ بھگ نصف درجن کتابیں لکھیں جو بیشتر عظیم شخصیتوں کی سوانح حیات پر مشتمل ہیں۔ ان میں "دادا نہرو" "دویکانند" بالخصوص ادبِ اطفال میں مفید و نادر اضافہ ہیں۔ لنکن نے کہا: "ذرے سے آفتاب" "ایلینروز ویلٹ" انگریزی تصانیف کے دلچسپ ترجمے ہیں جو کم سن قارئین کے لیے مفید اور اخلاق آموز کتب ہیں۔ اگرچہ منور نے یہ ترجمے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنی معاشی ضروریات کے پیشِ نظر مختلف اشاعتی اداروں کی فرمائش پر کئے لیکن ان میں بھی منور نے اپنا خونِ جگر جلایا ہے، اور بڑی محنت و جانفشانی سے ان تصانیف کو اُردو کے پیکر میں ڈھالا ہے۔

نسلِ آئندہ کے ذہنوں کی تشکیل کے لیے بچوں کا ادب کتنی اہمیت رکھتا ہے، اس واقعہ سے ثابت ہے کہ بھارت کے حصولِ آزادی کے بعد سری راج گوپال آچاریہ نے مدراس سے پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک خط میں لکھا تھا کہ —— "اب تو ہماری

؎۱ اُردو میں ادب اطفال (پروفیسر اکبر رحمانی) صفحہ ۱۵ (بچوں کے لکھنا۔ مقالہ از ظ۔ انصاری)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سیاسی جنگ ختم ہو چکی، بہتر ہے آپ کسی گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر بچوں کا لٹریچر تیار کیجئے۔"[1]

لیکن بچوں کے ادب کا کامیاب خالق وہی اہلِ قلم ہو سکتا ہے جو بچوں کی نفسیات کا ماہر ہو، اور انہی کی سادہ، سلیس، غیر پیچیدہ اور روزمرہ کی زبان میں لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ بچوں کی فطرت کا نباض ہو اور بچوں کو ایسا ادب فراہم کر سکے جو ان کی ذہنی و روحانی بالیدگی میں معاون ہو سکے اور انہیں ملک و قوم کی تعمیر و تشکیل کے مقدس فریضے کی تکمیل کے لیے فعال بنا سکے۔

ایلینر روز ویلٹ

منوّر نے جن مفید اور سبق آموز کتابوں کے ترجمے بچوں کے لیے کئے ہیں ان میں سے ہم سب سے پہلے "ایلنر روز ویلٹ" کا جائزہ لیں گے۔

ایلینر روز ویلٹ امریکہ کی خاتونِ اوّل تھیں اور وہ امریکہ کے ہر دلعزیز صدر جمہوریہ مسٹر فرینکلن روز ویلٹ" کی اہلیہ تھیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران روز ویلٹ ہی امریکہ کے صدر تھے۔ منوّر کا یہ ترجمہ 'ایلینر روز ویلٹ' کی سوانح عمری ہے۔ یہ خاتون بھی امریکی عوام میں حد درجہ ہر دلعزیز تھیں۔ اس سوانح عمری کے اصل مصنّف الفریڈ اسٹین برگ ہیں، اور منوّر کا یہ ترجمہ جو حالی پبلشنگ ہاؤس نے ۱۹۵۹ء میں شائع کیا، گیارہ ابواب پر مشتمل ہے، جو نہایت باریک چھپائی میں سستے کاغذ کے ۵۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس پہلو سے محمد حسن فاروقی کا بچوں کے ادب کے متعلق یہ شکوہ کسی حد تک مبنی بر حق ہے کہ ـــــ

"دوسری زبانوں سے ترجمہ ہو کر جو ادب اُردو میں منتقل ہو رہا ہے، اس میں بھی بچوں کے ماحول اور زبان و بیان کا خیال نہیں رکھا جاتا۔[2] اور بعض ادارے مالی منفعت کے لیے سستے کاغذ پر بغیر تصاویر کے بدنما کتابیں چھاپ رہے ہیں۔"

اگرچہ منوّر لکھنوی نے حتی المقدور سلیس اردو میں اس سوانح عمری کا انگریزی متن سے ترجمہ کیا ہے لیکن ایلینر کی جیون کتھا کے اُلجھاؤ اور واقعات کی طویل تفصیلات نے اسے بچوں کے ذہنی معیار سے قدرے بالا کی چیز بنا دیا ہے۔ ناشر نے اس کتاب کو ایک روپیہ قیمت والی سیریز میں شائع کیا ہے۔ لہذا کاغذ کی کفایت کا مسئلہ بھی پیشِ نظر رہا ہوگا۔

---

۱ ـ اردو میں ادب اطفال ـ ایک جائزہ (پروفیسر اکبر رحمانی) صفحہ ۱۰۱

۲ ـ [illegible] ایڈیشن ۱۹۹۱ء صفحہ [illegible]

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE 2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

حالانکہ آج کے مقابلہ میں اس کتاب کی اشاعت کا زمانہ ارزانی کا زمانہ تھا۔ بچے باریک چھپائی کی کتابوں کو پڑھنے سے یوں بھی جی چراتے ہیں۔ مواد کے اعتبار سے بھی یہ کتاب بچوں کے معیار سے مناسبت نہیں رکھتی۔ مثلاً ذیل کی عبارتیں دیکھیے اور بالخصوص ان میں خط کشیدہ دقیق الفاظ:۔

شادی کے متعلق ایک عبارت:۔

"شادی کے روز ایلنر تو پرسکون نظر آتی تھیں، لیکن فرینکلن شادی سے بیشتر اس قدر گھبرائے ہوئے تھے کہ ان کی طبیعت کو سنبھالنے کے لیے گروٹن کے صدر معلم ریورنڈ انڈی کاٹ پیباڈی کو جنہیں شادی کے مراسم کرانا تھے، انہیں ایک خلوت خانہ میں لے جانا پڑا۔ جب شادی کے لیے کوچ شروع ہوا تو ایلنر چچا ٹیڈ کے ساتھ نیچے اتر آئیں۔ ایلنر کے جسم پر اس وقت وہی سفید ساٹن کی پوشاک زیب دے رہی تھی جو دادی ہال نے اپنی شادی کے موقع پر زیب تن کی تھی۔"[1]

ایک اور عبارت:۔

"ماہ عروسی کے گزر جانے پر ایلنر کو، جو اب بیس سال کی ہو گئی تھی، کچھ باتیں اپنے شوہر کے بارے میں اور کچھ اپنے بارے میں معلوم ہوئیں۔ فرینکلن کو رات کے وقت کابوس کے دورے آتے تھے۔ وہ عالم خوابیدگی میں اٹھ کر چلنے لگتے۔ ایک مرتبہ کسی طرف سے بڑی وحشت ناک چیخیں آ رہی تھیں۔ ایلنر نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ چیخیں فرینکلن روز ویلٹ کی ہیں۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہے تھے۔ کیا تم کو گھومتا ہوا شہتیر نہیں دکھائی دیتا۔ ہر شخص کو ان لوگوں کے لقمۂ اجل بن جانے سے پیشتر جاگ اٹھنا چاہیے۔"[2]

دسویں باب کا ایک پیراگراف:۔

"جب ایلنر روز ویلٹ وائٹ ہاؤس پہنچیں تو اسٹفن ارلی کی آنکھوں

---

[1] ۔ ایلنر روز ویلٹ (مترجم: منور لکھنوی) ایڈیشن ۱۹۵۹ء صفحہ ۴۲ (باب چچیرے بھائی فرینکلن)

[2] ۔ ایلنر روز ویلٹ (مترجم منور لکھنوی) ایڈیشن ۱۹۵۹ء صفحہ ۵۰ (باب: خود اپنے طور پر)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ ایلینر کا خیال دُرست نکلا۔ ارلی نے کہا:۔
"صدرِ محترم انتقال فرما گئے۔ ان کی موت تو ہم لوگوں کے لیے المناک ہے ہی، لیکن اس سے زیادہ المناک ہمارے ملک اور تمام دنیا کے لیے ہے۔
ایلینر اس وقت خالی الذہن ہو رہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ارلی نے ان سے کہا۔ "میں نائب صدر ٹرومین کو بُلائے لیتا ہوں"
ایلینر کی زندگی کا یہ بدترین لمحہ تھا۔۔۔۔[1]

اگرچہ تاریخِ عالم کے طالب علم کے لیے یہ ترجمہ خاصی اہمیت، آگاہی اور دلچسپی کا حامل ہے لیکن یہ عام بچے کے ذہنی معیار سے ہٹ کر ہے اور اسے بچوں کے ادب کا حصہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مندرجہ بالا عبارتوں کے خط کشیدہ الفاظ سے ثابت ہے کہ یہ ثقیل اور دقیق الفاظ و تراکیب عام بچے کی تفہیم سے باہر ہیں۔ تاہم منوّر کا یہ نثری ترجمہ منجھی ہوئی با محاورہ اور شُستہ اُردو میں کیا گیا ایک نہایت عمدہ ترجمہ ہے۔ اس کتاب کو روسی کمیونزم کے جواب میں شروع کیے گئے وسیع امریکی سلسلۂ ابلاغ و اشاعت کی ایک کڑی سمجھا جا سکتا ہے جس کے لیے ایشیائی ممالک میں امریکی سفارت خانے حد درجہ سرگرم اور فعّال رہے ہیں۔

ذرّے سے آفتاب

یہ کتاب حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی کا شائع کردہ ایک اور نثری ترجمہ ہے جو منوّر لکھنوی کی قلمی کاوش ہے۔ یہ کتاب امریکہ کے ملک التجار فریک وِن ٹمیلڈ وِدلورتھ کی داستانِ حیات ہے۔ یہ ترجمہ ۱۹۶۰ء میں منظرِ عام پر آیا اور ۱۲۸ صفحات پر محیط ہے۔ یہ مقابلتاً سلیس زبان اور سادہ پیرایہ میں بیان کی گئی ایک دلچسپ سوانح عمری ہے۔ وِدلورتھ ایک مفلس کسان کا بیٹا کس طرح انتہائی عُسرت اور مفلسی کی زنجیریں توڑ کر اپنی ذہانت، مسلسل محنت اور جدّ و جہد سے امریکہ کا کروڑپتی تاجر بن گیا۔ یہ دلچسپ کہانی بڑے دلکش اور عام فہم انداز میں بچوں کے لیے ترجمہ کی گئی ہے۔ بچوں کے ادب میں تعلیمی اور اخلاقی مقاصد کی تکمیل کے ساتھ ساتھ تفریحی عنصر بھی نمایاں ہونا ضروری ہے۔ اس ادب کو محض اخلاقی، مذہبی یا نظریاتی پروپیگنڈے کا آلۂ کار بنا دینے سے اس عظیم مقصد کی تکمیل نہیں ہو سکتی جس کے لیے بچوں

---

[1] ایلینر روزویلٹ (مترجم منوّر لکھنوی) ایڈیشن ۱۹۵۹ء صفحہ ۱۴۹ باب: جنگ اور موت)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کا ادب تخلیق کیا جاتا ہے۔

"ذرّے سے آفتاب" ایک طویل لیکن مَن موہنی سوانح عمری ہے جو کہانی کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ منوّر کے ترجمے کی سادہ زبان اور اسلوب نے کہانی کی دلچسپی کو دوبالا کر دیا ہے رام موہن راؤ بچّوں کے ادب کے موضوعات کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"بچّوں میں خاندان اور سماج سے تعلق کی اہمیت کو ابھارا جائے۔ ہم بچّوں کو خاندان سے محبت کا سبق سکھائے بغیر کیوں کر توقع رکھ سکتے ہیں کہ یہی بچّے آئندہ چل کر اپنی قوم اور ملک سے محبت کر سکیں گے۔ دوسرے یہ کہ بچّے ایڈونچر پسند کرتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں دنیا کی تقریباً تمام ایڈونچر کہانیاں لکھی جا چکی ہیں اور انھیں بڑے اہتمام سے شائع کیا جا رہا ہے۔ ان کہانیوں کے تراجم سے بچّوں کے ادب کو مالا مال کیا جا سکتا ہے۔"[1]

"ذرّے سے آفتاب" اس قول کے اقتضا کی تائید اور تکمیل کرتی ہے۔ منوّر کے اس ترجمے کا انداز بڑا سلیس اور سادہ ہے با محاورہ زبان نے فرینک وِنفیلڈ وُڈ لورتھ کی اس جیون کتھا کو اور بھی سبق آموز اور دلچسپ بنا دیا جاتا ہے۔ ایڈونچر اور جوشِ عمل کڑی محنت اور لگن کا حوصلہ بخش سبق اس کہانی کے کلیدی عناصر ہیں۔ امریکہ جو آج دنیا کا سب سے خوش حال، متموّل اور ترقّی یافتہ ملک ہے، آج سے سَو برس پہلے اُس کی معاشی تصویر کیا تھی۔ عام لوگ کتنے مفلس تھے اور خصوصاً کسانوں کی اقتصادی بدحالی کا کیا عالم تھا، اس کی حقیقی تصویر اس سوانح حیات میں ملتی ہے اور اس ملک کے اقتصادی پسماندگی سے اُبھر کر بتدریج اور بسُرعت ترقّی کی منزلیں طے کرنے کی تصویر بھی اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ یہ سطور اُن دنوں کے امریکہ پر روشنی ڈالتی ہیں:۔

"زیادہ تعلیم فرینک کے مقدر میں نہ تھی۔ اس زمانے میں وہ چھوٹے سے مدرسے میں پڑھا کرتے تھے جو لال رنگ کا ایک کمرہ تھا۔ یہاں ہر عمر کے طلبا ایک ہی جگہ بیٹھتے اور ایک ہی اُستانی سب کو پڑھایا کرتی تھی۔ مفت عام تعلیم جس کو آج ہم ایک مسلّمہ حقیقت سمجھتے ہیں، ان دنوں نئی نئی رائج ہوئی تھی۔ امریکہ والوں کو اپنے ان مفت تعلیم دینے والے مدرسوں پر بڑا ناز تھا لیکن آج کل اُس زمانے کے مدرسے ہمیں نہایت عجیب و غریب معلوم ہوں گے۔"[2]

---

[1] ہفت روزہ "ہماری زبان" نئی دہلی۔ شمارہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۹ء

[2] ذرّے سے آفتاب (مترجم منوّر لکھنوی مطبوعہ ۱۹۶۰ء) صفحہ ۲۰ (باب: ایک شاہنشاہ سے ترغیب عمل)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اقتصادی بدحالی اور کساد بازاری کا منظر اس عبارت میں دیکھیے :۔

"خانہ جنگی کے خاتمے پر تجارتی کاروبار بالکل سرد پڑ گیا تھا اور یہ کساد بازاری کئی سال تک جاری رہی۔ ہر چیز کی قیمت بڑھ گئی تھی۔ روپیہ بازار میں تھا ہی نہیں ــــ دکان دار مددگار ملازموں کو رکھنے کے بجائے انھیں برطرف کر رہے تھے اور اگر کہیں کوئی جگہ خالی ہوتی بھی تھی تو لڑائی سے واپس آئے ہوئے جنگ آزمودہ سپاہیوں کو مل جاتی تھی۔ کوئی شخص بھی ایک ناتجربہ کار دیہاتی لڑکے کو ملازم رکھنے کے لیے آمادہ نہ ہوتا تھا۔"[1]

بلند نصب العین کے حصول کے لیے کڑی محنت کا عزم مصمم ہو تو انسان کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں لیکن اس کے بیج بچپن ہی میں آدمی کے ذہن میں بوئے جاتے ہیں خصوصاً جب ابن آدم کے نازک دل پر کوئی چوٹ پڑتی ہے اور اس کی غیرت کو للکارتی ہے۔ جب دس سالہ فرینک پانچ پنس کی چھوٹی سی رقم جیب میں لیے اپنے چھ سالہ بھائی چارلی کے ساتھ کارنر سٹور سے کوئی معمولی سی چیز خریدنے کے لیے جاتے ہیں جسے وہ اپنی والدہ کو سالگرہ کے تحفے کے طور پر دے سکیں تو سٹور کا کلرک انھیں حقارت سے ڈانٹتا ہے۔ ذیل کی عبارت میں اس گفتگو کا حظ اٹھایئے اور ترجمے کی سلاست کے ساتھ بامحاورہ اور منجھی ہوئی اردو کا بھی لطف اٹھایئے :۔

"ننھا چارلی بول اٹھا۔" ہمارے پاس پینی ہی کیوں نہیں۔ ہمارے پاس تو پانچ پینی ہیں۔"
پھر فرینک نے کہا۔" بھائی دکھادو نا انھیں۔"

" پانچ پینی ــــ اے پوری پانچ پینی ــــ" یہ کہہ کر کلرک کو پھر ہنسی آگئی، جس سے تحقیر کا انداز ٹپکتا تھا ــــ وہ پھر بولا۔" اتنی سی رقم لے کر چلے آئے ہیں سودا خریدنے۔" یہ کہہ کر اس نے فرینک کے کالر میں ہاتھ گھمایا اور پھر بولا۔" بس حد ہو گئی حماقت کی۔ اچھا اب یہاں سے چلے جاؤ اور ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، پانچ پینی والے خریداروں کے لیے کارنر اسٹور میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اب یہاں اپنے گندے چہرے پھر نہ دکھانا ــــ بس دال فے عین ہو جاؤ۔"[2]

---

[1] "ذرے سے آفتاب" (مترجم منور لکھنوی)، ایڈیشن ۱۹۶۰ء، صفحہ ۳۳ (باب : اسٹور میں ملازمتوں کی کم یابی)

[2] " " " " ۱۴ (باب : خرچ کرنے کے لیے صرف پانچ پینی)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

فرینک کے دل پر کلرک کے اس رویّے سے گہری چوٹ لگی۔ اس جذباتی ٹھوکر نے فرینک کے اس ارادے کو اور بھی پختہ کر دیا کہ وہ ایک اسٹور کا مالک ضرور بنے گا جس میں وہ پانچ پنس قیمت والا مال ہی فروخت کرے گا۔ چنانچہ وہ اسی کارنر اسٹور میں برسوں تک ملازم رہا۔ اُسے اسٹور کے کُھلنے سے ایک گھنٹہ پہلے حاضر ہو کر جاروب کشی اور جھاڑ پونچھ کرنی پڑتی تھی۔ پھر راکھ بٹور کر باہر پھینکنا، آتش دان گرم کرنا، لمپوں میں تیل بھرنا، اُن کی بتّیاں کترنا، پیکنگ کیسوں کو زور سے گھسیٹ کر تہہ خانے والے گوداموں میں پہنچانا، پیٹیاں کھولنا، ان میں سے مال نکال کر ہر چیز کی نوعیت کے لحاظ سے الگ چھانٹ کر شو کیسوں میں سجانا۔ یہ سب اُس کے فرائض تھے۔ ہفتے میں چھ روز اسٹور صبح سات بجے کُھلتا اور رات کے نو بجے بند ہوتا تھا۔

عزم و عمل کے سامنے کوئی کام ناممکن نہیں۔ آخر یہ لڑکا اپنے نصب العین کے حصول میں ظفرمند ہوا۔ وہ زمانہ بھی آیا جب

"فرینک وِدلورتھ کے ساتھی اُسے ایوانِ تجارت کا نپولین کہتے تھے۔ زمانۂ حال کے اس نپولین نے اپنے محل کو ایسے جدید ترین سامانِ آسائش سے مکلّف کیا تھا جس کا بوناپارٹ کے زمانے میں کوئی نام بھی نہیں جانتا تھا۔"[1]

۱۹۰۵ء تک وِدلورتھ کے اسٹور کی شاخیں بڑھتے بڑھتے ۱۲۰ تک پہنچ گئیں، ۱۹۰۹ء میں وِدلورتھ انگلینڈ جا پہنچے اور تین پنس اور چھ پنس کی قیمت والے مال کے اسٹور جاری کر کے وہ وہاں کے تمام بازاروں پر چھا گئے۔ کچھ شاخیں جرمنی میں بھی قائم ہو گئیں۔ تمام اسٹور خوب چمکے۔ کثیر منافع سے صدر خزانے میں خوب اضافہ ہوا۔ اکاؤنٹنٹوں کی فوج کو کروڑوں ڈالر کا حساب رکھنا پڑتا تھا۔ کیوں کہ اب یہ تجارتی ادارہ ۱۹۰۱ء سے ایک کارپوریشن کی شکل لے چکا تھا۔

اور پھر وِدلورتھ نے اپنے ذاتی فنڈ سے نیو یارک شہر میں ایک ایسی بلند اور گرجا نُما عمارت تعمیر کرائی جو "تجارت کا گرجا گھر" کے نام سے مشہور ہوئی۔ جس کی تعمیر پر اُس زمانے میں ایک کروڑ ۳۵ لاکھ ڈالر کی خطیر رقم خرچ ہوئی۔ اس عمارت کا افتتاح امریکہ کے پریذیڈنٹ وُڈرو وِلسن نے کیا اور اس افتتاحیہ تقریب میں ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے۔ کاروباری رہنما

---

[1] ذرے سے آفتاب (منوّر لکھنوی) صفحہ ۱۱۶ (باب : ایک سو قصبوں اور شہروں میں اسٹوروں کا سلسلہ)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ساہوکار، سیاست داں، پادری اہل قلم اور فن تعمیر کے ماہرین۔ نیز وڈ لورتھ کے اقارب کے علاوہ کارنر اسٹور کے مالک ولیم مور جنھوں نے سب سے پہلے اپنے اسٹور میں وڈ لورتھ کو ملازمت دی تھی۔ اس روز بقول فرینک وڈ لورتھ۔

"مجھے اپنی زندگی میں اتنی کسل مندی آج تک محسوس نہیں ہوئی' اور چارلی! مجھے آج خوشی بھی اتنی حاصل ہوئی جتنی اس سے پہلے کبھی نہیں حاصل ہوئی تھی۔ کل کی رات میری زندگی کی مبارک ترین رات تھی۔" ؎۱

فرینک وڈ لورتھ نے اپریل ۱۹۱۹ء کی آٹھویں تاریخ کو اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔ "بنویارک سن" اخبار نے ان کے بارے میں لکھا:۔

"انہوں نے دولت پیدا کی، مگر یہ دکھا کر نہیں کہ چھوٹی چھوٹی چیزیں زیادہ قیمت پر کس طرح بیچی جاتی ہیں۔ بلکہ اس کے بجائے یہ ثابت کر کے کہ زیادہ سے زیادہ مقدار میں چیزیں کم قیمت پر کس طرح فروخت کی جاتی ہیں۔" ؎۲

وویکانند۔ بچوں کے لیے ادب اطفال کے زمرے میں منوّر کی ایک اور مفید اور دلچسپ تالیف ہے۔ "وویکانند۔ بچوں کے لیے"، حکومتِ ہند کے شعبۂ اشاعت پبلی کیشنز ڈویژن کی اس باتصویر پیش کش کو منوّر لکھنوی نے مذکورہ ادارہ کی فرمائش پر اردو کا جامہ پہنایا۔ یہ ۶۴ صفحات پر محیط ہے اور پبلی کیشنز ڈویژن نے اسے جنوری ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔ اس سوانح حیات میں منوّر نے سوامی وویکانند کے واقعاتِ زندگی، افکار اور تعلیمات کو بہت ہی سادہ، سلیس، پُراثر اور دلچسپ انداز میں رقم کیا ہے۔

ہمارے ملک میں ۴۲ فیصد آبادی ایسے بچوں کی ہے، جن کی عمر چودہ برس سے کم ہے۔ ان بچوں کو صاف ستھرا ادب پڑھنے کو نہیں مل پاتا تو وہ فلمی رسالوں اور فحش لٹریچر پر گر پڑتے ہیں۔ بچوں کے ہاتھوں میں اخلاقی و تاریخی قصّے کہانیاں اور عظیم دیش بھگتوں کی جیون کتھائیں پڑھنے کو دینا ملک و قوم کے مستقبل کو روشن بنانا ہے۔ "وویکانند۔ بچوں کیلیے" اسی زمرے کی ایک دلچسپ تخلیق ہے۔ اس کے باتصویر ترجمے میں وویکانند کی زندگی کے

؎۱ ذرّے سے آفتاب۔ صفحہ ۱۲۴ (باب: تجارت کا گر جا گھر)

؎۲ ایضاً " ۱۲۸ (باب: مُوت سے کس کو رستگاری ہے)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اہم واقعات کو اس قدر مؤثر اور دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔ بچوں کی ذہنی نشو و نما پر اس کا نہایت مفید اور مثبت اثر پڑتا ہے اور قومی یکجہتی اور سیکولرازم کی قدروں کو پروان چڑھانے نیز سبھی مذاہب کے احترام اور مساوات کے جذبے کو فروغ دینے کی ترغیب ملتی ہے۔ چھوت چھات کی لعنت، اور اونچ نیچ کے امتیازات کو دلوں سے مٹا کر انسان کی خدمت و ہمدردی کے رویّوں کی تبلیغ ہوتی ہے۔

منوّر اس کتاب کے تیسرے باب میں رقمطراز ہیں:۔

"ہمارے ملک میں ایک ایسا زمانہ تھا، جب چھوت چھات کی وجہ سے لاکھوں غریبوں کی جان بڑے عذاب میں مبتلا تھی۔ اونچی ذات والے انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کو دوسری ذات کے لوگوں کے ساتھ ملنے جلنے، اُٹھنے بیٹھنے کی ممانعت تھی۔ جس سے اُونچی ذات کے لوگوں کے ساتھ ایک ہی مندر میں پوجا پاٹھ نہیں کر سکتے تھے۔ جن اسکولوں میں اونچی ذات کے لڑکے پڑھتے تھے، یہ لوگ اپنے لڑکوں کو ان میں پڑھنے کے لیے نہیں بھیج سکتے تھے۔ جن کنوؤں کو اونچی ذات والے استعمال کرتے تھے ان سے پانی بھرنے کا حق ان لوگوں کو نہیں پہنچتا تھا۔ انہیں چھونے کے قابل بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔"[۱]

نرین (وویکانند کا گھریلو نام) کو جب ان بدقسمت لوگوں کا خیال آتا، ان کا دل دُکھ سے بھر جاتا تھا۔ انہوں نے چھوت چھات کے اس ظالمانہ دستور کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس سے پرانے خیال کے کٹر لوگوں میں بڑی کھلبلی مچی، لیکن نرین نے ان کی ذرا بھی پرواہ نہیں کی۔ وہ ان لوگوں سے پوچھتے:۔ "آپ لوگ بھگوان کو کہاں تلاش کرتے ہیں؟ کیا یہ غریب بدنصیب اور کمزور انسان بھگوان کا رُوپ نہیں؟ پہلے ان کی پُوجا کیوں نہیں کرتے؟" نرین صرف باتوں کے دھنی نہیں تھے۔ سفر کے دوران وہ خود اکثر مہتروں اور خاکروبوں ہی کے ساتھ ٹھہرا کرتے اور ان کے ہاتھ کا حُقّہ پی لیتے۔ وہ ان پسماندہ لوگوں کے ساتھ بڑی عزّت اور محبّت سے پیش آتے۔

۱۔ وویکانند بچوں کے لئے (منوّر لکھنوی) صفحہ ۲۳

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

نزین کی تعلیم کے اثر سے رفتہ رفتہ لوگوں کے سوچنے کا انداز بدلا، اور اچھوت اُدھار کی تحریک جڑ پکڑ گئی ـــــ بچوں کے لیے زیر نظر کتاب میں جو معلومات درج ہیں اور جس سادہ و سلیس انداز میں دلتوں کی بھلائی اور چھوت چھات کے خاتمہ کی تحریک کا پس منظر بیان کیا گیا ہے، اس سے بچوں کے ذہنوں پر جو مثبت اور تعمیری اثرات مرتب ہونگے ان کی زبردست اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

۱۸۹۳ء میں شکاگو میں دنیا بھر کے عالم گیر مذاہب کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ وویکانند اپنے چیلوں کے جمع کئے ہوئے چندے سے امریکہ گئے، لیکن چونکہ وہ کسی تسلیم شدہ مذہبی ادارے کے ڈیلی گیٹ نہ تھے۔ اس لیے وہ کانفرنس میں شرکت کے مجاز نہ تھے۔ پروفیسر رائٹ اور ایک شفیق بوڑھی امریکن خاتون کی مدد سے انہیں کانفرنس میں شرکت کی اجازت مل گئی۔ ۱۱ ستمبر ۱۸۹۳ء کی سہ پہر کو جب وویکانند نے اپنی تقریر شروع کرتے ہوئے کہا، "میری امریکی بہنو اور بھائیو! تو ان کے الفاظ اور دل کش انداز تخاطب سے ایک عجیب جذباتی کیفیت اور جوش پیدا ہوگیا۔ ان کے چہرے کے جلال اور روحانی شخصیت سے بھی مندوبین حد درجہ متاثر ہوئے۔ سینکڑوں سامعین اپنی جگہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور خوشی سے زور زور سے تالیاں بجانے لگے۔ وویکانند نے لوگوں کے دلوں کو جیت لیا۔ انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ ـــــ "سارے مذاہب کا مقصد ایک ہے" انسان کو ایک ایسے عالمگیر مذہب کے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے، جس کے دائرے میں دنیا کے تمام مذاہب کے لیے جگہ ہو۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ تمام انسانوں کو خدا سے محبت کرنا چاہیئے۔ ایک دوسرے کے کام آنا چاہیئے اور آپس میں لڑنا بھڑنا نہیں چاہیئے۔

وویکانند تین برس تک مغربی ممالک میں رہے۔ وہ جرمنی انگلینڈ بھی گئے۔ منوّر لکھتے ہیں:۔

"تمام انگلستان نے ایک مہان گرُو کی حیثیت سے ان کا سواگت کیا۔ لیکن وویکانند کا کہنا تھا کہ وہ تو محض ایک ناچیز اور حقیر شاگرد ہیں، اور گرو خود نہیں بلکہ شری رام کرشن ہیں۔ ان کے بارے میں انہوں نے کہا، جو کچھ بھی میں ہوں، وہ ان کی دین ہے۔ میری ذات یا میری

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh. Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

باتوں میں جو کچھ اچھّی، سچّی اور ہمیشہ رہنے والی چیز ہے، وہ ان کے ذہن، مبارک دل اور رُوح کا عطیہ ہے۔" [1]

گرو بھگتی یعنی استاد کے احترام و عقیدت کی کیسی عمدہ مثال ملتی ہے۔ بچّے اگر اسی طرح استاد کی تعظیم کرنا سیکھ لیں تو قوم کے لیے ایک نیک فال ہے۔

جس روز ہزاروں امریکنوں کی پارلیمنٹ میں سوامی جی کا خیر مقدم کیا گیا۔ اسی دن کی یہ بات بھی منوّر لکھتے ہیں:۔

"جب وہاں ان کا شاندار استقبال ختم ہوا تو سوامی جی اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے آئے۔ جیسے ہی وہ بستر پر لیٹے، ان کا دل اپنے ملک کی، دُکھ بھری حالت کا خیال کر کے بھر آیا اور وہ بچوں کی طرح رونے لگے۔ تکیہ ان کے آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ وہ کھڑکی تک گئے اور اندھیرے میں گھورنے لگے۔ ان پر نیم بے ہوشی کا عالم طاری ہو گیا اور وہ یہ کہتے ہوئے گر پڑے ۔۔ " اے ماتا! جب میری ماتر بھومی میں انتہا درجے کی غریبی ہے تو مجھے اپنے نام اور شہرت کی کیا پرواہ ہے۔ ہم غریب ہندوستانیوں کی یہ کیا حالت ہو گئی ہے کہ ہمارے لاکھوں آدمی مٹھی بھر چاولوں کے لئے ترس کر مر جاتے ہیں۔ آخر بھارت کی جنتا کا اُدھار کون کرے گا۔ انہیں روٹی کون دے گا۔ مجھے بتاؤ کہ میں کس صورت سے ان کی مدد کر سکتا ہوں"۔ [2]

ایک روز کچھ فلاسفروں کے ساتھ سوامی جی کی بحث چل رہی تھی۔ دویکانند نے یہ کہہ کر مباحثہ ختم کر دیا اور سبھی فلسفیوں کا منھ بند کر دیا:۔

"بھگوان کو پانے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ انسان محتاجوں کے کام آئے۔ بھوکوں کو کھانا کھلائے۔ دُکھیوں کو ڈھارس دے۔ غریب اور بے آسرا لوگوں کی دستگیری کرے اور ایسے تمام لوگوں کی دیکھ بھال کرے جو بیمار ہوں اور جن کو تیمارداری کی ضرورت ہو"۔ [3]

۱؎ دویکانند۔ بچوں کے لیے (مترجم منوّر لکھنوی) ایڈیشن ۱۹۶۵ء، صفحہ ۴۹ (باب: کچھی دلیتوں میں)

۲؎۔ ایضاً ایضاً صفحہ ۴۴ ایضاً

۳؎ ایضاً ایضاً صفحہ ۵۳ ایضاً

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

آج کل کی نئی پیڑھی کو اسی تعلیم اور ایسے ہی سنسکاروں کی ضرورت ہے۔ اسی طرح کی کتابیں ان کے زیرِ مطالعہ لانی چاہئیں جس سے آنے والی نسل کے کیریکٹر کی تشکیل ہو۔ مذکورہ بالا عقائد کی تصدیق و تائید کچھ ایسے واقعات سے بھی ہوتی ہے جو وویکانند کی زندگی میں پیش آئے۔ بعض لوگ انہیں معجزات کہیں گے۔ جیسے کہ تیسرے باب (گھومنے پھرنے کا زمانہ) میں ایک واقعہ مذکور ہے۔ جو درج ذیل ہے:

"ایک مرتبہ نرین (وویکانند کا پیدائشی نام) ریل گاڑی سے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر اتر گئے۔ اس رات گرمی بڑی شدت سے پڑ رہی تھی۔ ان کے پاس صرف ایک کپڑا اور ایک تیسرے درجے کا ٹکٹ تھا۔ نرین بے حد تھکے ہوئے تھے۔ وہ مسافر خانے کے باہر زمین پر بیٹھ گئے اتنے میں ایک ادھیڑ عمر کا بیوپاری وہاں آپہنچا اور ان کے پاس بیٹھ گیا۔ یہ سوداگر نرین کے ساتھ ریل میں سفر کر رہا تھا۔ اس نے اپنی گٹھڑی کھولی اور کھانا کھانے لگا۔ نرین کو بہت زور سے بھوک لگی تھی۔ وہ پیاسے بھی بہت تھے۔ لیکن ان کے پاس ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ ان کو معلوم ہوا کہ اس اسٹیشن پر پانی بھی بکتا ہے۔ سوداگر نے مزید پوریاں اور لڈو کھانے کے لیے نکالے، اور کہنے لگا: جو لوگ دنیا تیاگ دیں اور روپے پیسے کا کوئی موہ نہ رکھیں ان کو بھوکے ہی رہنا چاہیئے۔ چونکہ آپ کو روپیہ کمانے کی فکر نہیں اسلیے آپ کو خالی پیٹ اور سوکھے حلق ہی پر قناعت کرنا چاہیئے۔"

اس کی یہ بات سن کر نرین بڑی متانت سے دیکھنے لگے، لیکن خاموش رہے۔ اتنے میں ایک شخص تیز تیز چلتا ہوا وارد ہوا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک پوٹلی اور ایک گلاس تھا اور بائیں ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا ایک برتن تھا۔ اس کی بغل میں ایک چٹائی لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے چٹائی کھول کر بچھادی۔ اس پر وہ کھانا رکھ دیا جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ پھر نرین کو آواز دی۔ باباجی آئیے! بھوجن کیجیے۔" نرین کو بہت تعجب ہوا، اور بولے: "بھائی تم بھول رہے ہو۔ مجھے تو یاد نہیں کہ اس سے پہلے کبھی ہماری تمہاری ملاقات ہوئی ہے۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اس پر اس شخص نے کہا کہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ خواب میں مجھے بھگوان رام کے درشن ہوئے، اور انہوں نے مجھے تاکید کی کہ میں جلدی سے اسٹیشن پہنچوں، اور ایک سوامی جی کو کھانا اور پانی پیش کروں۔ خواب میں مجھے آپ کے بھی درشن ہوئے تھے۔ اس لیے میں نے دُور ہی سے آپ کو پہچان لیا۔ اب آپ آیئے اور کھانا کھایئے۔ آپ بڑے بھُوکے ہوں گے۔"

اس واقعہ سے اس سوداگر کو بڑی شرمندگی ہوئی۔ اس نے زمین سے معافی مانگی اور ان سے آشیرواد کے لیے پرارتھنا کی۔"[1]

وویکانند جی کو احساس ہو گیا تھا کہ جس کام کی تکمیل کے لیے انہوں نے جنم لیا تھا وہ پورا ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنے مریدوں سے فرمایا — " اگر میں مر بھی جاؤں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے دنیا کو جو کچھ دیا ہے وہ پندرہ سو سال تک کے لیے کافی ہوگا۔" چنانچہ ۴/جولائی ۱۹۰۲ء کو صرف ۳۹ برس کی عمر میں سوامی جی نے اس فانی جسم کا چولا تیاگ دیا۔ رابندرناتھ ٹیگور نے ایک مرتبہ کہا تھا۔ " اگر تم بھارت کو جاننا چاہتے ہو، تو وویکانند کی زندگی کا مطالعہ کرو۔" بھارت کی جوان پیڑھی کے لیے فی الواقعی وویکانند کی زندگی ایک آدرش تھی اور تحریک عمل کا سرچشمہ۔ منوّر لکھنوی نے خوبصورت اور عام فہم اردو نثر میں ان کے سوانح حیات کو منتقل کر کے ایک مفید اور کارآمد کام کیا ہے۔ نئی نسل کے دلوں میں قومی یک جہتی، انسان دوستی، مذہبی رواداری، محتاجوں اور بے آسرا لوگوں کی ہمدردی اور بنی نوع انسان کی خدمت کے جذبات کے استحکام کے لیے منوّر کی یہ تصنیف خاص اہمیت رکھتی ہے۔

دادا نہرو

بچوں کے لیے اسی نوع کی ایک اور تصنیف جو منوّر لکھنوی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ وہ ہے " دادا نہرو" جو جون ۱۹۶۱ء میں مکتبہ جامعہ لمٹیڈ نئی دہلی نے بچوں کے لیے شائع کی۔ ۱۰۴ صفحات کی یہ کتاب بھی وویکانند کی سوانح عمری کی طرح بہت خوبصورت چھپی ہے۔ اس میں آزاد بھارت کے اوّلین وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے والدِ محترم پنڈت موتی لال نہرو کی جیون کتھا بڑے دلچسپ انداز میں بیان

[1] وویکانند۔ بچوں کے لیے (منوّر لکھنوی) صفحہ ۳۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کی گئی ہے۔ منوّر نے یہ کتاب موتی لعل نہرو کی صد سالہ جینتی کمیٹی کی تحریک پر تصنیف کی۔ یہ ترجمہ نہیں بلکہ حقائق و واقعات پر مبنی تصنیف ہے۔ اس کا دیباچہ حکومتِ ہند کے ایک سابق وزیر موہن لال سکسینہ نے تحریر کیا ہے۔

منوّر لکھنوی کی اس تصنیف میں بچوں کے لیئے بہت سی سبق آموز باتیں ہیں سب سے پہلے زبان ہی کو لیجیے۔ ظ۔ انصاری کی رائے ہیں:۔

" اچھی زبان سکھانا بھی، بچوں کے ادب کا ایک مقصد ہے۔ جن کتابوں، کتابچوں کو وہ بچپن یا لڑکپن میں شوق سے پڑھیں گے، ان کی زبان کا ذائقہ پکے بالوں کی عمر تک یاد رہے گا۔ زبان کی خوبصورتی، ماں کی مامتا کا ایک ٹکڑا سمجھو۔ زبان ایسی لکھی جائے جو بہت کچھ تو جانی پہچانی ہو، اور کسی قدر انجانی کہ پڑھنے میں مزہ ملے تو آگے جاننے کا شوق بھی لگا رہے۔ جانی پہچانی، نرم اور رواں زبان اگر ماں کا لاڈ ہے تو انجانے لفظ اور محاورے ماں کی گھُڑکی ـــــ لیکن اس گھڑکی میں بھی ایک چاؤ ہوتا ہے۔ اسے زبان کا رچاؤ کہتے ہیں۔" [1]

منوّر کی نثر کی زبان منجھی ہوئی، سادہ، عام فہم اور بامحاورہ اُردو ہے۔ کتاب کے پہلے باب میں سے اس بامحاورہ اور شستہ نثر کا ایک نمونہ دیکھیے:۔

" دادا نہرو بھی اپنی میٹھی میٹھی مَن موہنے والی زبان سے پھول برساتے رہتے۔ کبھی کبھی وہ پیار اور محبت کے جذبے میں آکر کہہ اُٹھتے۔ ماں! میں چاہتا ہوں کہ اتنا روپیہ کماؤں، اتنی دولت اکٹھا کروں، کہ ایک روز اِس گھر میں ہر طرف کنچن برسنے لگے۔

اپنے معصوم بچے کے ان بلند حوصلوں اور پیاری پیاری باتوں سے ماں کا کلیجہ ہاتھ بھر کا ہو جاتا۔ وہ مارے خوشی کے پھولی نہ سماتیں۔ جی جان سے ان پر نچھاور ہوتیں، اور ہزار ہزار بلائیں لیتیں۔" [2]

---

[1] ۔ اردو میں ادب اطفال ۔ ایک جائزہ (ڈاکٹر رحمانی) مطبوعہ سنہ ۱۹۹۱ء ۔ صفحہ ۱۳ (مضمون ۔ بچوں کے لیے لکھنا ۔ ظ انصاری) [2] دادا نہرو (منوّر لکھنوی) مطبوعہ سنہ ۱۹۶۱ء ۔ صفحہ ۱۳

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اسی طرح کی خوبصورت سادہ اور رواں ۔ نیز روزمرّہ اور محاورات سے مرصّع نثر کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو :۔

الٰہ آباد میں جس شان وشوکت اور ٹھاٹھ باٹھ سے وہ اپنی زندگی گزارتے تھے، اس سے کون واقف نہیں..... ان کے عیش وعشرت کے افسانے آج بھی لوگوں کی زبان سے سننے میں آتے ہیں۔ الہ آباد میں وہ فیشن کے لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ عدم تعاون کی تحریک میں شریک ہوتے ہی انہوں نے عیش وآرام کی زندگی کو خیرباد کہا۔ فیشن کو تلانجلی دیدی۔ نہ اب وہ گرمیوں میں پہاڑوں کی سیر وتفریح رہی، نہ انتہائی بیش قیمت اور پیرس کے دُھلے کپڑے، اب وہ ایک معمولی آدمی کی طرح کھدّر کے کپڑوں میں رہنے لگے تھے۔"[لہ]

ملک وقوم کی تعمیرِ نو اور ترقّی کے لیے بچوں کی تعلیم وتربیت موزوں خطوط پر کی جائے اور انہیں ایسا ادب پڑھایا جائے جو تہذیب وثقافت کی اعلیٰ اقدار سے انہیں روشناس کرائے تو یہی بچے مستقبل کے مفید، باعمل، بے تعصب اور کشادہ ظرف شہری بن سکتے ہیں۔ اسی لیے منوّر نے زیرِ نظر کتاب میں حب الوطنی، مذہبی رواداری، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، قومی یگانگت اور بھائی چارے کے واقعات وعناصر کو نمایاں طور پر پیش کیا ہے۔

ہرچند کہ سنسکرت، ہندی اور اُردو کے مفادات میں کسی طرح کا باہمی ٹکراؤ نہیں آج کچھ خود غرض اور فرقہ پرست عناصر فارسی اور عربی تو درکنار، اُردو جیسی خالص ہندوستانی زبان کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑے ہوئے ہیں، اور سنسکرت اور ہندی کو فروغ دینے کے بہانے، اردو کا گلا دبانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ بچوں کے لیے درجِ ذیل مثالیں یقیناً سبق آموز ہوں گی۔

"دادا نہرو کی ماں کو عربی زبان پر عبور تھا۔ قدرتی طور پر اُن کی خواہش تھی، اور یہ خواہش کچھ بے جا نہ تھی کہ موتی لال عربی زبان میں فضل وکمال حاصل کرلیں۔"

لہ دادا نہرو منوّر لکھنوی، ایڈیشن ۱۹۶۱ء صفحہ ۳۰

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE 2025 Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

دادا نہرو جن دنوں اپنے منجھلے بھائی کے ساتھ آگرے میں تھے،
ان کو باقاعدہ طور پر ایک مکتب میں داخل کرایا گیا۔ اسی مکتب میں انہوں
نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ بارہ برس کی عمر میں وہ اچھے خاصے
عربی داں ہو گئے۔ اس کم سنی میں بھی وہ جس مجلس میں پہنچ جاتے، لوگ
ان کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ فارسی زبان پر تو دادا نہرو نے گویا
قدرت حاصل کر لی تھی۔" ؎۱

دادا نہرو ہندو مسلمانوں کے باہمی اتحاد کو سب سے زیادہ مقدم سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم سب ہندوستانی پہلے ہیں اور مسلمان یا ہندو بعد میں۔ مسلمانوں کی طرف سے جداگانہ انتخاب کا معاملہ تھا۔ موتی لال نہرو چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو اوسط سے زیادہ نمائندگی مل جائے۔ انہوں نے اس سلسلے میں بڑا فراخ دلانہ رویہ رکھا، تاکہ دونوں فریقوں میں تعلقات خوشگوار ہو جائیں اور باہمی خون خرابہ بند ہو۔

کھانے پینے کے معاملے میں وہ بالکل آزاد تھے۔ ذات پات،
فرقے اور قوم ان باتوں سے وہ بے نیاز تھے۔ اسی وجہ سے نہ مسلمانوں سے
انہوں نے کبھی پرہیز کیا اور نہ کسی اور مذہب کے ماننے والے سے۔
سب ان کے دوست تھے۔ سب کے ساتھ ان کا اٹھنا بیٹھنا اور کھانا
پینا رہتا تھا۔" ؎۲

بچوں کی شخصیت کی نشوونما اور ان کے کردار و اخلاق کے ارتقاء کے لیے اسلاف کی تواریخ و سوانح میں سے ایسے حقائق و واقعات کو بچوں کے مطالعہ میں لانا مفید ہوگا جس سے وہ بلند حوصلہ اور نڈر بنیں۔ ایڈوینچر اور جوشِ عمل سے معمور ہوں۔ مصیبت میں ہمت نہ ہاریں۔ "دادا نہرو" میں منوّر لکھنوی نے اسی طرح کی کئی مثالیں بچوں کی رہنمائی کے لیے درج کی ہیں۔ مثلاً:۔

" دادا نہرو بڑے حوصلے والے اور نڈر قسم کے لوگوں میں سے
تھے۔ کسی سے خوف کھانا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ اس سلسلے میں

؎۱۔ دادا نہرو (منور لکھنوی) ایڈیشن ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۴
CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh Funding by IKS-MoE-2025-Grant
؎۲۔ ایضاً صفحہ ۱۴

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ایک واقعہ خاص طور سے یاد رکھنے کے قابل ہے۔

سنہ ۱۹۲۹ء میں جب شہیدِ وطن بھگت سنگھ نے اسمبلی میں بم پھینکا تو تمام سرکاری اور غیر سرکاری ممبر اپنی جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر چھپنے لگے۔ حد یہ کہ لوگوں کو جب باہر نکلنے کا موقعہ نہ مِلا تو کوئی میز کے نیچے جا پہنچا، کسی نے کرسی کی آڑ لی، مگر اس وقت بھی دادا نہرو نہایت مستقل مزاجی کے ساتھ جہاں بیٹھے تھے، بیٹھے رہے۔ اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔،، ؎۱

منوّر نے اپنی اس تصنیف میں دادا نہرو کی کھیل کود، شکار، شطرنج، ٹینس، باغبانی اپنے ہاتھوں سے کئی طرح کے پھول پودے اُگانے، اور شہسواری کے مشاغل وغیرہ سے گہری دلچسپی کا بھی تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ جس سے بچے ان سرگرمیوں میں حصہ لینے اور مہارت حاصل کرنے کا سبق سیکھ سکتے ہیں۔ دادا نہرو کی خوش مزاجی، زندہ دلی اور ہنسی مذاق کی عادت بھی مشہور تھی۔ بچے اس سے بذلہ سنجی شگفتہ مزاجی اور ہنس مُکھ رہنے کا درس لے سکتے ہیں۔ منوّر لکھتے ہیں کہ اپنی وفات سے چند روز پہلے موتی لال نہرو:-

،، آخری مرتبہ جب بیمار ہو کر الہ آباد سے لکھنؤ جا رہے تھے تو ان کے منہ پر کافی ورم تھا۔ انہوں نے اپنے بعض دوستوں کو مخاطب کر کے کہا، ,, دیکھو،، میں خوبصورتی کے مقابلے (بیوٹی کنٹیسٹ) میں حصہ لینے کے لیے جا رہا ہوں۔،، ؎۲

کتاب کے آخر میں منوّر لکھنوی نے دادا نہرو کے کچھ یادگار اقوال اور تقاریر کے اقتباس درج کئے ہیں جو ان کے نظریات اور اصولوں کی وضاحت کرتے ہیں۔ بلاشبہ دادا نہرو ایک تاریخ ساز شخصیت تھے جنھوں نے بھارت کی تحریک آزادی میں اہم اور نمایاں حصہ ڈالا۔

اسی طرح کی حب الوطنی کی مثالیں منوّر کے ترجمہ ,, لنکن نے کہا،، میں موجود ہیں، لیکن مضمون کی طوالت کے اندیشہ سے مذکورہ مثالوں ہی پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

؎۱ ۔ دادا نہرو (منور لکھنوی) طبع اول سنہ ۱۹۶۱ء ۔ صفحہ ۵۹

ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ۹۰

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بچوں کے ادب کے تراجم اور دیگر ادب پاروں کے سلسلے میں منورؔ نے جہاں بچوں کی لیاقت اور ذہنی سطح کے پیشِ نظر آسان، سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کیا۔ وہیں تصانیف اور موضوعات کے انتخاب میں بچوں کی نفسیات، ان کی دلچسپی اور شوق کا بھی خیال رکھا کہ کتاب کے ان پہلوؤں کو واضح کیا جائے، جن سے بچوں میں اعلیٰ اوصاف پیدا ہوتے ہیں اور وہ بلندیٔ کردار حاصل کر سکتے ہیں۔

اب جبکہ ہم پچھلے صفحات میں منورؔ لکھنوی کے لگ بھگ چھیالیس تراجم کے حسن و قبح پر بحث کر چکے ہیں، ان تراجم کے متعلق جو مجموعی تاثر ہمیں ملتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ منورؔ کا علمی تبحر، فنی ریاضت، سرمایۂ الفاظ، مفاہیم کو اردو نثر و نظم میں صحت اور وضاحت کے ساتھ منتقل کرنے کی مہارت اور چابکدستی، یہ سب اُمور مسلمہ ہیں۔ یہ سب اوصاف اور شستہ و شائستہ زبان، محاورہ بندی، بے پناہ قوتِ نظم اور فصاحت و بلاغت انہیں اپنے معاصر مترجموں میں ممتاز کرتی ہے اور بطور مترجم ان کی ایک واضح پہچان بناتی ہے۔

تاہم منظوم تراجم کے سلسلے میں مشہور فلسفی اور ہندی افسانہ نگار جینندر سے تفصیلی بحث کے بعد منورؔ لکھنوی نے خود اس بندھن اور معذوری کے باعث در آنے والی کوتاہی کا احساس و اعتراف کیا۔ مقفّٰی اور مردّف ترجمہ میں ضرورتِ شعری سے مترجم کو وضاحتِ مفہوم کے لیے کچھ فاضل شعر کہنے پڑتے ہیں۔ ہر چند کہ پابند نظم میں قاری لطفِ زبان و بیان سے محظوظ ہوتا ہے۔ تاہم طوالت کے شدید اور ناگوار احساس سے بچنے کے لیے آزاد نظم کی افادیت کا منورؔ نے اعتراف کیا ہے۔ بھاس کے ڈرامہ "چارودت" کے اپنے ترجمہ میں جو پیش لفظ منورؔ نے لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے جینندر جی سے ہوئی مفصل بحث کے حوالے سے تسلیم کیا ہے کہ آزاد نظم، منظوم ترجمہ میں اختصار اور جامعیت کے امکانات کو وسیع کر دیتی ہے۔ چنانچہ بیسویں صدی کے چھٹے دہا کے میں منورؔ نے جو ترجمے سپردِ قلم کئے ہیں، ان میں سے بیشتر میں آزاد نظم سے کافی حد تک کام لیا گیا ہے۔ مذکورہ پیش لفظ میں منورؔ لکھتے ہیں:۔

"پھر بھی مجھے یہ ماننا پڑا کہ پابند نظم میں شعری ضروریات کے تحت جو اضافہ ہوتا ہے، اس سے حسنِ اختصار پر پردہ پڑ جاتا ہے اور اس حقیقت سے تو کوئی صحیح الدماغ مصنف اور ادیب انکار نہیں

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کر سکتا کہ اجمال و اختصار بھی ادب کا ایک بہت بڑا حسن ہے۔ چنانچہ سنسکرت کا سارا شعری لٹریچر ایک طرف اجمال و اختصار اور دوسری طرف جامعیت کی بہترین تصویر ہے، لیکن سنسکرت میں اس اجمال و اختصار کا یہ حسن خاص طور پر اس لیے پیدا ہوا کہ اس میں ردیف تو دور رہی قافیہ کا التزام بھی روا نہیں رکھا گیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ سنسکرت زبان کی شاعری میں مقفّیٰ شاعری کا رواج ابتدا ہی سے نہیں ہے۔۔۔"

منوّؔر مزید اعتراف کرتے ہیں:۔

"ایک بات اور بھی عرض کرنا ضروری ہے۔ آزاد نظم گوئی اختیار کرنے سے مجھے فوراً ایک ذہنی انقلاب نظر آیا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ گویا میں کسی تنگ و تاریک قید خانے سے نکل کر کھلے میدان کی کھلی فضا میں سانس لے رہا ہوں۔۔۔۔"[۱]

بایں ہمہ نثری ترجمے ہوں یا منظوم ترجمے منوّؔر لکھنوی نے مختلف زبانوں پر اپنی کامل گرفت اور بطور مترجم اپنی قابلِ رشک مہارت اور خود اعتمادی کے طفیل بعض نقادوں کے اس الزام کو جھٹلا دیا ہے کہ مشرقی زبانوں (بالخصوص اردو) میں علمی اظہار کی کوئی روایت نہیں ہے۔ یا علمی زبان بہت کم ملتی ہے۔ پروفیسر آل احمد سرورؔ فرماتے ہیں:۔

"علمی زبان میں اظہار منطقی ہوتا ہے۔ حقیقی مفہوم ادا کرنے پر توجہ ہوتی ہے۔ کاروباری زبان میں سیدھے سادھے خیال اور فوری مطالب کو ادا کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ علمی زبان میں پیچیدہ سے پیچیدہ خیال کو اس طرح ادا کیا جاتا ہے کہ وہ ذہن میں روشنی کر دے۔ مہذّب زبان کی یہی پہچان ہوتی ہے کہ وہ ادبی اظہار اور علمی اظہار دونوں کے لیے سرمایہ رکھتی ہے۔"[۲]

---

[۱]۔ چارودت یا مفلس کا عشق (مترجم منور لکھنوی) قلمی مسوّدہ کا صفحہ ۳-۴ (دیباچہ)

[۲]۔ ترجمے کا فن اور روایت (مرتب ڈاکٹر قمر رئیس) صفحہ ۲۱۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation Chandigarh Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منوّر لکھنوی کے خوبصورت نثری اور منظوم تراجم کی سلاست، شگفتگی، اور روانی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اُردو ایک مہذّب زبان ہے۔ منوّر کے تراجم میں کہیں بھی اُکھڑے پن اور ناہمواریت کا احساس نہیں ہوتا۔ ان ترجموں میں منوّر لکھنوی کے خُلوص، ریاضت اور خونِ جگر کی مکمل نقش گری جلوہ گر ہے۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

باب ششم

مقامِ منّور

- منّور لکھنوی بطور استادِ فن
- اُردو اَدب پر منّور لکھنوی کے احسانات
- اُردو اَدب میں منّور لکھنوی کا مقام

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

مقامِ منوّرؔ

منوّرؔ لکھنوی نے زندگی کی آخری سانس تک ادب کی خدمت کی۔ اس نے تخلیقِ ادب کو ایک عبادت سمجھا اور اس عمل کو وہی خلوص، صداقت، انسانیت دوستی اور خود سپردگی نذر کی جس کی متقاضی اپنے معبود کی عبادت ہوتی ہے۔ اس نے ایسا ادب تخلیق نہیں کیا جو ہماری خارجی اور داخلی زندگی میں توازن و اعتدال کی بجائے بحران و انتشار پیدا کرے۔ مہندر باداؔ اپنے جریدہ "نگارش" میں ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"ادب یا تو اچھا ہوتا ہے یا بُرا۔ لیکن اچھے اور بُرے میں کیا فرق ہے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ ہر ادب کا مواد (CONTENT) کیسا ہے؟ اچھا یا بُرا۔ اچھا مواد وہ ہے جو صحت مند، مفید اور حوصلہ بخش ہو۔ بُرا مواد وہ ہے جو بیمار، غیر مفید، مایوس کن، تاریک اندیش یا گندہ ہو۔ سیاسی جدوجہد سے لیکر حسن و عشق کے موضوعات تک اچھے یا بُرے کی جستجو کی جاسکتی ہے۔ بُرے مواد کی ہیئت بظاہر کتنی خوب صورت ہو، اس کے اظہار و بیان میں جتنی شدت ہو یہ ادب اتنا ہی بُرا اور خطرناک ہے کیونکہ اس کا زہر زیادہ اثر انگیز اور کارگر ہوتا ہے۔ اچھا ادب وہ ہے جو اظہار و بیاں میں حسین و مؤثر ہو لیکن اس سے پہلے اس کے مواد کا صحت مند ہونا ضروری ہے۔"[1]

منوّرؔ نے اپنے قارئین کو صحت مند اور انسانی اقدار کو فروغ دینے والا ادب دیا کیونکہ ادب پوری زندگی کی تہذیب و تربیت کرتا ہے۔ یہ شاعر کو حصارِ ذات کی قید سے نکال کر فضائے

---

[1] ماہنامہ نگارش امرتسر (مدیر مہندر باداؔ) جلد ۴، شمارہ ۱۲، صفحہ ۸۸

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بسیط میں پر پھیلانے کی تحریک دیتا ہے۔ اس کی شاعری آئینہ فطرت اور پورے معاشرے کی ترجمان بن جاتی ہے۔ اس کے قلم سے نکلے ہوئے حروف پورے زمانے کے بلکہ پوری کائنات کے کرب وکیف کے غماز ہوتے ہیں اور ایسی تخلیق اُسے اِک پندارِ فن عطا کرتی ہے اور احساسِ فخر۔ نہ کہ احساسِ ندامت۔ جواہر لال نہرو اپنی مقبول زمانہ تصنیف ڈسکوری آف انڈیا (دریافتِ ہند) کا اختتام سوویت یونین کے ادیب نکولائی اوستروسکی کی ان سطور پر کرتے ہیں:۔

« زندگی انسان کی عزیز ترین تمنا ہے اور یہ زندگی انسان کو صرف ایک بار ملتی ہے۔ یہ زندگی اسے اس طرح گزارنا چاہیئے کہ اسے کبھی اس پر شرمندگی نہ ہو کہ برسوں وہ بغیر کسی مقصد کے زندہ رہا ہے۔ کبھی اسے ایک ذلیل اور بے کار ماضی پر شرمساری کا احساس نہ ہو۔ وہ اس طرح زندہ رہے کہ جب موت کی آہٹیں محسوس ہوں تو وہ کہہ سکے کہ میری ساری صلاحیتیں دنیا کے حسین ترین مقصد یعنی بنی نوع انسان کی نجات کے لیئے جدوجہد کی نذر رہی ہیں»۔ [۱]

مندرجہ بالا سطور کا اطلاق سو فیصد منوّر لکھنوی کی با مقصد حیات اور ان کے تعمیری مشن پر ہوتا ہے۔ فی الواقعی انہوں نے اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی بے کار نہیں جانے دیا۔ اور اپنی تخلیقی قوتوں کو ہمہ وقت بروئے کار لاتے رہے۔ انہوں نے ایک فعّال اور با مقصد زندگی بسر کی اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے سرچشمے سے ادب اور انسانیت کو قطرہ قطرہ سینچ کر اس کی نشوونما میں حصہ لیا۔ انہوں نے اپنی مقبول تصنیف "کمار سمبھو" کو (جو مہاکوی کالی داس کے ایک سنسکرت مہاکاویہ کا منظوم ترجمہ ہے) اپنے شفیق اُستاد منشی نوبت رائے نظر لکھنوی کے نامِ نامی سے معنون کرتے ہوئے جو منکسرانہ دعویٰ کیا ہے وہ سو فیصد برحق لگتا ہے۔ اور وہ دعویٰ یہ ہے:۔

ے
حاصلِ عمر نثارِ رہ یارے کردم
شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

منوّر کا مقام بطور استادِ فن کئی پہلوؤں سے بیشتر معاصر اُستادوں سے ممتاز اور منفرد

---

[۱] دوماہی جریدہ "پرواز ادب" (بھاشا دبھاگ پنجاب) پٹیالہ۔ شمارہ نومبر دسمبر ۱۹۸۹ء صفحہ ۸۸ [مقالہ جواہر لال نہرو بحیثیت ادیب از ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد]

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

رہا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ منوّر لکھنوی نے بیسیوں ناقہ ہائے بے زمام کو "سوئے قطار" لاکر کئی نئے دستخط دنیائے اردو سے روشناس کرائے۔ اور بساطِ شاعری پر ان نو واردان کے صحیح خد و خال ابھارنے اور انھیں تند آوری بخشنے کے لیے مخلصانہ مساعی کیں۔ یہ تو سچ ہے کہ شاعری کا جوہر قدرت کی ودیعت ہے اور یہ رجحان و رغبت خداداد ہوتے ہیں۔ لیکن اس آئینے کو جلا بخشنے میں استاد کا فیض و کرم بہت حد تک شامل رہتا ہے۔ بے عیب اور اعلیٰ شاعری کا ملکہ بغیر کسی ماہرِ فن کی رہنمائی کے حاصل نہیں ہوتا۔ نقد و اکتساب فنِ شاعری پر کامل گرفت و دسترس کے حصول کے لیے از حد ضروری ہیں۔ جن تلامذہ پر منوّر لکھنوی نے محنت کی اور جو خلوصِ دل سے اس گرامی منزلت، بلند کردار اور فاضل استاد کے نقوشِ قدم پر استوار رہے آج وہ مخصوص و منفرد ادبی مقام تک پہنچ چکے ہیں۔ ان ناموں کی فہرست بڑی طویل ہے اور یہ اس کتاب کے بابِ اوّل میں منوّر کے تلامذہ کے زیرِ عنوان شامل کی جا چکی ہے۔ منوّر سے مشورۂ سخن کرنے والے شعرا کی فہرست جو موصوف نے خود مرتب کی ہے، اس کی عکسی تصویر بھی بابِ اوّل میں شامل ہے۔

منوّر لکھنوی خود اپنے چند عزیز تلامذہ کے لیے اپنے دل میں کس قدر پیار، خلوص اور پدرانہ شفقت رکھتے تھے، اس کا اظہار انھوں نے کھل کر ذیل کی سطور میں کیا ہے۔ یہ مختصر اقتباس راقم السطور (شباب للت) کے ایک شعری مجموعہ کے لیے تحریر کردہ منوّر صاحب کے تعارفی مضمون میں سے لیا گیا ہے۔ (ان سطور کی عکسی تصویر بھی ذیل میں دی جا رہی ہے)۔ لکھتے ہیں:-

"شومئ قسمت یا خمیازۂ اعمال کے تحت ظاہری اولاد سے محرومی کے باوجود چند نوجوان شاعر ایسے ہیں جنھیں میں اپنی اولاد کی طرح پیار کرتا ہوں۔ ان میں ایک ہیں دہلی کے سیّد آفاق حسین آفاق (جو تقسیمِ ہند کے سلسلے میں کراچی چلے گئے لیکن ابھی تک مجھے اپنا بزرگ اور اپنا رہنما مانتے ہیں اور ابھی تک مجھ سے مشورۂ سخن کرتے رہتے ہیں)۔ دوسرے کالی چرن اثر دہلوی اور تیسرے نریش کمار شاد، اور چوتھے شباب للت۔ ایک نام کا اور بھی اضافہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ ہیں راج نرائن راز ایم۔ اے اگرچہ راز آفاق سے تو بہت جونیئر ہیں۔ لیکن شاد اور شباب سے کم جونیئر ہیں۔ یہ میرے بہت پیارے عزیزوں میں ہیں۔ اور کئی دوسرے نوجوانوں سے بھی مجھے بڑی محبت ہے لیکن جو سعادت مندانہ ادائیں آفاق، اثر، نریش، شباب اور راز میں پائی جاتی ہیں وہ نسبتاً دوسروں میں کم ملیں گی۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

میں نے اس امتیاز کا ذکر صرف عقیدت مندی کے معاملے میں کیا ہے۔ اور باتوں میں تو میرے سب عزیز یکساں طور پر قابلِ قدر ہیں۔"

[illegible]

منوّر ایک ادارۂ خیر تھے اور ان کا دل ہر ضرورت مند انسان کے لیے یکساں دھڑکتا تھا۔ اس میں کوئی تخصیص مذہب و ملّت نہ تھی۔ قرابت داری رنگ و نسل کا امتیاز نہ تھا۔ جیسا کہ باب اوّل میں تفصیلاً بیان کیا جا چکا ہے، منوّر کے آستانہ سے فیض یاب ہونے والے تلامذہ میں مسلمان، ہندو سکھ اور عیسائی ہر مذہب و فرقے کے شعرا تھے جنھوں نے اس شمعِ فروزاں سے ظرف و مقدور بھر روشنی کا اکتساب کیا۔

بطور استادِ فن منوّر کی وسیع النظری اور کشادہ دلی کا یہ عالم تھا کہ ان کے کاروانِ ادب میں دنیائے اردو کے جدید ترین شعرا بھی شامل تھے اور روایت پسند بھی۔ ان کے علاوہ متوازن ڈگر پر چلنے والے کچھ شعرا بھی تھے۔ جدیدیت کی تحریک جو کلیدی طور پر وجودیت کے فلسفے کی دین تھی اور روحانی حیثیت کی دعویدار، اگرچہ منوّر کو اپنے طلسم میں اسیر نہیں کر سکی لیکن صحت مند جدیدیت کی راہوں پر گامزن ہونے میں انھوں نے اپنے کچھ شاگردوں کی حوصلہ افزائی کی۔ اس سلسلے میں جدیدیت کی تحریک کے ایک اہم ستون پروفیسر بمل کرشن اشک اپنے مقالہ "منوّر میرے استاد" میں لکھتے ہیں:-

"میری غزلوں کا روایتی شاعری سے تعلق ٹوٹ چکا تھا۔ لب و لہجہ بالکل نیا تھا۔ . . . . بات یہاں تک پہنچی کہ متواتر چار پانچ مہینے تک میں مشورہ کے لیے اپنا کلام انھیں نہ بھیج پایا۔ انبالہ کے ایک مشاعرے میں پھر ملاقات ہوئی تمنّا صاحب کے گھر ہی۔ انھیں شکوہ تھا کہ میں نے لکھنا بند کر دیا ہے۔ ادھر بات ادھر ہی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "میری دو غزلیں سن لیجئے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں گے تو میں مشورہ کے لیے اپنی نئی چیزیں بھیج دوں گا۔" بہت غور سے سنتے رہے۔ داد دیتے رہے۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اور جب میں غزلیں سنا چکا تو فرمایا "تمہاری شاعری میں بنگلہ شاعری کے وہ اجزا داخل ہوگئے ہیں جن کی وجہ سے شاعری افسانہ نگاری کو چھوتی ہے۔ اور جو زبان تم استعمال کر رہے ہو اس میں غلطی کی گنجائش نہیں۔ غزلیں بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ خط ضرور بھیجتے رہنا"

"اچھے اُستاد ہیں، میں نے سوچا۔ اپنی طرف ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے اچھے سے اچھے شاگرد کو یہ مشورہ کبھی نہ دیں کہ یہ روزی پر لات مار دینے کے مترادف ہے۔ مگر ایسا تو جبھی ہو جب استاد نے مشورہ کو مزدوری سمجھ لیا ہو۔ یہاں ڈھنگ ہی اور ہے"[1]

اسی سلسلے میں خود منوّر لکھنوی اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں :۔

"ہر دوسری چیز کی طرح فنی قدریں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ ترک و اخذ کا سلسلہ ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔ شعر و ادب کے اسالیب اور ترک و اخذ کے معاملے میں بھی بقول پنڈت جواہر لال نہرو ہمیں اپنے دل و دماغ کی کھڑکیوں کو کھلا رکھنا چاہیئے۔ خود میرے کلام میں جدت ہو نہ ہو لیکن میں ہمیشہ اُس کلام کو سُن کر لوٹ پوٹ ہو جاتا ہوں جس میں کسی پہلو سے بھی کوئی انوکھی بات پاتا ہوں"[2]

اور فی الواقعی منوّر کے اس سچے اعتراف کی توثیق ایک اور جدت پسند شاعر پروفیسر آزاد گلاٹی کے خط کے جواب میں تحریر کردہ ان کے گرامی نامہ سے ہو جاتی ہے جو ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے۔ آزاد گلاٹی حضرتِ منوّر کے تلامذہ میں سے نہیں، محض ان کے نیازمند اور مداح رہے ہیں۔ جب آزاد گلاٹی نے اپنا پہلا مجموعۂ کلام "آغوشِ خیال" زیورِ طبع سے آراستہ ہونے کے بعد ازراہِ احترام منوّر لکھنوی کو بطور ہدیۂ نیاز ارسال کیا۔ تو جواباً منوّر صاحب نے اپنے شفقت نامہ میں اس باصلاحیت جدید شاعر کی کس کھلے دل سے حوصلہ افزائی اور پذیرائی کی، ملاحظہ ہو :۔

آدرش کتاب گھر۔ دہلی۔ ۶
۸/اگست ۶۴ء

عزیزم آزاد صاحب! تسلیم

آپ کا خط بھی آیا تھا اور "آغوشِ خیال" کی ایک جلد بھی۔ میں چونکہ والد صاحب کی ولادت کے جشنِ

---

[1] منوّر لکھنوی۔ شخصیت اور شاعری (مرتبہ راج نرائن رازؔ) مطبوعہ ۱۹۷۰ء، صفحہ ۶۹

[2] ماہنامہ پاسبان چنڈی گڑھ۔ شمارہ مئی ۱۹۵۹ء۔ صفحہ ۳۰ (مضمون: اکابرِ اردو ادب۔ منوّر لکھنوی)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

صدسالہ کے سلسلے میں ان کے حالات اور کلام کی ترتیب اور اشاعت کے اہم اور عجلت طلب کام میں بے حد مصروف ہوں اس لیے جلد رسید نہ بھیج سکا۔ کئی روز ہوئے شباب اِدھر آئے تھے۔۔۔۔۔ انہوں نے اس وقت تک "آغوشِ خیال" نہیں دیکھی تھی۔ میں نے اپنی کاپی انہیں دکھائی۔ بہت خوش ہوئے۔

"آغوشِ خیال" میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی تھی۔ یہ اس کی جاذبیت کا بیّن ثبوت ہے۔ اس سال یہ دوسرا مجموعۂ کلام کسی شاعر کا ہے جس نے مجھے بیحد متاثر کیا۔ اس سے پہلے رئیس امروہوی کے مجموعۂ کلام "الف" کے اچھوتے خیالات، اس کے جدید اور قدیم رنگ کے دلپذیر امتزاج اور رئیس کے تخیل کے ایک نئے موڑ نے مجھے والا و شیدا بنایا تھا۔ دوسرا مجموعۂ کلام ہے آپکا جو "آغوشِ خیال" کے حسین نام سے اُردو ادب کے ایوان میں جلوہ گر ہوا ہے۔۔۔۔۔۔ منوّر

اسی حوصلہ افزائی ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ حضرت منوّر نے آزاد گلاٹی کے اشعار کے حوالے سے مذکورہ شعری مجموعے پر اپنا تفصیلی تبصرہ بھی اس خط کے ساتھ منسلک کیا ہے۔ ان بزرگوں کی نیک خواہشات کی برکت سے آج آزاد گلاٹی جدید تحریکِ ادب کے اہم نمائندوں میں شمار ہوتے ہیں۔

منوّر چراغ سے چراغ جلانے کے اس سلسلے کو گورو رن (قرضِ استاد) کی ادائیگی قرار دیتے تھے اور اپنے اسی اعتقاد کے سہارے اپنی خرابیٔ صحت کے باوجود آخری عمر تک اپنے تلامذہ کی رہنمائی کرتے رہے۔ ان کے بابِ فیض سے کوئی مایوس نہیں لوٹا۔ اور بے نیازی کا یہ عالم کہ انہوں نے کبھی اپنے کسی شاگرد سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ کوئی فرمائش نہیں کی۔ وہ اکثر اپنے تلامذہ سے کہا کرتے تھے کہ وہ مشورہ دیتے ہیں، اصلاح نہیں کرتے اور حتی الامکان ان کی یہی کوشش رہتی تھی کہ اس مشورۂ سخن سے شاگرد کا بنیادی خیال مجروح نہ ہو۔

منوّر لکھنوی کے ایک اور نیاز مند بلراج حیرت اسی سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"جب پہلی بار میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو کہنے لگے کہ میں خود کو استاد ہونے کے قابل نہیں سمجھتا۔ میں نے بات بناتے ہوئے عرض کیا کہ پھر میرے نقّاد ہو جائیے اور میرے تجزیے ادھیڑتے رہیئے۔ قبلہ یہ سن کر ہنس پڑے اور فرمایا کہ یہ تجویز اچھی ہے۔ آپ کلام سنائیے میں اعتراض کر دوں گا۔ اور آپ جواب دیں گے یا اعتراض دور کریں گے۔ پھر یہ سلسلہ کچھ اتنا

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

دلچسپ ہوگیا کہ ایک ایک لفظ پر بحث ہونے لگی۔ یہاں تک کہ اگر موصوف زیرِ بحث زمین میں کوئی شعر عطا کرتے تو میں بے ادب ہوکر کہہ دیتا کہ حضور فوراً پکڑا جاؤں گا کہ آپ کا شعر پڑھ رہا ہوں، اور وہ ہنس پڑتے۔ اس سے مجھے دو فائدے ہوتے۔ ایک تو یہ کہ مجھے خود پر اعتماد بہت جلد ہوگیا۔ اور دوسرا یہ کہ میرا اسلوب خالص میرا رہا۔ ہاں یہ نقصان ضرور ہوا کہ میں براہِ راست اصلاح سے محروم ہوگیا۔"

منوّر بھی اگر چاہتے تو شاگردوں کے کلام پر دی گئیں اپنی اصلاحوں سے ہی ایک کتاب مرتب کر سکتے تھے جیسے ابوالفصاحت جناب جوشؔ ملیانی نے "آئینۂ اصلاح" شائع کی۔ اور مولانا ابرؔ حسنی کی بھی ایک کتاب منظرِ عام پر آئی ہے۔ لیکن منوّر خود نمائی سے بے نیاز، درویش صفت انسان تھے۔ ان کی اسی بے نیازی اور حلیمی کا ذکر تو ان کے ممتاز شاگرد دبمل کرشن اشکؔ نے نمایاں طور پر اپنے مضمون "منوّر میرے استاد" میں کیا ہے۔ مضمون کے آخری پیراگراف میں اشکؔ لکھتے ہیں:-

"میں کیسے کہوں کہ منوّر صاحب میں روایتی استاد کی کوئی خوبی موجود ہے۔ سیدھی بات تو یہ ہے کہ منوّر صاحب کے لیے استاد کے لفظ کا استعمال مجھے قطعاً نہیں جچتا۔ اگر استاد کے معنیٰ ہیں ایک ایسی شخصیت کے جو زبان پر قدرت رکھتی ہو تو صحیح اور اگر اس لفظ کے معنیٰ ہیں ایک ایسا شخص جو موزوں مشورہ کے بعد آپ پر اپنا کوئی ناجائز حق سمجھتا ہو، جو آپ کو اپنے گروہ کا ایک جزو سمجھتا ہو، جو ایک ایسا اسکول بنا کر بیٹھ گیا ہو جس میں زبان کی مقامی اور ذاتی صحت چند متروکات کے آئینے میں دیکھی جاتی چاہیئے تو منوّر استاد نہیں۔

میں نے اور بہت سے لوگوں نے ان سے زبان کی صحت سیکھی ہے۔ لیکن جو ہم سب پر ان کا تأثر ہے اسے انسانیت اور شرافت کا تأثر کہا جا سکتا ہے۔ جب کوئی آدمی مجھے یہ کہتا ہے کہ وہ منوّر صاحب کو جانتا ہے تو مجھے اس آدمی کی شرافت کا یقین ہو جاتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک شاعر اُن سے ملے اور کچھ پا کر نہ آئے۔ منوّر صاحب ایک ایسا آئینہ ہیں جس میں اپنی شکل دیکھتے وقت آدمی کو اپنے سر کے اردگرد ایک ہالہ کا احساس ہوتا ہے۔ روشنی اور صداقت کے ہالہ کا۔"[1]

اردو ادب پر منوّر کے احسانات کا سلسلہ طویل ہے۔ منوّر جیسے ذہین اور طبّاع ادیب نے اپنی

---

[1] منوّر لکھنوی شخصیت اور شاعری (مرتب راج نرائن رازؔ) صفحہ ۰

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تخلیقی کاوشوں اور اظہار باطن کے لیے اردو زبان ہی کا انتخاب کیوں کیا جب کہ انھیں سنسکرت، فارسی، ہندی اور انگریزی جیسی مشرقی اور مغربی زبانوں پر بھی کامل دسترس تھی۔ منوّر کے پُرکھوں نے بھی اردو زبان کی نمایاں خدمات کی تھیں اور اس کو بیش بہا فن پارے دیے تھے۔ شاعری پانچ پشتوں سے اس خاندان کی وراثت رہی تھی۔ لہٰذا منوّر ہی کیا، ان کی پیش رو پانچ پشتوں کے اور بالخصوص ان کے والد ملک الشعرا آفق لکھنوی کے احسانات بھی اردو زبان پر قرض تھے اردو زبان کی اپنی جاذبیت اور دلکشی برحق لیکن ہندو ادیبوں کی ان خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جن کے صدقے اردو کے جذب واثر میں اضافہ ہوا۔ مولوی عبدالحق فرماتے ہیں:۔

"شعروادب میں کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں ہندوؤں کے ذہن رسا اور فکر بلند نے معجزے نہ دکھائے ہوں۔ بعض شعبوں کے لیے تو پیشوا بھی یہی ہوئے۔ کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں ہندو بلند پایہ شاعر اور انشا پرداز نہ ہوئے ہوں"[1]

نازؔ نانک پوری اپنے مقالہ "ہندی بول چال میں غزلیہ شاعری کی روایت وابتدا" میں رقم طراز ہیں:۔

"بابائے اردو نے تو صرف اتنا ہی کہا ہے لیکن اگر ایمانداری سے تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندو ہر شعبے کے پیشوا رہے ہیں۔ پاکستان کے ادیب مخمور اکبرآبادی کا یہی خیال ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "اردو ہندوؤں کی زبان ہے"[2]

منوّر کا سب سے اہم کام قومی یک جہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی تبلیغ تھا۔ اس مقدس فریضے کی تکمیل کے لیے اردو جیسی مقبولِ عام اور رائج الوقت زبان کا منتخب کیا جانا قدرتی امر تھا کیونکہ یہ ہندوستان کے باشندوں کی مشترکہ میراث تھی۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں:۔

"ہندوستان کو سلطنتِ مغلیہ کی سب سے بڑی دین تاج محل، غالب اور اردو زبان ہیں اردو نہ صرف ہندوستانی قومیت کے تقاضوں کی تکمیل کرتی ہے بلکہ اس ملک کی دوسری زبانوں پر اس کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ یہ مشرقِ وسطیٰ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے۔

---

1. ہفت روزہ ہماری زبان۔ نئی دلی۔ شمارہ ۸ اپریل ۱۹۸۶ء
2. ہفت روزہ "ہماری زبان"، نئی دلی۔ شمارہ ۸ اپریل ۱۹۸۶ء

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

ایشیائی یک جہتی کی نمائندہ زبان ہے۔"[1]

قومی یک جہتی اور فرقہ وارانہ رواداری کے درس کی تبلیغ کے لیے منوّر کا اردو زبان کو وسیلہ بنانا ہی اس زبان پر بہت بڑا احسان ہے۔ اس سے اردو کی لسانی اہمیت و افادیت نیز مثبت زمرے کے سرمایۂ ادب میں بیش بہا اضافہ ہوا۔

منوّر کے فکری خمیر اور ذہنی ساخت و پرداخت میں سناتن دھرمی اعتقادات اور اسلامی نظریۂ حیات دونوں کے اثرات شامل تھے۔ ان کے تخلیقی عمل کا سنہری پہلو یہ ہے کہ ان دونوں مختلف عقائد میں جن کے کچھ اجزا کے مابین بُعدِ مشرقین ہے، کہیں بھی ٹکراؤ نہیں آنے دیا۔ بلکہ تضادات کو بھی انہوں نے تخلیقی عمل کے وسیلے سے ایک حسین و خوش گوار امتزاج میں بدل دیا۔ جسے ہم مخلصانہ رواداری کی معراج کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا آمیزہ SYNTHESIS ہے جو سبھی فرقوں کے لیے خوش آئند اور قابلِ قبول بھی ہے۔ اور یہی خوش گوار اور قبولِ خاطر امتزاج منوّر کی شاعری کے ایک منفرد پہلو کے روپ میں اُبھر کر سامنے آتا ہے۔

منوّر برِصغیر ہند میں بسنے والے سبھی فرقوں کو باہمی میل ملاپ اور بھائی چارے کا درس دے کر انہیں ہندوستان کے بلکہ دنیا کے آدرش ناگرک دیکھنا چاہتے تھے۔ اقبال کے پیغام میں "مردِ مومن" کرۂ ارض کا مثالی انسان ہے۔ منوّر کے پیغام میں ایک اچھا پڑوسی، بلا لحاظ مذہب و ملت دوسروں کے کام آنے والا اور بے تعصب بشر ایک مثالی شخصیت ہے۔ منوّر نے اسلامیات اور ہندو شاستروں کا غائر مطالعہ کیا تھا۔ گھریلو سنسکاروں اور ویدک لٹریچر کے مطالعہ سے بھی انہوں نے انسان دوستی کا سبق سیکھا تھا۔ ویدک دھرم بلا لحاظِ مذہب و ملت، رنگ و نسل "وشو پریم" کی ہدایت کرتا ہے۔ یجر وید کے چھتیسویں ادھیائے کے اٹھارہویں منتر میں کہا گیا ہے۔

"اے ایشور! مجھے سب پرانی متر کی درشٹی (دوست کی نظر) سے دیکھیں اور میں سب پرانیوں (جانداروں) کو متر کی درشٹی سے دیکھوں۔ اور ہم سب ایک دوسرے کو متر کی درشٹی سے دیکھا کریں۔ اس طرح آپ ہمیں درڑھ (مستحکم) کیجیے۔"[2]

اتھروید کے ایک منتر میں آتا ہے "ماتا بھومی پتروا ہم پرتھویہ" یعنی پرتھوی (زمین) میری ماں ہے

---

[1] ماہنامہ "سہیل" گیا۔ شمارہ ۱۰۔ ج ۱۵۔ صفحہ ۱۶

[2] ماہنامہ "ادم" نئی دلی۔ شمارہ نومبر ۱۹۹۲ء (مضمون: ویدک دھرم اور وشو پریم از پرنسپل ہنس راج بھسین صفحہ ۲۴

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اس پر پیدا ہونے والے تمام انسان اس کے پتر یعنی میرے بھائی ہیں۔ کیونکہ وہ سبھی اُسی آسمانی باپ کی اولاد ہیں۔ بھگوت گیتا کے ایک شلوک میں بھگوان کرشن فرماتے ہیں کہ دنیا کے تمام پرانیوں کی بھلائی میں لگا ہوا انسان برہم نروان (نجات) کو حاصل کرتا ہے۔ ایک وید منتر جو آریہ لوگوں کی روزمرہ کی عبادت کا حصہ تھا اور ابھی تک ہر پُوجا کے اختتام پر جس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ دنیا کے سبھی جانداروں کی خیر و بہبودی، راحت و سکون کی دعاؤں کا حامِل ہے۔ اس میں کہا گیا ہے۔ "سروے بھونتو سُکھینا، سروے سنتو نرامیا، سروے بھدرانی پشینتو، ما کسچ دُکھ بھاگ بھویت"

اسی طرح ایک اور وید منتر میں یہ دعا کی گئی ہے کہ ہمیں اچھے اور نیک خیالات جہاں سے بھی ملیں، اپنانے کی کوشش کریں۔ یعنی دُنیا کے جس خطے سے بھی نیک اور ارفع خیالات ملیں ہم انھیں احترام کے ساتھ قبول کر کے اپنی زندگی کو ان سے مستفید کریں۔ انہی ہدایات کے زیرِ اثر منوّر نے "افکارِ بلند" "الہاماتِ ایرانی"، اور "وجدانِ حافظ" جیسی کتابیں شائع کیں۔ مشرق و مغرب کے مشاہیر اور عظیم روحانی و اَدبی شخصیات کے مفید اور کار آمد افکار واقوال کا خوب صورت منظوم ترجمہ کر کے یہ ادبی شاہکار مرتّب کیے۔ اور اس طرح اُردو کے قارئین کے لیے شمع ہدایت روشن کی۔ عالم گیر انسانی بھائی چارے کا آفاقی پیغام اہلِ اردو کو ذہن نشین کرانے کی شعوری مساعی میں وہ ہندوستانی ادیبوں میں پیش پیش رہے۔

منوّر نے اپنی قومی اور تعمیری نظموں کے ذریعے حب الوطنی کے جذبات کو مہمیز لگانے کے ساتھ ساتھ سیکولرازم اور مذہبی رواداری کے نظریات کو فروغ دیا۔ امن، بھائی چارہ اور صلح و آشتی کے جس درس کی تبلیغ کبیر، نانک، امیر خسرو، رحیم اور نظیر اکبرآبادی کا مقدس نصب العین رہا، منوّر نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ اس درسِ مقدس کو عام کرنے کا سلسلہ آگے بڑھایا۔ اسی درسِ آشتی و یگانگت کے متعلق ڈاکٹر عابد حسین نے اپنی اہم تصنیف "قومی تہذیب کا مسئلہ" میں بھگتی تحریک کے مذکورہ عظیم شعرائے کے حوالے سے خصوصی ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

> "ہندوستان کی چار ہزار سال کی تہذیبی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ اس ملک میں گوناگوں کثرت کے اندر وحدت کا جو باریک رشتہ موجود ہے، وہ اربابِ قوّت کے جبر و تشدد سے نہیں بلکہ عارفوں کے وجدان سے، زاہدوں کی ریاضت سے اور فنکاروں کی تخلیق سے پیدا ہوا ہے اور یہی سادھن ہیں جن کے ذریعہ اسے زیادہ مضبوط اور پائیدار بنایا جا سکتا ہے۔"[۱]

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

مذکورہ حوالے میں جس مقصد کی نشاندہی کی گئی ہے، اسی کی تکمیل کے لیے منوّر نے بلا امتیاز مذہب و ملت دینی اور روحانی صحیفوں اور مختلف فرقوں کی مقدّس کتابوں کے ترجمے اردو میں کیے۔ ہر مذہب کے پیشواؤں کو اپنی شاعری میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اور اس طرح بھارت کے مختلف عقائد رکھنے والے فرقوں کے مقلّدین کو ذہنی اور جذباتی سطح پر باہم دگر قریب لانے کی عملی کوششیں کیں۔ اس ترغیبی تحریک کے بارے میں ڈاکٹر عابد حسین مزید فرماتے ہیں۔

> "چند سال تک نئی روشنی اور پرانی روشنی کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی تحریکیں اس طرح گھُل مِل کر ملک کی آزادی کے لیے کام کرتی رہیں کہ معلوم ہوتا تھا۔ ہندوستانی روح کے اندر سے متحدہ قومیت اور قومی تہذیب کا چشمہ نئے سرے سے جوش و خروش کے ساتھ اُبلنے لگا۔"[۲]

اسی خیال کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر عابد حسین اپنی مذکورہ تصنیف میں ہندو مفکّروں کیشو چندر، مہادیو ڈیسائی، گووند راناڈے، بال گنگادھر تلک، رام موہن رائے، سوامی وویکانند اور آربندو گھوش کے مستحسن کارناموں کا ذکر کرتے ہیں اور یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ گوتم بدھ سے گاندھی تک ہندو رہنماؤں نے ہندوئیت کو عالمگیر انسانیت میں سمو کر ہندوؤں میں وسعت نظری پیدا کی اور انھیں ایک متحدہ قومیت کی تعمیر کے لائق بنایا۔

منوّر کی شاعری انہی بزرگوں کی عظیم تحریکِ یک جہتی کا ایک حصّہ معلوم ہوتی ہے، بالخصوص ان کی نظمیہ شاعری "کائناتِ دل" سے لے کر "سوزِ وطن"، "نقوشِ منوّر"، اور "شگفتہ عقیدے" تک تحریکِ اتحاد و یک جہتی کو تقویت بخشنے والی ایک مسلسل تخلیقی جدوجہد کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ ان کی نظمیں ان کے تاریخی، مذہبی، سیاسی اور سماجی، نیز ثقافتی شعور کے ساتھ ساتھ ان کے روحانی عرفان و وجدان کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ اردو میں نظم کے پہلے اہم سیکولر شاعر نظیر اکبرآبادی کی طرح منوّر نے بھی اپنے مذہب کی شخصیتوں اور تقریبات کے علاوہ دیگر مذاہب کے پیش رووں، بزرگوں، پیغمبروں اور ان کی تعلیمات پر نظمیں کہی ہیں۔ منوّر کے نظمیہ کلام میں وہ ہندوستان پوری طرح رچا بسا ہے جو مختلف مذاہب کا مسکن ہے اور جہاں کی گنگا جمنی تہذیب

(صفحہ گذشتہ کا) [۱] قومی تہذیب کا مسئلہ (ڈاکٹر عابد حسین) کی تلخیص بعنوان "ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب۔ مطبوعہ جولائی ۱۹۵۵ء ص ۲۴

[۲] قومی تہذیب کا مسئلہ ، ایڈیشن ۱۹۵۵ء۔ صفحہ ۲۳۵

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

و ثقافت کو مختلف عقائد کے لوگوں نے سنوارا اور پروان چڑھایا ہے۔

اسلامیات سے متعلق منوّر لکھنوی کی بعض نظمیں نعتیہ شاعری کی بہت عمدہ مثالیں ہیں۔ اردو زبان میں دکن کی مشہور مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" سے لے کر کلام اقبال تک ہر اہم شاعر نے نعت گوئی کی ہے۔ مسلم شعرا کا سیرتِ نبی کی توصیف کرنا اور پیغمبر و اولیا کی شان میں منقبت گوئی وسیلۂ نجات و ثواب تصور کیے جاتے ہیں لیکن غیر مسلم شعرا کا رسول الٰہی کے تئیں اظہارِ انس و عقیدت اس عظیم شخصیت کی عظمت و طہارت کی دلیل ہے۔ منوّر نے بھی اپنے نعتیہ کلام میں حضرتِ محمدؐ، حضرت علیؓ، حضرت امام حسینؑ اور آلِ رسولؐ کا ذکر حد درجہ خشوع و خضوع، عقیدت و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ محض یہی نہیں انہوں نے قرآن مجید کی کچھ سورتوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ شہدائے کربلا کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے منوّر نے مرثیے بھی کہے ہیں۔ اور "مجاہدہ حسینی اور اسلام" کے نام سے ایک مدلّل کتابچہ بھی سپرد قلم کیا۔

غزل گوئی کی حیثیت سے بھی اردو ادب کو منوّر لکھنوی کی دین کم بضاعت و فرومایہ نہیں۔ اچھی غزل کہنا اور عام روش سے ہٹ کر کہنا، نیز اس میں اجتہاد اور نئے مضامین کی آمیزش، بغیر روحانی عرفان و وجدان کے ممکن نہیں۔ اپنے ایک مقالہ "نئی غزل اور روحانی حسیت" میں ڈاکٹر عنوان چشتی فرماتے ہیں:۔

> "شاعری بیان کا تجربہ نہیں بلکہ تجربے کا اظہار ہے۔ بلکہ یوں کہنے دیجیے کہ تجربے کا روحانی اظہار یا روحانی تجربے کا جمالیاتی اظہار ہے۔ اس لیے اچھے شاعر کے یہاں ادراک و تصورات کو ذوجانبی بنانے کا عمل دو سطحوں پر ہوتا ہے۔ ایک مادے کی تطہیر کر کے اس کو روحانی لہروں یعنی ذہنی پیکروں اور فکری زاویوں میں ڈھالنے کا عمل، دوسرا کثیف افکار کو لطیف برقی لہروں میں تبدیل کرنے کا عمل"۔ [۱]

منوّر کی غزل بھی روحانی تجربے کا جمالیاتی اظہار ہے ان کی غزل کے مضامین زیادہ تر ایک منفرد اور جداگانہ روحانی پُٹ لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ انہوں نے غزل کے روایتی ڈھانچے میں بڑی چابکدستی اور پُرکاری سے نئے روحانی مضامین داخل کیے ہیں۔ ہماری غزلیہ شاعری میں روایت سے مکمل انحراف کی کوئی بھی کوشش غزل کے عام مزاج کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ البتہ روایتی سانچوں میں نئے موضوعات اور خیال کو ڈھال کر نئی جہات کی نشاندہی کرنے والے اختراع کار ذہنوں کی کاوشیں مستحسن قرار دی جاتی ہیں۔ منوّر نے بھی غزل کی روایتی ہیئت کے ساتھ سمجھوتہ

---

[۱] سہ ماہی "جدید فکر و فن"، شملہ، شمارہ اگست، اکتوبر ۱۹۸۷ء (مقالہ "نئی غزل اور روحانی حسیت" از ڈاکٹر عنوان چشتی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کرلیا۔ لیکن اس میں اخلاقی، روحانی، وجدانی، فلسفیانہ اور معاشرتی حتیٰ کہ سیاسی مضامین کے دخول سے اس صنف کو فکری وسعتوں سے ہم کنار کیا، لیکن اس اختراعی عمل کے ساتھ منورؔ کی لکھنویت اس حقیقت کا بھی پاس رکھتی تھی کہ غزل کا مزاج دھان پان ہے جو نہ کسی ثقیل لفظ کا متحمل ہو سکتا ہے نہ ثقیل خیال کا۔ غزل کی نفاست، سلیقے اور شیشہ گری کے رکھ رکھاؤ کو انہوں نے ہر ممکن طور پر نباہا۔ اسی لیے مضامین کے تنوع کے ساتھ منورؔ کی غزل زبان کی شستگی، شائستگی، شگفتگی، نفاست اور صنائع شعری سے مملو ہے۔ غزل کو نئے مضامین، نئی ادائیں اور آن بان دے کر منورؔ نے اردو زبان اور اردو غزل کا وقار بڑھایا ہے۔

عموماً وارداتِ عشق ہی کو غزل کا کلیدی عنصر مانا جاتا ہے۔ غزل کا ہر شاعر عشق و محبت کو ہی اولاً اس صنف کا موضوع بناتا ہے۔ منورؔ بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ لیکن ان کے یہاں عشق کی جذباتیت رفتہ رفتہ فکر کی عنایت کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ ان کی تہذیبی روایتوں نے ان کے عشق میں صبر و احتیاط کو زیادہ اور بیباکی و جرأت کو کم بروئے کار رکھا۔ ان کا عشق جذبے سے فکر تک آہستہ خرامی سے بہنے والی خاموش ندی کا سنجیدہ سفر ہے۔ کسی طوفان کا پتہ شور دھارا نہیں۔ اس سفر میں عزت نفس، اور غیرتِ عشق کے مقامات و مراحل بھی نمایاں ہیں۔ اور تطہیر و تنزیہہ روح، پاکیزگی و ریاضت کے گھاٹ بھی۔ یہ عشق بہت جلد عشقِ حقیقی کے لامحدود امکانات اور حیات و کائنات کی طرف اپنا رخ پلٹ کر ایک ہمہ گیر جذبے کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ منورؔ کی غزل میں کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ عصری فضا اور حالات حاضرہ پر تبصرہ آرائی بھی ملتی ہے۔

منورؔ کی رباعیات و قطعات میں بھی فلسفیانہ اور اخلاقی رنگ غالب ہے۔ اس صنف میں بھی انہوں نے قابل قدر اضافے کیے ہیں۔ انہوں نے "طوافِ عجم" کے نام سے اپنی فارسی شاعری کا بھی ایک دیوان مرتب کیا تھا۔ یہ غیر مطبوعہ رہا۔ تاہم انہوں نے فارسی ادب کے جن شاہکاروں کے ترجمے اردو نظم و نثر میں کیے ہیں وہ خاصے کی چیز ہیں اور شائقینِ ادب سے داد و ستائش پا چکے ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اردو کو منورؔ لکھنوی کی سب سے گرانقدر دین عالمی ادبِ عالیہ کے کچھ منتخب شاہکاروں کے منظوم و منثور تراجم ہیں۔ جن کی زبان و ادب کے لیے مستقل اور پائیدار افادیت مسلم ہے۔ منورؔ نے سنسکرت، فارسی، بنگلہ، انگریزی اور جرمن زبانوں کی اہم ادبی تصانیف کو اردو کے قالب میں منتقل کر کے اردو ادب کے سرمایہ میں بیش بہا اور وقیع اضافہ کیا ہے۔ ادبی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کتابوں کے ترجمے کے میدان میں جس قدر کام منوّر نے کیا ہے، اس قدر پوری صدی میں کسی دیگر اردو ادیب نے نہیں کیا۔ مقدار اور معیار دونوں کے اعتبار سے منوّر کا کام لاثانی ہے۔ صحتِ مفہوم، زبان و بیان کی شستگی اور فنی محاسن سے مملو یہ تراجم شائع کروا کر جہاں منوّر نے زبانِ اردو پر ناقابلِ فراموش احسان کیا ہے، وہاں قومی ثقافت کے میدان میں بھی اپنی عظمتِ فن کے مستقل نقوش ثبت کیے ہیں۔

ترجمہ بجائے خود تخلیقی عمل ہے۔ ل۔ احمد اکبر آبادی نے مترجم کی ادبی حیثیت کا اعتراف اپنے مقالہ "ترجمہ اور قومی ثقافت" میں ان الفاظ میں کیا ہے:-

"مترجم اپنی جگہ ایک مصنّف ہی ہوتا ہے۔ قومی ثقافت کی تعمیر میں دوسروں کی طرح وہ بھی ایک کارگزار فرد ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مترجم ادب کا رتبہ اس شخص کا رتبہ ہے جو اسپتال میں جا کر اپنا خون دیتا ہے"[1]

ادبی حلقوں میں اب یہ تسلیم کیا جانے لگا ہے کہ ایک اعتبار سے ترجمے کو تصنیف پر فضیلت بھی ہے کیونکہ جہاں اصل مصنّف کے ذہن پر تو خیالات براہِ راست گھڑے گھڑائے الفاظ کی صورت میں نازل ہوتے ہیں، وہاں مترجم کو اس کے برعکس اصل مصنّف کے افکار و اقوال کے لیے جسم و لباس وضع کرنا پڑتا ہے اور ان کے اظہار کے لیے اسلوب و الفاظ کی جستجو کرنا پڑتی ہے۔

منوّر نے جہاں مختلف قوموں کے ادبِ عالیہ کو بھارتیوں اور بالخصوص اُردو داں طبقے سے روشناس کروا کے ان کے ادبی آفاق میں توسیع کی وہاں مختلف ہندوستانی اور غیرملکی زبانوں کے ادبی اور ثقافتی سرمایہ کو اردو زبان کے ثقافتی خزانے میں ڈال کر اس زبان کو متموّل کیا۔ ل۔ احمد اکبر آبادی رقم طراز ہیں:-

"قومی ثقافت کی تعمیر میں مترجم کی کاوشیں کسی سے کم درجہ نہیں ہوتیں۔ ایک جوہر قابل تصنیف متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو کر مصنّف کی بین الاقوامی قدر و منزلت کی ضامن بن جاتی ہے۔ اس کے برخلاف اُسی کتاب کا مترجم اپنے قومی ادب کی دُنیا میں پہچانا جاتا ہے اور ملک سے باہر شاذ ہی متعارف ہو سکتا ہے"[2]

---

[1] ماہنامہ "شاعر"، بمبئی۔ شمارہ فروری ۱۹۷۵ء، صفحہ ۱۰ تا ۱۲۔ (مقالہ: ترجمہ اور قومی ثقافت۔ از ل احمد اکبر آبادی)

[2] ماہنامہ "شاعر"، بمبئی۔ شمارہ فروری ۱۹۷۵ء، صفحات ۱۰ تا ۱۲ (مقالہ: ترجمہ اور قومی ثقافت۔ ل احمد اکبر آبادی)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

لیکن منوؔر لکھنوی کے معاملے میں تو قصہ ہی مختلف ہے۔ اپنے ملک کے باہر تو شاید منوؔر کے کام کی فراخدلی سے پذیرائی کی گئی ہو لیکن اپنے ملک میں شاذ ہی کسی نقاؔد یا تذکرہ نگار نے اس عظیم ادیب اور مترجم کی محنتِ شاقہ اور اس کے نصف صدی سے زائد کے مفید ترین کام کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔ بہت سے ناقدین نے شعوری طور پر یا شاید لاعلمی کی بنا پر منوؔر کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسی بہت سی مثالیں خاکسار کے علم میں ہیں۔ ایک نمایاں مثال جو درج ذیل ہے۔ خالی از دلچسپی نہ ہوگی۔

"مذہبی تصانیف کے اردو تراجم" کے زیرِ عنوان اپنے مقالے میں ڈاکٹر عبدالحق صاحب منوؔر لکھنوی کی مخلصانہ خدمات پر اظہار رائے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"دھمپد مہاتما گوتم بدھ کی تعلیمات سے متعلق اہم ترین کتاب ہے۔ اسے گیتا جیسا مقام حاصل ہے۔ منوؔر لکھنوی نے اس کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ دھمپد کا ایک نثری ترجمہ رنگ محل دہلی سے بھی شائع ہوا ہے مگر مترجم کا نام درج نہیں۔ اس دور کے مشہور شاعر منوؔر لکھنوی کو ترجمے کی ادبیات میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ آزادی کے بعد انہوں نے بہت سی اہم تصانیف کو اردو میں منتقل کیا اور نظم کی صورت دی۔ ان کے منظوم ترجمے دوسرے مترجمین سے بہتر ہیں۔ "گیتا"، "شکنتلا" اور "ارمغانِ حجاز" کے علاوہ "آریہ ابھی و نے" سوامی وویکانند کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ پرم بھگت جے دیو کی مشہور سنسکرت تصنیف کا "گیت گووند یا سرمدی نغمے" کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ "مالویکاگن مترا" اور "ساگر سنگیت یا بحرِ ترنم" بھی انھیں کا ترجمہ ہے۔ موخر الذکر مشہور پیشوا سی آر داس کی عشق و معرفت سے لبریز کتاب جسے اروند و گھوش نے انگریزی میں منتقل کیا تھا، اسے منوؔر لکھنوی نے اسی انگریزی ترجمے کے سہارے اردو کا لباس دیا ہے[1]"

(نوٹ: "آریہ ابھی ونے" دراصل سوامی دیانند بانی آریہ سماج کی تصنیف ہے، سوامی وویکانند کی نہیں)

ناقدری اور بے نیازی کی انتہا یہ ہے کہ جس کتاب (ترجمے کا فن اور روایت) سے یہ اقتباس لیا گیا ہے اس کے فاضل موئلف کی نگاہ منوؔر لکھنوی جیسے مخلص اور دیانتدار مترجم کی زندگی بھر کی خدمات پر پڑی ہی نہیں۔ اس کتاب کے شروع میں فاضل موئلف نے ستائیس صفحات (صفحہ ۵ تا ۳۱)

---

[1] ترجمے کا فن اور روایت (مرتب ڈاکٹر قمر رئیس)۔ ایڈیشن ۱۹۷۶ء۔ صفحات ۲۶۸-۲۶۹ (مقالہ: مذہبی تصانیف کے اردو تراجم ڈاکٹر عبدالحق)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کا طویل مقدمہ اپنی جانب سے شامل کیا ہے جس میں انہوں نے اہم مترجمین کے ناموں کی طویل فہرست تو دی ہے اور مختلف غیر معروف مترجمین کے نام بھی اس میں گنوائے ہیں لیکن اس صدی کے ممتاز اور اہم ترین مترجم منوّرؔ لکھنوی اور اس کے مفید اور وقیع کام کو صاف نظر انداز کر گئے ہیں جو منوّرؔ کی نصف صدی کی جگر کاوی کا ماحصل ہے۔

اسے کہتے ہیں چراغ تلے اندھیرا

جمہوریہ ہند کی راجدھانی اور اردو کے اہم ترین مرکز دلّی میں رہنے بسنے والا ایک پختہ مشق ادیب اور شاعر، مستند اور ممتاز مترجم جو اپنی ساٹھ سالہ ادبی خدمات کے دوران اپنی اہم طبع زاد شعری تصانیف کے علاوہ عالمی ادب عالیہ کے لگ بھگ چھیالیس شاہکاروں کے ترجمے کرتا ہے، جس میں سے کم از کم ستائیس کتابی شکل میں شائع ہو کر مارکیٹ میں آتے ہیں اور قارئین و ناقدین ادب تک پہنچتے ہیں، ملک بھر کی لائبریریوں میں جگہ پاتے ہیں۔ اور بعض کو ہماری یونیورسٹیوں کے تعلیمی نصاب میں برسوں تک رکھا جاتا ہے، جس میں سے نصف درجن سے زائد تراجم کو ملک کا اہم ترین اردو ادارہ۔ انجمن ترقّی اردو ہند شائع کرتا ہے، ترجمہ کے فن پر ترتیب دی جانے والی کتاب کے مقدّمے میں ذکر پانے کا بھی مستحق نہیں سمجھا جاتا۔

ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیئے

ایسا سہواً ہوتا ہے یا عمداً یا مصلحتاً، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جو مرنجاں مرنج شخصیتیں خود نمائی کے اوچھے ہتھکنڈوں سے گریزاں اپنی شرافت اور قناعت کے حجروں میں بند، ادبی دھڑے بندیوں سے الگ تھلگ، خاموشی سے ادب کی نمایاں اور بیش بہا خدمت میں مصروف رہتی ہیں، اسی سلوک کی سزاوار سمجھی جاتی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں منوّرؔ لکھنوی کے قلم سے نکلے ہوئے ستائیس مطبوعہ اور انیس غیر مطبوعہ تراجم کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ لیکن منوّرؔ مرحوم کا کام محض انہیں تراجم تک محدود نہیں رہا۔ تقسیم وطن سے قبل انہوں نے کئی اہم کتابوں کے تراجم کیے جو تقسیم ہند کے بعد نایاب ہو گئے۔ "گیت گووند" (عرف سرمدی نغمے) کے ترجمے میں اپنے تعارفی مضمون میں منوّرؔ لکھتے ہیں کہ انہوں نے پرم ہنس رام کرشن مشن کے سوامی ابھیدا نند کی تصنیف "ان فولڈمنٹ آف سیکرٹ" (UNFOLDMENT OF SECRET) کا ترجمہ اردو میں "مشعلِ طریقت" کے نام سے کیا تھا جو لاہور سے شائع ہوا تھا۔ لاہور ہی میں

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سوامی رام تیرتھ کے کچھ انگریزی لیکچروں کو اور رام کرشن مشن کے کچھ سناسیوں کے اُپدیشوں کو بھی انہوں نے اردو میں منتقل کیا تھا۔ سوامی ویویکانند کی تصنیف بھگتی یوگ کا ان کا ترجمہ اور امریکی اَدب سے لیے گئے کچھ روحانی اسباق کے ان کے تراجم لاہور کے روحانی رسالہ "پیامِ یار" میں شائع ہوئے تھے۔ انہی دنوں منورؔ نے رائے رگھوناتھ صاحب کے ایما سے ایک کتاب "ہیروز آف دی پنجاب" کا ترجمہ کیا۔ اس سے قبل منورؔ نے لکھنؤ کے قیام کے دوران مسٹر مکٹ بہاری لال بھارگو منیجر اودھ اخبار کی ایک انگریزی تصنیف "انڈین ایڈمنسٹریشن" کا ترجمہ ۱۹۱۸ء میں کیا تھا۔
۱۹۲۳ء میں اپنے ایک بزرگ رشتے دار پروفیسر کے سی رائے کی فرمائش سے مشہور انگریز ماہر سیاست برنز (BURNES) کی معرکہ آرا اور نہایت سنگلاخ انگریزی تصنیف "پولیٹکل آئیڈیلز" (POLITICAL IDEALS) کا ترجمہ "سیاسی نصب العین" کے نام سے کیا اور یہ موصوف پروفیسر کے سی رائے کے نام ہی سے شائع ہوا۔

علمی اور ادبی تراجم کے علاوہ اپنی مالی ضروریات کے پیشِ نظر منورؔ نے لائف انشورنس کارپوریشن نئی دلی کے ایما سے کئی پمفلٹوں اور کتابوں کا ترجمہ بھی کیا، جو سرکاری طور پر شائع ہو گئے۔

اردو زبان کے لیے منورؔ لکھنوی کے تراجم کی افادیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ماضی میں لکھی گئی ہر ادبی تحریر کچھ مسلّمہ اہمیت رکھتی ہے۔ عالمی ادب میں کلاسکس (CLASSICS) کی بے پناہ اہمیت اور افادیت ہے۔ قدیم ادبی سرمایوں کو "نقش و نگارِ طاقِ نسیاں" بنا کر ہم نئے ادب کو بہت سی خوبیوں اور دلنوازیوں سے محروم کر دیں گے۔ اَدب کی صحیح قدر و قیمت کا ادراک عصروں کے موازنہ سے ہوتا ہے۔ نئے ادب کی شناخت بھی اسی عمل سے ہوگی کہ ہر عہد کے ادبی ذخیروں کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ چراغ سے چراغ جلانے کا عمل ہے پرکھوں کے تخلیق کردہ ادب سے ہم بہت کچھ سیکھتے ہیں اور پاتے ہیں، چاہے ہمارے یہ پیش رو مصنفین اور شعرا دنیا کے کسی گوشے سے تعلق رکھتے ہوں۔ منورؔ نے مشرق و مغرب کے کلاسیکی ادب کو اردو نظم و نثر کے قالب میں پیش کر کے ایک بہت بڑا کام کیا ہے۔ کالی داس کے جن شاہکاروں کا ترجمہ کرنے میں بڑے بڑے ناموں والے شہرت یافتہ ادیبوں کا پتّہ پانی ہوتا تھا، منورؔ نے ان فن پاروں کے منظوم ترجمے پورے فنی رکھ رکھاؤ اور صحتِ مفہوم کے ساتھ کر کے دنیائے اردو کو پیش کیے ہیں۔ "کمار سمبھو" جیسی مقدس منظوم داستان کو ہاتھ ڈالنے کا کسی مترجم کو حوصلہ نہ ہوا۔ لیکن منورؔ نے اس کا خوبصورت منظوم ترجمہ پیش کر کے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

دنیائے ادب کو حیران کر دیا۔ ان سے پہلے یا ان کے بعد کسی بھی اردو مصنف نے اس صحیفے کو اردو کے جامے میں پیش نہیں کیا۔ جرمنی کے کلاسیکی ادب میں سے گوئٹے کی تمثیل "فاؤسٹ" کا منظوم ترجمہ کوئی کارِ آساں نہ تھا۔ یہ عظیم خدمت بھی منورؔ ہی کے حصے میں آئی۔ اور اس نے "فاؤسٹ" کے دونوں حصوں کا چھ سو سے زائد صفحات پر محیط ترجمہ منظوم کر کے اہلِ اردو کو دیا۔ اردو ادب کے کارواں کی پیش رفت کے لیے اس کے سرمایہ میں ان فاضلانہ تراجم کے اضافے ایک حد درجہ مفید، مثبت اور مستحسن اقدام ہیں۔ یہ ترجمے سادگی، حسنِ ابلاغ اور شعریت کے خوب صورت امتزاج ہیں۔

ہندوستانی قوم کی نئی نسل کے لیے بھی منورؔ نے کچھ نامور، عظیم شخصیات کے سوانحِ حیات کے اردو تراجم نثری پیکروں میں پیش کیے۔ بچوں کے ادب کے اس سلسلۂ کتب میں منورؔ نے وہ عکس ابھارے ہیں جو ان کم سن قارئین کی ذہنی تربیت کے لیے ضروری اور مفید ہیں۔ ان کتابوں میں مترجم نہ مبلغ بنا ہے اور نہ خطیب۔ لیکن اپنے اُسلوب سے اس نے واقعات و واردات کو ایسا بہاؤ دیا ہے کہ ان سے کہانی بھی مرتب ہوئی اور اخلاقیات کی بلا واسطہ تلقین بھی۔

لیکن اس شریف انسان اور خود دار شاعر کو سلوکِ اہلِ دنیا راس نہیں آیا۔ ناقدریِ فن اور اپنی محرومیوں کا شدید احساس منورؔ لکھنوی کی آخری دور کی غزلوں اور نظموں میں عکس ریز ہے۔ ان کے آخری برسوں کی تخلیقات ان کی نفسیاتی الجھنوں کا سراغ لگانے میں معاون ہوتی ہیں۔ شاعر کا شعور اور لاشعور مل جل کر اس کے ذہن پر جو اثرات مرتب کرتے ہیں وہی اس کے اشعار میں ڈھل کر اس کی شاعری کا حصہ بنتے ہیں۔ یہ نفسیاتی تجزیہ ہمیں فنکار کے ذہنی کرب کی تفہیم اور اس کے فن کی تو زین و تحسین کے لیے بہتر بنیاد فراہم کرتا ہے۔ فرار و قنوطیت اور رجائیت کے جو تضادات منورؔ لکھنوی کے آخری دورِ حیات کی شاعری میں عکس فگن ہیں دراصل ان کی مشکلات، مالی تنگدستی، محنت کشی، بڑھتی ہوئی گرانیِ اشیا کے باعث ایک ریٹائرڈ سرکاری ملازم کے ذہنی تناؤ اور ادب کے اجارہ داروں کی زیادتیوں کے شدید احساس کی پیداوار ہیں۔ یہ نفسیاتی اُلجھنیں اس کے حالاتِ گرد و پیش کی دین ہیں اور اُس سیاسی نظام کی جسے ایک آدرش نظام تصوّر کر کے شاعر نے اپنی جوانی میں ملک و قوم کے خوش آئند مستقبل کے رنگین خواب دیکھے تھے لیکن ان رنگین خوابوں کی تعبیر نے شاعر کو مایوسی کے سوا کچھ نہیں بخشا۔ یہ مایوسی شخصی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

منوّر کی شرافتِ نفس اور خودداری، گروہ بندی، خوشامد اور زمانہ سازی سے اجتناب، خودنمائی اور نرگسیت سے گریز اور لاتعلقی نے انھیں اس شہرت و دولت سے محروم رکھا جو ان کے بعض ہم عصروں کے حصّے میں آئی۔ یہ احساس محرومی کہیں کہیں ہلکے سے جذبۂ رشک و رقابت کا تاثر بھی دیتا ہے۔ لیکن اس نفسیاتی عمل کے منطقی نتائج سے شاعر کیسے بچ سکتا ہے۔ وہ گوشت پوست کا بنا ہوا ایک نارمل انسان بھی ہے۔ اسی لیے کہیں کہیں منوّر کی شاعری ناقدری فن کا نوحہ اور اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور "روشنیِ طبع" کی مرثیہ خوانی کا روپ دھارن کر لیتی ہے۔ نرگسیت کی بجائے یہ ایک گہری قنوطیت اور عدمِ انصاف کے خلاف احتجاج کی مظہر بن جاتی ہے۔ مثلاً ذیل میں دیئے گئے ایک غیر مطبوعہ طویل نظم کے کچھ بند اس کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ غیر مطبوعہ نظم راقم السطور کو خود حضرت منوّر کی زبان سے سننے اور نوٹ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ اگرچہ نظم میں تقدیر سے شکوہ کیا گیا ہے لیکن اس میں روئے سخن کس کی طرف ہے، ایک ذہین قاری اس کا بآسانی اندازہ کر سکتا ہے:۔

شکوہ بنام تقدیر

● کھول اے تقدیر مجھ پر بھی تو بابِ لطف کھول
دے رہا ہوں تجھ کو میں آواز کتنی دیر سے
بند دروازہ ہے کیوں آخر یہ میرے ہی لیے
رنجِ خمیازہ ہے کیوں آخر یہ میرے ہی لیے

● دیکھتا ہوں میں کہ فوراً مسکرا دیتی ہے تو
گھورنا تیرا مِری جانب بہ استہزا کے ساتھ
تیرے دروازے پہ آکر جب صدا دیتا ہوں میں
جرم کرتا ہوں تجھے آواز کیا دیتا ہوں میں

● جو نہوں قائل خدا کے ان سے تو خوش ہو خدا
دو جہاں کی نعمتیں پاکر بھی دیں جو گالیاں
رحمتوں پر رحمتیں نازل ہوں اُن کے واسطے
دو جہاں کی نعمتیں حاصل ہوں ان کے واسطے

● لاکھ صلواتیں بھی سن کر حکمراں جن پر نہال
جو کریں پبلک کو آمادہ بغاوت کے لیے
سر پرستی اور جن کی گالیاں کھا کھا کے ہو
قدر ان کی بڑھ کے پہلے سے بھی کچھ گھبرا کے ہو

نظم طویل ہے اور اس کے منتخب بندوں کا ہی حوالہ جو یہاں دیا گیا ہے اُس نفسیاتی اور جذباتی کشمکش کی غمازی کرتا ہے جو بے انصافی، حق تلفی اور ناقدری کی ضربات سے پیدا ہوتا ہے۔ ذیل کے کچھ اور منتخب بند اُس جذبۂ رشک و رقابت کے جواز کا بھی پتہ دیتے ہیں:۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

• تو خطا کاروں کی ساتھی تجھ کو خر مستی پسند
ان کی خلقت بھی فدائی، ان پہ حاکم بھی نثار
• مجھ سے محنت کا تقاضا، مجھ سے ارشاد عمل
مفت خوروں کے لیے ہیں پنشنیں پر پنشنیں

جو خرابانی ہیں ان کی قدر فرماتی ہے تو
دونگڑے ان پر زر و دولت کے برساتی ہے تو
زندگی بھر ایڑیاں رگڑوں یہی تلقین ہے
کیا یہی دستور ہے تیرا، یہی آئین ہے؟

جوابِ تقدیر بنام شاعر

• تو سمجھتا بھی ہے جن پر ہیں ہوں بے حد مہرباں
چار دن کی چاندنی کے واسطے یہ رشک کیوں
• وقت پر ہر بات ہوتی ہے ہمیشہ یاد رکھ
ہے یہ اک قانونِ قدرت اس کا ٹلنا ہے محال
• کس لیے ناحق ہے نالاں کس لیے ہے اضطراب
وقت سے پہلے مرا دروازہ کھل سکتا نہیں

میرے پیارے ان کو عیش مستقل حاصل نہیں
فارغ البالی میں بھی شکلِ سکوں حاصل نہیں
وقت سے پہلے تو اک تنکا بھی ہل سکتا نہیں
وقت سے پہلے خدا بھی تجھ کو مل سکتا نہیں
بیٹھ خاموشی سے جا کر چیخنا بے کار ہے
وقت سے پہلے بنے کچھ کام یہ دشوار ہے

اور یہ "وقت" منور لکھنوی کی زندگی میں کبھی نہیں آیا۔ بڑھتی منہگائی کے دور میں حالات روز بروز دگرگوں ہوتے گئے۔ کنبہ چلانے کے لیے انھیں آخری عمر میں بھی تالیف و ترجمہ کا مشکل اور محنت طلب کام کرنا پڑا۔ گزر اوقات کے لیے اپنی صحت کو بھی داؤ پر لگانا پڑا۔ ۱۹۵۷ء میں ریٹائر منٹ پر انھیں گریجوئٹی کی جو رقم سرکار سے ملی یا پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ، وہ جمع پونجی انھوں نے فیض گنج والا مکان خریدنے میں لگا دی۔ دلّی میں سر چھپانے کو آخر کوئی مستقل ٹھکانہ تو درکار تھا ہی۔ مکان کی اوپر کی منزل انھوں نے کرایہ پر اٹھا دی اور بعد میں اس کرایہ دار نے ان کی بے ضرر شخصیت اور شرافتِ کردار کا ناجائز فائدہ اٹھا کر انھیں اور ان کے پسماندگان کو ناکوں چنے چبوائے۔

نظم کے آخری دو بند "قہرِ درویش بر جانِ درویش" کی تلقین و ہدایت ہیں۔ یا پھر دل کو بہلانے کے لیے طفل تسلی۔ راضی برضا رہنے اور صبر و قناعت کا جو فلسفہ روایتی ہندو طرزِ فکر اور منورؔ کے مذہبی سنسکاروں کی ودیعت رہا، یہاں بھی شاعر کے ذہن پر ساری و طاری ہو کر نظم کے آخری دو بندوں کی تخلیق کا محرک بنا ہے۔ اخلاقی قدروں سے محروم معاشرے میں حق تلفی کا ہدف بنے ہوئے فنکار کے پاس چارۂ کار بھی کیا ہے۔ اپنی روح کے کرب کو بہلانے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کے لیے اُسے روحانی پندونصائح کی آڑ لینا پڑتی ہے۔ یا اگلے جنم اور اگلے جہان کے خوش گوار مستقبل کے آسرے پر جینا پڑتا ہے جب کہ نااہل اور نامستحق لوگ شہرت و دولت ہتھیا لیتے ہیں۔ انور ندیم ایڈیٹر سہ ماہی "ادبی چوپال" اپنے ایک اداریے میں لکھتے ہیں:۔

"سچ تو یہ ہے کہ ادب کے ہر دور نے اپنے ٹھیکے دار بھی پیدا کیے ہیں جنھوں نے اپنے ہم عصر عظیم نقاد اور ادیبوں کی راہ میں کانٹے بوئے ہیں۔ جن کے فریب نے کبھی چوتھائی، کبھی آدھی، اور کبھی پوری پوری صدیاں چاٹ لی ہیں۔ اور وقت اُن بڑے فنکاروں کی تخلیقات سے غافل رہا ہے۔ ان کی عظمتوں کے ضروری اعتراف میں انتہائی مجبوری کے ساتھ برسوں خاموش رہا ہے"۔[1]

اب یہ مصلحتوں کے سلاسل سے بندھے ان ادبی ٹھیکداروں کی ستم ظریفی تھی یا نقدیر کی کہ انعامات و اعزازات بانٹنے والے اداروں اور سرکاری اکاڈمیوں کی نگاہ بھی منور کے کام تک نہیں پہنچی۔ لیکن پیہم حق تلفیوں نے منوّر کو اپنے ادبی مقام اور عظمتِ فن کے متعلق زیادہ بیدار اور حسّاس کر دیا۔ اس کی خود اعتمادی ان ضربات سے مجروح تو ہوئی لیکن مضمحل نہیں ہوئی۔ اُسے اپنی محنت، ریاضت، علمیت، صلاحیتِ اعلیٰ، قادر الکلامی، خلوص خدمتِ فن، رفعتِ مقصد اور پاکیزگیِ نصب العین کا شدید احساس رہا اور اس پر بجا ناز بھی۔ اگر اسے کوئی نقاد شاعر کی نرگسیت قرار دے تو یہ نرگسیت بھی سو فی صداقت پر مبنی ہے۔ انصاف شرط ہے۔ یہ ناز اور خود اعتمادی وہ ہے جس کا شاعر ہر لحاظ سے مستحق ہے۔ اسے پندارِ فن کہیے یا عظمتِ فن کا احساس۔ منوّر لکھنوی کے یہ اشعار جوان کی مثنوی "درسِ عظیم" میں سے منتخب کیے گئے ہیں، اُردو ادب میں منوّر کے مقام کے تعیین میں معاون ہو سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو شاعر کی نگاہ میں اپنا منصب و مرتبہ کیا ہے۔

میں منوّر ہوں خود اپنے نور سے — کام کیا مجھ کو چراغِ طور سے
اِک وَرَق قرآن کا سینہ میرا — اک سبق ایمان کا سینہ میرا
مستیاں وجدان کی نس نس میں ہیں — تابشیں عرفان کی نس نس میں ہیں
شمسؔ تبریزی کے جذبے کی پکار — صوفیِ رومیؔ کا میں آئینہ دار
عطر میری روح میں عطّارؔ کا — میں ہوں نشہ حافظِؔ مے خوار کا

---

[1] سہ ماہی ادبی چوپال لکھنؤ: شمارہ جولائی۔ اگست۔ ستمبر ۱۹۷۶ء (مضمون: ادب اور ادیب، رشتے اور زاویے۔ از انور ندیم) صفحہ ۱۱

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

میری اک اک سانس سعدی کی غزل — صورتِ خیام مینا در بغل
ہیں نظام الدین کی وسعت میں دخیل — خسروانہ حسنِ معنیٰ کا کفیل
زہر کا مارا ہوا سقراط ہیں — پردہ دارِ لغزشِ بقراط ہیں
گوتمی نروان اک ہدیہ میرا — جلوۂ جن راج اک تحفہ مرا
مجھ میں ننکانہ کی درویشی صدا — میری ہر آواز نانک کی صدا
مجھ سے راما نند کا رتبہ کبیر — اپنے در کا اک میں لاثانی فقیر
وید کے الہام کا کشاف ہیں — سپت رشیوں کی نگاہِ صاف ہیں
مستیاں میرا کی مجھ سے آشکار — مجھ میں سہجو کے تموّج کی بہار
چھاؤں میری روح کی تلسی کی چھاؤں — سور کی آنکھوں میں ہوں میں نند گاؤں
عکسِ فرخ خال میری روح پر — پرتوِ اقبال میری روح پر
میرا اہلِ دل سراپا درد بھی — لالۂ احمر، چراغِ زرد بھی
بادۂ ٹیگور کی موجِ رواں — جادۂ گاندھی کا اک سنگِ نشاں
مجھ میں گوئٹے کی فسوں سازی بھی ہے — نٹشے کی حشر پردازی بھی ہے
شیکسپیر کا سخن میرا سخن — لانگ فیلو میں ہی، میں ہی بائرن
والمیکی مجھ میں نقشِ اولیں — ویاس کا ہر حرف مجھ سے دلنشیں
مجھ میں کالی داس، بھوبھوتی کا زور — عنصری کا مجھ میں فردوسی کا شور
پا کے فرزندی اُفق کی شاد ہوں — حق تو یہ ہے نازشِ اجداد ہوں
جوشِ وحشت سے گریباں چاک ہوں — ترجمانِ ہر زبانِ پاک ہوں
سیر ہیں سب ترجمانی سے مری — دنگ ہیں معجز بیانی سے مری
جراتِ دل اب مجھے توفیق دے — مجھ کو درمانِ غمِ تخلیق دے

اگرچہ مذکورہ بالا منتخب اشعار جو عمر کے آخری پڑاؤ پر تخلیق کی گئی منورؔ لکھنوی کی ایک نامکمل مثنوی سے لیے گئے ہیں، اور یہ ترجمے سے طبعزاد تخلیق کی طرف شاعر کی مراجعت کے عزم کا اظہار کرتے ہیں لیکن یہ منورؔ کے صحیح ادبی مقام کے تعین میں بھی ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ نیز منورؔ کے وسیع مطالعہ، نصف صدی سے زائد کی مشقِ سخن، علمی و فنی ریاضت، ادبی تخلیق و ترجمہ کے مقدس عمل کے تئیں ان کی سپردگی اور روز و شب کی لگن کی غمازی کرتے ہیں۔ انہوں نے

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

تخلیقِ ادب کو زندگی بھر ایک عبادت سمجھ کر خلوص دل سے سرسوتی (علم و ادب و فن کی دیوی) کی بارگاہ میں اپنے خونِ جگر کے چراغ جلائے۔ وہ تخلیقی عمل جسے اقبال نے "نوائے صبحگاہی" کا نام دے کر شاعر کا "جگر خون کرنے کا" حیلہ اور وسیلہ قرار دیا ہے، آخری دم تک منورؔ کی توجّہ کا مرکز رہا جس سے اس نے اپنے قارئین کو ذہن و نظر کی روشنی بخشی، شاعروں کی کم از کم دو پیڑھیوں کو اصلاحِ سخن سے فیضان بخشا، اردو کے سرمایۂ ادب کو وسعت و وقعت عطا کی۔ اپنے فاضل و کاملِ فن والد ملک الشعرا، اُفقؔ لکھنوی کا نام روشن کیا اور اپنے محترم استاد حضرتِ نوبت رائے نظرؔ کا بھی۔ نیز سنسکرت اور فارسی سے نا آشنا اردو داں قارئین کو اپنے اسلاف کی تحریروں اور مذہبی و ثقافتی کلاسیکی ادب کے نادر نمونوں تک رسائی بخشی۔ اس سے ہندو و مسلم دونوں فرقوں کا قاری مستفیض ہوا۔

لیکن شومئی قسمت سے منورؔ اولاد کی نعمت سے محروم رہے۔ رحمتِ ایزدی نے انھیں کمالِ فن تو عطا کیا۔ لیکن عرشؔ ملسیانی یا جگن ناتھ آزادؔ جیسا کوئی لائق اور سعادت مند شاعر بیٹا عطا نہیں کیا۔ جو اقلیم ادب میں ان کا جانشین بنتا، جو منورؔ کے مفید مشن کو دنیائے علم و ادب میں آگے بڑھاتا اور منورؔ کو صحیح مقام اور شہرت دلانے میں معاون ہوتا۔ جیسے ڈاکٹر جگن ناتھ آزادؔ نے اپنے فاضل والد منشی تلوک چند محرومؔ کا نام روشن کرنے کی مساعی کیں اور جناب عرشؔ ملسیانی نے اپنے پدرِ بزرگوار ابو الفصاحت جناب جوشؔ ملسیانی کی شہرت و ناموری میں اضافہ کیا۔ نہ ہی منورؔ لکھنوی کو سرکاری ذرائع ابلاغ تک بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اس طرح کی رسائی حاصل تھی جو ان کے بعض معاصرین کو حاصل رہی، اور ان معاصرین کی شہرت و خوشحالی کا زینہ بنی رہی۔ نہ وہ کسی ساہتیہ اکاڈمی کے کاسہ لیس بن سکے۔

منورؔ کے تئیں ناقدین اور تذکرہ نگاروں کی سرد مہری اور بے نیازی کی ایک بڑی وجہ منورؔ کی شرافت، پاکبازی اور پرہیزگاری بھی رہی۔ وہ شراب و کباب اور شیشہ و جام سے زندگی بھر حذر کرتے رہے جبکہ ادب اور فن کی دنیا میں رندِ مشرب ادیبوں کا سکّہ رائج الوقت تھا۔ وہ اس طرح کے احباب سے قربت پیدا نہ کر سکے۔ کسی اَدبی دھڑے یا گروہ میں شامل نہیں ہوئے اور نہ کسی ادبی تحریک سے وابستہ ہوئے۔ نہ کسی خاص نقّاد یا مدیر و صحافی کے پچھلگّو بنے۔ وہ خاموشی سے اپنی ادبی اور تخلیقی ریاضت میں مگن رہے۔ اور تمام تر ایمانداری کے ساتھ ادب کی خدمت بجا لاتے رہے۔

منورؔ لکھنوی کی علمی زندگی ایک اتھاہ سمندر تھی۔ وسعتِ مطالعہ، ذوقِ تحقیق، اصابتِ رائے،

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

اور سیکولر نقطۂ نگاہ کے زیرِ اثر ان کا قلم نرم رَو اور سبک مزاج تھا۔ وہ اردو شاعری کی صحت مند روایات کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ اپنی تخلیقی کاوش سے انہوں نے اخلاقی، اصلاحی اور قومی شاعری کی ایک فضا قائم کرنے کی سعی کی۔ نیز خارجی اجتماعی زندگی کے فکری، روحانی اور سماجی مسائل کی تا حدِ امکاں ترجمانی کرنے کی بھی۔

منوّرؔ کی غزلوں کے بعض اشعار اور منتخب نظمیں روشنی کے ایسے میناروں کی حیثیت رکھتی ہیں جو قارئین اور نئی نسل کے ادیبوں اور شاعروں کی راہیں روشن کر سکتی ہیں۔ اگرچہ ان کی شاعری پر فلسفہ، اخلاق اور روحانیت کی پرچھائیاں کافی گہری ہیں، تاہم اس حقیقت سے بھی ہم روگردانی نہیں کر سکتے کہ انسانی زندگی کو مذہب و اخلاق ہی نے علو اور وقار بخشا ہے۔

ادب و شعر کا کام شانتی، پریم کے گیت گانا اور امن و صلح کی فضا پیدا کرنا ہے اور اس طرح جہاں تک ممکن ہو اس عالمِ فانی کو جنت الفردوس کا نمونہ بنانا۔ اس کا کام یہ نہیں کہ نفرت، تشدّد اور جنگ کے نعرے بلند کرے اور فتنہ و فساد کی آگ کو ہوا دیکر دنیا کو جہنم زار بنائے۔ لہذا منوّرؔ نے بامقصد اور مثبت ادب کی تخلیق کی لیکن ادب کو محض پروپیگنڈہ یا "سیاسی ڈرل" کی نعرے بازی نہیں بنایا۔ ان کے ادب اور ان کی عملی زندگی کا مقصد انسانیت کا علو، تہذیب و تربیت تھا، اور اسی لیے دنیا کو خیرباد کہتے ہوئے یہی احساس اطمینان ان کی روح کا ہالہ کیے رہا کہ۔

ع شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

بلاشبہ منوّرؔ لکھنوی تاریخ ساز شاعر تھے۔ پیشہ ور مشاعرہ باز یا مصلحتوں کے غلام ادیب نہ تھے اور اُردو ادب کی تاریخ میں ان کا ذکر ناگزیر ہے۔ صنفِ ترجمہ کی تاریخ میں بالخصوص ان کا نام دائم و قائم رہے گا اور جو مستقل نقوش انہوں نے چھوڑے ہیں وہ کسی بھی متعصّب ناقد کے مٹانے سے نہیں مٹ پائیں گے۔

میرا اعتقادِ راسخ ہے کہ اردو ادب کی دنیا ایسے غیر متعصب اور غیر جانبدار نقّادوں اور تذکرہ نگاروں سے ابھی خالی نہیں ہوئی جن کا ضمیر اس تحقیقی کاوش کے مطالعہ سے بیدار ہوگا۔ اور جو ادب میں اقتصادی، جماعتی اور شخصی مصلحتوں سے پہلوتہی کرکے منوّرؔ کے فن اور اس کی بیش بہا دین کی صحیح پرکھ کر سکیں گے۔ آج بھی کم از کم ایک درجن ادبی شاہکاروں کے تراجم کے ان کے مکمل مسوّدے، اور نظمیات و غزلیات کی آٹھ دس بیاضیں غیر مطبوعہ حالت میں ان کے پسماندگان کے پاس محفوظ ہیں۔ ضرورت ہے کہ انھیں بھی زیورِ طبع سے آراستہ کرکے اردو کے قارئین کو ان سے محظوظ اور مستفید ہونے کی سعادت فراہم کی جائے۔ اردو کے سرمایۂ ادب میں بھی اِس سے بیش بہا اضافہ ہوگا۔

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

کتابیات

نام کتاب	مصنف	سن اشاعت	ناشر
منوّر لکھنوی کی کتابیں اور قلمی مسوّدات			
نذرِ ادب (رباعیات کا جیبی ایڈیشن)	منوّر لکھنوی	مارچ ۱۹۲۹ء	مصنف بذریعہ قطب الدین احمد پروپرائٹر نامی پریس (لکھنؤ)
راماین والمیکی	〃	۱۹۳۱ء	میسرز سنت سنگھ اینڈ سنز لاہور
نسیمِ عرفاں [ترجمہ بھگوت گیتا]	〃	۱۹۳۶ء	آدرش کتاب گھر۔ بازار سیتارام۔ دہلی۔۶
کائناتِ دل (نظمیں)	〃	۱۹۳۹ء	رادھیکا پرشاد سکسینہ۔ بلبلی خانہ۔ دہلی۔۶
کمار سمبھو (منظوم ترجمہ)	〃	۱۹۵۲ء	انجمن ترقی اردو ہند بک ڈپو۔ اردو بازار۔ دہلی۔۶
دھمپد یا سچّی راہ (ترجمہ)	〃	۱۹۵۴ء	انجمن ترقیِ اردو ہند۔ علی گڑھ
وجدانِ حافظ 〃	〃	۱۹۵۶ء	انجمن ترقیِ اردو ہند بک ڈپو۔ دہلی۔ ۶
مجاہدۂ حسینی اور اسلام (نثر)	〃	جون ۱۹۵۸ء	امامیہ مشن۔ لکھنؤ
نغمۂ قلندری (اودھوت کا ترانہ)	〃	جون ۱۹۵۸ء	آدرش کتاب گھر، دہلی
گجیندر موکش (نظم)	〃	۱۹۵۸ء	ایضاً
روحانی مکالمہ (منظوم ترجمہ)	〃	۱۹۶۰ء	ایضاً
ایلیز روز ویلٹ (نثر ترجمہ)	〃	۱۹۵۹ء	حالی پبلشنگ ہاؤس۔ دلّی
ذرّے سے آفتاب (نثر ترجمہ)	〃	۱۹۶۰ء	ایضاً
دادا نہرو 〃	〃	جون ۱۹۶۱ء	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ۔ نئی دلّی
نوائے کفر (غزلیات)	〃	دسمبر ۱۹۶۱ء	آدرش کتاب گھر۔ دریا گنج۔ نئی دلّی
ادائے کفر 〃	〃	۱۹۶۲ء	ایضاً
ساگر سنگیت (نثر ترجمہ)	〃	۱۹۶۲ء	ایضاً
صدر کی گیتا (تالیف)	〃	۱۹۶۳ء	ایضاً

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

نام کتاب	مصنف	سن اشاعت	ناشر
ابھگیان شکنتلا ترجمہ	منور لکھنوی	سنہ ۱۹۶۳ء	آدرش کتاب گھر۔ فیض گنج۔ دریا گنج۔ نئی دہلی
لمعاتِ اُفق تالیف	"	سنہ ۱۹۶۴ء	ایضاً
گیت گووند سربدی نغمے ترجمہ منظوم	"	سنہ ۱۹۶۴ء	ایضاً
وویکانند۔ بچوں کے لیے	"	جنوری سنہ ۱۹۶۵ء	پبلی کیشنز ڈویژن۔ وزارتِ اطلاعات و نشریات نئی دِلی
درخشاں نکتے نثر ترجمہ	"	سنہ ۱۹۶۷ء	شری ست دھرم منڈل۔ الیسٹ پٹیل نگر۔ نئی دِلی
سمندری جوان اور دیگر نادر جرمن افسانے (ترجمہ)	"	ستمبر سنہ ۱۹۶۸ء	آدرش کتاب گھر نئی دلی (بشرکت ہورسٹ ارڈمین ورلاگ۔ مغربی جرمنی و سوئٹزرلینڈ)
فاؤسٹ حصّہ اوّل و دوم	"	سنہ ۱۹۶۹ء	میکس مولر بھون نئی دِلی
میری یادداشتیں نثر ترجمہ	"	سنہ ۱۹۶۶ء	لکشمی بک اسٹور۔ جن پتھ دہلی۔ برائے انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز۔ نئی دِلی ۲۔
سوزِ اقبال منظوم ترجمہ	"	سنہ ۱۹۷۰ء	کتب خانہ انجمن ترقیٔ اردو ہند۔ دِلی ۶
درگاسپت شتی "	"	درج نہیں	گن ہیر کشور ماتھر۔ دہلی سائنٹفک ورکس اجمیری گیٹ۔ دہلی۔ ۶
مدرا راکھشس نثر ترجمہ	"	"	انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ
آریہ ابھے و نے منظوم ترجمہ	"	سنہ ۱۹۶۸ء	رائے صاحب چودھری پرتاپ سنگھ ٹرسٹ۔ ماڈل ٹاؤن کرنال
مالویکاگن متر ترجمہ		پس مرگ سنہ ۱۹۷۳ء	انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ
رمبھاشک سمواد منظوم ترجمہ	"	سنہ ۱۹۳۹ء	رادھیکا پرشاد سکسینہ۔ بلبلی خانہ۔ دِلی ۶

غیر مطبوعہ قلمی مسوّدے

تعبیرِ منظوم (قرآن مجید کی سورتوں کے ترجمے)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

الہاماتِ مغرب (انجیلِ مقدس کے کچھ ابواب کے ترجمے)

سوزِ وطن (نظموں کا مجموعہ)

نقوشِ منوّر "

شگفتہ عقیدے "

تابانیاں (غزلیات)

تاثراتِ منوّر (بیاضِ غزلیات)

بساطِ فکر "

شاخِ مرجاں "

زیرۂ گل (رباعیات و قطعات کی بیاض)

طوافِ عجم (فارسی کلام کی بیاض)

رباعیات و قطعاتِ بابا طاہر ہمدانی (ترجمہ منظوم)

الہاماتِ ایرانی (مختلف شعرا کے فارسی اشعار کے تراجم)

ونے پتریکا (تلسی داس کی ونے پتریکا کا نثری ترجمہ)

وکرم اُروشی (کالی داس کی تمثیل کا ترجمہ)

رگھوونش (کالی داس کے مہاکاویہ کا ترجمہ)

مالتی مادھو (بھوبھوتی کی تمثیل کا ترجمہ)

کند مالا (سیتا بن باس) (دنگ ناگ کی تمثیل کا ترجمہ)

مفلس کا عشق (چارودت) بھاس کے ڈرامہ کا ترجمہ

نغموں کا نذرانہ (گیتانجلی) ٹیگور کے ۱۰۳ گیتوں کے منظوم تراجم

افکارِ بلند مختلف عظیم شخصیات کے اقوال کے منظوم تراجم

جین گرنتھ سار جین دھرم کی تعلیمات

درسِ عظیم (مثنوی۔ "وِدُر نیتی" کے ترجمہ کا ابتدائی حصہ)

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

سائنک پاٹھ	(مناجاتیں)	متفرق روحانی کتابچے
فریادیں	(نوحے)	〃
معروضات		〃
سری روپ کلا چرتر	/	
داستان	(نثر)	منور لکھنوی کی خودنوشت سوانح عمری

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

دیگر مصنّفین کی کتابیں

نام کتاب	مصنف/مؤلف	سنِ اشاعت	ناشر
متورلکھنوی۔ شخصیت اور شاعری	راج نارائن رازؔ	سنہ ۱۹۷۰ء	نصرت پبلشرز۔ وکٹوریہ سٹریٹ، لکھنؤ
تذکرۂ معاصرین	مالک رام	سنہ ۱۹۷۲ء	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دِلّی۔ ۲۵
گلدستۂ سخن	گنپت سہائے سری واستو	سنہ ۱۹۸۸ء	کتابستان۔ ۳۰ چک، الٰہ آباد
بزمِ ماتم	بادا کرشن گوپال مغمومؔ		مصنف ۳۱۴۴۔ سیکٹر ۲۰۔ ڈی چنڈی گڑھ
منزل منزل	شباب للت	سنہ ۱۹۷۰ء	للت برادرز پبلشرز ریلوے روڈ کورکشیتر
تنقید کیا ہے	آل احمد سرور	سنہ ۱۹۴۷ء	کتابی دنیا لمیٹڈ۔ دہلی
تاریخِ نظم و نثرِ اُردو	آغا محمد باقر	سنہ ۱۹۳۲ء	شیخ مبارک علی اینڈ سنز، لاہور
	(بھارت میں طبع اوّل)	نامعلوم	آزاد بک ڈپو امرتسر
آزادی کا ادب (جلد اوّل)	گوپال متّل	سنہ ۱۹۵۷ء	مکتبہ تحریک، ۹۶ انصاری مارکیٹ، نئی دِلّی۔ ۲
یادوں کا جشن	کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ	سنہ ۱۹۸۶ء	جشنِ بیدی سحر کمیٹی۔ ایل۔ ۴۔ کناٹ سرکس نئی دِلّی
غزل کے نئے جہات	پروفیسر سید محمد عقیل	سنہ ۱۹۸۹ء	مکتبۂ جدید، $\frac{9}{1}$ گولہ مارکیٹ۔ نئی دِلّی۔ ۲
غزل کا نیا منظر نامہ	ڈاکٹر شمیم حنفی	سنہ ۱۹۸۱ء	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
اردو شاعری میں اشاریت	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	سنہ ۱۹۸۳ء	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ ۹ گولا مارکیٹ نئی دِلّی ۲
شہ نامۂ ہند (مسوّدہ)	بھگوان داس شعلہ	غیر مطبوعہ	مصنّف مرحوم، چڑی روڈ۔ کوتوالی بازار دھرم سالہ ہماچل
تنقیدی اشارے	آل احمد سرور	سنہ ۱۹۶۸ء	مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ
جگن ناتھ آزاد۔ ایک مطالعہ	محمد ایوب واقف	سنہ ۱۹۸۸ء	مونو مینٹل پبلشرز۔ نئی دِلّی
سنسکرت ساہتیہ کا آلوچناتمک اتہاس (دیوناگری)	ڈاکٹر بابو رام ترپاٹھی	سنہ ۱۹۷۳ء	ونود پستک مندر، اسپتال روڈ۔ آگرہ (یو۔پی)
تذکرہ شعرائے ہریانہ	ڈاکٹر رانا گنوری	سنہ ۱۹۸۳ء	مصنف [illegible] پروفیسر کالونی کیتھل ہریانہ

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

نام کتاب	مصنف/مؤلف	سنِ اشاعت	ناشر
دورِ جدید کے چند منتخب اردو شعرا	عبدالشکور ایم اے	سنہ ۱۹۴۳ء	کتب خانہ دانش محل - امین آباد - لکھنؤ
ارمغانِ حجاز (ترجمہ)	مضطر مجاز	سنہ ۱۹۷۷ء	مکتبہ نشاۃِ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد
ترجمہ کا فن اور روایت	ڈاکٹر قمر رئیس	سنہ ۱۹۷۶ء	تاج پبلشنگ ہاؤس جامع مسجد دہلی - ۶
دل کی گیتا	خواجہ دل محمدؒ	سنہ ۱۹۴۵ء	خواجہ بک ڈپو۔ موہن لال روڈ۔ لاہور
من کی گیتا	منموہن لال چھابڑہ	سنہ ۱۹۸۸ء	۲، آنند لوک نئی دلی ۴۹
اردو میں ادبِ اطفال۔ ایک جائزہ	اکبر رحمانی	سنہ ۱۹۹۱ء	ایجوکیشنل اکادمی۔ اسلام پورہ۔ جل گاؤں (مہاراشٹر)
گیتا تجلی (منظوم ترجمہ)	سیّد ظہیر عباس	درج نہیں	رنگ محل پبلی کیشنز۔ مظفر نگر۔ یو۔پی
نوائے ادب	مؤلفہ تلوک چند محروم	سنہ ۱۹۵۵ء	کرشنا بک ڈپو۔ انبالہ شہر
چند ادبی شخصیتیں	شاہد احمد دہلوی	سنہ ۱۹۸۰ء	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج نئی دلی ۲
تخلیق و تنقید	امیر اللہ خاں شاہین	سنہ ۱۹۸۶ء	ایضاً
تاریخِ ادب کی تدوین	علی جواد زیدی	سنہ ۱۹۸۳ء	نصرت پبلشرز لکھنؤ
اردو شاعری میں قومی یکجہتی کی روایت	ڈاکٹر رام آسرا راز	سنہ ۱۹۷۷ء	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ دہلی۔ ۲۵
اردو غزل میں قومی یکجہتی کے عناصر	ڈاکٹر مجاور حسین	سنہ ۱۹۸۷ء	اتر پردیش اردو اکاڈمی۔ لکھنؤ
اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب	ڈاکٹر کامل قریشی	سنہ ۱۹۸۷ء	دہلی اردو اکاڈمی۔ دریا گنج۔ نئی دلی۔ ۲
اقبال کے تصوراتِ عشق و خرد	ڈاکٹر وزیر آغا	سنہ ۱۹۸۸ء	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ نئی دلی ۲
قومی تہذیب کا مسئلہ	ڈاکٹر سیّد عابد حسین	سنہ ۱۹۵۵ء	انجمن ترقیِ اردو (ہند) علی گڑھ
اردو شاعری میں منظر نگاری	ڈاکٹر سلام سندیلوی	سنہ ۱۹۷۸ء	
دانش و بینش	کوثر چاند پوری	سنہ ۱۹۷۵ء	
لذ کار	آزاد گلاٹی	سنہ ۱۹۸۷ء	راجیو گلاٹی۔ نابھہ (پنجاب)
درگا سہائے سرور جہان آبادی۔ حیات اور شاعری	بادا کرشن گوپال مغموم	سنہ ۱۹۸۲ء	مصنف۔ ۲۶ رِبگ پیس روڈ۔ فیر فیلڈ نیو جرسی USA
کاروانِ ادب	مرتبہ ادبی کمیٹی	سنہ ۱۹۷۵ء	انجمن ترقی اردو ہند، شاخ دہلی

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

رسائل و جرائد

نام اخبار/جریدہ	شمارہ	مدیر	ناشر
ماہنامہ نگار لکھنؤ	سالنامہ جنوری فروری سنہ ۱۹۵۷ء	مولانا نیاز فتحپوری	ادارہ "نگار" لکھنؤ
دو ماہی شاخسار کٹک	شمارہ ۲۰، ۲۲، ۲۳ سنہ ۱۹۶۹ء	امجد نجمی	ادارہ شاخسار، بخشی بازار کٹک
ماہنامہ تعمیرِ ہریانہ چنڈی گڑھ	ستمبر اکتوبر سنہ ۱۹۷۷ء	ایم ایل بھاٹیہ	محکمہ تعلقات عامہ ہریانہ۔ سول سیکریٹریٹ، چنڈی گڑھ
روزنامہ ہندوستان ٹائمز نئی دِلی	۲۵ مئی سنہ ۱۹۷۰ء	—	ادارہ ہندوستان ٹائمز نئی دِلی۔۱
روزنامہ تیج۔ دہلی	متعدد شمارے	دھرم پال گپتا وفا	نیا بازار۔ دہلی ۶۔
روزنامہ 'وطن'، دہلی	ایضاً	شو نارائن بھٹناگر	ادارہ "وطن" چاندنی چوک۔ دہلی
ماہنامہ شاعر بمبئی	فروری سنہ ۱۹۷۴ء	اعجاز صدیقی	مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس ۵۲۶، بمبئی ۸
ماہنامہ شاعر بمبئی	جنوری سنہ ۱۹۷۸ء	"	"
ایضاً	مارچ سنہ ۱۹۷۹ء	تاجدار احتشام صدیقی	"
ماہنامہ "تحریک" نئی دِلی	سلور جبلی نمبر سنہ ۱۹۷۷ء	گوپال متل مخمور سعیدی	ادارہ تحریک، ۹، انصاری مارکیٹ نئی دِلی۲
ماہنامہ بیسویں صدی دِلی	ستمبر سنہ ۱۹۶۷ء	خوشتر گرامی	ادارہ بیسویں صدی، دریا گنج، نئی دلی۔۲
سہ ماہی "جدید فکر و فن" شملہ	اکتوبر سنہ ۱۹۸۶ء	دھرم پال عاقل	بھاشا سنسکرتی وبھاگ۔ شملہ۔۳
سہ ماہی "ادبی چوپال" لکھنؤ	اگست ستمبر سنہ ۱۹۷۶ء	انور ندیم	ہم لوگ پبلشرز، پوسٹ بکس نمبر ۲۹۷ لکھنؤ
دو ماہی "پروازِ ادب" پٹیالہ	نومبر دسمبر سنہ ۱۹۸۸ء	ایم ایس بدھیراجہ	محکمہ السنہ، پنجاب، پٹیالہ
ماہنامہ "نگارش" امرتسر	جلد ۴ شمارہ ۴	مہندر باوا	مکتبہ "نگارش" امرتسر
ماہنامہ "محفل" لاہور		طفیل ہوشیارپوری	مکتبہ "محفل" رائل پارک لاہور
ماہنامہ "ادم" دہلی	اپریل سنہ ۱۹۹۲ء	برہمانند نندہ	دفتر ادم کھڑکی ایکسٹنشن مالویہ نگر۔ نئی دِلی۔۱۷
ایضاً	نومبر سنہ ۱۹۹۲ء		"

SRINAGAR
Dated: ....

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

روزنامہ/جریدہ	شمارہ	مدیر	ناشر
ماہنامہ "سہیل" گیا (بہار)	شمارہ ۱۱ جلد ۵۱ فروری سنہ ۱۹۹۲ء	مسعود منظر	ادارہ "سہیل" ریور سائیڈ گیا (بہار)
ماہنامہ "انشا" کلکتہ	مئی سنہ ۱۹۸۹ء	ف۔س۔اعجاز	انشا پبلی کیشنز۔ ۶-۱ اے کنائی سیل سٹریٹ کلکتہ ۷۳-پن ۷۰۰۰۷۳
سہ ماہی "نخلستان" جے پور	اکتوبر تا سمبر سنہ ۱۹۸۸ء	ابوالفیض عثمانی	راجستھان اردو اکاڈمی سی سکیم۔ جے پور
ماہنامہ "گل کدہ" سہسوان	جنوری تا مارچ سنہ ۱۹۹۲ء	جلیس سہسوانی	ادارہ "گل کدہ" رستم ٹولہ۔ سہسوان بدایوں
ماہنامہ "نئی روشنی شاہ آباد	جون سنہ ۱۹۵۴ء	طالب شاہ آبادی	ادارہ نئی روشنی شاہ آباد
ماہنامہ رہنمائے تعلیم دِلی	مارچ سنہ ۱۹۹۱ء	ہر بھجن سنگھ تھاپر	پلاٹ نمبر ۵۲، پروانہ وہار۔ روہنی۔ دہلی-۸۵
ماہنامہ حقیقت بیانی دِلی	اکتوبر سنہ ۱۹۷۰ء	جگدیش مہتہ درد	۱۳/۱ پریم نگر جنک پوری۔ دہلی
ماہنامہ جاں نثار امرتسر	جولائی سنہ ۱۹۷۰ء	برہم ناتھ دت	ادارہ "جاں نثار" ۶۸۔ سبھاش نگر کٹڑہ شیر سنگھ امرتسر
ماہنامہ "پاسبان" چنڈی گڑھ	مئی سنہ ۱۹۵۹ء	رنبیر سنگھ امر	محکمہ تعلقات عامہ پنجاب، سیکرٹریٹ، چنڈی گڑھ
ہفت روزہ صدائے پنجاب جالندھر	۲-۹ مارچ سنہ ۱۹۵۸ء	سورج کنول سرور	صدائے پنجاب۔ سنٹرل ٹاؤن، جالندھر
ہفت روزہ ہماری زبان نئی دِلی	۲۲ دسمبر سنہ ۸۶ء	ڈاکٹر خلیق انجم	اردو گھر۔ راؤز ایونیو۔ نئی دِلی ۳
ایضاً ایضاً	۲۲ مئی سنہ ۱۹۸۸ء	ایضاً	ایضاً
″ ″	۱۵ جنوری سنہ ۱۹۸۹ء	″	″
″ ″	۲۲ اپریل سنہ ۱۹۸۹ء	″	″
″ ″	۸ اپریل سنہ ۱۹۸۷ء	″	″
″ ″	۱۵ اکتوبر سنہ ۱۹۸۹ء	″	″
ماہنامہ "انتخاب" ڈھاکہ	نومبر سنہ ۱۹۸۶ء	ڈاکٹر عزیزی	مرکز تخلیق ادب سید پور۔ بنگلہ دیش
ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ (دیا نرائن نگم نمبر)	جون جولائی سنہ ۱۹۸۲ء	امیر احمد صدیقی	محکمہ اطلاعات۔ اتر پردیش۔ لکھنؤ

Gandhi Memorial College
SRINAGAR
Acc. No. ....
Dated: ....
CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

G.M.C.E.J
3535

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

بشیشور پرشاد منوّر ہمارے صفِ اوّل کے شعرا میں تھے۔ اُنھوں نے شاعری میں جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ اُردو کے ادب العالیہ کے جادے پر روشنی کے مینار ہیں۔ لیکن اِس دورِ ناقدر شناس کو کیا کہیے کہ شعر و ادب کو اپنا خونِ جگر دینے والوں کو بھی یہ دور اس طرح فراموش کر دیتا ہے کہ شاعر ہو یا نثر نگار، اُس کے انتقال کے بعد اُس کے کام کے ساتھ ہی ساتھ اُس کا نام بھی ذہنوں سے محو ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ناقدر شناسی کا یہ رُجحان اگرچہ وطنِ عزیز کی اور زبانوں میں بھی پایا جاتا ہے لیکن ہم اُردو والے اِس فراموش گاری اور اس بے اعتنائی کے معاملے میں دوسری تمام زبانوں کے اہلِ قلم سے آگے ہیں۔

خدا بھلا کرے ڈاکٹر شباب للت کا کہ انھوں نے اِس قریب قریب گم شدہ ہیرے کو ماضی کے نہاں خانے سے برآمد کر کے اور اس پر سے وقت کی گرد جھاڑ کے اسے اپنی اصل صورت یعنی درخشندہ ہیرے کی طرح پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر شباب للت مدیر "جدید فکر و فن" (شملہ) خود ایک باکمال شخصیت ہیں۔ آپ اُردو میں ایم۔ اے ہونے کے علاوہ تاریخ میں بھی ایم۔ اے ہیں۔ گولڈ میڈلسٹ ہیں، ماہرِ تعلیم ہیں اور ان تمام محاسن کے علاوہ اُن کی اوّلین پہچان ایک ماہرِ فن شاعر اور نثر نگار کی ہے۔ میں اسے اُردو ادب کی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر شباب للت ایسے معروف شاعر، مستند نقاد اور معتبر محقق نے "منوّر لکھنوی ایک مطالعہ" کے زیرِ عنوان تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اردو شاعری کے سچّے اور کھرے پارکھی، اور جوہر شناس اس کتاب کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور بشیشور پرشاد منوّر کے کمالِ سخن گوئی کو "منوّر لکھنوی ایک مطالعہ" کے آئینے میں دیکھ کر منوّر لکھنوی کے شاعرانہ محاسن سے بھی متاثر ہوں گے اور ڈاکٹر شباب للت کو بھی ان کی دیدہ ریزی اور جگر کاوی کی داد دیں گے۔

جگن ناتھ آزاد

ایسوسی ایشن آف انڈین یونیورسٹیز گیسٹ ہاؤس
نئی دہلی۔ ۱۵ اگست ۱۹۹۵ء

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation,Chandigarh.Funding by IKS-MoE-2025-Grant